فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۹)

المجلد التاسع

بقية الصلوٰة، صلوٰة المريض

الجمعية العيدين، الجنائز الىٰ حمل الجنازة

۳۴۲۴ ــــــــ ۳۸۹۳

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبه اشرفیه، دیوبند، ضلع سهارنپور، الهند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

فہرست مضامین

۹/بقیۃ کتاب الصلاۃ

۲۷/ باب صلاۃ المریض

۲۸/ باب الجمعة

(۱) فصل في الفضائل و وقتها

۲/ فصل في شرائط الجمعة

۳/ فصل في أذان الجمعة

۴/ فصل في الخطبة

۱/ فصل في الإمامة والقضاء وغيرها

۲/ فصل في صلاة العیدین

۳/ فصل في صلاة العید في المسجد

۴/ فصل في تكبيرات التشريق

۵/ فصل في من يجب عليه صلاة العيد

۶/ فصل في الدعاء، والمصافحة

۱۰/ كتاب الجنائز

۱/ باب الجنائز ومتعلقاتها

۲/ باب غسل المیت

۳/ باب تکفین المیت

۴/ باب فضل صلوة الجنازة وغيرها

۷/ باب من یستحق بالصلاۃ علی المیت

۸/ باب من یصلیٰ علیہ ومن لا یصلیٰ علیہ

۹/ باب حمل الجنازة

۹/ بقية كتاب الصلاة

(۲۷) باب صلاۃ المریض

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

پیشاب کے قطرے نکلتے رہیں تو نماز کیسے پڑھے؟

سوال [۳۴۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے ساتھ یہ پریشانی ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد تقریباً نصف گھنٹہ قطرے آتے رہتے ہیں، اس کے بعد وہ نماز وغیرہ کے لئے وضو کرتا ہے، اب اگرچہ قطرہ نہیں آیا، یعنی آدھے گھنٹہ کے بعد، مگر قطرہ کا شبہ رہتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قطرہ آگیا ہو، پھر کپڑے یا عضو مخصوص کو دیکھتا ہے تو وہاں گیلا پن اور نمی نہیں ہوتی اور ایسا قریب بیس برس سے ہے، یہ پریشانی ہے کیا کیا جائے؟ بعد از پیشاب نصف گھنٹہ اگرچہ قطرہ کا احتمال ختم ہوجاتا ہے، مگر ایسا لگتا رہتا ہے جیسے قطرہ آگیا ہو؛ لیکن کپڑے اور عضو پر نہ تو گیلا پن ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی نشان، اس شبہ کو لے کر بہت تشویش ہے، رہنمائی فرمائیں؟

المستفتی: عبداللہ رامپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کے لئے بہتر شکل یہ ہے کہ پیشاب سے فراغت کے بعد سوراخ کے اندر کوئی چیز مثلاً روئی وغیرہ رکھ لے؛ تاکہ اس کے اندرونی حصہ سے

پیشاب باہر نہ آئے اور اس کے بعد مطمئن ہوکر وضو کرکے نماز ادا کرلے؛ اس لئے کہ روئی وغیرہ رکھنے کی وجہ سے پیشاب کا قطرہ نہ تو باہر آئے گا اور نہ ہی وضو ٹوٹے گا یہ بہتر شکل ہے؛ لیکن اگر یہ شکل نہ ہوسکے تو خوب کھنکھار کر کھڑے ہوکر ٹیشو پیپر یا مٹی کے ڈھیلے وغیرہ کا استعمال کرے اور تھوڑی دیر کے لئے ذرا بدن میں حرکت دے، اس کے بعد پانی سے استنجاء کرے اور پائجامہ کی رومالی پر پانی کی چھینٹیں مار لے، پھر اس کے بعد وضو کرکے بےفکری سے نماز پڑھے اگر کچھ نکلنے کا شبہ محسوس ہو تو اس کی طرف قطعاً دھیان نہ دے اور یہ سوچے کہ میں نے پانی کے ذریعہ سے رومالی کو بھگودیا ہے؛ لہٰذا جو کچھ بھیگا ہوا دیکھے اس کے بارے میں یہی سوچے کہ یہ اس پانی کی تراوٹ ہے، جو میں نے رومالی کو پانی کے چھینٹوں کے ذریعہ سے تر کیا ہے، شریعت کا یہی حکم ہے۔

قلت: و من كان بطئ الاستبراء، فليفتل نحو ورقة مثل الشعيرة ويحتشي بها في الإحليل فإنها تتشرب ما بقي من أثر الرطوبة التي يخاف خروجه –إلى– وقد جرب ذلك فوجد أنفع من ربط المحل الخ (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في الفرق بين الاستبراء والاستنقاء، زكريا ۱/ ۵۵۸، كراچي ۱/ ۳۴۵)

الحيلة في قطع هذه الوسوسة، أن ينضح فرجه بالماء، فإذا أراه الشيطان ذلك أحاله على الماء. (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الطهارة، الفصل الثاني في مايوجب الوضوء، زكريا ۱/ ۲۷۰، رقم: ۳۵۷)

عن سعيد بن جبيرؓ، أن رجلا أتى ابن عباس فقال: إني أجد بللاً إذا قمت أصلي، فقال ابن عباس: انضح بكأس من ماء، وإذا وجدت من ذلك شيئاً، فقل هو منه، فذهب الرجل فمكث ما شاء الله، ثم أتاه بعد ذلك فزعم أنه ذهب ما كان يجد من ذلك. (السنن الكبرى للبيهقي دارالفكر، جديد ۱/ ۲۷۳، رقم: ۷۸۰، بيروت قديم ۱/ ۱۶۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۶۱۳/۱۱)

اشارہ سے نماز پڑھنے والے کے پیچھے رکوع سجدہ کرنے والوں کا نماز پڑھنا

سوال [۳۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اشارہ کر کے نماز پڑھنے والے کے پیچھے رکوع وسجدہ کرنے والے کی نماز درست ہے یا نہیں؟ نیز اس میں فرائض ونوافل کا حکم یکساں ہے یا کوئی فرق ہے؟ کیوں کہ مرکز میں حضرت مولانا زبیر صاحب کرسی پر تراویح پڑھاتے ہیں، اسی کو بتا کر ہمارے یہاں ایک صاحب نے کرسی پر بیٹھ کر تراویح پڑھائی۔

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رکوع اور سجدے پر قادر لوگوں کا اشارے سے نماز پڑھنے والے کی اقتداء کر کے نماز پڑھنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ رکوع اور سجدے پر قادر لوگوں کی حالت قوی ہے اور امام کی حالت ضعیف ہے، قوی کا ضعیف پر بنا کرنا درست نہیں ہے، اس سلسلے میں فرائض ونوافل سب کا حکم یکساں ہے؛ لہٰذا آپ کے وہاں جس صاحب نے مولانا زبیر صاحب کا حوالہ دے کر کرسی پر بیٹھ کر تراویح پڑھائی ہے، اس کے پیچھے جتنے دن تراویح پڑھی گئی مقتدیوں کی تراویح کی نماز درست نہیں ہوئی۔

نیز مولانا زبیر صاحب کا حوالہ دینا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ مولانا زبیر صاحب کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز نہیں پڑھتے؛ بلکہ زمین پر بیٹھ کر با قاعدہ رکوع وسجدے کے ساتھ فرض و وتر اور تراویح کی نماز پڑھتے ہیں اور مرکز سے براہ راست مولانا عبید اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالرحیم صاحب سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ فرض و وتر کی نماز خود مولانا عبدالرحیم صاحب پڑھاتے ہیں اور تراویح حضرت مولانا زبیر صاحب مدظلہ باقاعدہ رکوع وسجدے کے ساتھ پڑھاتے ہیں، نہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھاتے ہیں اور نہ اشارے کے ساتھ پڑھاتے ہیں، مسئلہ شرعی یہ ہے کہ بیٹھ کر رکوع وسجدے کے ساتھ نماز

پڑھانے والے کے پیچھے کھڑے ہوکر اقتداء کرنا درست ہے اور محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے اپنی عبادت خراب نہیں کرنی چاہئے۔

ویصح اقتداء القائم بالقاعد، الذي یرکع، ویسجد، لا اقتداء الراکع والساجد بالمؤمي، هکذا في فتاوی قاضیخان. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بیان ما یصلح إماما لغیره، زکریاقدیم ۱/۸۵، جدید ۱/۱۴۲)

ولایصح اقتداء الراکع، والساجد بالمؤمي. (قاضي خاں علی هامش الهندیة، کتاب الصلاة، باب الاذان، فصل فیمن یصح الاقتداء به و فیمن لا یصح، زکریا قدیم ۱/۸۹، زکریا جدید ۱/۵۸)

ولاقادر علی رکوع، و سجود بعاجز عنهما. وفي الشامي: أي بمن یؤمي بهما قائماً، أو قاعداً، بخلاف مالو أمکناه قاعداً، فیصح لبناء القوي علی الضعیف. (شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب الواجب کفایة هل یسقط بفعل الصبي وحده، کراچي ۱/۵۷۹، زکریا ۲/۳۲۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۶۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۸ھ

قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [۳۴۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی بیمار رہتا ہے؛ لیکن نماز کے لئے پیادہ چل کر مسجد میں آتا ہے اور بیٹھ کر نماز باجماعت ادا کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ اتنی قدرت رکھتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کھڑے ہوکر کہے، تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد سلمان لاتور، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیمار آدمی کو اگر اتنی قدرت ہو کہ کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ اور ایک آیت یا اس سے کم پڑھ سکتا ہے، تو کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ کہہ کر نیت باندھنا لازم ہے اور جب کھڑے ہونے میں تحمل نہ ہو سکے تو درمیان میں بیٹھ جانے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳/ ۵۵، جدید زکریا ۵/ ۱۵۸)

عن ابن عباسؓ، عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: یصلي المریض قائماً، فإن نالته مشقة صلی جالساً. الحدیث (المعجم الأوسط للطبراني، دارالفکر ۳/ ۱۰۳، رقم: ۳۹۹۷)

وإذا کان قادراً علی بعض القیام ولو قدر آیة، أو تکبیرة دون تمامه. قال أبو جعفر الهندواني: یؤمر بأن یقوم مقدار ما یقدر، فإذا عجز قعد، وإن لم یفعل خشیت أن تفسد صلاته. (عنایة مع الفتح،باب صلاة المریض کوئٹہ ۱/ ۴۵۷، دارالفکر بیروت ۲/ ۳، زکریا ۲/ ۳-۴)

لو کان قادراً علی بعض القیام دون تمامه یؤمر بأن یقوم قدر ما یقدر، حتی إذا کان قادراً علی أن یکبر قائماً، ولا یقدر علی القیام للقراء ة، أوکان قادراً علی القیام لبعض القراء ة دون تمامها یؤمر بأن یکبر قائماً، ویقرأ قدر ما یقدر علیه قائماً، ثم یقعد إذا عجز. قال شمس الأئمة الحلواني: هو المذهب الصحیح. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلاة المریض، زکریا قدیم ۱/ ۱۳۶، جدید ۱/ ۱۹۶)

فإذا کان قادراً علی بعض القیام دون تمامه کیف یصنع؟...... قال الفقیه أبو جعفر: یؤمر بأن یقوم مقدار ما یقدر، فإن عجز قعد. (الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الصلاة، الفصل الحادي والثلاثون في صلاة المریض، زکریا ۲/ ۶۶۸، رقم: ۳۰۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۶۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۵ھ

تھوڑی دیر قیام پر قدرت رکھنے والے کا ہر رکعت میں تھوڑی دیر کے لئے قیام کرنا

سوال [۳۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو مریض کھڑے ہوکر نماز نہ پڑھ سکے اس کو بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے، مگر ہو سکے تو تکبیر تحریمہ کھڑے ہوکر کہہ لے یا جتنی دیر کھڑا ہو سکے اتنا کھڑا ہوکر بیٹھ جائے، معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر مریض ہر رکعت میں تھوڑی دیر کھڑا ہونے کی طاقت رکھتا ہے، تو کیا ہر رکعت میں تھوڑی دیر کھڑا ہوکر بیٹھ جائے یا یہ مسئلہ صرف پہلی رکعت کا ہے کہ تکبیر تحریمہ کھڑا ہوکر کہہ کر بیٹھ جائے؟ فقہاء کی جو رائے ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے اندر قیام فرض ہے؛ البتہ جو مریض قیام پر قادر نہیں یا تھوڑی دیر قیام کی طاقت رکھتے ہیں، تو ایسے مریض کے لئے حسب قدرت قیام فرض اور لازم ہوگا، بریں بنا ہر رکعت میں جتنی دیر کھڑے ہوسکتے ہیں، اتنی دیر کھڑے ہونے کے بعد پھر بیٹھ کر پڑھنے کی گنجائش ہے۔

من فرائضها القيام في فرض لقادر عليه وعلى السجود. (در مختار مع الشامي، باب صفة الصلاة، بحث القيام، كراچي ١/٤٤٤، زكريا ٢/١٣٢)

أصح الأقاويل في تفسير العجز أن يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوىٰ.

(هندية، الباب الرابع عشر في صلاة المريض، زكريا قديم ١/١٣٦، جديد ١/١٩٦)

ولو كان قادراً على بعض القيام دون تمامه يؤمر بأن يقوم قدر ما يقدر، حتى إذا كان قادراً على أن يكبر قائماً، ولا يقدر على القيام للقراءة، أو كان قادراً على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائماً، ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائماً، ثم يقعد إذا عجز قال شمس الأئمة الحلواني: هو المذهب الصحيح.

(هنـدية، كتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلوٰة المريض، زكريا قديم ١٣٦/١، جديد ١٨٦/١، جديد ١٩٦/١، حلبي كبير، الفرض الثاني القيام، اشرفي ص: ٢٦٢، الفتاوى التاتارخانية قديم ٢٥٦، كتاب الصلاة، الفصل الحادي والثلاثون، زكريا ٦٦٨/٢، رقم: ٣٥٣٧)

"وإلا" أي بأن قدر على بعض القيام قام بقدر ما يمكنه بلا زيادة مشقةٍ، ولو بالتحريمة وقراءة آية...... هو المذهب الصحيح؛ لأن الطاعة بحسب الطاقة، قوله "قام بقدر ما يمكنه"؛ لأن البعض معتبر بالكل...... والمعنى أنه يقوم إلى أن يتعسر عليه القيام فيقعد، وهذه الحالة كحالة العجز ابتداءً. (طحطاوي مع المراقي، باب صلاة المريض، دارالكتاب ديوبند ص: ٤٣١، شامي، زكريا، باب صلاة المريض، كراچي ٩٧/٢، زكريا ٥٦٧/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر المظفر ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۶۳۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۲۴ھ

سجدہ پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا

سوال [۳۴۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں چند آدمیوں نے آنکھیں بنوائی ہیں، ڈاکٹر نے سجدہ کرنے کو سختی سے منع کر دیا ہے قیام اور رکوع کر سکتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا سجدہ پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے قیام ورکوع ساقط ہوجائے گا؟ اور بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی یا کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنا فرض ہوگی؟ اور سجدہ بیٹھ کر اشارہ سے کرلیں، فقہاء کی کیا رائے ہے؟

المستفتی: محمد عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: مسئولہ صورت میں سجدہ پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور ایسے لوگ رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرسکتے ہیں۔

عن ابن عمر رضي الله عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من استطاع منكم أن يسجد فليسجد، ومن لم يستطع فلا يرفع إلى جبهته شيئاً ليسجد عليه؛ ولكن ركوعه، و سجوده يؤمي برأسه. (المعجم الأوسط دارالفكر ۲۰۷/۵، رقم: ۷۰۸۹)

عن نافع أن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما كان يقول: إذا لم يستطع المريض السجود، أومأ برأسه إيماء، ولم يرفع إلى جبهته شيئاً.

(موطأ إمام مالك، باب العمل في جامع الصلاة، اشرفي ديوبند ص:۵۹)

وإن قدر على القيام، ولم يقدر على الركوع، والسجود لم يلزمه القيام، ويصلي قاعداً يؤمي إيماء؛ لأن ركنية القيام للتوسل به إلى السجدة لما فيها من نهاية التعظيم، فإذا كان لايتعقبه السجود لايكون ركناً، فيتخير والأفضل هو الإيماء قاعداً؛ لأنه أشبه بالسجود. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، اشرفي ۱/ ۱۶۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۳ھ

عمر رسیدہ سانس کا مریض جو طہارت حاصل کرنے پر قادر نہ ہو، کس طرح نماز پڑھے؟

سوال [۳۴۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں اس قدر کمزور ہوں اور سانس کا مریض ہوں کہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ بذات خود غسل کرسکوں بوجہ عمر ۷۲ر سال، اس وجہ سے ہاتھ پیر سب جواب دے رہے ہیں، تو اب کس طرح غسل کروں اور کس طرح وضو کروں؛ کیوں کہ جب دوسرا اٹھاتا ہے تب میں اٹھ پاتا ہوں، پھر نماز کس طرح ادا کی جائے، تیمّم کی بھی طاقت نہیں؛ کیوں کہ اتنی ہی مجبوری

شامل حال ہے اور کوئی کرانے والا بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں نماز کس طرح ادا کی جائے؟ اس کا جواب بہت جلد دیں؛ کیوں کہ نمازیں قضا ہو رہی ہیں۔

المستفتی: محمد یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جولوگ آپ کو آ کر اٹھاتے ہیں وہ آپ کو وضو بھی کرا سکتے ہیں؛ اس لئے ان سے وضو کی خدمت لے کر نماز پڑھا کریں، اگر ٹھنڈا پانی استعمال کرنے پر قادر نہیں ہیں، تو پانی گرم کرالیں اور اگر گرم پانی کا نظم نہیں تو ان کے ذریعہ تیمّم کرالیں، دیوار پر بھی تیمّم جائز ہو جاتا ہے۔

وإن عجز عن التيمم في الأكثر، أو النصف، سقط التيمم، ويصلى إذا صح، وقيل يأمر غيره أن يؤممه، أو مسح وجهه، وذراعيه على جدار.

(تاتار خانية، كتاب الطهارة، الفصل الخامس في التيمم، زكريا ۱/ ۳۸۱، رقم: ۸۳۳، كوئٹه ۱/ ۲۴۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۸/۱۴۲۳ھ

غیر کی مدد سے وضو پر قادر شخص کا تیمّم سے نماز پڑھنا

سوال [۳۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی آنت اور ٹانگ کی ہڈی کا آپریشن ہوا ہے، ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے، مگر پیر ٹخنوں تک کھلا ہوا ہے، اس پر پلاسٹر نہیں ہے، یہ شخص اس حالت میں چل پھر نہیں سکتا ہے؛ البتہ بیٹھ جاتا ہے اور پیر پھیلائے رہتا ہے، اس حالت میں کیا یہ شخص تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا استعانت بالغیر کے ذریعہ وضو کرنا لازم ہے؟ اگر اس شخص نے اب تک تیمّم کر کے

نمازیں ادا کیں، تو کیا ان کا اعادہ لازم ہے؟ وضو کرانے والے اور خدمت گار بہت موجود ہیں، جو وضو کرا سکیں، تو کیا اس شخص کے لئے تیمّم کافی ہوگا یا وضو کر کے نماز ادا کرے گا؟

المستفتی: شرافت اللہ، ناسکہ سرائے شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ٹخنوں کے نیچے پلاسٹر کا حصہ کھلا ہوا ہے، تو وضو میں اس کا دھونا بھی واجب ہے اور جو نمازیں اب تک تیمّم سے پڑھی جا چکی ہیں وہ واجب الاعادہ ہیں۔

فإن كان الأكثر صحيحًا، والأقل جريحاً يغسل الصحيح، ويمسح على الجريح إن أمكنه، وإن لم يمكنه المسح يمسح على الجبائر، أو فوق الخرقة. (هندية، كتاب الطهارة، الباب الرابع في التيمم، زكريا قديم ١/ ٢٨، جديد ١/ ٨١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۷۳۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۹ھ

آپریشن شدہ آنکھ والا شخص وضو کر کے نماز پڑھے یا تیمّم کر کے؟

سوال [۳۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی آنکھ کا آپریشن ہوا، پانی منھ پر لگانے کو اور آنکھ دھونے کو ڈاکٹر نے منع کر دیا، یہ شخص چلتا پھرتا بھی ہے، مگر منھ کو پانی لگانا منع ہے، تو کیا یہ شخص نماز تیمّم کر کے ادا کرے یا پھر نماز کو قضا کرے، جب تک پانی لگانے کی اجازت نہیں ہے؟

المستفتی: شرافت اللہ، ناسکہ سرائے شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنکھ پر لگی پٹی کے اوپر تر انگلیوں سے مسح کرے اور باقی

اعضاء کو دھوئے اور اگر آنکھ پر پٹی نہیں ہے، تو وضو کے وقت آنکھ کو اچھی طرح سے بند کرے کہ پانی آنکھ کے اندر نہ جائے اور چہرے کو دھولے، اگر ڈاکٹر نے آنکھوں پر پانی لگنے سے منع کیا ہے چہرے پر پانی لگنے سے منع نہیں کیا ہے۔

عن الحكم قال: إذا كان في اليد، أو الرجل الجرح فخشي عليه صاحبه إن أصابه الماء مسح على الخرقة إذا توضأ. (مصنف ابن أبي شيبه، كتاب الطهارة، المسح على الجبائر ۲/ ۱۲۰، رقم:۱۴۵٤)

وكما يجوز المسح على الخف يجوز المسح على الجبائر، إذا كان يضره المسح على الجراحة، وإذا كان لايضره المسح على الجراحة لايجوز المسح على الجبائر. (قاضيخان على الهندية، كتاب الطهارة، فصل في المسح على الخفين زكريا قديم ۱/ ۵۰، زكريا جديد ۱/ ۳٤)

المسح على الجبائر إنما يجوز إذا كان لايقدر على المسح على القرحة، كما كان لايقدر على غسلها، بأن كان يضرها الماء، أما إذا كان يقدر على المسح على القرحة، فلايجوز المسح على الجبائر. (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الطهارة، الفصل السادس، المسح على الخفين، زكريا ۱/ ٤۲٤، رقم: ۱۰۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۳۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۹ھ

ریاحی مریضہ کے لئے ایک وضو سے نماز کا حکم

سوال [۳۴۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری والدہ محترمہ (عمر لگ بھگ ۶۵/ سال عرصے) سے مختلف امراض میں مبتلا نہایت نحیف وضعیف ریاحی تکلیف کی وجہ سے دوران نماز ریاح خارج ہونے کی صورت میں

ایک ہی وقت کی نماز میں کئی کئی بار وضو کرتی ہیں، کیا ایک وقت کی نماز کے لئے صورت مذکورہ میں ایک ہی وضو کافی ہے؟ براہ کرم واضح جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) استنجاء کرنے میں وہ باوجود ضعف اور ہزال جسم ۳۰/۴۰ منٹ لگاتی ہیں، کئی کئی بار مسلسل استنجا کرتی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے ضعف میں اضافہ ہوتا ہے، واضح فرمائیں شریعت کی رو سے استنجاء کی اصل اور ضروری مقدار کتنی ہے؟

المستفتی: محمد افضال، ٹھٹھیرہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال نامہ کے مطابق آپ کی والدہ شرعاً معذور کے حکم میں داخل ہیں اور معذور کے لئے حکم یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے لئے مستقل وضو کرلیا کرے بار بار وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس ایک مرتبہ وضو کر کے نماز پڑھے چاہے اس درمیان غیر اختیاری طور پر ریح خارج ہو، بہر صورت نماز درست ہے۔

وصاحب عذر من به سلس بول، أو استطلاق بطن، أو انفلات ريح، أو استحاضة، إن استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة، ولو حكمًا إلى أن قال و حكمه الوضوء لكل فرض، ثم يصلي به فيه فرضاً، ونفلاً.

(الدر المختار، كتاب الطهارة، باب الحيض، مطلب في أحكام المعذور، زكريا ١/٤ ٠ ٥، كراچي ١/ ٥ ٠ ٣، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الطهارة، باب الحيض و الاستحاضة، دارالكتاب ديوبند ص: ١٤٩)

(۲) شریعت میں استنجاء کی اصل یہ ہے کہ انسان کا دل اس کے اثر کے ختم ہونے پر مطمئن ہوجائے اور اس کے لئے الگ سے کوئی مقدار متعین نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پانی بہانا کافی ہے اور ایک لوٹے سے استنجاء کرنا کافی ہے، زیادہ سے زیادہ دو لوٹا استعمال کرے، اس سے زیادہ غیر ضروری ہے۔

يجب الاستبراء الخ هو طلب البراءة من الخارج بشيء مما ذكره الشارح،

حتى يستيقن بزاول الأثر. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في الفرق بين الاستبراء والاستنقاء والاستنجاء، زكريا ۱/ ۵۵۸، كراچي ۱/ ۳٤٤)

يلزم الرجل الاستبراء......والمراد طلب براءة المخرج عن أثر الرشح، حتى يزول أثر البول......ويطمئن قلبه. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الطهارة، فصل في الاستنجاء، قديم ٢٤، دارالكتاب ديوبند جديد ۴۲)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍شوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۱۵۰)

جس کو پیشاب کی نلکی لگی ہوئی ہے وہ کس طرح نماز پڑھے؟

سوال [۳۴۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کے گردہ کا آپریشن ہوا ہے، ڈاکٹر نے نلکی لگادی ہے، جس میں سے پیشاب آتا رہتا ہے، ایک تھیلی پلاسٹک کی دے دی ہے، جس میں پیشاب اکٹھا ہوجاتا ہے، جو ہر وقت مریض سنبھالے رہتا ہے، کیا یہ شخص وضو کرکے ایسی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے؛ جبکہ پیشاب کی تھیلی سامنے لٹکی ہوئی ہے؟ یا کیا کرے؟ وضاحت مطلوب ہے۔

المستفتی: حافظ شرافت اللہ، محلّہ ناسکہ سرائے، شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا شخص شرعی طور پر معذور ہے اور ایسے معذور کے لئے اسی طریقے پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے، جس طرح سے پیشاب کا تھیلا اس کے سامنے لٹکا ہوا ہے۔

وصاحب عذر من به سلس بول لايمكنه إمساكه، حتى ما قال: إن استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة، بأن لايجد في جميع وقتها زمناً

یتوضأ ویصلي فیه خالیاً عن الحدث. (الدر المختار مع الشامي، کتاب الطهارة، باب الحیض، مطلب في أحکام المعذور، کراچي ۱/ ۳۰۵، زکریا ۱/ ۵۰٤)

ومن به عذر کسلس بول……یتوضأ لوقت کل فرض لا لکل فرض ولا نفل. (مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، کتاب الطهارة، باب الحیض والاستحاضة، دارالکتاب دیوبند ص: ۱٤۹، قدیم ۸۰، هندیة، کتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء، الفصل الرابع في أحکام الحیض، زکریا قدیم ۱/ ٤۱، جدید ۱/ ۹۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۳۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۹ھ

آں حضرت ﷺ نے بیماری کے زمانہ میں کرسی پر بیٹھ کر نماز کیوں نہیں پڑھائی؟

سوال [۴۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ ﷺ کو ایک موقعہ پر چوٹ لگی تو آپ کھڑے ہوکر رکوع وسجدہ کرنے پر قادر نہ تھے؛ لہٰذا آں حضرت ﷺ نے زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھائی، سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کرسی پر بیٹھ کر نماز کیوں نہیں پڑھائی؛ جبکہ کرسی کا وجود آپ کے زمانہ میں بھی تھا؟

المستفتی: محمد فرقان غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصل بنیاد یہ ہے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنے خالق ومالک حق تعالیٰ کے سامنے بندہ اپنی ذلت کا اظہار کرتا ہے، کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے میں یہ مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا؛ اس لئے آں حضرت ﷺ نے زخم کی سخت تکلیف کی حالت میں بھی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھائی ہے۔

عن أنس بن مالکؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سقط عن فرسه فجحشت ساقه، أو كتفه، وآلى من نسائه شهراً، فجلس في مشربة له درجتها من جذوع النخل، فأتاه أصحابُه يعودونه فصلیّٰ بهم جالساً وهم قيامٌ.
(بخاري‌شريف، كتاب الصلاة، باب الصلاة في السطوح و المنبر، النسخة الهندية ۱/۵۵، رقم: ۳۷۶، ف:۳۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۴۰۲)

بلا عذر شدید کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [۴۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش کس وقت ہے؟ اور کس طرح کے عذر سے جائز ہے؟

المستفتی: محمد سلیمان غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص پیر اور کمر وغیرہ میں تکلیف کی وجہ سے کسی بھی طرح زمین پر بیٹھ کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اس کے لئے یہ گنجائش ہے کہ کرسی یا اسٹول وغیرہ پر بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھ لے؛ لیکن جو شخص کسی بھی طرح زمین پر پالتھی مار کر یا پیر پھیلا کر بیٹھ سکتا ہو اور اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہو تو اس کے لئے کرسی وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ممنوع اور مکروہ ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱؍۵۷۹، چند اہم عصری مسائل ص: ۱۲۵)

عن عمران بن حصين قال: كانت بي بواسير، فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصلاة، فقال صل قائماً، فإن لم تستطع فقاعداً، فإن لم تستطيع فعلى جنب. (بخاری شريف، تقصير الصلاة، باب إذا لم يطق قاعداً

صلى على جنب النسخة الهندية ١/ ١٥٠، رقم: ١١٠٦، ف: ١١١٧، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في صلاة القاعد، النسخة الهندية ١/ ١٣٧، دار السلام رقم: ٩٥٢)

فإن عجز عن الركوع، والسجود، وقدر على القعود، فإنه يصلي قاعداً بإيماء. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الحادي والثلاثون في صلاة المريض ٢/ ٦٦٧، رقم: ٣٥٣٥)

يصلي مؤمياً وهو قاعد إن تعذر الركوع والسجود لما قدمناه، ولأن الطاعة بحسب الطاقة. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، زكريا ٢/ ١٩٩، كوئٹه ٢/ ١١٣)

فإن عجز عن الركوع، والسجود، وقدر على القعود، فإنه يصلي قاعداً بإيماء. (محيط برهاني، كتاب الصلاة، الفصل الحادي والثلاثون في صلاة المريض، المجلس العلمي ٣/ ٢٦، رقم: ٢٣٣٨، كذا في الهندية، كتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلاة المريض، زكريا قديم ١/ ١٣٦، جديد ١/ ١٩٦، شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، زكريا ٢/ ٥٦٨، كراچي ٢/ ٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۴۱۷)

کیا حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ثابت ہے؟

سوال [۴۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا آپ ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الرحمٰن، کھرگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا نہ تو آپ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی

حضرات صحابہ ﷺ سے؛ چناں چہ ایک موقعہ پر آپ کی پنڈلی میں چوٹ لگ گئی تو آپ نے زمین پر بیٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھائی؛ حالاں کہ کرسی کا وجود آپ کے زمانے میں بھی تھا، اسی طرح صحابیٔ رسول حضرت اُہبان بن اوسؓ کے گھٹنے میں تکلیف رہتی تھی وہ بجائے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کے زمین پر بیٹھ کر اور گھٹنے کے نیچے تکیہ رکھ کر نماز پڑھتے تھے۔

عن أنس بن مالکؓ، أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقط عن فرسه فجحشت ساقه، أو کتفه، وآلی من نسائه شهراً، فجلس في مشربة له درجتها من جذوع النخل، فأتاه أصحابُه یعودونه، فصلیّ بهم جالساً، وهم قیامٌ.
(بخاري شریف، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ في السطوح والمنبر الخ النسخة الهندیة ۱/۵۵، رقم:۳۷٦، ف:۳۷۸)

عن مجزأة عن رجل منهم من أصحاب الشجرة، اسمه أهبان بن أوس، وکان اشتکیٰ رکبته، فکان إذا سجد جعل تحت رکبتهٖ وسادۃ. (بخاري شریف، کتاب المغازي، باب غزوۃ الحدیبیة، النخسة الهندیة ۲/٦۰۰، رقم:۴۰۲۲، ف:۴۱۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۴۹/۴۰)

کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنا اولیٰ ہے یا بیٹھ کر؟

سوال [۳۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر ہے اور بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے پر بھی قادر ہے تو اس کے لئے کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے اور یہ حنفیہ کا مشہور قول ہے، مگر

حضرت مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے ۲/۴/۱۴۳۴ھ میں ایک مدلل فتویٰ لکھا ہے، جو ماہنامہ البلاغ کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث اور اعلاء السنن کی عبارت سے اس کے برخلاف یہ ثابت فرمایا ہے کہ بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے؛ اس لئے کہ کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کی صورت میں قیام جو رکن صلوۃ ہے، اس کی ادائیگی ہوجاتی ہے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں اس کی ادائیگی رہ جاتی ہے، تو مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ اپنی تحقیق سے آگاہ فرمائیں کہ فقہاء کے مشہور قول کو ترجیح حاصل ہوگی یا مفتی تقی صاحب کے قول کو اس سلسلہ میں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیے۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن، بڑا گاؤں ہموانہ، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کا تحقیقی فتوی دیکھ لیا گیا ہے، حضرات فقہاء متاخرین کا مشہور قول یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر ہے اور زمین پر بیٹھ کر بھی اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر ہے، تو ایسی صورت میں اس کے لئے کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا زیادہ بہتر اور راجح ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

وإن قدر على القيام، ولم يقدر على الركوع، والسجود لم يلزمه القيام ويصلي قاعداً يؤمي إيماء؛ لأن ركنية القيام للتوسل به إلى السجدة لما فيها من نهاية التعظيم، فإذا كان لايتعقبه السجود لايكون ركنًا، فيتخير، والأفضل هو الإيماء قاعداً؛ لأنه أشبه بالسجود. (هداية مع الفتح، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، زكريا ٢/٦، كوئٹه ١/٤٦٠، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، زكريا ٢/٢٠٥، كوئٹه ٢/١١٦، عناية مع الفتح، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض،

کوئٹہ ۱/ ۴٦۰، زکریا ۲/ ٦، بدائع الصنائع، کتاب الصلاة، الکلام في صلاة المریض، زکریا ۱/ ۲۸۷، ھندیة، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، زکریا قدیم ۱/ ۱۳٦، جدید ۱/ ۱۹٦، خانیة علی الھندیة، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، زکریا قدیم ۱/ ۱۷۱، زکریا جدید ۱/ ۱۰۷، در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، کراچي ۲/ ۹۷، زکریا ۲/ ۵٦۷، منحة الخالق، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، زکریا۲/ ۲۰۵، کوئٹہ ۲/ ۱۱٦)

فإن كان يقدر على القيام، ولايقدر على السجود، أومیٰ إيماءً، وهو قاعد، كذا ذكره الشيخ شمس الأئمة الحلواني، والسرخسي، وذكر الشيخ المعروف بخواهر زاده، والشيخ الصفار أنه بالخيار إن شاء صلى قائماً بإيماء، وإن شاء صلى قاعداً بإيماء، وهو الأفضل عندنا. وفي الخانية: والمستحب أن يصلي قاعداً بإيماء. (تاتار خانیة، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض ، زکریا ۲/ ٦۷۰، رقم: ۳۵٤۱، المحیط البرھاني، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، المجلس العلمي ۳/ ۲۷، رقم: ۳٤۱)

احقر ایک عرصہ تک یہی مسئلہ لکھتا رہا کہ قیام ایک رکن صلوۃ ہے؛ اس لئے اگر کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے پر قدرت ہے اور بیٹھ کر اشارہ سے بھی نماز پڑھنے پر قدرت ہے، تو ایسی صورت میں دونوں شکلوں میں سے کوئی بھی شکل اختیار کر کے نماز پڑھ لے،تو نماز صحیح اور درست ہوجائے گی؛ لیکن کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کی صورت میں قیام کا رکن ادا ہو جاتا ہے؛ اس لئے کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنا بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں زیادہ راجح اور بہتر ہوگا، مگر حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری کی طرف سے بار بار فقہاء کے مشہور قول کے مطابق جو جزئیہ ہے وہ پیش ہوتا رہا؛ اس لئے فقہاء کے مشہور قول کے مطابق مذکورہ جزئیہ کی وجہ سے کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی افضلیت لکھنے لگا اور فقہاء کی مذکورہ جزئیات کا حوالہ بھی

دیتا رہا؛ لیکن کبھی بھی فقہاء کی ان جزئیات پر اطمنان نہیں رہا؛ کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنا صحیح حدیث اور نص قرآنی کے موافق ہے اور بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا فقہاء کے قیاس سے ثابت ہے اور فقہاء کا قیاس نص قرآنی اور نص حدیث کے مقابلہ میں اضعف الدلائل میں سے ہے۔ نیز خود فقہاء کے درمیان اختلاف بھی ہے اور کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے میں فقہاء کا اختلاف بھی ختم ہوجاتا ہے، جیسا کہ طحطاوي اور کبیری وغیرہ کی عبارات میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔

ظاهر المذهب جواز الإيماء قائماً، أو قاعداً، كما لايخفى. قال الحلبي: لو قيل: إن الإيماء قائماً، هو الأفضل خروجاً من الخلاف، يعني خلاف من يشترط القيام عند القدرة عليه لكان موجهاً. (طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، دار الكتاب ديوبند ٤٣١، ٤٣٢)

أما إذا كان يقدر على القيام؛ لكن يلحقه نوع مشقة من غير ألم شديد، ولاخوف ازدياد مرض، أو بطؤ برء، فلايجوزله ترك القيام، ولو قدر عليه متكئاً على عصاً، أو خادم. قال الحلواني: الصحيح أنه يلزمه القيام متكئاً، ولو قدر على بعض القيام لا كله لزمه ذلك القدر حتى لو كان لايقدر إلا على قدر التحريمة لزمه أن يتحرم قائماً، ثم يقعد. (كبيري، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، اشرفية ص: ٢٦١، ٢٦٢)

اس لئے بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کو ہم زیادہ افضل اور بہتر سمجھتے ہیں، صحیح حدیث کا حوالہ آگے آرہا ہے۔

آج حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کا تحقیقی فتویٰ نظر سے گزرا، جو اپنی پہلی رائے کے مطابق ہے، جس پر احقر کو ہمیشہ اطمینان رہا ہے اور حضرت مولانا مفتی صاحب موصوف کی اس تحقیق کے ذریعہ سے اپنی پہلی رائے کے بارے میں مزید اطمینان ہوگیا؛ اس

لئے کھڑے ہوکر اشارہ سے پڑھنے کو راجح اور بہتر سمجھتا ہوں اور امید کی جاتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری بھی اب اس تحقیق سے مطمئن ہوجائیں گے۔

حدیث ملاحظہ فرمائیے:

عن عمران بن حصين قال: كانت بي بواسير، فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصلاة، فقال صل قائماً، فإن لم تستطع فقاعداً، فإن لم تستطع فعلى جنب. (بخارى شريف، تقصير الصلاة، باب صلاة القاعد بالإيماء، ١/ ١٥٠، رقم:١١٠٦، ف:١١١٧، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في صلاة القاعد، النسخة الهندية ١/ ١٣٧، دار السلام رقم:٩٥٢)

عن ابن بريدةؓ، قال: حدثني عمران بن حصينؓ، وكان مبسوراً، قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلاة الرجل قاعداً، فقال من صلى قائماً فهو أفضل، ومن صلى قاعداً، فله نصف أجر القائم، ومن صلى نائماً، فله نصف أجر القاعد. (بخاري شريف، تقصير الصلاة، باب صلاة القاعد، النسخة الهندية ١/ ١٥٠، رقم: ١١٠٤، ابو داؤد شريف، كتاب الصلاة، باب في صلاة القاعد، النسخة الهندية ١/ ١٣٧، دار السلام رقم: ٩٥٢)

اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی صاحب نے اپنی تحقیق میں حضرت مولانا ظفر عثمانیؒ کی اعلاء السنن کا جو تحقیقی جزئیہ پیش کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

إن ركنية القيام قد ثبتت بالنص، وهو قوله تعالى "وقوموا لله قانتين" وقوله لعمران صل قائماً، فإن لم تستطع فقاعداً وبالإجماع، فلا يسقط وجوبه عن القادر عليه بالقياس الذي ذكرتموه، فإن القياس أضعف الدلائل لايجوز معارضة القطعي له–وقوله قلت: وتعليل المسئلة، بذلک أولىٰ مما عللها به الجمهور من علمائنا...... والأحوط عندي ماذكره في النهر من وجوب القيام عليه القراءة......وهذا وإن تفرد

صاحب النهر بذكره ولم يوافقه عليه أحد من ناقلي المذهب؛ ولكنه قوي من حيث الدليل، فإن ظاهر حديث عمران مؤيدله كما لا يخفى.

(اعلاء السنن، كتاب الصلاة، ابواب صلاة المريض، باب إذا لم يستطع القيام يصلي قاعداً، دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۸/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۳۳۷۱۱)

کیا کھڑے ہوکر اشارہ سے اور کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا برابر ہے؟

سوال [۴۴۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا مسئلہ درپیش ہے، اس زمانے کے سارے مفتیان کرام یہی لکھتے ہیں کہ جب تک بیٹھ کر کے اشارہ سے نماز پڑھنے پر قدرت ہو تو کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا ممنوع اور مکروہ ہے، مگر حضرت مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی نے ۲/۴/۱۴۳۴ھ میں اپنے ایک تحقیقی فتوی میں لکھا ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مشابہ ہے اور حضرت کے الفاظ یہ ہیں ''لہٰذا جب اشارہ سے نماز پڑھنے والے کے لئے زمین پر ہی بیٹھ کر پڑھنا متعین اور ضروری نہ ہوا؛ بلکہ کھڑے ہوکر اشارہ سے بھی پڑھنا جائز ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر بھی اشارہ سے پڑھنا جائز ہے، ماہنامہ البلاغ صفحہ: ۴۸، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ، ہمیں اس بارے میں کچھ تردد ہے؛ اس لئے کہ آدمی کے لئے سب سے زیادہ آرام وراحت کی شکل کرسی پر بیٹھنے میں ہے اور یہ آرام وراحت نہ تو زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے میں ہے اور نہ ہی کھڑے ہوکر اشارہ سے نماز پڑھنے میں ہے؛ بلکہ معذور آدمی کے لئے کھڑا ہونا کافی مشقت کا باعث ہوتا ہے اور کرسی پر بیٹھنے کی صورت میں کسی قسم کی مشقت اور تکلیف نہیں ہوتی، تو ایسی صورت میں کرسی پر بیٹھ کر اشارہ

سے نماز پڑھنے کو کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنے کے مشابہ قرار دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا؛ اس لئے مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ کو واضح انداز میں بیان کر کے ہمارے شبہ کو دور فرما کر مطمئن فرمائیں؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن بڑا گاؤں، موانہ، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کا تحقیقی فتوی دیکھ لیا گیا، اس میں جو تحقیقات پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر سے ہمیں اتفاق ہے؛ لیکن کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کو کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنے کے برابر جو قرار دیا گیا ہے، اس سے ہم کو اتفاق نہیں ہے، حضرت مفتی صاحب موصوف اس تشبیہ پر دوبارہ نظر ثانی فرمالیں تو بہتر ہے، اور اس کی کئی وجوہات ہمارے سامنے آئی ہیں۔

(۱) کرسی پر بیٹھنے کی صورت میں پیروں، کمر اور پورے بدن پر کوئی زور نہیں پڑتا جس میں معذور کے لئے کوئی پریشانی نہیں ہوتی؛ جبکہ کھڑے ہونے کی صورت میں پورے بدن کا زور پیروں اور کمر پر مکمل پڑتا ہے، جو کرسی پر بیٹھنے کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا اور معذور آدمی کھڑے ہو کر جب نماز پڑھتا ہے، تو اس کو کم وبیش کچھ نہ کچھ تکلیف برداشت کرنی پڑجاتی ہے جس کا تجربہ سب کو ہے۔

(۲) حاکم کے سامنے کھڑا ہونا عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کرنا ہے اور کرسی پر بیٹھنے میں عاجزی وانکساری نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ کرسی پر بیٹھنا اعزاز واکرام اور بڑائی کا سبب ہے، جو حاکم کے سامنے نامناسب سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی چھوٹا بڑے کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس وقت تک کھڑا رہتا ہے، جب تک بڑے کا حکم نہ ملے اور بڑوں کے سامنے کرسی پر بیٹھنا بے ادبی سمجھا جاتا ہے، مگر کھڑے رہنے کو ادب کے دائرہ میں سمجھا جاتا ہے تو دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

(۳) قیام نماز کا رکن اور فرض ہے اور کرسی پر بیٹھنے کے ذریعہ سے یہ رکن اور فرض ہرگز ادا نہیں ہوسکتا؛ اس لئے کرسی پر بیٹھنے کو قیام کے برابر قرار دینا درست نہیں ہوسکتا۔

(۴) خیر القرون میں بھی کرسیاں تھیں، حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کو جب چوٹ لگی تو آپ ﷺ نے کرسی پر بیٹھ کر نماز نہیں پڑھائی؛ بلکہ زمین پر بیٹھ کر کے نماز پڑھائی، اگر کرسی پر بیٹھنا قیام کے برابر ہوتا تو آپ ﷺ قیام کی فرضیت اور رکنیت کی ادائیگی کی نیت سے ضرور کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھاتے، مگر آپ ﷺ نے کرسی پر بیٹھ کر نماز نہیں پڑھائی۔

نیز خیر القرون میں جہاد اسلامی کا دور دورہ رہا ہے، سینکڑوں صحابہ کرامؓ زخم خوردہ ہو چکے تھے، مگر اس کے باوجود کسی سے بھی کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ثابت نہیں؛ بلکہ بعض صحابہؓ سے یہ ثابت ہے کہ زخم کی وجہ سے گھٹنے زمین پر نہیں رکھ سکتے تھے تو گھٹنوں کے نیچے تکیہ رکھ کر تکلیف برداشت کرتے ہوئے رکوع سجدہ کے ساتھ نماز ادا کی ہے جیسا کہ حضرت اہبان بن اوسؓ کے واقعہ میں ہے۔

عن مجزأة عن رجل منهم من أصحاب الشجرة، اسمه أهبان ابن أوسؓ، وكان اشتكىٰ ركبته، فكان إذا سجد جعل تحت ركبتهٖ وسادة.

(بخاري شريف، كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية النسخة الهندية ۲/ ۶۰۰، رقم: ۴۰۲۳، ف: ۴۱۷۴)

ان وجوہات کی بناء پر کرسی پر بیٹھنے کو قیام جیسے رکن صلوۃ کے برابر قرار دینا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

(۵) قیام ایک رکن صلوۃ ہے جو قرآن وحدیث سے منصوص ہے اور کرسی پر بیٹھنا نہ رکن ہے، نہ واجب ہے، نہ سنت ہے اور نہ ہی مستحب ہے؛ بلکہ نماز کے اعمال میں سے کسی بھی عمل میں شامل نہیں ہے اور افعال صلوۃ میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتا؛ لہٰذا ایک ایسے عمل کو قیام جیسے رکن صلوۃ کے برابر قرار دینا ہماری سمجھ میں نہیں آتا؛ بلکہ جو شخص کھڑے ہو کر قراءت کرنے پر قدرت رکھتا ہو، وہ کرسی پر بیٹھ کر قراءت کرے گا تو قیام جیسے رکن صلوۃ کے فوت ہو جانے کی

وجہ سے اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہوگی۔ اور اس بات کو حضرت مفتی صاحب موصوف نے بھی اپنی مذکورہ تحریر میں ثابت فرمایا ہے، ہاں البتہ کوئی شخص ایسا معذور ہو، جو نہ قیام پر قدرت رکھتا ہو اور نہ ہی زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو، تو صرف اس کے لئے انتہائی مجبوری میں کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے اور اس کی اجازت بھی صرف اس زمانہ کے اہل فتاوی دیتے ہیں، خیر القرون سے لے کر ایک صدی پہلے تک کسی بھی فقیہ نے معذور کے لئے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کو جائز لکھا ہو احقر کی معلومات میں نہیں ہے؛ جبکہ ہر دور میں ہر جگہ کرسی کا وجود رہا ہے اور کسی بھی فقیہ نے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا مسئلہ نہیں اٹھایا؛ اس لئے کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا افعال صلوۃ کے کسی بھی خانہ میں داخل نہیں ہے، ان وجوہات کی بناء پر حضرت مفتی صاحب موصوف نے جو کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے برابر قرار دیا ہے اس کے بارے میں حضرت والا سے نظر ثانی کی گذارش ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۳۲ ۱۱۷)

کرسی پر نماز کے متعلق ایک جامع فتوی

سوال [۳۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جماعت کھڑی ہوتے وقت کرسی پر نماز پڑھنے والے معذور حضرات صف میں کرسی کس طرح رکھیں کرسی کے پچھلے پائے صف کے آخری حصہ پر رکھیں یا اگلے پائے صف کے آخری حصے پر رکھیں؟ اسی طرح صف بناتے وقت پہلی صف تکبیر تحریمہ کے وقت جہاں تک پر ہوئی ہے وہیں کرسی رکھ لیں یا شروع ہی سے کرسی صف کے بالکل کنارے رکھیں، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: شکیل، فیض گنج مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کرسی کا وجود زمانہ نبوت کے بہت پہلے سے پایا جاتا ہے اور دور نبوت، دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ جہاد اسلامی کا زمانہ تھا، کسی کے پیر میں چوٹ آئی، کسی کے ہاتھ میں چوٹ آئی، کسی کی کمر میں چوٹ آئی، کسی کے کولہے میں چوٹ آئی، مگر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا کسی سے ثابت نہیں، حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کو پیر میں سخت چوٹ آئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اٹھنے، بیٹھنے اور نقل وحرکت میں آپ ﷺ کو زبردست تکلیف ہوتی تھی پھر بھی آپ ﷺ نے کرسی پر بیٹھ کر نماز نہیں پڑھائی؛ بلکہ زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھائی، جس کا ذکر حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے۔

المعجم الاوسط میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو بھی معذور آدمی سجدہ پر قدرت رکھتا ہو تو وہ سجدہ کے ساتھ نماز پڑھے اور جو سجدہ پر قدرت نہیں رکھتا ہے وہ سجدہ کے لئے تکیہ یا ٹیبل وغیرہ کسی اونچی چیز پر سجدہ نہ کرے؛ بلکہ اپنے سر کے اشارے سے رکوع سجدہ کر کے نماز پڑھے۔

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من استطاع منكم أن يسجد فليسجد، ومن لم يستطع فلا يرفع إلى جبهته شيئاً ليسجد عليه؛ ولكن ركوعه وسجوده برأسه. (المعجم الأوسط، دار الفكر ٥/ ٢٠٧، رقم: ٧٠٨٩)

اور یہ اثر موطا امام مالک میں موجود ہے ملاحظہ فرمائیے:

عن نافع أن عبد الله بن عمر كان يقول: إذا لم يستطع المريض السجود، أومأ برأسه إيماء، ولم يرفع إلى جبهته شيئاً. (موطا إمام مالك، باب العمل في جامع الصلاة، اشرفي ديوبند ص: ٥٩)

اور المعجم الکبیر للطبرانی میں یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عمرؓ قال: عاد رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا من

أصحابه مريضاً، وأنا معه فدخل عليه، وهو يصلي على عود فوضع جبهته على العود، فأومأ إليه، فطرح العود وأخذ وسادة. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: دعها عنك، إن استطعت أن تسجد على الأرض، وإلا فأومأ إيماءً، واجعل سجودک أخفض من ركوعک. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۲/۲۰۹، رقم: ۱۳۰۸۲، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر ۳/۲۳۵، رقم: ۳۷۷۰)

اور مسند ابویعلی موصلی میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ ایک مریض کی عیادت کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ موجود تھا، تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ مریض تکیہ پر سجدہ کر رہا تھا، تو آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع فرما کر یہ ارشاد فرمایا: کہ اگر تم زمین پر سجدہ کرنے پر قدرت رکھتے ہو، تو زمین پر سجدہ کرو ورنہ اشارہ کے ساتھ نماز پڑھا کرو اور رکوع کے مقابلے میں سجدہ میں زیادہ جھکا کرو، اسی روایت کو امام ابو ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسند بزار کے حوالے سے نقل فرمایا ہے اور ساتھ ہی فرمایا:

رجال البزار رجال الصحيح

عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما، قال: عاد رسول الله صلى الله عليه وسلم مريضاً، وأنامعه فرآه يصلي ويسجد على وسادة فنهاه. وقال: إن استطعت أن تسجد على الأرض فاسجد وإلا فأومأ إيماء، واجعل السجود أخفض من الركوع. (مسند أبي يعلىٰ الموصلي، دار الكتب العلميةبيروت ۲/۲۰۱، رقم:۱۸۰۵، بيروت، مجمع الزوائد ۲/۱۴۸)

اس روایت کو امام بیہقیؒ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عاد مريضاً، فرآه يصلي على وسادة، فأخذها فرمى بها، فأخذ عوداً ليصلي عليه، فأخذه فرمى به، وقال: صل على الأرض إن استطعت وإلا

فأوم إيماءً، واجعل سجودک أخفض من رکوعک. (السنن الكبرى للبيهقي، باب صلاة المريض، باب الإيماء بالركوع، والسجود إذا عجز عنهما، دار الفكر جديد ۳/۲۳۶، رقم:۳۷۶۸)

نیز حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے سے متاخرین فقہاء تک کسی بھی فقیہ نے اپنی کتاب میں کرسی پر نماز پڑھنے کا مسئلہ نہیں اٹھایا؛ اس لئے کہ نماز اللہ کی ایسی عبادت ہے، جس میں بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی ذلت اور عاجزی وانکساری کا اظہار کرتا ہے اور کرسی پر بیٹھنا باعث اعزاز ہوتا ہے؛ اس لئے حدیث وفقہ کی تمام کتابوں میں معذورین کی نماز کا عنوان قائم کیا گیا ہے، مگر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا کوئی مسئلہ نہیں لکھا گیا ہے؛ البتہ اگر کوئی آدمی زمین پر کسی بھی ہیئت پر بیٹھ سکتا ہے، پالتی مار کر یا پیروں کو پھیلا کر یا ٹیڑھا میڑھا ہو کر بیٹھ سکتا ہو، تو اسی ہیئت پر بیٹھ کر اگر رکوع سجدہ کر سکتا ہے تو کرے گا ورنہ اسی ہیئت میں اشارہ کے ساتھ نماز پڑھے گا اور اگر زمین پر بیٹھنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے، تو لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس تفصیلی حکم کے بعد کرسی پر نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی آدمی زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا ہے اور وہ کرسی پر بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہے، تو ایسی انتہائی مجبوری کی حالت میں کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، مثلاً کوئی بڑا آپریشن ہوا ہے، جس کی وجہ سے زمین پر بیٹھنے سے زخم کو نقصان ہونے کا خطرہ ہے یا کولہے میں ایسی تکلیف ہے کہ زمین پر کسی طرح بیٹھنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنے پر بھی قدرت نہیں ہے، تو ایسی انتہائی مجبوری کی حالت میں کرسی پر اشارہ کے ساتھ نماز پڑھنے پر کی گنجائش ہے اور ایسا شخص نماز کھڑی ہوتے وقت جو صفیں مکمل ہوتی ہیں، ان میں سے کسی صف کے ایک کنارے پر نماز پڑھے؛ لیکن جس صف پر نماز پڑھ رہا ہے، اسی صف پر کرسی رکھے، پیچھے والی صف پر نہ رکھے؛ اس لئے کہ پیچھے والی

صف کا وہ حصہ اس صف پر نماز پڑھنے والے کے سجدہ کی جگہ ہے، آج کے زمانہ میں کرسی پر نماز پڑھنے کا ایک تساہلی سلسلہ شروع ہو چکا ہے، جس کو کرسی پر نماز پڑھنے کی گنجائش ہو سکتی ہے ایسا ۱۰۰/ میں ایک آدھ مشکل سے نظر آتا ہے، ورنہ ۹۹/ فیصد وہ حضرات کرسی پر نماز پڑھتے ہیں، جن کو شریعت نے کرسی پر پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے؛ اس لئے ہر نمازی کو پہلے ہی سے اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی نماز کو کرسی کے ذریعہ خراب نہ کرے۔ ہمارے قریب کی کئی مسجدوں میں بہت ساری کرسیاں رکھی نظر آرہی تھیں۔ اور اچھے خاصے لوگ آ کر کے کرسیوں پر نماز پڑھتے تھے، ان کو شرعی مسئلہ سے آگاہ کر دیا گیا۔
الحمدللہ ان مسجدوں سے ساری کرسیاں ہٹ گئی ہیں، وہی حضرات جو کرسی پر نماز پڑھتے تھے آج **الحمد للہ** بغیر کرسی کے نماز پڑھ رہے ہیں، مسئلہ تفصیل سے اس لئے لکھا گیا ہے تاکہ ہر مسلمان بھائی دوسرے کو صحیح مسئلہ بتادے۔

وكذا لو عجز عن الركوع، والسجود وقدر على القيام، فالمستحب أن يصلي قاعداً بإيماءٍ، وإن صلى قائما بإيماء جاز عندنا، هكذا في فتاوى قاضيخان .
(هندية، كتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلوة المريض قديم ١/١٣٦، جديد ١/١٩٦)

إن كان جلوسه كما يجلس للتشهد أيسر عليه من غيره، أو مساوياً لغيره كان أولىٰ، وإلا اختار الأيسر في جميع الحالات. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، كراچي ٢/٩٧، زكريا ٢/٥٦٦، ٥٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۷/ ۱۴۲۱ھ

کرسی پر نماز کا حکم

سوال [۳۸۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ وانمباڑی کی مسجدوں میں ہر کس و نا کس کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے؛ اس لئے حسب ذیل مسائل کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں، اس پر مطلوب یہ ہے کہ:

(الف) یہ مسائل صحیح ہیں یا نہیں؟

(ب) اگر کوئی مسئلہ صحیح نہیں ہے تو اس کی صحیح شکل کیا ہے؟

(د) صحیح ہونے کی صورت میں فقہ کی کتابوں سے حوالہ درکار ہے؟

(ج) اِسی کے تعلق سے مزید اہم مسائل ہوں تو ان کو بھی تحریر فرما دیں، تو عین نوازش ہوگی۔

''کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کے مسائل''

نمبر۱: فرض وواجب نماز میں قرأت (سورۂ فاتحہ وسورۃ) کرتے وقت کھڑے ہونا ضروری (فرض) ہے؟

نمبر۲: کھڑے ہونے پر انتہائی مشقت ہونے کی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

نمبر۳: بیٹھ کر پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر رکوع سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا چاہئے، سجدہ کرنے کی سکت نہ ہونے پر زمین پر بیٹھ کر ہی اشارہ کرکے پڑھنا چاہئے؟

نمبر٤: قیام (قرأت کرتے وقت) مکمل قیام نہیں ہوسکتا صرف تھوڑی دیر ہی کھڑے ہونے کی طاقت ہونے کی صورت میں اسے تھوڑی دیر کے لئے ہی کھڑا ہونا لازمی (واجب) ہے؟

نمبر٥: بیٹھ کر نماز پڑھنے کا مطلب التحیات میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ کر نماز پڑھنا ہے؟

نمبر٦: اگر التحیات کی طرح بیٹھنے کی سکت نہ ہو تو جس طرح بیٹھنے کی طاقت ہو، اسی طرح بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں؟

نمبر۷: اشارہ سے نماز پڑھنے کی صورت میں رکوع کے لئے جتنا جھکا جاتا ہے، اس سے زیادہ سجدہ کے لئے جھکنا چاہئے؟

نمبر۸: سجدہ کرنے کے لئے تکیہ یا ڈسک وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

نمبر۹: کھڑے ہونے پر یا زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھنے سے انتہائی مشقّت ہونیکی صورت میں میں ہی کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

نمبر۱۰: کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں اپنے دونوں ہاتھوں کوسہارا دے کر یا ٹیک لگا کر پڑھنا صحیح طریقہ نہیں ہے؟

نمبر ۱۱: اللہ کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی وبے بسی کوظاہر کرنے کا طریقہ ہی نماز ہے، اپنی ظاہری حالت سے بھی عاجزی ظاہر ہونی چاہئے؟

نمبر۱۲: ارشاد خداوندی ہے کہ اطاعت خدااور رسول ﷺ کے خلاف عمل کر کے اپنے عمل کو ضائع نہ کریں؟

نمبر۱۳: جوسجدہ پر قادر نہ ہو اس پر قیام بھی فرض نہیں ہے؟

حضرات مفتیان کرام سے عاجزانہ گذارش ہے کہ اس کا جواب فوری طور پر روانہ کر دیں، تو عین نوازش ہوگی۔ **جزاکم اللہ تعالیٰ أحسن الجزاء.**

المستفتی: وفاق المکاتب القرآنیہ، مسجد امین آباد، قادر پیٹ، وانمباڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) فرض اور واجب نماز میں قیام پر قادر شخص کے لئے کھڑا ہونا فرض ہے، سوال نامہ میں جس انداز سے تعبیر کی گئی ہے، وہ تعبیر درست نہیں ہے؛ بلکہ حکم شرعی وہی ہے جو ہم نے جواب میں لکھا ہے کہ قیام پر قادر شخص پر تکبیر تحریمہ سے لے کر رکوع تک قیام فرض ہے۔

ومنها القيام وهو فرض في صلاة الفرض، والوتر. (عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، زكريا قديم ١/٦٩، جديد ١/١٢٦)

(۲) یہ درست ہے کہ کھڑے ہونے پر انتہائی مشقت اور تکلیف کی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔

فإذا عجز عن القيام يصلي قاعدًا. (بـدائع الصنائع، كتاب الصلاة الفصل

في أركان الصلاة زكريا ۱/ ۲۸٤، كراچي ۱/ ۱۰٥، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۱۲)

(۳) یہ بات بھی درست ہے کہ کھڑے ہونے پر قادر نہ ہونے کی صورت میں زمین پر بیٹھ کر باضابطہ رکوع اور زمین پر سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے، مگر رکوع وسجدہ اشارہ سے کرنا درست نہیں؛ ہاں البتہ یہاں تین حکم شرعی الگ الگ ہیں۔

نمبر ۱: قیام پر قادر نہیں ہے، مگر رکوع وسجدہ پر قادر ہے، تو ایسے شخص کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، مگر بیٹھنے کی حالت میں رکوع کرنا اور زمین پر سجدہ کرنا لازم ہے۔

نمبر ۲: قیام پر قادر ہے، مگر رکوع وسجدہ پر قادر نہیں، مثلاً کسی کی ریڑھ کی ہڈی میں سخت تکلیف ہے جس کی بنا پر کھڑا تو ہوسکتا ہے، مگر رکوع وسجدہ نہیں کرسکتا، یا آنکھ بنوائی گئی ہے اور اس حالت میں قیام پر قادر ہے، مگر وقتی طور پر رکوع اور سجدہ سے منع کردیا گیا ہے، تو ایسے آدمی کے لئے رکوع وسجدہ اشارہ سے کرنا جائز ہے اور ایسا آدمی کرسی پر بیٹھ کر بھی رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرسکتا ہے، مگر سجدہ کے لئے دو اینٹ سے اونچا میز یا کوئی اور چیز رکھ کر سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر ۳: ایسا معذور آدمی جو نہ قیام پر قادر ہو اور نہ ہی زمین پر سجدہ کرنے پر، تو ایسے آدمی کے لئے زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کی اجازت ہے؛ لیکن اگر زمین پر بیٹھنے پر بھی قادر نہیں ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرسکتا ہے یہی وہ معذور شخص ہے، جس کے لئے کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا جائز ہوتا ہے، مثلاً ایکسیڈنٹ میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی، زمین پر بیٹھ نہیں سکتا اور زمین پر سجدہ بھی نہیں کرسکتا ہے، تو وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

فإذا عجز عن القيام، يصلي قاعداً بركوع وسجود، فإن عجز عن الركوع والسجود يصلي قاعدًا. (بدائع الصنائع، كتاب صلاة، فصل في أركان الصلاة،

زكريا١/٢٨٤، كراچي ١/١٠٥، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ١/٢١٢)

فإن فعل وهو يخفض برأسه لسجوده أكثر من ركوعه، صح علىٰ أنه إيماء لاسجود إلا أن يجد قوة الأرض. وفي الشامي: فحينئذٍ ينظر إن كان الموضوع مما يصح السجود عليه كحجر مثلاً ولم يزد ارتفاعه على قدر لبنة، أو لبنتين، فهو سجود حقيقي، فيكون راكعاً، ساجداً لامؤمياً......وإن لم يكن الموضوع، كذلك يكون مؤمياً. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، كراچي ٢/٩٨، زكريا ٢/٥٦٨-٥٦٩)

ومنها القيام لقادر عليه وعلى السجود، فلو قدر عليه دون السجود ندب إيماؤه قاعداً. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچي ١/٤٤٤، ٤٤٥، زكريا ٢/١٣٢)

(۴) اگر کوئی شخص مکمل قیام پر قادر نہ ہو؛ لیکن تھوڑی دیر کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے، تو ایسے شخص پر تھوڑی دیر کھڑا ہونا لازم ہے۔

وإن قدر على بعض القيام، ولو متكئاً على عصاً، أو حائط قام لزوماً بقدر ما يقدر ولو قدر آية أو تكبيرة على المذهب. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، كراچي ٢/٩٧، زكريا ٢/٥٦٧)

(۵/۶) تشہد کی طرح نماز پڑھنے کا حکم مریض کے لئے اس وقت ہے، جب آسانی سے اس ہیئت پر بیٹھنے پر قادر ہو؛ لیکن اس ہیئت پر بیٹھنا دشوار ہو تو جس طرح اس کو سہولت ہو بیٹھ سکتا ہے، اس پر کسی ہیئت کی پابندی نہیں ہے۔

من تعذر عليه القيام صلى قاعداً، كيف شاء على المذهب. وقال زفر: كالمتشهد. وفي الشامية قال في البحر: ولايخفىٰ ما فيه؛ بل الأيسر عدم التقييد بكيفية من الكيفيات. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، كراچي ٢/٩٥، زكريا ٢/٥٦٤ تا ٥٦٦)

(۷) یہ درست ہے کہ اشارہ سے نماز پڑھنے کی صورت میں رکوع کے اشارہ کے مقابلہ میں

سجدہ کا اشارہ زیادہ جھک کر کرنا چاہئے۔

ویجعل سجوده أخفض من رکوعه. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب صلوة المریض، کراچي ٢/٩٨، زکریا ٢/٥٦٨)

(٨) جو شخص رکوع وسجدہ پر قادر نہ ہو، تو اس کے لئے بیٹھنے کے بعد تکیہ یا میز پر سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم اگر ان چیزوں پر سجدہ کرلیا تو اصل میں سجدہ کی ادائیگی سر جھکانے سے ہو جائے گی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سجدہ کے لئے جو چیز سامنے رکھی جائے، اگر وہ چیز دو اینٹ کے برابر اونچی ہے یا دو اینٹ کی اونچائی سے کم ہے، تو یہ سجدہ کا اشارہ شمار نہیں ہوگا؛ بلکہ یہ زمین پر ہی سجدہ کرنا شمار ہوگا اور اگر جو چیز سامنے رکھی ہوئی ہے، وہ دو اینٹ سے زیادہ اونچی ہے، تو اس پر سجدہ کرنا اور اس کے بغیر صرف اشارہ سے سجدہ کرنا دونوں برابر ہیں؛ لہٰذا سجدہ کرنے کے لئے ایسی چیز رکھنے کی ضرورت نہیں، اگر اس پر سجدہ کر بھی لے گا تو سجدہ کا فریضہ ادا ہو جائے گا؛ لیکن اس چیز پر سجدہ کرنے کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

وفي الشامیة: فحینئذٍ ینظر إن کان الموضوع مما یصح السجود علیه کحجر مثلاً ولم یزد ارتفاعه علی قدر لبنة، أو لبنتین، فهو سجود حقیقي، فیکون راکعاً ساجداً لا مؤمیا...... وإن لم یکن الموضوع کذلک یکون مؤمیًا.

(شامي، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض، کراچي ٢/٩٩، زکریا ٢/٥٦٩)

(٩) جو شخص ضعف یا کمزوری یا مرض کے بڑھ جانے کے خطرہ سے قیام سے عاجز ہو، تو ایسے شخص کے لئے بیٹھ کر فرض و واجب نمازیں پڑھنا جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص بیٹھنے سے عاجز ہو؛ لیکن وہ کھڑا ہو سکتا ہے، تو ایسے شخص کے لئے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا لازم ہے، اور رکوع بھی کھڑے ہونے کی حالت میں کرے گا، ہاں البتہ سجدہ کے لئے کرسی پر بیٹھنے کی گنجائش ہے، اور اگر کمر کی تکلیف کی وجہ سے کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہے اور نہ زمین پر بیٹھنے پر قادر ہے، تو ایسے شخص کے لئے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ

جواب نمبر ۳ رمیں تفصیل سے لکھا گیا۔

(۱۰) کرسی پر بیٹھ کرنماز پڑھنے کی صورت میں ٹیک لگانا مکروہ تحریمی ہے؛ البتہ ضرورت کی وجہ سے ٹیک لگائیں یا سہارا لیں تو جائز ہے۔

وإذا لم يقدر على القعود ومستويا وقدر متكئاً، أو مستنداً إلى حائط أو إنسان يجب أن يصلي متكئا أو مستنداً. (عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلوة المريض، زكريا قديم ١/١٣٦، جديد ١/١٩٦)

(۱۱/۱۲) نماز میں خشوع وخضوع اللہ کے یہاں محبوب اور پسندیدہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. [المؤمنون:١-٢]

(۱۳) مطلقاً یہ کہنا درست نہیں کہ جو آدمی سجدہ پر قادر نہ ہو اس پر قیام فرض نہیں؛ اس لئے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کھڑا ہوسکتا ہے، چل سکتا ہے؛ لیکن آنکھوں میں آپریشن کی وجہ سے یا ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا ہے اور نہ ہی سجدہ کرسکتا ہے، تو ایسے شخص کے لئے کھڑے کھڑے اشارہ سے نماز پڑھنے کا حکم ہے، اسی طرح گردن میں یا سر میں یا چہرہ میں کوئی ایسی تکلیف ہے، جس کی وجہ سے سجدہ نہیں کرسکتا ہے یا کمر کی تکلیف کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا، تو ایسا شخص کھڑے کھڑے اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے۔

ومنها القيام في فرض لقادر عليه وعلى السجود، فلو قدر عليه دون السجود ندب إيماؤه قاعداً. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة باب صفة الصلاة، كراچي ١/٤٤٤، ٤٤٥، زكريا ٢/١٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۳۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۲/۶ھ

معذور کا کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [٣٤٤١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کا ایکسیڈنٹ کے اندر پیر ٹوٹ گیا، پھر ایک مہینہ کے بعد پلاسٹر کی حالت میں نماز پڑھنے کے لئے آیا، مغرب میں تو بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھ لیا؛ لیکن عشاء میں نہ پڑھ سکا تکلیف زیادہ ہونے کی وجہ سے؛ لہٰذا کرسی لگا کر نماز پڑھی تو بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کی نماز نہیں ہوئی؛ اس لئے کہ وہ امام سے اونچا ہو گیا، تو کیا یہ قول درست ہے؟

المستفتی: مصلیان جامع مسجد شاہی مرزعہ، پی، ٹی، ایس، نگر مہال (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو لوگ دو منزلہ مسجدوں میں یا مسجد کی دو چھتی میں نماز پڑھتے ہیں وہ لازمی طور پر امام سے اونچائی پر ہوتے ہیں، جیسے ان کی نماز بلا کراہت ہو جاتی ہے، اسی طرح معذور کی نماز بھی بلا کراہت درست ہو جاتی ہے، امام سے اونچا ہونے سے نماز میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

من تعذر عليه القيام لمرض – إلى قوله– صلىٰ قاعداً، ولو مستنداً إلى وسادة أو إنسان، فإنه يلزمه ذلک على المختار. (در مختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، كراچي ٢/٩٧، زكريا٢/٥٦٤)

فلو قاموا على الرفوف والإمام على الأرض أو في المحراب لضيق المكان لم يكره لو كان معه بعض القوم في الأصح. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة الخ زكريا ٢/٤١٥، كراچي ١/٦٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍ ۸۳۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۱۶ھ

گھر سے پیدل چل کر آنے والے کا کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [۳۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص مسجد کی پہلی صف میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے لوگ راس سے کہتے ہیں کہ اگلی صف میں کرسی نہ ڈالے، مگر وہ مانتا نہیں اب اگر کوئی مقتدی قرآن پاک کی تلاوت کرنا چاہے تو کیسے کرے؛ جبکہ وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے اور تلاوت کرنے والے سے کہتا ہے کہ اگر تلاوت کروگے تو گنہگار ہوگے؛ کیوں کہ میں کرسی پر بیٹھا ہوں، تو کیا اس شخص کو پہلی صف میں کرسی ڈالنی چاہئے؛ جبکہ گھر سے پیدل چل کر مسجد تک آتا ہے؟

المستفتی: محمد اسلم، شکلوں کا کنواں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہے اور کسی خاص مرض کی وجہ سے رکوع وسجدہ پر قادر نہیں ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔

ولو قدر علی القیام مع عدم القدرة علی الرکوع فیصلي قاعداً یومي إیماءً. (الموسوعة الفقهیة ۲۷/۲۶۲)

اور ایسا شخص اپنی کرسی مسجد کے بالکل دائیں یا بالکل بائیں آخری کنارہ پر رکھوایا کرے، آخری کنارہ پر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھے اور آخری کنارہ پر پہلی صف میں بھی کرسی ڈال کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، مگر صف کے بیچ میں کرسی ڈال کر نہ بیٹھے، اس کی وجہ سے صفوں کی درستگی اور یکسانیت باقی نہیں رہتی ہے اور حدیث شریف میں صفوں کی درستگی اور یکسانیت کی تاکید آئی ہے۔

قال في المعراج: الأفضل أن یقف في الصف الآخر، وهذا لو قبل الشروع، فلو شرعوا وفي الصف الأول فرجة له خرق الصفوف.

(شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کراچي ۱/۵۶۹، زکریا ۲/۳۱۰)

عن أنس رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: سووا صفوفكم، فإن تسوية الصفوف من إقامة الصلاة. (بخاري شريف، كتاب الأذان، باب إقامة الصف من تمام الصف، النسخة الهندية ١/١٠٠، رقم: ٧١٤، ف:٧٢٣)

قرآن کریم کی تعظیم اور ادب ضروری ہے؛ لیکن جب ایک آدمی مسجد میں عذر کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ کر نماز میں مشغول ہے اور اسی کے بغل میں دوسرا آدمی قرآن کریم کی تلاوت کر رہا ہے، تو عرف میں اسے خلاف ادب نہیں سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ مسجد نبوی میں صفہ پر لوگ بیٹھے عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اسی کے دائیں بائیں نیچے دوسرے لوگ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں؛ البتہ اگر کوئی نیچے قرآن کریم کی تلاوت کر رہا ہو اور اسی کے بغل میں کوئی آدمی چارپائی پر بیٹھا یا لیٹا ہو، تو اسے ہمارے عرف میں خلاف ادب سمجھا جاتا ہے؛ لہٰذا کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے بغل میں قرآن کریم کی تلاوت عرفاً خلاف ادب شمار نہیں ہوگی؛ اس لئے کہ دونوں عبادت میں مشغول ہیں اور معذور آدمی عذر کی وجہ سے کرسی چھوڑ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا؛ اس لئے یہ خلاف ادب نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۱/۱۱۷، زکریا مطول ۲/۴۹۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۶/۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادالثانیہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۱۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۵ھ

کمر کی تکلیف میں مبتلا شخص کا کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [۳۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض حضرات سے کمر میں درد کی وجہ سے رکوع اور سجدہ نہیں ہوتا ہے؛ لیکن کھڑے ہوسکتے ہیں، ایسے لوگ کرسی پر نماز پڑھتے ہیں، کیا کرسی پر نماز پڑھنے کی وجہ سے قیام معاف

ہو جائے گا؟ جبکہ قیام پر قادر ہیں رکوع اور سجدہ پر قادر نہیں ہیں، آج کل کرسی پر نماز پڑھنا عام ہوتا جا رہا ہے، اس کی وضاحت فرمادیں؟

المستفتی: محمد اصغر، سیڑھا، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو لوگ کمر کی تکلیف کی وجہ سے رکوع اور سجدہ پر قادر نہ ہوں اور کھڑے ہونے پر قادر ہوں اور زمین پر بیٹھنے پر بھی قادر ہوں، تو ان کے لئے کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش تو ہے؛ لیکن افضل اور بہتر یہی ہے کہ زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھیں، کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ان کے لئے جائز نہیں ہے۔

نیز اگر زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے پر قدرت رکھتے ہوں تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر پیروں میں یا کمر میں یا کولھے وغیرہ میں اس طرح تکلیف ہے کہ زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھنے پر قدرت نہیں ہے، تو ایسے لوگوں کے لئے مجبوراً کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر کسی بھی ہیئت میں زمین پر بیٹھنے پر قدرت نہیں ہے اور رکوع وسجدہ پر بھی قدرت نہیں ہے، مگر قیام پر قدرت ہے اور کرسی پر بیٹھنے پر بھی قدرت ہے، تو ایسے لوگوں کے لئے بھی کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ جب زمین پر سجدہ کرنے پر قدرت نہ ہو تو قیام کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے۔

وكذا لو عجز عن الركوع والسجود، وقدر على القيام فالمستحب أن يصلي قاعداً بإيماء، وإن صلى قائماً بإيماء جاز عندنا. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صلاة المريض، زكريا قديم ١/١٣٦، جديد ١/١٩٦)

ولأن السجود أصل وسائر الأركان كالتابع له؛ ولهذا كان السجود معتبراً بدون القيام كما في سجدة التلاوة، وليس القيام معتبراً بدون السجود؛

بل لم يشرع بدونه، فإذا سقط الأصل سقط التابع ضروة؛ ولهذا سقط الركوع عمن سقط عنه السجود، وإن كان قادراً على الركوع وكان الركوع بمنزلة التابع له، فكذا القيام؛ بل أولىٰ لأن الركوع أشد تعظيماً وإظهارًا لذل العبودية من القيام، ثم لما جعل تابعاً له وسقط بسقوطه، فالقيام أولىٰ إلا أنه لوتكلف وصلى قائما يجوز لما ذكرنا؛ ولكن لايستحب؛ لأن القيام بدون السجود غير مشروع بخلاف ما إذا كان قادراً على القيام، والركوع، والسجود؛ لأنه لم يسقط عنه الأصل، فكذا التابع. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، الكلام في صلاة المريض، قديم كراچي ١/١٠٧، زكريا ١/٢٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۶۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۳/۱۲ھ

(۲۸) باب الجمعة

(۱) فصل في الفضائل ووقتها

جمعہ کی فضیلت

سوال [۳۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن کی خصوصیت کیا ہے؟ اوراس کی فضیلت کیا ہے؟ اگر جمعہ کے دن کے بارے میں حدیث پاک میں کوئی مخصوص فضیلت وارد ہوئی ہوتو ضرور مع حوالہ تحریر فرمادیں؟

المستفتی: شعیب احمد، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جمعہ کے دن کی فضیلت سے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں؛ چناں چہ حدیث شریف میں ہے کہ روئے زمین میں جمعہ کے دن سے زیادہ بہتر اور افضل دن پر سورج طلوع نہیں ہوا (کیوں کہ) اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا گیا اور اسی دن آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن آدم علیہ السلام کو جنت سے روئے زمین پر اتارا گیا اور اسی دن آدم علیہ السلام کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔

اس سے متعلق حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة رضـ أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خير يوم طلعت عليه الشمس يوم الجمعة، فيه خلق آدم، وفيه أدخل الجنة، وفيه أخرج منها، ولاتقوم الساعة إلا في يوم الجمعة. (صحيح مسلم، كتاب الجمعة، فصل في فضيلة

یوم الجمعة على باقي الأيام، النسخة الهندية ١/ ٢٨٢، بيت الأفكار رقم: ٨٥٤، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب فضل يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١١١، دارالسلام رقم: ٤٨٨، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب فضل يوم الجمعة و ليلة الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١٥٠، دارالسلام رقم: ١٠٤٦، سنن النسائي، كتاب الجمعة، ذكر الساعة التي يستجاب فيها الدعاء يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١٥٤، دارالسلام رقم: ١٤٣١)

عن أبي لبابةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن يوم الجمعة سيد الأيام وأعظمها عند الله من يوم الأضحى ويوم الفطر، فيه خمس خلال: خلق الله فيه آدم، وأهبط الله فيه آدم إلى الأرض، وفيه توفى الله آدم، وفيه ساعة لايسأل الله فيها العبد شيئاً إلا أعطاه ما لم يسئل حراماً، وفيه تقوم الساعة. الحديث. (ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب في فضل الجمعة، النسخة الهندية ١/ ٧٦، دارالسلام رقم: ١٠٨٤، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٥/ ٣٣، رقم: ٤٥١١، المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، في فضل صلاة الجمعة ويومها قديم ٢/ ١٥٠، مؤسسة علوم القرآن جديد ٤/ ١٥٥، ١٥٦، رقم: ٥٥٥٩، مسند أحمد بن حنبل ٣/ ٤٣٠، رقم: ١٥٦٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۹۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۱۷ھ

جمعہ کے دن جلد از جلد مسجد پہونچنے کی فضیلت

سوال [۳۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا جمعہ کے دن سویرے نماز جمعہ کے لئے جانا لازم اور ضروری ہے؟ اور سویرے جانے کی کیا فضیلت ہے؟ کیا حدیث میں اس کے لئے کوئی خاص فضیلت وارد ہوئی ہے؟ اگر کوئی

حدیث اس کے متعلق وارد ہوئی ہے تو ضرور تحریر فرمادیں؟

المستفتی: محمد سلمان لاتور، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے لئے سویرے جانے سے متعلق بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں؛ چناں چہ حدیث شریف میں اس بات کی صراحت ہے کہ جمعہ کے دن مسجد کے دروازوں پر فرشتوں کو متعین کردیا جاتا ہے اور وہ فرشتے پہلے آنے والے کی فضیلتیں نوٹ کرتے ہیں، الاول فالاول، اسی طرح سلسلہ وار آنے والے کا نام نوٹ کرتے رہتے ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ پہلے آنے والے کو اونٹ صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، اس کے بعد آنے والے کو گائے بیل وغیرہ صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، اس کے بعد آنے والے کو بکرا صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، اس کے بعد آنے والے کو مرغ اور پرندہ صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے اور اس کے بعد آنے والے کو انڈا وغیرہ صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ الغرض حدیث شریف میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ جمعہ کے دن جتنا ہوسکے جلد جامع مسجد میں پہونچنا چاہئے، جو جتنا جلد مسجد پہونچے گا، اس کو اتنا ہی ثواب اور افضلیت حاصل ہوگی۔

اس سے متعلق حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي هريرة رضـ قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إذا كان يوم الجمعة وقفت الملائكة على باب المسجد يكتبون الأول فالأول، ومثل المهجر كمثل الذي يهدي بدنة، ثم كالذي يهدي بقرة، ثم كبشاً، ثم دجاجة، ثم بيضة، فإذا خرج الإمام طووا صحفهم، ويستمعون الذكر.

(بخاري شريف، كتاب الجمعة، باب الاستماع إلى الخطبة، النسخة الهندية ١/١٢٧، رقم: ٩١٩، ف: ٩٢٩، مسلم شريف، كتاب الجمعة، باب الطيب والسواك يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/٢٨٢، بيت الأفكار رقم: ٨٥٠)

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تقعد الملائكة يوم الجمعة على أبواب المسجد يكتبون الناس على منازلهم، فالناس فيه كرجل قدم بدنة، وكرجل قدم بدنة، وكرجل قدم بقرة، وكرجل قدم بقرة وكرجل قدم شاة وكرجل قدم شاة وكرجل قدم دجاجة، وكرجل قدم دجاجة وكرجل قدم عصفوراً، وكرجل قدم عصفوراً، وكرجل قدم بيضة، وكرجل قدم بيضة. (نسائي شريف، كتاب الجمعة، باب التبكير إلى الجمعة، النسخة الهندية ١/١٥٦، دارالسلام رقم:١٣٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۲۸/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۲/۱۴۳۶ھ

ساعتِ اجابت کب ہے؟

سوال [۴۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن قبولیت کی کون سی گھڑی ہے؟ اس کے بارے میں علماء سے سنا ہے کہ جمعہ کے دن میں کوئی ایسا وقت ہے، جس میں دعا کرنے والے کی دعاء ضرور قبول ہوتی ہے، اگر ایسی کوئی حدیث ہو تو ضرور تحریر فرمادیں؟

المستفتی: محمد اکبر چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہے، جس میں بندوں کی دعاء ضرور قبول ہوتی ہے اور اس گھڑی کو ساعتِ اجابت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کتب احادیث میں اس قبولیت کی گھڑی سے متعلق بے شمار روایات وارد ہوئی ہیں؛ چناں چہ بعض روایات میں عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک کے درمیانی وقت کی صراحت آئی ہے اور بعض روایات میں جمعہ کی نماز سے لے کر فراغت تک کے درمیانی

وقت کی صراحت آئی ہے، ان کے علاوہ اور بھی روایات ہیں؛ لیکن علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے عصر کے بعد والی روایت کو حنفیہ کا راجح مذہب نقل فرمایا ہے؛ البتہ بہتر یہی ہے کہ اگر کسی کو گنجائش ہو تو جمعہ کے پورے دن کو عبادت کے لئے مخصوص کرے اس میں قبولیت کی گھڑی ضرور مل جائے گی۔

ساعتِ اجابت سے متعلق روایات ملاحظہ فرمائیے:

عن أنس بن مالکؓ عن النبي صلی اللہ علیه وسلم قال: التمسوا الساعة التي ترجیٰ في یوم الجمعة بعد العصر إلی غیبوبة الشمس. (ترمذي شریف، کتاب الصلاۃ، باب في الساعة التي ترجیٰ في یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۱۱، دارالسلام رقم: ۴۸۹، سنن أبي داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الإجابة، أیة ساعة هي في یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۵۰، دارالسلام رقم: ۱۰۴۸)

کثیر بن عبد اللہ عن أبیه عن جدہٖ عن النبي صلی اللہ علیه وسلم قال: إن في الجمعة ساعة لایسأل اللہ العبد فیها شیئاً إلا آتاہ اللہ إیاہ قالوا: یا رسول اللہ! أیة ساعة هي؟ قال: حین تقام الصلاۃ إلی انصراف منها. (ترمذي شریف، کتاب الصلاۃ، باب في الساعة التي ترجیٰ في یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۱۱، دارالسلام رقم: ۴۹۰، سنن أبي داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الإجابة، أیة ساعة هي في یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۵۰، دارالسلام رقم: ۱۰۴۹)

عن أبي بردۃ بن أبي موسیٰ الأشعريؓ، قال: قال لي عبد اللہ بن عمر: أسمعت أباک یحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم في شأن ساعة الجمعة؟ قال قلت: نعم، سمعته یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: هي مابین أن یجلس الإمام إلی أن تقضی الصلاۃ. (صحیح مسلم، الجمعة، باب في الساعة التي في یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۲۸۱، بیت الأفکار رقم: ۸۵۳)

في الساعة المحمودة خمسة و أربعون قولاً وأذكر ههنا اثنين. قول الأحناف أنها بعد العصر إلى غروب الشمس، وهو مختار أبي حنيفة وأحمد بن حنبل. والقول الثاني: إنها بعد الزوال من الخطبة إلى الفراغ عن صلاة الجمعة، واختاره الشافعية، ورجح الزملكاني الشافعي القول الأول. (العرف الشذي على هامش الترمذي، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۹۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۲/ ۱۴۳۶ھ

جمعہ کے دن مرنے والے کی فضیلت

سوال [۴۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن مرنے والے کے متعلق کیا فضیلت وارد ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں حدیث شریف تحریر فرمادیں؟

المستفتی: عبیداللہ، بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی فضیلتوں میں سے ایک اہم فضیلت یہ بھی ہے کہ جو شخص جمعہ اور جمعرات کی درمیانی رات یا جمعہ کے دن وفات پاتا ہے، تو وہ عذاب قبر سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ اور عذاب قبر سے حفاظت کے تین اسباب ہیں، جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) عظمت ذات کی وجہ سے عذاب قبر سے حفاظت ہوتی ہے، جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام، شہداء اور معصوم بچے، اللہ کے یہاں ان کی ذات کی عظمت ہے، جس کی وجہ سے اللہ کے یہاں ان کی عذاب قبر سے حفاظت کی جاتی ہے۔

(۲) عظمت عمل کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ عذاب قبر سے محفوظ رکھتے ہیں، مثلاً کوئی شخص

سونے سے پہلے سورۂ ملک (تبارک الذی) پڑھنے کا معمول بنالیتا ہے، تو اس عمل خیر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب قبر سے اس کی حفاظت فرما دیتے ہیں، جیسا کہ حسب ذیل روایت سے واضح ہوتا ہے۔

عن ابن عباسؓ قال ضرب بعض أصحاب النبي صلی اللہ علیه وسلم خباءه علی قبر وهو لا یحسب أنه قبر، فإذا قبر إنسان یقرأ سورة الملك حتی ختمها، فأتی النبي صلی اللہ علیه وسلم، فقال: یا رسول اللہ! إني ضربت خبائي علی قبر وأنا لا أحسب أنه قبر، فإذا فیه إنسان یقرأ سورة الملك حتی ختمها، فقال النبي صلی اللہ علیه وسلم هي المانعة، هي المنجیة تنجیه من عذاب القبر. (ترمذي، فضائل القرآن، باب ماجاء في سورة الملك، النسخة الهندیة ۱۱۷/۲، دار السلام رقم: ۲۸۹۰، مسند البزار مکتبة العلوم والحکم ۴۳۹/۱۱، رقم: ۵۳۰۰، المعجم الکبیر للطبراني، دار إحیاء التراث العربي ۱۷۴/۱۲، رقم: ۱۲۸۰۱)

(۳) عظمت زمان کی وجہ سے بھی عذاب قبر سے حفاظت ہو جاتی ہے جیسا کہ کوئی شخص جمعہ اور جمعرات کی درمیانی رات یا جمعہ کے دن مرتا ہے، تو جمعہ کے دن کی عظمت کی وجہ سے اللہ تعالی اسے عذاب قبر سے محفوظ فرما لیتے ہیں اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی ظالم آدمی جمعہ کے دن مرتا ہے، تو وہ بھی عذاب قبر سے محفوظ ہو جائے گا جیسا کہ روایت سے واضح ہوتا ہے، مگر آخرت کے حساب و کتاب سے نہیں بچ پائے گا وہاں کی پکڑ اپنی جگہ ہے۔

روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن عبد اللہ بن عمروؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ما من مسلم یموت یوم الجمعة، أو لیلة الجمعة إلا وقاه اللہ فتنة القبر. (ترمذي شریف، کتاب الجنائز، باب ماجاء في من یموت یوم الجمعة، النسخة الهندیة ۲۰۵/۱، دار السلام رقم: ۱۰۸۰، مسند أحمد ۱۶۹/۲، رقمخ ۶۵۸۲، المعجم الأوسط للطبراني ۲۳۱/۲، رقم: ۳۱۰۷)

عن أنسؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من مات يوم الجمعة وقي عذاب القبر. (مسند أبي يعلى الموصلي، دار كتب العلمية بيروت ٣/ ٤٠٠، رقم: ٤٠٩٩)

عن ابن شهاب أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من مات ليلة الجمعة، أو يوم الجمعة برئ من فتنة القبر، أو قال وقي فتنة القبر، وكتب شهيداً.

(المصنف لعبد الرزاق، باب من مات يوم الجمعة المجلس العلمي ٣/٢٦٩، رقم: ٥٥٩٥)

(۴) مزید ایک چوتھی چیز یہ ہے کہ اللہ کے یہاں عظمت مکان کی وجہ سے بھی مرنے والوں کی فضیلت آئی ہے جیسا کہ حدود حرم مکی اور حدود حرم مدنی کی سرزمین کا تقدس اللہ کے یہاں اس قدر ہے کہ وہاں پر مرنے والوں کی بڑی فضیلت آئی ہے، ایک حدیث میں وارد ہوا ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جس شخص کو اس بات کی گنجائش ہو کہ مدینہ کی سرزمین پر آکر مرے، تو وہ ضرور وہاں کی رہائش اختیار کر کے وہاں پر مرنے کی کوشش کرے؛ اس لئے کہ مدینہ میں مرنے والوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور شفاعت فرمائیں گے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من استطاع أن يموت بالمدينة، فليمت بها، فإني أشفع لمن يموت بها. (ترمذي، المناقب، باب ماجاء في فضل المدينة، النسخة الهندية ٢/ ٢٢٩، دار السلام رقم: ٣٩١٧)

اور دوسری حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص حرمین میں سے کسی ایک مقام پر مرتا ہے، قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اس کے لئے لازم ہوجائیگی اور قیامت کے دن اس کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو امن وحفاظت کا پروانہ مل جائے گا۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أنس بن مالكؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من مات في أحد الحرمين، بعث من الآمنين يوم القيامة، ومن زارني محتسباً

إلى المدينة كان جواري يوم القيامة. (شعب الإيمان للبيهقي، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۰، رقم:۴۱۵۸)

عن جابرؓ قال: قال رسول الله صلى عليه وسلم: من مات في أحد الحرمين بعث اٰمناً. (المعجم الأوسط للطبراني، دار الفكر بيروت ۴/ ۲۵۰، رقم: ۵۸۸۳)

عن سلمانؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من مات في أحد الحرمين استوجب شفاعتي، وكان يوم القيامة من الاٰمنين. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۶/ ۲۴۰، رقم:۶۱۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۲۲/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۲/۱۴۳۶ھ

محلّہ کی مسجد چھوڑ کر جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد جانا

سوال [۳۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ حضرات اپنے محلّہ کی مسجد کو چھوڑ کر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد جاتے ہیں کہ ثواب زیادہ ملے گا؛ جبکہ اپنے محلّہ میں مسجد اچھی خاصی بڑی ہے، کیا اپنے محلّہ کی مسجد کا حق نہیں ہے کہ جمعہ کی نماز بھی وہیں ادا کریں؟ اس کے جواب سے نوازیں۔

المستفتی: زبیر عالم انصاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز پنج گانہ کے لئے لوگوں کو محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا تاکیدی حکم ہے، بلا کسی شرعی عذر کے محلّہ کی مسجد کو چھوڑنا جائز نہیں؛ بلکہ فقہاء نے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کو جامع مسجد کے مقابلہ میں افضل قرار دیا ہے اور نماز پنج گانہ سے متعلق ہی لوگوں پر محلّہ کی مسجد کا حق بھی ہے؛ لیکن جمعہ کے دن جمعہ کی نماز جامع مسجد میں افضل اور بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۲۵۲/۱، ۶۶/۳، جدید زکریا ۱۶۲/۸)

ومسجد حيه أفضل من الجامع. (شامي، كتاب الصلاة، مطلب في أفضل المساجد، كراچي ۱/۶۵۹، زكريا ۲/۴۳۳)

ولأجل أن الجمعة جامع للجماعات. (رسائل الأركان ص:۱۱۸)

عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صلاة الرجل في بيته بصلاة، وصلاته في مسجد القبائل بخمس و عشرين صلاة، وصلاته في المسجد الذي يجمع فيه بخمس مأة صلاة. الحديث (سنن ابن ماجه، ماجاء في قيام شهر رمضان، باب ما جاء في الصلاة في المسجد الجامع، النسخة الهندية ۱/۱۰۲، دارالسلام رقم:۱۴۱۳، مشكوة ۱/۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۴۲۷)

مسلسل تین جمعہ چھوڑنے والے کا حکم

سوال [۳۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عالم دین نے دوران تقریر یہ حدیث بیان کی کہ امام اعظمؒ کے نزدیک جو شخص مسلسل تین جمعہ کی نماز ترک کردے تو وہ کافر ہے، کیا یہ حدیث صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے تو ایسے عالم دین پر شریعت کا کیا حکم لاگو ہوتا ہے؟ ان سوالات کا جواب مع سند کے عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں؟

المستفتی: عبداللہ، مقام وپوسٹ: جونکا، وایا: تین پہاڑ صاحب گنج (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مضمون کی حدیث کتابوں میں ملتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حقارۃً واہانۃً ترک کرنا کفر ہے اور تساہلاً بلا عذر ترک کرنا فسق ہے۔

عن أبي الجعد الضمريؓ وكانت له صحبة–أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ترك ثلاث جمع تهاونًا بها، طبع الله على قلبه.
(سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب التشديد في ترك الجمعة، النسخة الهندية ۱/۱۵۱، دارالسلام رقم: ۱۰۵۲)

المراد بالتهاون التساهل وقلة المبالاة والاهتمام وليس المراد الاستخفاف فإنها كفر الخ (بذل المجهود، سهارنپور قديم ۲/۱۶۳، دارالبشائر الإسلامية جديد ۵/۳۰، تحت رقم الحديث: ۱۰۵۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/۷۰۷)

عرفہ کا دن افضل ہے یا جمعہ کا دن؟

سوال [۳۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کا دن زیادہ افضل ہے یا عرفہ کا دن زیادہ افضل ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زیادہ صحیح اور راجح یہی ہے کہ عرفہ کا دن جمعہ کے دن سے افضل ہے، یعنی سال کے تمام ایام میں عرفہ کا دن سب سے افضل ہے اور ہفتہ کے ایام میں جمعہ کا دن سب سے افضل ہے۔

واستدل به على أنه أفضلُ من يوم عرفةَ، والأصحُّ أن يوم عرفة أفضلُ، وجُمِعَ بأنه أفضلُ أيام السنة ويوم الجمعة أفضل أيام الأسبوع. (فتح الملهم، ماجاء في فضل يوم الجمعة على باقي الأيام......، مكتبه اشرفية ۲/۳۹۶)

وأما إذا قيل: أفضل أيام السنة فهو عرفة، وأفضل أيام الأسبوع فهو الجمعة. (مرقاة المفاتيح، هل الجمعة أفضل أم يوم الجمعة، مكتبه امدادية ملتان ۳/۲۳۲)

فأما إن أراد أفضل أيام السنة، فتعين يوم عرفة، وإن أراد أفضل أيامِ الأسبوع، فتعين الجمعة. (شرح النووي على صحيح مسلم، النسخة الهندية ۱/۲۸۲)

استدل به علىٰ أنه أفضل من يوم عرفة، قال الزرقاني: الأصح أن يوم عرفة أفضل أيام السنة، ويوم الجمعة أفضل أيام الأسبوع. (أوجز المسالك ۲/۴۵۴ دار القلم) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رمحرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۱۰/۴۰)

جمعہ وجمعرات کی درمیانی شب میں سورۂ کہف پڑھنے کی فضیلت

سوال [۴۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کی فضیلت کس حدیث سے ثابت ہے، اگر کوئی جمعرات کے دن مغرب بعد سورۂ کہف پڑھ لے، تو وہ جمعہ کے دن پڑھنے میں شامل ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد عادل بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کی فضیلت متعدد احادیث سے ثابت ہے اور یہ فضیلت جمعرات کے دن مغرب بعد پڑھنے والوں کو بھی اسی طرح ملے گی، جس طرح جمعہ کے دن پڑھنے والوں کو ملتی ہے؛ اس لئے کہ شرعاً جمعہ سے پہلی والی رات جمعہ ہی کی ہوتی ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن من قرأ سورة الكهف في يوم الجمعة أضاء له من النور مابين الجمعتين. (مستدرك حاكم، كتاب التفسير قديم ۲/۳۹۹، مكتبة نزار مصطفىٰ الباز جديد ۱۲۷۵/٤، رقم: ۳۳۹۲)

عن أبي سعيد الخدريؓ قال: من قرأ سورة الكهف ليلة الجمعة أضاء له من النور فيما بينه وبين البيت العتيق. (مسند الدارمي دارالمغني ۲۱٤۳/٤، رقم: ۳٤۵۰، كنز العمال بيروت ۵۷٦/۱، رقم: ۲٦۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۲۷/۴۰)

جمعۃ المبارک کہنا کیسا ہے؟

سوال [۳۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لفظ جمعہ کے ساتھ بعض لوگ ’’المبارک‘‘ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جمعۃ المبارک کہتے ہیں، از روئے شرع اس کی کیا حیثیت ہے؟ بینوا توجروا.

المستفتی: مظاہر حسین ابو حذیفہ، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لفظ جمعہ کے ساتھ المبارک کا لفظ شامل کرکے جمعۃ المبارک کہنا صحیح اور درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ کا دن بہت زیادہ فضیلت اور برکت والا دن ہے، حدیث پاک کے اندر آیا ہے کہ جن ایام میں سورج طلوع ہوتا ہے، ان میں سب سے خیر وبرکت کا دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی دن جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن جنت سے نکالا گیا، اسی دن قیامت قائم ہوگی۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة رضـ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة: فيه خلق آدم، وفيه أدخل الجنة، وفيه أخرج منها، ولاتقوم الساعة إلا في يوم الجمعة. (ترمذي شريف، كتاب الصلاة، باب فضل يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۰، دارالسلام رقم: ٤۸۸، مسلم شريف، كتاب الجمعة، باب فضل يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۲۸۲، بيت الأفكار رقم: ۸٥٤، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۱٥/ ۲۰۰، رقم: ۸٥۹٥، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۲/ ۸۳٦، رقم: ۱۷۲۹)

دوسری حدیث میں ہے کہ جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے، جس میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے، بعض روایات میں عصر کے بعد کا وقت آیا ہے اور بعض روایات میں جمعہ کی نماز کا وقت بتایا گیا ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أنس بن مالك عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: التمسوا الساعة التي ترجى في يوم الجمعة بعد العصر إلى غيبوبة الشمس. (ترمذي شريف، كتاب الصلاة، باب في الساعة التي ترجى في يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۱، دارالسلام رقم: ٤۸۹)

عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن في الجمعة ساعة لايسأل الله العبد فيها شيئاً إلا آتاه الله إياه، قالوا: يا رسول الله! أية ساعة هي؟ قال حين تقام الصلاة إلى انصراف منها. (ترمذي، كتاب الصلاة، باب في الساعة التي ترجى في يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۱، دارالسلام رقم: ۱۸۲)

عن أبي بردة رضـ بن أبي موسىٰ الأشعري قال: قال لي عبد الله بن عمر: أسمعت أباك يحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في شأن ساعة الجمعة؟ قال قلت: نعم، سمعته يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم

یقول: هي مابين أن يجلس الإمام إلى أن تقضى الصلاة. (صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب في الساعة التي في يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/۲۸۱، بيت الأفكار رقم:۸۵۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۱۴/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۱۵ھ

زوال شمس سے قبل نماز جمعہ کی ادائیگی

سوال [۴۴۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کئی مساجد میں جمعہ زوال سے قبل ادا کرنے کا رواج شروع ہو چکا ہے، مساجد کی انتظامیہ تنگیٔ جگہ و پارکنگ کا اور لوگ معاشی تنگی کا عذر کرتے ہیں، کیا اس طرح جمعہ ادا ہو جاتا ہے؟ چاروں مسالک کو مع دلائل واضح کریں اور چاروں ائمہ کے نزدیک جمعہ کا کون سا وقت افضل ہے؟ تحریر فرمائیں نماز جمعہ یا خطبہ میں زوال ہو جائے تو کیا یہ صحیح ہے یا دہرانا پڑے گا؟ چاروں مسالک کے دلائل اور مفتی بہ قول تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد عبد السبحان، کیلوفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چاروں اماموں میں سے کسی کے نزدیک بھی زوال سے پہلے جمعہ کی نماز جائز نہیں ہے اور پورے سال زوال کے بعد جمعہ کی نماز کی ادائیگی میں جلدی کرنا مسنون ہے۔

وأما الوقت فمن شرائط الجمعة، وهو وقت الظهر حتى لايجوز تقديمها على زوال الشمس لما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه لما بعث مصعب بن عمير إلى المدينة قال له: إذا مالت الشمس فصل بالناس

الجمعة. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، قبيل فصل في بيان مقدار صلاة الجمعة، كراچي ۲۶۹/۱، زكريا ۶۰۲/۱)

الشرط الثالث الوقت، يعنى وقت الظهر حتى لايجوز تقديمها على الزوال. (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون، شرائط الجمعة، زكريا ۵۵۷/۲، رقم: ۳۲۸۵)

وقال الجمهور: ليس بمشروع (أي الإبراد) لأنها تقام بجمع عظيم، فتأخيرها مفضٍ إلى الحرج ولاكذلك الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، كراچي ۳۶۷/۱، زكريا ۲۵/۲)

عن أنس بن مالك رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس. (صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس ۱۲۳/۱، رقم: ۸۹۴، ف: ۹۰۴، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في وقت الجمعة، النسخة الهندية ۱۱۲/۱، دارالسلام رقم: ۵۰۱، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب وقت الجمعة، النسخة الهندية ۱۵۵/۱، دارالسلام رقم: ۱۰۸۴، مسند أحمد بن حنبل ۱۲۸/۳، ۱۵۰، ۲۲۸، المصنف لابن أبي شيبه، مؤسسة علوم القرآن، جديد ۶۲/۴، رقم: ۵۱۷۸، السنن الكبرى، دارالفكر ۴۲۰/۴، رقم: ۵۷۶۶)

عن أياس بن سلمة بن الأكوع عن أبيه كنا نجمع مع رسول صلى الله عليه وسلم، إذا زالت الشمس، ثم نرجع نتتبع الفيءَ. (مسلم شريف، كتاب الجمعة، باب في وقت صلاة الجمعة، النسخة الهندية ۲۸۳/۱، بيت الأفكار رقم: ۸۶۰)

زوال سے قبل جمعہ کا وقت ہی نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے صورت مسئولہ میں نہ نماز جمعہ صحیح ہوگی اور نہ ہی خطبہ، بریں بناء اس کا اعادہ لازم ہے۔

ولايتصور أداء الفرض وقت الاستواء قبل الزوال؛ لأنه لا فرض قبله. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، بيان الوقت المكروه، كراچي ۱۲۷/۱، زكريا ۳۲۹/۱)

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَوْقُوْتًا .

[سورۃالنساء:۱۰۳]

ومن شرائطها الوقت فتصح في وقت الظهر (هداية) وقال العلامة ابن الهمام: لقوله صلى الله عليه وسلم: إذا مالت الشمس الخ وروي أنه صلى الله عليه وسلم لما بعث مصعب بن عمير إلى المدينة قال: إذا مالت الشمس فصل بالناس الجمعة. وفي البخاري عن أنس رضي الله عنه: كان صلى الله عليه وسلم يصلي الجمعة حين تميل الشمس وأخرج مسلم عن سلمة بن الأكوع رضي الله عنه، كنا نجمع مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا زالت الشمس. (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة كوئٹه ۲/۲۷، زكريا ۲/٥٤، دارالفكر مصري قديم ۲/٥٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۳۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۱۱ھ

○❖○

(۲) فصل في شرائط الجمعة

نماز جمعہ کا وجوب اور شرائط

سوال [۳۴۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ کس جگہ واجب ہے اور اس کے کیا شرائط ہیں جس جگہ جمعہ واجب ہوتا ہے؟

(۲) کس جگہ جمعہ واجب نہیں؟ اور جس جگہ جمعہ واجب نہیں احتیاطاً جمعہ ادا کرتے ہیں تو پھر دو فرضوں کے بعد کیا چار فرض ادا کریں، بطور ظہر یا سنت ہی پڑھیں اور اگر بعد میں فرض پڑھیں تو جماعت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: سعید احمد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لئے شہر یا قصبہ ہونا شرط ہے، اگر شہر یا قصبہ نہیں ہے اور گاؤں میں ہندو مسلم ملا کر تین ہزار سے زائد کی آبادی ہے، تو وہاں بھی قصبہ کے حکم میں ہونے کی وجہ سے جمعہ صحیح ہو جاتا ہے، اس سے کم آبادی والے گاؤں اور دیہات میں جمعہ صحیح نہیں ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۸۰)

عن علي رضي قال: لا جمعة و لا تشريق إلا في مصر جامع. (مصنف عبد الرزاق، الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۱۶۷/۳، رقم: ۵۱۷۵)

ويشترط لصحتها سبعة أشياء. الأول: المصر. وتحته في الشامية: عن أبي حنيفة رح أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق، ولها رساتيق الخ

(شامي، كراچي ۱۳۷/۲، زكريا ۵/۳، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

(۲) جس جگہ جمعہ واجب نہیں ہے، وہاں پر احتیاطاً جمعہ ادا کرنا جائز نہیں ہے، وہاں پر ظہر پڑھنا فرض ہے، اگر ظہر نہ پڑھیں گے اور باجماعت جمعہ پڑھ لیں گے تو سب کے اوپر ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا اور اس طرح معمول بنا لینا بھی جائز نہیں ہے کہ باجماعت جمعہ پڑھ لیا جائے، اس کے بعد احتیاط الظہر پڑھ لیا کریں؛ بلکہ وہاں کے لوگوں پر صرف ظہر کی نماز فرض ہے۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) أنه لا تجوز في الصغيرة (وقوله) لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۷، كراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۵۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۹/۳ھ

اقامت جمعہ وعیدین کے شرائط

سوال [۳۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احناف کے نزدیک ہندوستان جیسے ملک میں **اقامت جمعہ وعیدین** کے کیا شرائط ہیں؟ مزید شہریت کا مدار کیا ہے؟ شہر کسے کہتے ہیں؟ جواز جمعہ کے لئے کتنی شہریت ضروری ہے؟ کوئی ایسی جامع مانع تعریف فرمائیں جس سے کوئی الجھن باقی نہ رہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

المستفتی: حافظ محمد اشتیاق مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان جیسے ملک میں جمعہ وعیدین کے لئے اہم ترین شرط یہ ہے کہ آبادی کی حیثیت شہر نما ہو، یعنی اس میں باقاعدہ بازار ہو، ہر چیز ہر وقت ملتی ہو، ہسپتال، ڈاکخانہ، تھانہ وغیرہ ہو، تو وہاں جمعہ وعیدین جائز ہے، چاہے آبادی کی تعداد کم کیوں

نہ ہو اور تین ہزار کی آبادی ہو جائے، بازار وغیرہ وہاں موجود نہ ہو تو وہاں بھی جمعہ وعیدین جائز ہے؛ اس لئے کہ تین ہزار کی آبادی کو قصبہ کے حکم میں تصور کیا جاتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲/۳۱۴، ۲/۳۱۵، جدید ڈابھیل ۸/۹۱، بہشتی زیور ۱۱/۸۰)

عن عليؓ قال: لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولا تشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٩)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التى فيها أسواق، ولا في الصغيرة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٦، كراچي ٢/١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۶۰۶)

قیام جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ کا ہونا لازم ہے

سوال [۳۴۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں مدار پور فیض آباد میں جمعہ کے قیام کے سلسلہ میں کوششیں جاری ہیں؛ حالانکہ یہاں پر برتن کی دوکان موجود نہیں ہے، آپ سے یہ استفسار مقصود ہے کہ برتن وغیرہ حوائج وضروریات میں سے ہے یا نہیں؟ برتن دیگچی اور اس قسم کی دیگر ضروریات کے لئے اس گاؤں سے پانچ کیلو میٹر دور ایک شہر میں جانا پڑتا ہے، تو کیا ایسے گاؤں میں جمعہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد طارق، فیض آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حنفیہ کے نزدیک جمعہ صحیح ہونے کے لئے شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے، جو قصبہ جیسا ہو اور قصبہ جیسا ہونے کی دو شکلیں حضرات فقہاء اور اکابر نے لکھی ہیں۔

(۱) آبادی چاہے کم ہو یا زیادہ لیکن باضابطہ بازار اور حکومتی عملہ ہو، ضروریات زندگی کی تمام چیزیں وہاں فراہم ہوں، تو ایسی جگہ جمعہ کی نماز لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/۲۰۱، جدید ڈابھیل ۸/۷۹، دارالعلوم ۵/۴۴)

عن ابن جریج رضؓ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنودى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي ۳/۱٦۸، رقم: ٥۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) لاتجوز في الصغيرة التى ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/٦)

(۲) ضروریات زندگی کی اشیاء فراہم ہوں یا نہ ہوں؛ لیکن آبادی کی مردم شماری تقریباً تین ہزار یا اس سے زیادہ ہو تو اتنی بڑی آبادی کو چاہے اس میں ضروریات کی اشیاء فراہم نہ ہوتی ہوں تب بھی قصبہ کے حکم میں قرار دیا گیا ہے، اس میں جمعہ پڑھنا جائز ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۸۰)

تقع فرضاً في القصبات، والقرى الكبيرة. (شامي، باب الجمعة، زكريا ۳/٦، كراچي ۲/۱۳۸)

اب آپ اپنے یہاں کی آبادی اور اس کی حیثیت کو دیکھ لیں کہ اگر ان دونوں شکلوں میں سے کوئی ایک شکل پائی جاتی ہے، تو وہاں جمعہ جائز ہے اور اگر کوئی بھی شکل نہیں پائی جاتی ہے، تو وہاں جمعہ جائز نہیں ہے، اس کا فیصلہ آپ خود کرلیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۴/۱۴۲۳ھ

جمعہ کی نماز کس جگہ جائز ہے؟

سوال [۳۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع جاجو پارہ جس کی آبادی تقریباً تین ہزار سے زائد ہے، گاؤں میں تین مساجد، دو مدرسے، ایک ہسپتال، دو سرکاری جونیر و پرائمری اور ایک پرائیویٹ اسکول ہیں، جنمیں روزمرہ ضروریات کی تقریباً سبھی چیزیں دستیاب ہیں، پرچون کی تھوک وفٹکر ہر دو طرح کی دوکانیں، آٹا پیسنے کی چار چکیاں، تین پالیشر، گڑ بنانے کے چار کریشر اور تیل نکالنے کا ایک کولھو بھی موجود ہے، ڈاکٹر مقامی و بیرونی دونوں جگہ کے ہیں، کپڑے وسلائی، مٹھائی کی دوکانیں، ٹیلیفون سہولیات بھی میسر ہیں، گاؤں لب سڑک آباد ہے، جس پر تقریباً باہر آمد و رفت کے لئے سواریاں ہمہ وقت ملتی رہتی ہیں، اہل علم کی تعداد تقریباً ۳۵/ ہے، جس میں سے ایک مفتی اور دس عالم باقی حفاظ کرام ہیں، گاؤں میں ایک عیدگاہ ہے، جس میں عید کی نماز کافی عرصہ سے ہوتی چلی آرہی ہے، کیا ان ضروریات وسہولیات کے میسر ہوتے ہوئے اور گاؤں کی آبادی مذکورہ بالا تعداد میں ہوتے ہوئے جمعہ کی نماز ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: حافظ امیر الدین، محمد الیاس مع مصلیان مسجد جاجو پارہ، ہردوئی

مندرجہ ذیل مقامی علماء کرام ومفتیان عظام نے چل پھر کر گاؤں کا جائزہ لیا ہے اور انہیں کے مشورہ سے مذکورہ بالا تحریر کو مرتب کیا ہے۔

محمد لقمان القاسمی	صغیر احمد مدرس	محمد احسن قاسمی	مشیت اللہ قاسمی
مفتی دار العلوم جامع الہدی گلشہید مرادآباد	مدرسہ سیدنا صدیق اکبرؓ قصبہ پہانی، ہردوئی	مفتی مدرسہ اسلامیہ الطاف العلوم کھوائی میرٹھ	خادم درس وافتاء مدرسہ جامعہ عربیہ سیتاپور

مجیب الرحمٰن	محمد ساجد	احقر یونس
مدرس مدرسہ بینی گنج	خادم تدریس دار العلوم دیوبند	مدرس مدرسہ قصبہ مادھوگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں کی مردم شماری تین ہزار سے زائد ہو، وہ گاؤں قصبہ اور شہر کے حکم میں ہوتا ہے، حنفیہ کے نزدیک ایسے بڑے گاؤں میں جمعہ وعیدین بلاشبہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: بہشتی گوہر ۱۱/۸۱، امداد الفتاوی ۱/۶۲۲)

عن ابن جریجؒ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة، فنودى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي ۳/۱۶۸، رقم: ۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) لاتجوز في الصغيرة التى ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۶۹/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۰/۲۰ھ

کتنی بڑی آبادی میں جمعہ کا قیام جائز ہے؟

سوال [۳۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ موضع شہباز پور، جو مین روڈ پر واقع ہے، جس کی آبادی مردم شماری کے مطابق دو ہزار ہوتی ہے، جس میں کم از کم ایک صدی سے جمعہ ہوتا ہے، موضع ہذا میں نماز عیدین، مذبح، کریشر، بھٹہ اور ہفتہ واری بازار لگتا ہے، گاؤں میں چند عالم اور حفاظ کرام موجود ہیں، جن میں سے چند افراد متصل گاؤں کروندہ میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے ہیں، اب دریافت طلب

امر یہ ہے کہ گاؤں شہباز پور میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؛ جبکہ وہاں تقریباً ایک صدی سے جمعہ کی نماز ہوتی ہے، اگر نماز جمعہ جائز نہیں تو کیا ظہر کے ترک کی وجہ سے اہل شہباز پور گنہ گار ہوں گے؟ اور اگر نماز جمعہ جائز ہے تو گاؤں کے جو افراد دوسرے گاؤں میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے ہیں، ان کا وہاں جانا درست ہے یا اپنے ہی گاؤں میں نماز جمعہ ادا کی جائے؟

(۲) شہباز پور کے قریبی گاؤں محمود پور جس کی آبادی تین ہزار سے زائد ہے اور مین روڈ پر مارکیٹ قائم ہے، وہاں بھی نماز جمعہ ہوتی ہے اور دونوں گاؤں کی پنچایت اور پردھان ایک ہے، برائے مہربانی دونوں گاؤں شہباز پور اور محمود پور میں نماز جمعہ کے جواز وعدم جواز کے بارے میں مفصل ومدلل جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: عبدالصمد، کوتوالی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحت جمعہ کے لئے آبادی کا دو اعتبار سے لحاظ کیا جاتا ہے۔

(۱) کثرت آبادی، تین ہزار کی آبادی شرعاً کثرت آبادی میں شامل ہے؛ لہٰذا موضع محمود پور جس کی آبادی تین ہزار سے زائد ہے، اس کے بڑے گاؤں اور قصبہ کے حکم میں ہونے کی وجہ سے وہاں پر جمعہ پڑھنا واجب ہے۔

عن ابن جریجؒ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة، فنودی للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي ۳/۱٦۸، رقم: ۵۱۷۹)

(۲) حیثیت آبادی کا اعتبار: اگر آبادی مردم شماری کے اعتبار سے کچھ کم بھی ہے؛ لیکن گلی

کوچے، بازار، روزمرہ کی اشیاء، ہسپتال، اسکول، تھانہ، سرکاری آفیسر اور سرکاری دفاتر وغیرہ سب موجود ہوں تو ایسی صورت میں آبادی کی حیثیت بڑھ جاتی ہے، جس کی وجہ سے مردم شماری کم ہونے کے باوجود اسے شہر اور قصبہ کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے اور اس میں جمعہ جائز ہو جاتا ہے، موضع شہباز پور میں مردم شماری دو ہزار بتلائی جارہی ہے اور یہ آبادی کے اعتبار سے کم تعداد ہے، اس میں حیثیت کے اعتبار سے وہ تمام چیزیں نہیں ہیں جو ایک شہر یا قصبہ میں ہوتی ہیں، سرکاری دفاتر، ہسپتال، تھانہ، اسکول اور سرکاری آفیسر وغیرہ وہاں موجود نہیں ہیں، مذبح، کریشر، بھٹہ وغیرہ کی وجہ سے آبادی کی حیثیت نہیں بڑھتی؛ اس لئے موضع شہباز پور میں جواز جمعہ کے بارے میں ہمیں تردد ہے؛ اس لئے ہم جواز کی بات لکھنے سے معذرت خواہ ہیں۔

في الدر: ويشترط لصحتها سبعة أشياء. الأول: المصر. وتحته في الشامية: عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه،أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا هو الأصح. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٧، زكريا ٣/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۶۴۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۳ھ

قیام جمعہ کے لئے کتنی آبادی شرط ہے؟

سوال [۳۴۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کے لئے تکلیف کا باعث یہ ہے کہ احقر محکمۂ شرعیہ گجرات کا صدر ہے؛ لہٰذا آپ حضرات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۲) عدم وجوب جمعہ کے متعلق ایک مفتی صاحب کو سوال مرتب کرنے کے متعلق ذمہ داری حوالہ کی تھی، انہوں نے برضا ورغبت ذمہ داری قبول فرمائی تھی، مگر سترہ ماہ ہوگئے باوجود توجہ دلانے کے ذمہ داری ادا نہیں کی؛ اس لئے وجوب جمعہ کے قائل حضرات کی طرف سے سوال لکھا جارہا ہے۔

(۱) قریۂ کبیرہ۔

(۲) دونوں گاؤں ایک قریہ کے حکم میں ہیں؟

(۳) رویدرا گاؤں میں دس سال پہلے جمعہ ادا ہوتا تھا، مگر شرعی مسئلہ معلوم ہونے کی وجہ سے جمعہ کو ترک کردیا گیا، دس سال میں حالات تیزی سے بدلے، پچاس ساٹھ نئے مکان، مزید مدرسہ کے ۲۵؍ کرایہ کے مکان، ایک دارالعلوم جس میں فی الحال تین سو طلباء کی گنجائش ہے، مگر دو سو طلباء پڑھتے ہیں، لڑکیوں کے لئے مدرسہ خیاطی کا انتظام، دوکانوں کی تعداد میں اضافہ، دیگر کاریگروں کا اضافہ وغیرہ امور کی وجہ سے اہل قریہ نے جمعہ کے متعلق سوال کیا، حالات بدلنے سے حکم بدلے گا، ایک مفتی صاحب نے وجوب جمعہ کا فتویٰ دیا، دوسرے مفتی صاحب جن کو سوال مرتب کرنے کی ذمہ داری حوالہ کی گئی تھی وہ عدم وجوب کے قائل ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے سوال نہیں مرتب کیا، وجہ وجوب جمعہ کا فتویٰ اصل مسئلہ حالات حاضرہ کی وجہ سے ہوجائے یا اختلاف جواب ہو؟

(۴) رویدرا گاؤں میں تقریباً دو ہزار کی آبادی ہے، سات کلاس تک اسکول ہے، ۴۵؍ سال سے مشین ٹنکی سے پانی کا نظم ہے، مکتب میں چھ سات مدرس پڑھاتے ہیں، دس یا گیارہ دوکانیں ہیں، ڈاکخانہ موجود ہے، پچاس سال سے گورنمنٹ کی طرف سے منظور شدہ شرائط پر غلہ کی دوکانیں ہیں، ۲۵؍ کرایہ کے مکان وقف ہیں، ٹیلی فون، ۷؍۸؍ رکشہ، ٹریکٹر اور ایک دارالعلوم جس میں دو سو طلبہ موجود ہیں، قیام وطعام کا مکمل نظم ہے، طالبات کے لئے دینی تعلیم اور خیاطی کا نظم ہے، اہل قریہ نے بھی خیاطی کا نظم کیا ہے، ڈاکٹر بھی موجود ہے، ان حالات کے ساتھ رویدرا کے متصل ملحق ایک قریہ کرمالی ہے، دونوں دیہات کا نظم ایک نام

علیحدہ ہے، مگر درمیان میں راستہ فقط بارہ پندرہ فٹ کا ہے، اجنبی آنے والے کو نہ بتلایا جاوے تو مکمل اس قریہ کورویدرا کا محلّہ تصور کرے گا، اس کی آبادی تقریباً ۹۰۰/افراد ہوں گے تو حکیم الامتؒ کی تحریر کے مطابق دونوں دیہات کو نو وارد ایک ہی تصور کرے گا؛ لہٰذا دونوں کو ایک ہی کے حکم میں سمجھ کر قریۂ کبیرہ کا حکم لگا کر وجوب جمعہ کا فتویٰ دیا ہے۔

نائی، لوہار جدید آلات کے ساتھ، بڑھئی جدید مشین کے ساتھ موجود ہیں، تعمیری کام کرنے والے تین کنٹریکٹر بھی ہیں، مجموعی تین مسجدیں ہیں، چوتھی مسجد کا احساس ہے، دو مکتب میں دس اساتذہ، دارالعلوم میں تیرہ اساتذہ ہیں، مجموعی آبادی تین ہزار کے قریب ہے: لہٰذا جمعہ واجب ہے؟

(۵) عوام میں چہ میگوئیاں ہورہی ہیں جو موجب فتنہ نہ ہو، احقر نے عوام کو ساکت کر دیا ہے کہ مفتیان کرام کے فتاوی پر عمل ہوگا؛ اس لئے امید کہ جواب تحریر فرما کر ممنون فرمائیں؟

المستفتی: مفتی احمد بیمات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دو گاؤں اس طرح مل جائیں کہ دونوں کے درمیان کوئی بڑا کھیت نہ ہو اور اجنبی آدمی دونوں کو دیکھ کر ایک ہی گاؤں سمجھ لیتا ہو، تو ایسی صورت میں شرعی طور پر دونوں آبادی کو ایک ہی آبادی اور ایک ہی گاؤں کہا جائے گا اور احکام جمعہ میں دونوں کو ایک ہی شمار کیا جائے گا؛ اس لئے رویدرا اور کرمالی دونوں گاؤں قیام جمعہ کے مسئلہ میں ایک ہی شمار ہونے کی وجہ سے دونوں کی آبادی اور مردم شماری کا اعتبار ہوگا اور جب دونوں کی مردم شماری تین ہزار تک پہونچ چکی ہے، تو اس میں بلاکسی شرط کے محض مردم شماری کی کثرت کی وجہ سے حنفی مسلک کے مطابق جمعہ کا قیام جائز اور درست ہو جائے گا۔

(مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵/۶۵، امداد المفتیین ۲/۳۱۰، بہشتی زیور ۱۱/۸۰، امداد الفتاوی ۱/۶۷۱)

اور بڑا گاؤں جس میں ضروریات زندگی کا سامان موجود ہو وہاں کے لوگوں پر جمعہ کی ادائیگی فرض ہے۔

عن ابن جريجؒ، قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة، فنودي للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي ۳/ ۱٦۸، رقم: ۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۲۹ھ

جمعہ کے قیام کے لئے کتنی آبادی ضروری ہے؟

سوال [۳۴٦۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی نماز جائز ہونے کے لئے کتنی آبادی کی ضرورت ہے؟

المستفتی: محمد طارق انور رشیدی، مغلپورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے جائز ہونے کے لئے شہر یا قصبہ ہونا ضروری ہے کہ جس میں باقاعدہ بازار ہو اور جس میں ضرورت کی تمام اشیاء مہیا ہوں۔

عن عليؓ قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لاجمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع. مؤسسة علوم القرآن ٤/ ٤٦، رقم: ۵۰۹۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق – إلی أنه لاتجوز في الصغیرة التی لیس فیها قاض. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶)

نیز اگر تین ہزار کی آبادی ہو تو وہاں جمعہ جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۶۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۸۹۱)

چند لوگوں کا مسجد کے باہر خطبہ وجماعت کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند اشخاص قبل نماز جمعہ کسی شہر میں جانے کے لئے روانہ ہوئے، عین نماز جمعہ کے وقت اپنے مستقر پر پہونچے، کئی مساجد میں نماز جمعہ ہو چکی تھی، دو تین مساجد میں نماز ہونی باقی تھی، مقامی لوگوں نے بتایا کہ فلاں مسجد میں نماز جمعہ مل جائے گی، ماروتی گاڑی سے جو کہ ساتھ تھی جیسے ہی وہاں پہونچے، امام ومقتدی نماز سے فارغ ہو چکے تھے دعاء میں مشغول تھے، وہاں لوگوں نے بتایا کہ اسٹیشن کے پاس فلاں مسجد میں دو بجے نماز ہوتی ہے، وہاں پر مل سکتی ہے، جو کہ تقریباً ایک کلومیٹر دور تھی؛ لیکن ان لوگوں نے اسی مسجد کے برابر (باہر) میں مدرسہ کی جگہ میں مسجد سے خطبہ کی کتاب لے کر نماز جمعہ باجماعت ادا کر لی؛ جبکہ دوسری مسجد میں جماعت مل سکتی تھی۔ نیز اذان اول نہ پڑھی؛ بلکہ صرف اذان ثانی پڑھ کر بغیر ممبر کے خطبہ پڑھ کر نماز جمعہ باجماعت ادا کر لی۔

(۱) کیا ایسی حالت میں جبکہ کسی دوسری مسجد میں نماز جمعہ باجماعت ادا کی جاسکتی ہو مسجد سے باہر جماعت بنا کر نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کیا صرف اذان ثانی پڑھ کر خطبہ پڑھنا اور نماز جمعہ ادا کرنا؛ جبکہ اذان اول نہیں پڑھی جائز ہے یا نہیں؟
(۳) بغیر ممبر خطبہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ استدعاء ہے کہ قرآن وحدیث کے مکمل دلائل کے ساتھ مشرح تینوں سوالوں کا جواب عنایت فرمائیں؟

المستفتی: سید اقبال حیدر، چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ مسجد ومدرسہ دونوں ایک احاطہ میں ہیں؛ لہٰذا جب اس طرح ایک احاطہ میں، مسجد کے حصہ میں جمعہ ہوجانے کے بعد مدرسہ کے حصہ میں دوسرا جمعہ پڑھ لیا گیا ہے، تو وہ بھی شرعاً صحیح ہوگیا ہے؛ لیکن ایک احاطہ میں ہونے کی وجہ سے دوسرا جمعہ اگرچہ صحیح ہے؛ لیکن مقصد جمعہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے بہتر نہیں ہوا۔

واجتمع الناس على رجل فصلى بهم جاز للضرورة، كما فعل عليؓ في محاصرة عثمانؓ، وإن فعلوا ذلك لغير ما ذكر لايجوز لعدم الضرورة، وروي ذلك عن محمد في العيون، وهو الصّحيح. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب الجمعة، جديد دارالكتاب ديوبند ص:۵۰۷، قديم ۲۷۶)

(۲) جب نماز جمعہ بغیر اذان اول کے پڑھ لی گئی تو اس صورت میں نماز جمعہ تو ہوجائے گی؛ لیکن سنت مؤکدہ کے ترک کرنے کی وجہ سے سخت گنہگار ہوں گے۔

وهو سنة للرجال في مكان عال مؤكدة هي كالواجب في لحوق الإثم للفرائض الخمس في وقتها. (شامي، كتاب الصلاة، باب الأذان كراچي ۳۸۴/۱، زكريا ۴۸/۲، مصري ۳۵۷/۱، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في الأذان، زكريا ۱۳۵/۲، رقم: ۱۹۵۸)

(۳) بغیر ممبر کے خطبہ دینا خلاف سنت ہے، سنت طریقہ یہی ہے کہ ممبر پر خطبہ دیا جائے؛ لیکن جب بغیر ممبر کے خطبہ دے دیا گیا تو خطبہ ہوگیا۔

و من السنة أن يكون الخطيب على منبر اقتداء برسول الله صلى الله عليه وسلم. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٢/ ٢٥٩، كوئٹه ٢/ ١٤٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۳/۵ھ

جمعہ کے شرائط مفقود ہونے والے گاؤں میں رہنے والے علماء ومفتیان کی ذمہ داری

سوال [۳۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بستی میں مسلمانوں کی آبادی صرف ڈیڑھ سو ہے اور کفار کی آبادی ایک سو ہے، ہر چہار جانب کافروں کی گھنی غیر معمولی آبادی ہے؛ جبکہ مسلمانوں کی دوسری بڑی آبادی بہت دور ہے اور زید کی بستی میں حنفی مسلک کے مطابق نماز جمعہ کے شرائط مفقود ہیں، پھر بھی عوام وعلماء عرصۂ دراز سے نماز جمعہ ادا کرتے آرہے ہیں اور اس کو ختم کرنے میں فتنہ و فساد ہونے کا ظن غالب ہے، تو کیا ان کی نماز درست ہے یا ظہر باقی رہے گی؟ اور فی الحال اس کو ختم کیا جائے یا برقرار رکھا جائے؟ نیز زید کی اسی بستی میں ایک مسجد ایک عیدگاہ اور ایک قبرستان ہے، جس میں قلت آبادی کی بنا پر فساد وغیرہ میں بڑا خطرہ محسوس ہوتا ہے اور زندگی دوبھر ہو جاتی ہے، تو کیا مسلمانوں کا وہاں سے ہجرت کرنا درست ہے؟ واضح ہو کہ وہاں اکثریت غرباء وفقراء کی ہے جو ہجرت کی وسعت نہیں رکھتے؟

المستفتی: محمد محسن، تکمیل ادب، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس جگہ جمعہ جائز نہیں اگر وہاں ظہر چھوڑ کر جمعہ ادا کیا جائے گا تو ان پر ظہر کا فریضہ باقی رہ جائے گا؛ البتہ اگر جمعہ کی مخالفت کرنے سے اختلاف و

انتشار کا اندیشہ ہو تو مسئلہ بتا کر خاموشی اختیار کرلیں اور خود جمعہ میں شرکت نہ کریں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۶۵، فتاویٰ محمودیہ ۱۴/۲۴۵، ۱۴/۲۵۳، جدید ڈابھیل ۸/۱۳۹-۶۵)

ولها شرائط وجوب وأداءٍ (إلى قوله) أن الأداء لا يصح بانتفاء شروطه. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۲/ ۵، كراچي ۲/ ۱۳۷)

ولو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، باب الجمعة، زكريا ۲/ ۷، كراچي ۲/ ۱۳۸)

جس مقام پر مسلمان اپنے دین، جان، عزتِ عیال اور مال کی حفاظت پر قادر نہ ہوں اور شعائرِ اسلام پر کما حقہ عمل ممکن نہ ہو وہاں سے ہجرت کر جانا فرض ہے اور اگر وہاں رہ کر شریعت پر اعلانیہ طور سے عمل میں دشواری ہو اور دوسری جگہ سہولت معلوم ہو، تو ایسی جگہ سے ہجرت کرنا مستحب اور باعث اجر وثواب ہے۔ سوال میں ذکر کردہ بستی کا حال؛ چونکہ ایسا نہیں ہے؛ اس لئے وہاں سے ہجرت کرنا فرض یا مستحب نہ ہوگا؛ البتہ وہاں سے چلے جانے میں بھی کوئی گناہ نہیں؛ بلکہ جائز ہے اور اگر وہاں رہتے ہوئے اپنے جان و مال اور اولاد کی حفاظت کرے اور مفسدین کی جماعت سے پوری تدبیر اور قوت سے مقابلہ کرے اور اپنے بھائیوں کی مدد کرے، تو باعث اجر وثواب ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا، جو شخص جان و مال، اولاد اور دین وعزت کی خاطر لڑتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۹/ ۳۷۴، جدید ڈابھیل ۴/ ۶۴۰، کفایت المفتی قدیم ۹/ ۳۰۶، ۹/ ۳۰۹، جدید زکریا مطول ۲/ ۳۹۰، ۲۹۴)

والمعنى أنهم إن كانوا في أرض لا يقدرون فيها على إقامة دينهم ولا يسلمون فيها من أذى الكفار، فإن أرض ربهم واسعة، فليهاجروا إلى موضع منها يقدرون فيه على إقامة دينهم ويسلمون فيه من أذى الكفار كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم والمسلمون. ("اضواء البيان" العنكبوت تحت آية: ۵۶، قديم ۶/ ۴۶۹، كذا في روح المعاني، العنكبوت تحت آية: ۵۶، زكريا ۲/ ۱۴، قديم ۲۱/ ۹)

قالوا: كل هجرة لطلب علم، أو حج، أو جهاد، أو قرار إلى بلد يزداد

فيه طاعة، أو زهدًا، أو ابتغاء رزق طيب، فهي هجرة إلى الله و رسوله.

(أحكام القرآن حضرت تهانوي، العنكبوت: ٥٦، ٢/) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ررجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۱۵ھ

دیہات میں جمعہ کے جواز کی شرائط

سوال [۳۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی نماز درست ہونے کے لئے مصر، فنائے مصر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے، جہاں روزمرہ کی ضروریات بسہولت ملتی ہوں تو مصر، قصبہ، بڑا گاؤں ہر ایک کی تعریف کیا ہے؟ الگ الگ واضح طور پر تحریر فرمائیں، اگر اختلاف ہو تو مفتی بہ قول تحریر فرمائیں۔ نیز روزمرہ کی ضروریات میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں؟ کل کتنی چیزیں ضروریات میں شمار ہوں گی، دو تین دوکانیں ہوں؛ لیکن کھانے کی اشیاء کے علاوہ اور کچھ نہ ملتا ہو، تو اس کا شرعاً اعتبار ہے یا نہیں؟

(۲) اگر شرائط نہ پائی جائیں صرف عرصۂ دراز سے جمعہ ایسی بستی میں ہوتا آرہا ہے، تو اس کو منع کرنا چاہئے یا نہیں؟ اگر منع کرنے سے فتنہ کا خوف ہو یا نہ ماننے کا اندیشہ ہو تو کیا کیا جائے؟ مزید شرائط جمعہ پائی نہ جائیں، اس کے باوجود اگر کوئی شخص پڑھتا ہے یا پڑھاتا ہے، تو اس کے ذمہ سے ظہر ساقط ہوگی یا نہیں؟ اور اس کے ذمہ قضاء لازم ہے یا نہیں؟ اور وہ شخص گنہگار ہوگا یا نہیں؟

(۳) یہ مسئلہ عموم بلویٰ اور ضرورت کے تحت داخل ہوکر جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یا بقیہ ائمۂ ثلاثہ کے قول کے مطابق فتوی دیا جاسکتا ہے؟ تو پھر نماز جمعہ کے تمام متعلقہ مسائل میں انہیں کے مذہب کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

(۴) جہاں شرائط نہ ہوں وہاں عیدین کی نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ پڑھنے والا ثواب کا حق دار ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد طیب کونہلی، عبدالمنان، امام مسجد کونہلی، سیتامڑھی (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حنفیہ کے نزدیک جواز کے لئے شہر، قصبہ اور ایسا بڑا قریہ ہونا شرط ہے جس میں لگ بھگ تین ہزار کی آبادی ہو اور ضروری اشیاء مل جاتی ہوں، ضروری اشیاء میں خورد ونوش کا سامان کپڑے وغیرہ کی دوکانیں اور پیشہ وروں کا ہونا شامل ہے، جن سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

بأن المصر موضع يندفع فيه حاجة الإنسان الضرورية من الأكل، بأن يكون هناك من يبيع طعاماً، والكسوة الضرورية، وأن يكون هناك أهل حرف يحتاج إليهم كثيراً. (رسائل الأركان ص: ١١٤، بحواله فتاوى رحيمية قديم ٥/ ٥٤، جديد زكريا٦/ ٩٠)

(۲) مصر کی تعریف میں اختلاف ہے؛ لیکن بظاہر عرف پر مدار ہے، عرفاً جس شہر اور قصبہ کی آبادی زیادہ ہو، بازار گلیاں ہوں اشیاء ضرورت سب ملتی ہوں وہ شہر ہے۔

(مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۱۰۲/۵)

وفي التحفة: عن أبي حنيفةؒ أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أوعلم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا هو الأصح .

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٣٧، زكريا٣/ ٥)

(۳) قصبہ بڑے گاؤں سے بڑا شہر نما ہوتا ہے، شہر کی طرح ہر چیز وہاں پائی جاتی ہیں، ڈی ایم اور کلکٹر کا ہونا ضروری نہیں، بڑا گاؤں وہ ہے: جس کی آبادی لگ بھگ تین ہزار کی ہو، وہ بھی قصبہ کے حکم میں ہے اور اس میں بھی جمعہ جائز ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ کی رائے ہے، امداد الفتاوی ۱/ ۶۱۷، اور بہشتی زیور میں یہی مذکور ہے۔

(۴) چھوٹا گاؤں وہ ہے: جس کو اردو میں دیہات سے تعبیر کرتے ہیں اور اس میں شہر قصبہ وغیرہ کے شرائط بھی موجود نہ ہوں اور اس کی آبادی میں مردم شماری دوتین ہزار بھی نہ ہو، تو ایسے چھوٹے گاؤں میں شرعاً جمعہ جائز نہیں، ظہر کی نماز اس پر باقی رہ جاتی ہے اور اگر منع کرنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو فتنہ سے بچنا بھی لازم ہے، اگر ایسا مقام ہے کہ جہاں عموم بلویٰ کی بناء پر شدید ضرورت پیش آجائے، تو ایسے مقام میں اگر امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کیا جائے، تو ان کے مسئلہ کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کے متعلق تمام شرائط کا لحاظ رکھنا بھی لازم ہے؛ اس لئے امام شافعی کے مسلک پر عمل کرنا دشواری سے خالی نہیں، ورنہ تلفیق لازم آجاتی ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۸۹)

(۵) شرائط نہ ہونے کی صورت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

صلوة العيد في القرىٰ تكره تحريماً؛ لأنه اشتغال بما لايصح؛ لأن المصر شرط الصحة. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ۱۶۷/۲، زكريا ۴۶/۳)

مگر فتنہ سے بھی بچنا لازم ہے۔ نیز نماز عید جمعہ کی طرح نہیں ہے؛ اس لئے کہ جہاں جمعہ صحیح نہیں ہوتا وہاں ظہر کی نماز لازم آجاتی ہے، مگر عیدین کی نماز نہ پڑھی جائے تو اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

دیہات میں جمعہ سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال [۳۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں چھوٹے چھوٹے علیحدہ علیحدہ نام کے چند گاؤں ہیں، کسی کی آبادی پانچ

سوکسی کی چھ سو ہے، اسی میں ایک گاؤں سریہ کے نام سے ہے، جس کی کل آبادی بمشکل تمام دو سو افراد پر مشتمل ہوگی۔ مذکورہ گاؤں کے شمال وجنوب میں آدھا آدھا کلومیٹر دور ہفتے میں ایک ایک دن اٹھائی بازار لگتا ہے، کچھ فاصلے پر سرکاری بینک بھی واقع ہے، تقریباً دس سال سے ایک صاحب کی سعی سے جمعہ کا قیام عمل میں آیا، مگر اسی وقت سے مقامی ذی علم اور تجربہ کار علماء اس سے متفق نہ رہے اور نہ کبھی شریک جمعہ ہوکر جمعہ کی نماز ادا کی، اب جبکہ کئی عالم و مفتی فارغ التحصیل ہوئے اور کتب فقہ اور اکابرین کی رائے کو دیکھ کر مشکوک ہوئے کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں حنفیہ کے نزدیک قیام جمعہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے تب لوگوں کے سامنے بات رکھی گئی، بحمد اللہ لوگ صحیح بات ماننے اور شریعت مطہرہ پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں، اب ایسی صورت میں مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) مذکورہ کسی گاؤں میں جمعہ کے دن اذان و نماز ظہر باجماعت مسجد میں نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ ہر گاؤں کے چند افراد شریک ہوکر جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں، تو کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ یا عام دنوں کی طرح جمعہ کے دن بھی ہر گاؤں میں ظہر کے لئے اذان و نماز باجماعت کی ادائیگی لازم ہے؟

(۳) جبکہ تمام گاؤں علیحدہ علیحدہ ناموں کے ساتھ موسوم ہیں اور ہر دو گاؤں کے درمیان کھیت وسڑک کے ذریعہ آدھا کلومیٹر کا فاصلہ ہے، تو کیا ایسی صورت میں تمام گاؤں کو ایک شمار کرکے جمعہ قائم کرنا درست ہے؟

(۴) چونکہ دس سال سے جمعہ کی نماز ہورہی ہے، اگر فتوی عدم جواز کا ہو اور بعض لوگوں کے عدم اتفاق واختلاف کی بات ہو تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

(۵) جس جگہ شرائط جمعہ نہ ہوں اور لوگ پڑھتے ہوں، وہاں جمعہ کو بند کرنا بہتر ہے یا بنیت نفل جمعہ میں شریک ہوکر بعد میں احتیاط الظہر پڑھنا بہتر ہے؟

(۶) وعظ ونصیحت یا دینی فائدہ اور شوق نماز کے پیش نظر شرائط جمعہ کے بغیر جمعہ کے قیام

کا کیا حکم ہے؟ بینوا بیانًا شافیًا تؤجروا أجرًا وافیًا، فإن الله لایضیع أجر المحسنین.

المستفتی: اہلیان موضع متھر ہنڈیہ، بلرام پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر چیز کے کچھ اصول وقواعد ہوتے ہیں، اگر ان اصول وقواعد کے موافق عمل کیا جائے تب ہی وہ عمل صحیح اور قابل قبول ہوگا، ورنہ صحیح اور قابل قبول نہ ہوگا، مثلاً نابالغ لڑکا بالغوں کا امام نہیں بن سکتا؛ اس لئے کہ امامت کے لئے بالغ ہونا شرط ہے، نماز کی صحت کے لئے طہارت شرط ہے، بلا طہارت نماز درست نہ ہوگی، اسی طرح وقت سے پہلے اگر نماز پڑھی جائے تو نماز نہ ہوگی۔ نیز حج کی ادائیگی کے لئے ماہ ذی الحجہ کا ہونا اور ارکان کی ادائیگی کے لئے جو جگہیں مقرر کی گئی ہیں وہاں جاکر ارکان ادا کرنا ضروری ہے ورنہ فریضۂ حج ادا نہ ہوگا، اسی طرح نماز جمعہ کی صحت کے لئے شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا شرط ہے، بڑا گاؤں وہ ہے جس میں گلی کوچے ہوں، بازار ہو، روزمرہ کی ضروری اشیاء ملتی ہوں، کم از کم تین ہزار کی آبادی ہو تو وہاں جمعہ کی نماز واجب ہے اور جو گاؤں ایسا نہ ہو اس میں جمعہ ادا کرنا جائز نہیں ہے، دیکھئے میدان عرفات میں لاکھوں حاجیوں کا اجتماع ہونے کے باوجود جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی؛ بلکہ ظہر پڑھی جاتی ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کا دن تھا پھر بھی ہزاروں صحابہ کے اجتماع میں جمعہ نہیں پڑھا گیا؛ بلکہ ظہر باجماعت پڑھی گئی اور آج تک ظہر ہی پڑھی جاتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ نماز جمعہ کی صحت کیلئے شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا شرط ہے، سوال نامہ میں جس گاؤں کا ذکر ہے وہ یقیناً چھوٹا گاؤں ہے؛ اس لئے وہاں جمعہ کی نماز پڑھنا قطعاً جائز نہیں ہے، پڑھی جائے تو ادا نہ ہوگی؛ بلکہ نفل ہوجائے گی اور نفل کے لئے اذان واقامت، خطبہ، قرأت بالجہر اور نفل باجماعت پڑھنے کی کراہت، نیز ظہر باجماعت ترک کرنا موجب فسق اور کراہت تحریمی کا باعث ہے؛ اس لئے گاؤں والوں پر ظہر باجماعت پڑھنا لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/ ۳۱۹ تا ۳۳۱،

جدید ڈابھیل ۸/۱۰۵ تا ۱۲۳، تعلیم الاسلام ۴/۷، کفایت المفتي قدیم ۳/۱۸۹، زکریا مطول: ۵/۱۶۲، مسائل نماز جمعہ ص: ۷۷)

ولا جمعة بعرفات في قولهم جميعاً. (جامع الصغير ص:۱۱۲)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق، وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التى ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. كما في المضمرات. والظاهر أنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، ألا ترى أن في الجواهر: لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۷، وكذا في تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۱/۵۲٤، امداد يه ملتان ۱/۲۱۷، امداد الأحكام ۲/۳٤۰، البحر الرائق، زكريا ۲/۲٤۸، كوئٹه ۲/۱٤۱، ومجمع الأنهر بيروت، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة ۱/۲٤٥، وفتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، كراچي ۲/۲۲، زكريا ۲/٥۱، هداية، باب صلوة الجمعة اشرفى ديو بند ۱/۱٦۸، كبيري، باب صلوة الجمعة اشرفية ديو بند ٥٤۹، قديم ٥۱۰، صغيري، مطبع مجتبائي دهلي ۲۷۷، ونور الإيضاح، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، امداديه ديو بند ۱۱۷، ۱۱۸، مالا بد منه ٥٤، بهشتى ثمر ۱/۱٤۳، وطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دارالكتاب ديو بند ص:٥۰٤، قديم ۲۷٤)

(۲) جہاں شرائط جمعہ موجود نہ ہوں وہاں چند افراد کا یکجا ہو کر جمعہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے اہل گاؤں پر جمعہ کے دن بھی دوسرے دنوں کی طرح ہر گاؤں میں اذان واقامت کے ساتھ ظہر کی نماز باجماعت پڑھنا لازم وضروری ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵/۱۵۱-۱۶۳-۱۶۵)

ألاترى أن في الجواهر لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۷)

(۳) جبکہ چند گاؤں اپنے نام کے اعتبار سے الگ الگ ہیں اور ہر دو گاؤں کے درمیان کھیت وسڑک کے ذریعہ فاصلہ بھی ہے اور انفرادی طور پر کسی میں بھی شرائط جمعہ موجود نہیں ہیں، تو محض اقامت جمعہ کے لئے ان کی آبادی کو ایک شمار کر کے قریۂ کبیرہ کا درجہ دینا قواعد

شرعیہ اور عرف وعادت کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے؛ اس لئے اہل علاقہ کا اکٹھا ہوکر ایک گاؤں میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ آپ خود نہ پڑھیں اور نہ پڑھائیں؛ بلکہ اعلان کردیں کہ یہاں جمعہ درست نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۶/ ۵۲۶، جدید ڈابھیل ۸/ ۱۴۷)

(۵) جس جگہ شرائط جمعہ نہ ہوں اور لوگ کم علمی کی وجہ سے پڑھ رہے ہوں تو وہاں جمعہ کو موقوف کر کے ظہر قائم کرنا ضروری اور مطلوب شرع ہے، بنیت نفل جمعہ میں شرکت کرنے سے دوسرے لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ بھی جمعہ پڑھتے ہیں؛ لہٰذا ایسی جگہ جمعہ پڑھ کر بعد میں احتیاط الظہر پڑھنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۷/ ۲۰۲، ۱۴/ ۲۳۵، جدید ڈابھیل ۸/ ۱۶۸، ۴۴، امداد الفتاوی ۱/ ۶۴۱ ومسائل نماز جمعہ ص: ۷۷)

(۶) شریعت میں مصلحت کی رعایت اس وقت ہوتی ہے جب وہ حکم شرعی کے خلاف نہ ہو اور جب مصلحت حکم شرعی کے خلاف ہو، تو پھر مصلحت کی اجازت ہرگز نہ ہوگی؛ بلکہ حکم شرعی پر عمل کرنا لازم ہوگا، مذکورہ گاؤں میں جب شرائط جمعہ موجود نہیں ہیں، تو پھر کسی دینی فائدہ و مصلحت کے پیش نظر جمعہ پڑھنا درست نہیں ہے؛ بلکہ ظہر باجماعت ادا کرنا ضروری ہے، جس کی قسمت میں نماز اور عبادت لکھی ہے اور جس کو خوف خدا ہے وہ پھر بھی ادا کرے گا اور جو بدقسمت ادا نہ کرے، اس کی فکر کسی کے ذمہ نہیں وہ اپنی قبر کا سامان خود کرے گا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۹/ ۱۳۷، جدید ڈابھیل ۸/ ۱۵۲، امداد الفتاوی ۳/ ۳۷۵ ومسائل نماز جمعہ: ۷۸)

المفسدة إذا ترجحت على المصحلة اقتضت تحريم الفعل. (روح المعاني، سورة البقرة: ۲۱۹، زكريا ديوبند ۲/ ۱۷۳)

إذا كان فعل الإمام مبنياً على المصلحة فيما يتعلق بالأمور العامة لم ينفذ أمره شرعاً إلا إذا وافقه، فإن خالفه لم ينفذ. (الأشباه والنظائر قديم ص: ۱۸۹)

مزید تفصیل کے لئے اوثق العری وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ۶/ ۱۴۲۶ھ

گاؤں میں نماز جمعہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال[۳۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم لوگ صوبہ بہار کے ضلع سمستی پور کے دیہات کے رہنے والے ہیں، ایسی جگہ ہے جہاں ضروریات کا سامان نہیں ملتا اور بہت دنوں سے یہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، مولوی حضرات شامل بھی ہوتے ہیں؛ بلکہ امامت بھی کرتے ہیں اور احتیاط الظہر پڑھتے ہیں۔

(۱) نماز ہوگی یا نہیں؟

(۲) احتیاط الظہر پڑھنا کیسا ہے، ان کی امامت ہوگی یا نہیں؟

(۳) تقریباً دو ہزار کی آبادی ہے، ہندو مسلمان دونوں کے دو محلے ہیں دونوں میں ایک ایک مسجد ہے، ایک بڑی ہے دوسری چھوٹی، چھوٹی مسجد میں جمعہ کے وقت میں کوئی نماز نہیں ہوتی۔ کیا اس محلّہ کے افراد جمعہ کے وقت میں اذان دے کر ظہر کی نماز باجماعت پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

(۴) ایسے علاقہ میں اگر عید کی نماز سے پہلے قربانی کرلی تو قربانی درست ہوگی یا نہیں؟ جبکہ عید کی نماز بھی ہوتی ہے۔

المستفتی: عبدالغفار قاسمی، لادھہ کپسیہ، سمستی پور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لئے دو چیزوں میں سے ایک چیز لازم ہوتی ہے۔

(۱) آبادی کی حیثیت یعنی ایسی آبادی ہو جس میں ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود ہو، اسکول، اسپتال، تھانہ اور روزمرہ کے خورد ونوش کی ہر چیز کی دکانیں، بازار نما موجود ہوں اور قصبہ جیسی شکل ہو، اگرچہ مردم شماری کم ہو؛ لیکن آبادی کی حیثیت قصبہ نما ہونے کی وجہ سے وہاں جمعہ جائز ہوجائے گا۔

(۲) آبادی کی مردم شماری اگر چہ بازار نما نہ ہو؛ لیکن وہاں کی مردم شماری تین ہزار سے اوپر ہو،تو ایسی صورت میں وہ گاؤں قصبہ کے حکم میں ہونے کی وجہ سے وہاں بھی جمعہ جائز ہوگا۔اور سوال نامہ میں جس آبادی کا ذکر ہے اس میں دونوں چیزیں نہیں ہیں۔مذکورہ گاؤں مردم شماری کے اعتبار سے قصبہ کے حکم میں نہیں ہے اور حیثیت آبادی بھی بازار جیسی نہیں ہے؛اس لئے وہاں جمعہ جائز نہ ہوگا؛ بلکہ وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہوگا اور دونوں مسجدوں میں باقاعدہ اذان واقامت اور جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنی چاہئے،جب اس گاؤں میں جمعہ درست ہی نہیں ہے تو ظہر کی جو نماز پڑھی جائے گی وہ اصل نماز ہوگی۔اسے احتیاط الظہر نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ اداءِ فرض کہا جائے گا اور جہاں نماز جمعہ جائز نہیں ہے، وہاں پر نماز عید بھی درست نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے گاؤں میں نماز عید سے پہلے قربانی درست ہے۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۴۲/۸)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۱۳۸/۲، زکریا ۶/۳)

وفیما ذکرنا إشارة إلیٰ أنه لا تجوز في الصغیرة التی لیس فیها قاض، ومنبر، وخطیب. کما في المضمرات...... ألا ترى أن في الجواهر: لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر......وکما أن المصر، أو فنائه شرط جواز الجمعة، فهو شرط جواز صلاة العید. (شامي کراچي ۱۳۸/۲، زکریا ۷/۳)

فأما أهل السواد، والقریٰ، والرباطات عندنا یجوز لهم التضحیة بعد طلوع الفجر. (شامي، کتاب الأضحیة، کراچي ۳۱۸/۶، زکریا۹/ ٤٦١)

لاتجوز لأمیر الموسم......ولابعرفات؛ لأنها مفازة، وتؤدی في مصر واحد بمواضع کثیرة علی المذهب وعلیه الفتوی دفعاً للحرج وعلی المرجوح، فالجمعة لمن سبق تحریمة وتفسد بالمعیة، والاشتباه فیصلي بعدها آخر ظهر، وکل ذلک خلاف المذهب، فلایعول علیه کما حرره في البحر الخ

(الدر المختار علی رد المحتار، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، مطلب في جواز استنابة الخطیب، کراچي ۲/ ۱٤٤، زکریا ۳/ ۱٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۶۰۶/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱/۲۴ھ

گاؤں میں نماز جمعہ ہو تو علماء شرکت کریں یا نہ کریں؟

سوال [۳۴۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ ہمارے علاقہ میں لوگ (حنفی) اپنے اپنے کھیتوں میں گھر بنا کر رہتے ہیں، گاؤں یا قصبہ کی شکل میں اجتماعی طور پر آباد نہیں ہیں شرقاً، غرباً اور شمالاً ہر سہ جانب تقریباً ایک سو بیس کلو میٹر کی دوری پر شہر (ضلع) ہے، بجانب جنوب تقریباً ساٹھ کلو میٹر پر شہر ہے، اگرچہ ضلع تو نہیں ہے؛ لیکن مثل ضلع ہے، اس کے قریب کوئی شہر نہیں ہے؛ اس لئے جمعہ اور عیدین کے لئے ان شہروں تک دوری اور وسائل کی کمی کے وجہ سے پہونچ نہیں سکتے اور جہالت کا غلبہ ہے، نماز پنج وقتہ کے پابند تو بہت کم ہیں؛ البتہ جمعہ کا سب اہتمام کرتے ہیں، دور دراز سے چل کر سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، سالہا سال سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ علماء کرام ومفتیان عظام کی رائے اختیار کرنے میں فتنہ ہے؛ اس لئے جہاں جمعہ جاری ہے، جاری ہی رکھا جائے؛ اس لئے جاری ہے کہ اکثر طبقہ جاہل ہے؛ لیکن معدودے دینی اداروں کے فضلاء کرام بھی اس علاقہ میں رہتے ہیں، جو عیدین میں تو سب شریک ہوتے ہیں؛ لیکن جمعہ میں بعض شریک ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے، جو شریک نہیں ہوتے ہیں وہ اپنے گھر بیٹھے رہتے ہیں، ان کے لئے مستقل مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے، عوام ان کو جمعہ نہ پڑھنے والے اور جمعہ سے روکنے والے ایک فرقہ کے روپ میں دیکھتے ہیں اور بدظنی حد سے زیادہ بڑھ رہی ہے، عوام کو ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ یہ تو جمعہ ہی نہیں پڑھتے، خوب تبصرے ہوتے ہیں اور علماء کے طبقہ سے بدظنی دن بدن پھیلتی جارہی ہے، ایسی بگڑی ہوئی صورت حال میں علماء کرام کیا کریں؟

الف: آیا جمعہ وعیدین میں شریک ہوں یا نہ ہوں؟ نیز ایسی جگہوں پر جمعہ وعیدین کی امامت کریں یا نہیں؟

ب: اگر شریک ہوں تو جمعہ کے بعد ظہر کے نام سے چار فرض پڑھیں یا نہیں؟ اگر پڑھیں تو عوام کو اس کی اطلاع دینا ضروری ہے یا نہیں؟ تا کہ بعض لوگ بھی اس پر عمل کر سکیں؟

ج: اگر چار فرض پڑھیں تو جماعت کرنے میں فتنہ ہے، اب تنہا پڑھیں تو اس حدیث پر عمل کیسے ہوگا؟ جس میں چالیس دن تک تکبیر اولی کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے، اکثر دوسرے علاقہ سے تبلیغی جماعتیں آتی رہتی ہیں، وہ لوگ تکبیر اولی کے پابند ہوتے ہیں، ایسے لوگ کیا کریں، اس حدیث پر عمل کیسے کریں؟

د: نیز اس کے متعلق دوسرے علاقہ کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ ایسی جگہوں پر آخر ظہر کی چار رکعت کی ضرورت نہیں ہے اس میں حرج ہے، جمعہ کافی ہو جائے گا، پھر یہ کہ خواص پڑھیں اور عوام نہ پڑھیں، یہ بات بھی رفتہ رفتہ عوام تک پہونچ جائے گی تو ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا کہ علماء کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ ہے، ان کو مقتدیٰ کیسے مانا جائے؟ اس لئے جمعہ ہی پڑھنا کافی ہو جائے گا اور سبھی کو شریک ہونا چاہئے اور جو لوگ شریک نہیں ہوتے ہیں، ان کو بھی ترغیب دلا کر شریک کرنا چاہئے اور ان کا کہنا ہے کہ پر پیچ حالات میں حنفیوں کو امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ دوسرے امام (امام شافعیؒ وغیرہ) کے مسلک پر عمل کی اجازت ہوگی؟ آیا ان علماء کا یہ استدلال درست ہے یا نہیں؟ ازراہ کرم تسلی بخش مفصل، مدلل حوالوں کے ساتھ جواب عنایت فرمادیں، نوازش ہوگی۔ شکریہ

سوال نمبر۲: مذکورہ بالا علاقہ میں ایک مشکل پانی کی بھی ہے، زمین کا پانی کھارا ہے: اس لئے کھانے پینے کے علاوہ ضروریات تو زمین کے پانی سے پوری ہو جاتی ہیں، مگر پینے کے لئے بارش کا پانی حوض میں جمع کیا جاتا ہے اور آئندہ سال بارش ہونے تک اسی کو دوائی کے طور پر بہت ہی محتاط انداز سے پیا جاتا ہے، یہ حوض زمین میں سات آٹھ ہاتھ گہرے ہوتے ہیں او

راتنے ہی اوپر گولائی میں ہوتے ہیں جو دہ در دہ کی مقدار سے کم ہوتے ہیں، یہ حوض آبادی سے دور ہوتے ہیں، اردگرد کی زمین ہموار کردی جاتی ہے،اس کا پانی جمع ہوکر بہہ کر حوض میں بھر جاتا ہےاور ہر آدمی کے ایک ایک دو دو حوض باپ، دادا کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں او رچونکہ بارش کے علاوہ کھیتی وغیرہ ہوتی نہیں ہے؛ اس لئے جہالت کی طرح غربت وافلاس بھی غالب ہے، ہر شخص پرانے حوض کوتوڑ کر نیا حوض بنانے کی وسعت نہیں رکھتا کہ اس کو دہ در دہ بنادیا جائے،اگر دہ در دہ بنایا بھی جائے تو اکثر ناکام ہوجاتا ہےاور کئی مجبوریاں ہیں،زمین نرم ہونے کی وجہ سےاس مقدار مذکورہ سے بڑانہیں بنا سکتے۔

مذکورہ حوض میں سال بھر میں کبھی چڑیا کبھی چوہے مرتے رہتے ہیں اور مجبوری کی وجہ سے تمام لوگ اسی پانی کو پیتے رہتے ہیں، کنویں کا پانی کھارا ہےاور یہ حوض ہر ایک کے ذاتی ہوتے ہیں؛ اس لئے دوسرے کواجازت بھی نہیں دیتے ہیں، پھر گاؤں کے متصل آبادی نہیں ہے؛ اس لئے سرکار کی طرف سے بھی کوئی انتظام نہیں اور نہ امید ہے۔ باوجود مسئلہ بتانے کے سیکڑوں نہیں؛ بلکہ ہزاروں میں شاید ہی کوئی ایک رکتا ہو،عوام وخواص سب ہی کا یہی حال ہے او رخصوصاً موسم گرما میں، یہ علاقہ قابل رحم ہوتا ہے، دست وغیرہ کی شکایت ہوجاتی ہے،اس مسئلہ میں بھی بعض کا کہنا ہے کہ ان مجبوریوں کے پیش نظر حنفیوں کو حدیث قلتین (یعنی امام شافعیؒ کے مسلک پر) عمل کرنے کی اجازت ہوگی؟

الف: جناب والا اس مسئلہ میں بھی پوری رہنمائی فرمائیں کہ حدیث قلتین پر عمل کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد یعقوب، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جاہلوں کی جہالت کی وجہ سے احکام شرع میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہوگی ،علمی طبقہ کے لوگ باقاعدہ اذان دے کر علی الاعلان ظہر کی نماز پڑھا

کریں، اگرکسی نے مصلحت کو پیش نظر رکھ کران کے ساتھ جمعہ پڑھ لیا ہے تو اس پر ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا، ہاں البتہ جس گاؤں کی آبادی تین ہزار تک پہنچ گئی ہے، اس میں شرعاً جمعہ کی نماز جائز ہے، آس پاس میں تین ہزار کی آبادی والے گاؤں تو ضرور ہوں گے، وہاں جاکر آپ لوگ جمعہ کی نماز پڑھ لیا کریں، تو کیا پریشانی ہے؟ شہر ہی میں جانا کیا ضروری ہے؟ اگر آبادی تین ہزرا تک پہنچ گئی ہے، تو وہاں پر جمعہ کی امامت ضرور کیجئے۔

ب: دیہات میں جمعہ وظہر کو جمع کرنا ممنوع ہے؛ کیونکہ جمعہ نفل ہو جائے گا اور نفل کی جماعت ممنوع ہے۔

ج: آپ کو اگر فتنہ واختلاف سے محفوظ ہوکر تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز کی خواہش ہے، تو آپ بڑے گاؤں میں جاکر جمعہ کی نماز پڑھ لیا کریں اور تبلیغی جماعت والے مسافر ہوتے ہیں وہ اگر دو تین مل کر نماز پڑھ لیں گے تو پورا ثواب مل جائے گا، وہ لوگ جمعہ کے دن ایسے چھوٹے دیہات میں قیام نہ کریں، جہاں یہ سب فتنہ ہو، غیر جمعہ کے ایام میں وہاں جایا کریں۔

(۲) دوسرے علماء کا جمعہ کی اجازت دینا شرعاً درست نہیں ہے، جمعہ پڑھنے کے باوجود ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا۔ امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرنے میں تلفیق لازم آتی ہے، جو کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

(۳) اگر مرنے کا صرف گمان ہے، تو محض گمان کی وجہ سے پانی میں کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز اگر آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، پھر بھی مجبوری کی بناء پر ایسا پانی پینے کے لئے دل گوارا کرتا ہے، تو حضرت امام شافعیؒ کے مسلک پر مجبوراً عمل کی گنجائش ہوسکتی ہے، اس طرح عموم بلوی کی وجہ سے عدول عن المذہب کے جواز کے بارے میں ایضاح المسالک ص: ۱۵۵/ کا مطالعہ کرنا مفید ثابت ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۹۹/۳۳)

جمعہ نہ پڑھنے پر گاؤں میں انتشار کا خدشہ ہو تو کیا کریں؟

سوال[۳۴۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں جمعہ کے شرائط نہیں پائے جاتے ہیں، نہ وہاں باضابطہ بازار ہے اور نہ ہی تمام ضروریات زندگی دستیاب ہوتی ہیں۔

نیز اس گاؤں کی آبادی بھی تین ہزار نہیں ہے، یہاں کے لوگ عرصۂ دراز سے جمعہ کی نماز ادا کرتے چلے آرہے ہیں، بریلوی مکتبۂ فکر کے اس گاؤں کے باشندہ قاری صاحب کہتے ہیں کہ گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے گاؤں والوں کو جمعہ کی دو رکعت سے فراغت کے بعد چار رکعت احتیاط الظہر ادا کرنی چاہئے۔ نیز تاتارخانیہ کی درج ذیل عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے:

والاحتياط في القرىٰ، أن يصلي السنة أربعاً، ثم الجمعة، ثم ينوى أربعاً سنة الجمعة، ثم يصلي الظهر، ثم ركعتين سنة الوقت، فهذا هو الصحيح المختار، فلو كان أداء الجمعة صحيحاً، فقد أداها وسنتها، وإن لم تكن الجمعة صحيحة، فقد صلى الظهر، فالأربع سنة، والأربع فريضة، والركعتان بعد هذا سنة. (فتاوى تاتاخانية ٢/ ٥٤، جديد زكريا ديوبند ٢/ ٥٥٥، رقم: ٣٢٧٩)

لیکن فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۵۲۴، البحر الرائق ۲/ ۱۴۳ کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ احتیاط الظہر نہ پڑھی جائے، آنجناب سے استفسار ہے کہ احتیاط الظہر پڑھنے اور نہ پڑھنے کے متعلق فیصلہ کن جواب سے نوازیں۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ پڑھے لکھے حضرات کی ایسی صورت میں کیا ذمہ داری ہے؟ یاد رہے کہ جمعہ کو بند کرنے کے متعلق اگر زوردار انداز سے کہا جائے گا تو خلفشار وانتشار کا قوی اندیشہ ہے۔

المستفتی: محمد یامین، رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ گاؤں میں جمعہ کے شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے جمعہ صحیح نہیں ہے، اگرچہ بند کرانے میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہو اور ان کو صاف صاف مسئلہ بتادیا جائے کہ یہاں پر جمعہ ادا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ظہر کی نماز پڑھنا ضروری ہے اس کے باوجود نہ مانیں تو وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں، دیہات میں جمعہ اور احتیاط الظہر کو جمع کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ لازمی طور پر ظہر کی نماز پڑھی جائے۔ تاتارخانیہ کی عبارت کا مصداق ایسی بڑی بستی ہے، جس میں جمعہ کے شرائط پائے جانے اور نہ پائے جانے میں شک ہو؛ لیکن مذکورہ دیہات میں چونکہ یقینی طور پر جمعہ کے شرائط نہیں پائے جارہے ہیں؛ اس لئے احتیاط الظہر کا مسئلہ وہاں کے لئے نہیں ہے اور بڑی بستی میں بھی احتیاط الظہر کا عوام کو حکم نہیں دیا جائے گا؛ کیونکہ عوام کی ناواقفیت کی بنا پر ان میں انتشار اور فتنہ کا اندیشہ ہے، اسی کو فتاوی محمودیہ قدیم ۵۲۴/۱۶، جدید ڈابھیل ۱۴۷/۸، البحر الرائق، کتاب الصلوۃ، باب الجمعۃ، زکریا دیوبند ۲۵۲/۲، کوئٹہ ۱۴۳/۲ میں بیان کیا گیا ہے، اگر جمعہ بند کرنے میں خلفشار کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں مقتدیٰ اور علماء حضرات کو قطعی طور پر ظہر کی نیت سے چار رکعت ظہر پڑھنا لازم ہے اور اگر وہاں کے لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہونے میں فتنہ کا خطرہ ہے، تو مقتدی بن کر شریک ہوجائیں، امام ہرگز نہ بنیں اور بعد میں اپنی ظہر کی نماز ادا کرنا ان پر لازم ہے۔

وكذا لا يَصِحّ أداء الجمعة إلا في المصر، وتوابعه، فلاتجب على أهل القرىٰ التى ليست من توابع المصر، ولايصح أداء الجمعة فيها. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة،باب الجمعة، زكريا ديوبند ۵۸۳/۱، كراچي ۲۵۹/۱)

لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة،زكريا ۷/۳، كراچي ۱۳۸/۲)

كل موضع وقع الشک في كونه مصراً، ينبغي لهم أن يصلوا بعد الجمعة أربعاً بنية الظهر احتياطاً، حتى أنه لو لم تقع الجمعة موقعها

یخرجون عن عهدة فرض الوقت بأداء الظهر إلی قوله: نعم! إن أدیٰ إلی مفسدة لا تفعل جهاراً والكلام عند عدمها، ولذا قال المقدسي: نحن لا نأمر بذلک أمثال هذه العوام؛ بل ندل علیه الخواص ولو بالنسبة إلیهم.

(شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في نیة آخر ظهر بعد صلوة الجمعة، زکریا ۳/۱۷، کراچي ۲/۱٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۱ھ

شرائط جمعہ مفقود ہونے والی جگہ میں مقتدی حضرات کی ذمہ داری

سوال [۳۴۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا گاؤں جہاں جمعہ کے شرائط بالکل نہیں پائے جاتے ہیں، نہ ہی ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں اور نہ ہی اتنی آبادی ہے کہ وہاں جمعہ قائم کیا جاسکے؛ لیکن پھر بھی بہت سالوں سے جمعہ ہوتا ہے۔ اب اگر جمعہ بند کرایا جائے، تو اختلاف وانتشار اور فتنہ کا اندیشہ ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی حالت میں جمعہ بند کرایا جائے یا بدستور باقی رکھا جائے؟

(۲) ایسی جگہ لوگوں کے اوپر سے جمعہ کی نماز پڑھنے کی وجہ سے ظہر ساقط ہوگی یا نہیں؟ اگر ساقط نہ ہوگی تو گذشتہ زمانہ کی قضا لازم ہوگی یا نہیں؟

(۳) ایسی جگہ علماء اور مقتداء حضرات کو کیا کرنا چاہئے؟ یہ حضرات جمعہ پڑھیں یا ظہر؟ نیز اگر ظہر پڑھتے ہیں تو عوام برا بھلا کہتے ہیں، تو عوام کا برا بھلا کہنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عرفان پینی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر اس جگہ بہت دنوں سے جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، اور اب

جمعہ بند کرانے میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہے، تو فساد کرنے اور الجھنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ لوگوں کو صاف صاف مسئلہ بتادیا جائے کہ یہاں جمعہ کی شرائط نہیں پائی جارہی ہیں، اس کے باوجود اگر لوگ نہیں مانتے ہیں تو وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں؛ لیکن جن کو مسئلہ معلوم ہے ان کے لئے ایسی جگہ جمعہ کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۶۲/۱۶ ۵، جدید ڈابھیل ۱۴۷/۸، کفایت المفتی قدیم ۱۸۷/۳، ۱۸۰، جدید زکریا ۲۳۲/۳، ۲۲۶، زکریا جدید مطول ۱۶۱/۵، آپ کے مسائل اوران کا حل قدیم ۳۹۸/۲، جدید زکریا ۱۱۳/۴)

وكذا لا يصح أداء الجمعة إلا في المصر، وتوابعه، فلاتجب على أهل القرىٰ التي ليست من توابع المصر، ولا يصح أداء الجمعة فيها.

(بدائع الصنائع، كتاب الصلاة،باب الجمعة، زكريا ديوبند ۵۸۳/۱، كراچي ۲۵۹/۱)

(۲) ایسی جگہ جمعہ نماز پڑھنے سے فریضۂ ظہر ذمہ سے ساقط نہ ہوگا؛ بلکہ ظہر کا فریضہ ذمہ میں بدستور باقی رہے گا، اگر ظہر ادا نہ کریں گے، تو گنہگار رہوں گے اور گذشتہ زمانہ کی قضاء بھی لازم ہوگی۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۱۱۴/۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۵۱۵/۱۶، جدید ڈابھیل ۱۴۷/۸، فتاوی دارالعلوم، دیوبند زکریا ۱۳۷/۵)

لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۷/۳، كراچي ۱۳۸/۲)

(۳) ایسی جگہ علماء و مقتدا حضرات کو چاہئے کہ جمعہ کے روز ایسی جگہ جمعہ کی نماز ادا کریں جہاں جمعہ کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں اور اگر اس جگہ رہنا ناگزیر ہو جائے اور جمعہ کی نماز میں شرکت نہ کرنے کی صورت میں ایسے فتنہ کا اندیشہ ہو جس کا وہ تحمل نہ کر سکے، تو مقتدی بن کر جمعہ پڑھ لے؛ لیکن بعد میں ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۶۷۵/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۳ھ

جہاں جمعہ صحیح نہیں وہاں صرف ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے

سوال [۳۴۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جہاں جمعہ کی نماز صحیح نہ ہو، وہاں جمعہ اور ظہر دونوں کی باجماعت نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد حمید، علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہاں جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے، وہاں جمعہ جائز ہی نہیں، صرف ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے دونوں نہ پڑھیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵/۳۸)

عن عليؓ قال: لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولا تشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۱۷۸/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۱۸ھ

دیہات میں نماز جمعہ ادا کرنے سے نماز ظہر ساقط نہیں ہوگی

سوال [۳۴۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی نماز جس جگہ دیہات کی مسجدوں میں پہلے سے ہوتی ہوئی چلی آرہی ہے، وہاں جمعہ کی نماز پڑھ لینے سے ظہر کی نماز ساقط ہوگئی یا پڑھنا پڑے گی؟

المستفتی: عبدالوحید، مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس دیہات میں شرعاً جمعہ جائز نہیں ہے، اس میں جمعہ پڑھنے سے ظہر کا فرض ساقط نہیں ہوگا؛ بلکہ بدستور باقی رہے گا، اگرچہ اس میں جمعہ ہوتا آیا ہو۔

لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض (إلى قوله) لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۷، كراچي ۲/ ۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۰/۲۹ھ

قریۂ صغیرہ میں ظہر کی جگہ جمعہ پڑھنا

سوال [۳۴۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسی جگہ جہاں جمعہ واجب نہیں ہے؛ لیکن ایک عرصۂ دراز سے جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، اگر ان کو منع کیا جائے تو فتنہ کا اندیشہ ہے؛ اس لئے منع نہیں کیا جا سکتا، اب وہ عالم جو وہاں جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے یا اتفاق سے کوئی عالم دیہات میں پہونچ گیا، تو انہوں نے جمعہ کی نماز پڑھادی، تو اس امام پر یا اس عالم پر جو اتفاقاً پہونچ گیا ظہر کی نماز واجب ہے یا جمعہ کی نماز اس کے لئے کافی ہو جائے گی؟ نیز اس دیہات میں رہنے والے عوام کی نماز جمعہ ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: شریف احمد گڈاوی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن دیہاتوں میں جمعہ کی شرائط موجود نہیں ہیں، ان میں جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوتی، وہاں والوں پر ظہر کی نماز فرض ہے، اگر ظہر کی نماز نہیں پڑھیں گے تو

ظہر کا فرض ان کے ذمہ باقی رہ جائے گا اور جو علماء اس گاؤں میں جمعہ کے دن پہونچتے ہیں، ان پر بھی جمعہ فرض نہیں ہے، ان پر ظہر پڑھنا فرض ہے۔

عن الحارث عن علي رضؓ قال: لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع.

(مصنف عبد الرزاق، الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي ۳/۱٦۷، رقم:۵۱۷۵)

لاتجوز في الصغيرة (إلى قوله) لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۷، كراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ / ۳۸۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۲۵ھ

جن دیہاتوں میں پہلے سے جمعہ ہوتا آرہا ہے ان کا حکم

سوال [۳۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جن دیہاتوں میں پہلے سے جمعہ ہوتا آرہا ہے اور آج بھی ان دیہاتوں کی آبادی ۱۰۰۰ / ہزار ۵۰۰ پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے وہاں جو جمعہ پڑھا جارہا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ان پر ظہر کا فرض باقی رہ جاتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الاحد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن دیہاتوں کی آبادی ایک ہزار یا پانچ سو ہے اور وہاں روزمرہ کی ضروری اشیاء فراہم نہیں ہیں، تو ایسے دیہاتوں میں جمعہ جائز نہیں ہے۔ وہاں ظہر کی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ومشروع نہیں ہے، ان لوگوں پر ظہر کا فریضہ باقی رہ جاتا ہے۔

(مستفاد: ایضاح المسائل/۶۵، فتاوی دار العلوم ۵/۳۷)

وفيما ذكرنا إشارة أنه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض،

ومنبر، وخطيب–والظاهر أنه أريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة ألاترىٰ أن في الجواهر: لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨)

وفي القنية: صلاة العيد في القرىٰ تكره تحريماً، ومثله في الجمعة.
(شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين كراچي ٢/١٦٧، زكريا٣/٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۴۹/۴۰)

دیہات میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۳۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیہات میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس دیہات میں دو ہزار سے کم آبادی ہے، باقاعدہ بازار بھی نہیں ہے۔

المستفتی: فضل اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں ہو کہ عورت، مرد، مسلم، غیر مسلم ۳؍ ہزار افراد پر مشتمل ہوں اور وہاں روز مرہ کی ضروریات مہیا ہوں، اس سے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۶۴، فتاوی عثمانی ۱/۵۱۶، محمودیہ میرٹھ ۲۱/۱۲۷، محمودیہ ڈابھیل ۸/۱۲۴، فتاوی دارالعلوم ۵/۳۳)

عن حذيفة رضؓ قال: ليس على أهل القرىٰ جمعة، إنما الجمعة على أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

وشرط أداء الجمعة المصر: أي شرط صحتها أن تؤدى في مصر؛ حتى لا تصح في قرية، ولامفازة. لقول علي رضؓ: لا جمعة، ولا تشريق، ولاصلاة فطر، ولا أضحى، إلا في مصر جامع، أو في مدينة عظيمة.
(البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، کوئٹہ ۲/ ۱٤۰، زکریا، دارالکتاب ۲/٥٤۲)

عن أبي حنيفةؒ، أنه بلدة كبيرة فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۷، زكريا ۳/٥، حلبي كبير، فصل في صلوة الجمعة، مكتبه رحيمية قديم اشرفية ديو بند جديد ٥٥۰، بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، كراچي ۱/ ۲٦۰، زكريا ديوبند ۱/ ٥٨٥، تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، امداديه ملتان ۱/۲۱۷، زكريا ديوبند ۱/٥۲٤، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۲۶/۴۰)

گاؤں میں جمعہ پڑھنا

سوال [۳۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں میں باوجود شرائط نہ پائے جانے کے ایک عرصہ سے جمعہ ہو رہا ہے، بند کرنے میں فتنہ کا خطرہ ہے، اب ایک مسجد اور بن گئی ہے، معلوم یہ کرنا ہے کیا بارش وغیرہ کے موقع پر اس دوسری مسجد میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں؟ اور کیا ان حضرات پر جمعہ پڑھنے کی وجہ سے عید کی نماز بھی واجب ہے؟ اگر بارش ہو جائے تو کیا یہ حضرات عید کی نماز اپنی اپنی مسجدوں میں پڑھ سکتے ہیں؟

المستفتی: عبدالرشید، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حنفیہ کا مفتی بہ قول یہی ہے کہ جس گاؤں میں شرائط جمعہ نہ پائی جائیں، وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قیام درست نہیں اور کسی جگہ عرصہ سے جمعہ ہوتے رہنا اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا؛ لہٰذا صورۃ مسؤلہ میں قدیم وجدید دونوں مسجدوں میں جمعہ کے دن گاؤں والوں پر جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز باجماعت پڑھنا لازم ہے اوران پر عید کی نماز بھی واجب نہیں ہے، بارش ہو یا کوئی اور موسم ہو، ہر حال میں حکم یکساں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶۰/۸)

عن حذیفةؓ، قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاۃ، من قال: لا جمعة، ولاتشریق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

وشرائط أدائها: المصر، أي شرط صحتها: أي تؤدي في مصر؛ حتی لا تصح في قریة، ولامفازة. لقول عليؓ: لا جمعة، ولا تشریق، ولاصلاۃ فطر، ولا أضحی، إلا في مصر جامع، أو في مدینة عظیمة. (البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعة، زکریا ٢/٢٤٥، کوئٹه ٢/١٤٠)

لاتجوز في الصغیرۃ التي لیس فیها قاض، ومنبر وخطیب......ألا تری أن في الجواهر: لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة کراچي ٢/١٣٨، زکریا ٣/٧)

وفي القنیة: صلاۃ العید في القریٰ تکره تحریماً. وفي الشامیة: ومثله في الجمعة. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاۃ، باب العیدین، کراچي ٢/١٦٨، زکریا ٣/٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۷۰۲/۱۱)

چھوٹے گاؤں میں جمعہ کا حکم

سوال [۳۴۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد ہے جو نہ شہر میں ہے اور نہ ہی قصبہ میں ہے، یہ مسجد پنڈ میں ہے، یعنی گاؤں میں پنڈ دھرم کوٹ میں ہے، یہ مسجد پورے پچاس سال ویران رہی اور اب اسے آباد کیا گیا ہے، پہلے کا کچھ پتہ نہیں یہ جامع مسجد تھی یا نہیں؟ مسجد بھی چھوٹی ہے، یہاں سے شہر صرف سات کلومیٹر ہے اور شہر میں بھی جامع مسجد ہے۔ کیا یہاں دھرم کوٹ میں جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہاں جمعہ کے دن جمعہ کی شرائط بھی مکمل نہیں ہیں، صرف تھانہ ہے اور میڈیکل اسٹور ہیں، مسلم کم ہیں، منکر اسلام زیادہ ہیں، جو مسلم ہیں وہ بھی خانہ بدوش ہیں، تو کیا یہاں جمعہ ہوسکتا ہے؟

المستفتی: محمد بشیر الدین قاسمی، کشمیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہاں کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو، چاہے وہ آبادی سارے غیر مسلم کی کیوں نہ ہو، تو وہاں شرعی طور پر جمعہ جائز ہے اور اگر مذکورہ مقام میں مسلم وغیر مسلم کی آبادی بچے، بوڑھے سب ملا کر تین ہزار سے کم ہے، تو وہاں جمعہ جائز نہیں ہے، جمعہ کے جواز کے لئے شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا شرط ہے، چاہے آبادی ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی، اس میں کوئی فرق نہیں ہے اور بڑے گاؤں کی شکل تین ہزار کی آبادی میں ہوجاتی ہے، اس سے کم میں چھوٹا گاؤں اور دیہات مانا جاتا ہے؛ اس لئے وہاں جمعہ جائز نہیں ہوتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۲۰، عزیز الفتاوی ۱/۲۷۸، امداد المفتیین ۳۹۶)

عن حذیفة رضی اللہ عنہ قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشریق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الكبيرة التي فيها أسواق ”إلى قوله“ لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. كما في المضمرات. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۷، بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في شرائط الجمعة، زكريا ديوبند ۱/۵۸۳، كراچي ۱/۲۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۷۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۸ھ

قریۂ صغیرہ میں جمعہ کی نماز کا حکم

سوال [۳۴۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں پکے مکانات بھی نہیں ہیں اور اتنے آدمی بھی نہیں ہیں کہ جتنے آدمی ہونے پر جمعہ جائز ہے، مگر جمعہ ہوتا ہے، تو اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے تحریر فرمائیں کہ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ میں نے منع کیا تو لوگ کہتے ہیں کہ دو چار نمازی آتے ہیں وہ بھی نہیں آئیں گے۔

المستفتی: محمد شہزاد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہاں پر جمعہ کی شرائط موجود نہ ہوں، تو وہاں پر جمعہ کی نماز صحیح نہ ہوگی، وہاں والوں پر ظہر کی نماز ادا کرنا فرض ہے، اگر ظہر چھوڑ کر جمعہ پڑھیں گے تو ان کے اوپر ظہر کا فریضہ باقی رہ جائے گا اور آپ لوگ اس کے مکلّف نہیں ہیں کہ جہاں جمعہ شرعی طور پر صحیح نہیں ہے، وہاں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے شرعی حکم میں تغیر پیدا کریں، شریعت کے حکم کو اسی طرح باقی رکھنا لازم ہے، جس طرح شریعت نے مقرر کر دیا ہے؛ اس لئے وہاں پر مذکورہ مصلحت کی وجہ سے بھی جمعہ قائم کرنا درست نہ ہوگا۔

عن علي رضؓ **قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلاة فطر، ولاأضحى، إلافي مصر جامع، أو مدينة عظيمة.** (المصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لاجمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم:٥٠٩٩)

لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۱۴۸)

گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین کا فرق

سوال [۳۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں نو یا دس گاؤں کے لوگوں نے مل کر کسی ایک گاؤں میں متفق ہو کر نماز جمعہ ادا کرنا مقرر کیا ہے اور ہر گاؤں کے درمیان آدھا کیلومیٹر، ایک کیلومیٹر، ڈیڑھ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے اور جس جگہ جمعہ ہوتا ہے، اس گاؤں میں سو گھر مسلم اور سو گھر غیر مسلموں کے ہیں اور ضروریات میں سے راشن پانی اور ڈاکٹر کے علاوہ کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی ہے، اور یہی بات نماز عید میں بھی ہے، تو اس گاؤں میں نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ مذکورہ گاؤں میں سے کسی بھی گاؤں کی آبادی ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہے، تو ایسی جگہوں پر نماز جمعہ وعیدین پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

اور اگر نماز درست ہے تو پھر ان میں سے کچھ گاؤں کے لوگوں نے اپنے اپنے گاؤں میں الگ سے جمعہ قائم کرلیا ہے، اور وہاں بھی جس گاؤں میں جمعہ قائم کیا ہے، اس گاؤں کی آبادی مسلموں کی ۴۵؍گھر اور غیر مسلموں کی ایک سو بیس گھر ہے اور ضروریات کے سلسلے میں بالا گذشتہ چیزیں ہی موجود ہیں اور اسی طرح عید کی نماز بھی انہوں نے قائم کرلی ہے، تو پھر ان

کے لئے وہاں جمعہ اور عید کی نماز قائم کر لینا درست ہے یا نہیں؟ آپ حضور والا سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ احقر کو پیچیدہ مسئلہ کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبدالصمد، پرتا بگڈھی، عربی دوم متعلم جامعہ ہذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں کی آبادی لگ بھگ تین ہزار سے کم ہے اور وہاں تھانہ، ہسپتال، سرکاری دفاتر اور باقاعدہ بازار وغیرہ میں سے کوئی نہیں ہے، وہاں شرعی طور پر جمعہ قائم کرنا درست نہیں ہے، وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز ادا کرنا فرض ہے؛ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں ہے، وہاں والوں پر ظہر پڑھنا لازم ہے اور دیہات میں عید کی نماز قائم کرنا بھی مشروع نہیں ہے، مگر عید کی نماز اور جمعہ کی نماز میں بہت بڑا فرق ہے کہ دیہات والے ظہر کی نماز نہ پڑھ کر جمعہ کی نماز پڑھیں گے، تو ان کے اوپر ظہر کا فریضہ باقی رہ جاتا ہے اور عید کی نماز پڑھنے کی صورت میں ان کے اوپر کوئی فریضہ باقی نہیں رہتا؛ اس لئے دونوں برابر درجے کے نہیں ہیں۔

يشترط لصحتها سبعة أشياء: الأول: المصر. و في الشامية: عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أو علم غيره، يرجع الناس إليه فيما وقع من الحوادث، وهذا هو الأصح. إلى قوله: لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب، كما في المضمرات ......ألا ترىٰ أن في الجواهر: لو صلوا في القرىٰ، لزمهم أداء الظهر. (درالمختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۵-۷، كراچي ۲/ ۱۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ررجب المرجب ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۱۴۰/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۷/۹ھ

قریۂ صغیرہ میں جمعہ وعیدین کی نماز پڑھنا

سوال [۳۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کل آبادی تقریباً ڈھائی سو گھر ہے؛ لیکن دو محلے ہیں اور بیچ میں ایک نالہ ہے، ہم لوگ نالہ کے ایک طرف ہیں اور نالہ سے اس طرف کی آبادی تقریباً ۸۰/اسّی گھر ہے، جس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۲۵/گھر ہے۔ نیز یہاں مسجد بھی ہے، جس میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت ہوتی ہے اور دونوں محلہ ملا کر تقریباً خاص خاص ساری ضروریات پوری ہوجاتی ہیں، مثلاً کھانے، پینے اور پہننے اوڑھنے اور علاج معالجہ کی ساری ضروریات پوری ہوجاتی ہیں اور قصبہ سے متصل ہے؛ لیکن ڈاکخانہ یہاں سے ایک کلومیٹر دوری پر ہے، آج تک یہاں جمعہ کی نماز نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوتی ہے؛ لیکن عید وبقرعید کی نماز ایک سال سے ہورہی ہے، عید وبقرعید کی نماز پڑھنے کا مقصد گاؤں سے باہر غیر مزروعہ زمین کو انجمن کے تحت داخل کرنا ہے، یہاں مسلمانوں میں آپس میں تنازعہ ہوگیا ہے کہ آیا اس جگہ نماز جمعہ وعید وبقرعید درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: انعام اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں ہو کہ عورت، مرد، مسلم وغیر مسلم کم از کم تین ہزار افراد پر مشتمل ہو؛ لہٰذا مسئولہ صورت میں یہاں عید وبقرعید کی نماز درست نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۰۴/۲، جدید ڈابھیل ۱۳۵/۸، ایضاح المسائل اضافہ شدہ ص: ۶۵)

عن علي رضـ **قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلاة فطر، ولاأضحى، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة.** (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لاجمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٩)

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة–وفي ما ذکرنا إشارة إلی أنه لاتجوز في الصغیرة. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۱۳۸/۲، زکریا ۳/۶-۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شوال المکرم ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۹۲۶/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲ھ

دیہات میں نماز جمعہ قائم کرنے کا حکم

سوال [۳۴۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ جمعہ کی نماز گاؤں میں جائز نہیں اور جہاں قائم ہے وہاں پڑھی جائے، روکی نہ جائے؛ بشرطیکہ بعد میں ظہر کی نماز پڑھی جائے اور بکر کہتا ہے کہ ظہر کی نماز پڑھنے سے جمعہ کی نماز پڑھنے لوگ نہیں آئیں گے اور جمعہ کی اہمیت ختم ہو جائے گی؛ لہٰذا شرعی حکم تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد شارق وعلیم الدین، کشن گنج (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں میں جمعہ پڑھنے کی شرائط موجود ہیں، وہاں کے لوگوں پر جمعہ پڑھنا فرض ہے اور جس گاؤں میں جمعہ کے قیام کی شرائط موجود نہیں ہیں، تو وہاں کے لوگوں کے لئے جمعہ پڑھنا جائز نہیں، ظہر کی نماز ہی جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب اور ضروری ہے اور آپ کے گاؤں میں جمعہ واجب ہے یا نہیں؟ اس وقت تک بتایا نہیں جا سکتا؛ جب تک وہاں کی مردم شماری اور آبادی کی حیثیت کی تفصیل نہ معلوم ہو جائے۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۳۳۹/۲)

عن حذیفة رضي اللہ عنه قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل

الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، و لاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

ويشترط لصحتها سبعة أشياء. الأول: المصر (در مختار) وفي الشامية: عن أبى حنيفةؒ أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ٢/١٣٧، زكريا ٣/٥، حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في صلوة الجمعة، اشرفية ديوبند جديد ٥٤٩-٥٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۵۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۴/۱۳ھ

گاؤں میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں مانی مئو قصبہ سانڈی ضلع ہردوئی یوپی میں قدیم زمانے سے جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، دو جماعتیں ہیں: ایک جمعہ ادا کرتی ہے، دوسری جماعت ظہر ادا کرتی ہے، آج سے تقریباً پندرہ سال قبل سے جمعہ کے بارے میں عدم جواز کا فتوی ملنے پر ایک جماعت ظہر ادا کرتی آئی ہے، اس وقت آبادی بھی کم تھی؛ لیکن اس وقت بارہ سو صرف ووٹر ہیں، گاؤں قصبہ سے متصل ہے، صرف ندی کا فاصلہ ہے، ضروریات کی اکثر چیزیں مل جاتی ہیں، مورنگ سیمنٹ، اشیاء خوردنی وغیرہ بھی مل جاتی ہیں؛ لہٰذا ایسی صورت میں جمعہ ادا کرنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الجلال، سانڈی ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں

ہونا شرط ہے، جوکم سے کم تین ہزار افراد اور تین ہزار مردم شماری پر مشتمل ہو، اس سے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز فرض ہے، اگر ظہر چھوڑ کر جمعہ پڑھیں گے، تو ان پر ظہر کا فریضہ باقی رہ جائے گا۔ مذکورہ سوال سے پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کی آبادی تین ہزار افراد سے کم ہے؛ اس لئے وہاں جمعہ جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ قصبہ سے چند کلومیٹر دور ہی کیوں نہ ہو۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۶۴، ۶۵، کتاب المسائل ۱/۴۲۲، ۴۲۴)

عن أبي عبد الرحمن قال: قال علي رضـ: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/ ٤٦، رقم: ٥٠٩٨)

لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/ ١٣٨)

ومن كان مقيماً بموضع بينه وبين المصر فرجة من المزارع والمراعي نحو القلع ببخاریٰ الاجمعة على أهل ذلك الموضع، وإن كان النداء يبلغهم الخ. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، قديم زكريا ١/ ١٤٥، جديد ١/ ٢٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۷۰۹/۳۵)	۱۴۳۳/۶/۲ھ

قریۂ صغیرہ میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر سے تقریباً تین میل دور ایک مسجد ہے اور مسجد کے محلّہ میں تقریباً سو آدمی ہوں گے؛ لیکن مذکورہ مسجد میں پانچ وقت کی اذان ونماز نہیں ہوتی ہے، صرف جمعہ کی نماز پندرہ یا بیس آدمی با جماعت پڑھتے ہیں، تو کیا مذکورہ مسجد میں نماز جمعہ صحیح ہوگی یا نہیں؟ مع الدلائل وضاحت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔

(۲) صورت مسئلہ یہ ہے مثلاً زید نے بکر کو ایک بیگہ زمین دو ہزار روپیہ کے بدلہ میں دی، اس شرط پر کہ جب میں دو ہزار روپیہ واپس کروں گا، تب میں زمین لے لوں گا اور اس دوران میں بکر اس زمین سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اگر دو سال گذر جائیں، تو بیس روپیہ ٹیکس بکر سے وصول کیا جاتا ہے، تو شریعت کی رو سے مذکورہ مسئلہ کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: جمیل احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ محلّہ شہر سے بالکل الگ ہے، بہت چھوٹا ہے، اور شریعت میں ایسے چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز درست نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے اس گاؤں کے لوگوں پر نماز پنجگانہ وظہر لازم ہے، جمعہ صحیح نہ ہوگا۔

عن حذیفة رضـ قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشریق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ٣/٧، کراچي ٢/١٣٨)

(۲) یہ معاملہ شرعاً رہن ہے اور معاملہ رہن میں شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا مرتہن کے لئے سود اور حرام ہے؛ اس لئے مذکورہ معاملہ ناجائز اور حرام ہے۔

لایحل له أن ینتفع بشيءٍ منه بوجه من الوجوه؛ إن أذن له الراهن؛ لأنه إذنه له في الربا؛ لأنه یستو في دینه کاملاً فتبقی له المنفعة فضلاً الخ. (شامي، کتاب البیوع، فصل في القرض، مطلب کل قرض جر نفعاً فهو ربا، زکریا ٧/٣٩٥، کراچي ٥/١٦٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۱۷۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۱۲ھ

چھوٹے گاؤں میں نماز جمعہ جائز نہیں

سوال [۳۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بستی ہے جس میں مسلمانوں کی تقریباً ۳۵/ گھر کی آبادی ہے، جہاں کے لوگ اسی بستی کے اندر نماز جمعہ ادا کرتے ہیں؛ حالانکہ نماز جمعہ صحیح ہونے کی جو شرطیں ہیں وہ نہیں پائی جارہی ہیں اور تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر دور قصبے میں جامع مسجد ہے؛ لیکن وہاں پر مشکل سے اس بستی کے دس آدمی پہونچ پاتے ہیں اور یہاں پر نماز جمعہ جب ہوتی ہے تو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوجاتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں لوگوں کی رائے سے اس بستی میں نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ہوگا کہ نہیں؟ سبھی لوگوں کے یہاں پر جمعہ کی نماز میں زیادہ دلچسپی لینے کی وجہ سے نماز جمعہ اسی بستی میں قائم کردیا گیا، تو ایسا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ نماز جمعہ صحیح ہوگی یا نہیں؟ یہاں پر پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔

المستفتی: لیاقت علی، بابو ہنومان دکائی دموا، کالری، چنداواڑہ (ایم پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسے چھوٹے گاؤں میں فقہاء احناف کے نزدیک جمعہ کی نماز جائز نہیں ہے، اگرچہ جمعہ کی وجہ سے لوگوں میں نماز کی دلچسپی ہوگئی ہو؛ اس لئے مذکورہ گاؤں میں جمعہ جائز نہ ہوگا۔

عن علي رضـ قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلاة فطر، ولاأضحى، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لاجمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم:٥٠٩٩)

لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض (إلى قوله) ألاترى أن في الجواهر: لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة،

باب الجمعة ، زکریا ۳/۷، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴۰۶/۲۷)

قریۂ صغیرہ میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیہات میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پڑھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ نیز ان کو احتیاطاً ظہر پڑھنا چاہئے؟ اگر پڑھیں تو فرداً فرداً پڑھیں یا جماعت کے ساتھ پڑھیں؟ اگر ظہر پڑھنا ضروری ہے، تو جمعہ پڑھنے سے فائدہ کیا؛ بلکہ ایک ناجائز چیز کو جائز سمجھنے کا گناہ الگ سے ہوگا اور اگر احتیاطاً ہی حکم ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ جائز ہے، پھر ناجائز کہنے کا کیا مطلب؟ دیہات میں جمعہ کے عدم جواز کی صورت میں تمام مفتیان کرام اور علماء کبار کی خاموشی کے کیا معنی؟ جس کی وجہ سے کچھ مفتیان اور علماء بھی اس ناجائز فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ دلائل فقہیہ کے علاوہ احادیث بھی اس سلسلہ میں تحریر فتاوی کے وقت سامنے رکھیں تو مستفتی کو کافی مدد ملے گی۔

المستفتی: عرفان احمد قاسمی گونڈوی، مدرسہ تنویر العلوم دارا پور پرتا بگڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چھوٹے گاؤں اور دیہات میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہے، جو لوگ دیہات میں جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، ان پر شرعاً ظہر کی نماز باقی اور لازم ہے، جمعہ پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور دیہات میں جمعہ کے عدم جواز پر علماء و مفتیان کرام خاموش نہیں رہے ہیں؛ بلکہ اس بارے میں کتابیں اور فتاوی لاتعداد شائع ہو چکے ہیں۔

لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب ...... والظاهر أنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة ألا ترى أن في الجواهر: لوصلوا في القرى لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۷، كراچي ۲/۱۳۸)

عن عليؓ قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامعٍ. (مصنف عبد الرزاق، الجمعة، باب القرىٰ الصغار، المجلس العلمي ۳/۱۶۷، رقم: ۵۱۷۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/۲۴۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۱/۸ھ

گاؤں کے پروا میں جمعہ کی نماز صحیح نہیں

سوال [۳۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بڑا گاؤں جس کی آبادی تقریباً دو ہزار سے زائد ہے اور اس میں مسلمانوں کے صرف تین گھر ہیں، اسی گاؤں کا پروا جس میں مسلمانوں کے ۱۲/۱۳ ؍گھر ہیں اور آبادی غیر قوم کی بھی کم ہے، اس پروا میں مسجد کی بنیاد قریب دس سال پہلے پڑی تھی اور اب تک پنج وقتہ نماز بھی ہوتی رہی، اب پروا کے مسلمانوں نے ہمت کر کے مسجد کو مکمل کر لیا ہے اور کچھ دنوں کے بعد جمعہ کی نماز بھی پڑھنے لگے؛ کیونکہ دو میل سے کم پر قریب میں کوئی مسجد نہیں ہے؛ اس لئے قرب وجوار کے گاؤں والے اور پروا کے لوگ مل کر نماز جمعہ بھی پڑھنے لگے، چند جمعہ پڑھنے کے بعد کسی نے کہہ دیا یہاں نماز جمعہ نہیں ہوگی؛ اس لئے نماز جمعہ بند ہوگئی، نماز جمعہ بند ہونے سے جو نئے نمازی بنے تھے وہ اور وقتوں کی بھی نماز نہیں پڑھتے ہیں نمازی بالکل ختم ہوگئے۔ مذکورہ پروا لب سڑک ہے، جو جی ٹی روڈ سے ملا ہوا ہے اور چاروں طرف سے آنے جانے کے راستے ہیں، ہفتہ میں دو بازار بھی لگتے ہیں اور سرکاری سادھن سیمنٹ، گودام بھی

بنا ہوا ہے، اس میں ہر قسم کی سہولت ہے اور جماعت وغیرہ بھی آیا کرتی ہے، جو اسی مسجد میں قیام کر کے قرب وجوار کے گاؤں میں تبلیغی کام کرتی ہے، ایسی حالت میں مندرجہ بالا پروا کی مسجد میں نماز جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: اسلام الدین، معلم مدرسہ فیض العلوم، بلونت پورسدھولی، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ پروا قریۂ کبیرہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں شہر یا قصبہ کی شرائط پائی جاتی ہیں؛ اس لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پروا میں نماز جمعہ صحیح نہ ہوگی، وہاں کے لوگوں پر جمعہ کے روز ظہر پڑھنا فرض ہے، اگر جمعہ پڑھ لیا جائے تو دوبارہ ظہر بھی پڑھنا لازم ہوگا، ورنہ ان پر ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا۔

عن عليؓ قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، وكان يعد الامصار البصرة، والكوفة، والمدينة، والبحرين، ومصر، والشام، والجزيرة. وربما قال: اليمن، واليمامة. (مصنف عبد الرزاق، الجمعة، باب القرىٰ الصغار، المجلس العلمي ۱۶۸/۳، رقم:۵۱۷۷)

لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. كما في المضمرات (إلى قوله) ألا ترى أن في الجواهر: لوصلوا في القرى لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۷/۳، كراچي ۱۳۸/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۳۶۷)

چھوٹے پوروہ میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک ایسے چھوٹے پوروہ پر ہے، جہاں صرف پانچ چھ گھر مسلم وغیر مسلم آباد ہیں،

مجموعی آبادی قریب پندرہ افراد پر مشتمل ہے، پنجوقتہ نماز میں دوتین فرد کبھی کبھی ہو جاتے ہیں، یہاں تو اذان واقامت اور جماعت کا کوئی اہتمام ونظم نہیں ہے۔

بحمد اللہ پوروہ کے سبھی مسلم افراد مسلک احناف سے وابستہ ہیں بلا کسی تفریق واختلاف کے ہمیشہ ہمیش سے آج تک ظہر کی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، یہاں سے قریب ڈھائی کلومیٹر دوری پر ایک مشہور بازار اتر کی جانب واقع ہے، جس میں ہر طرح کی بے شمار دوکانیں ہیں، زندگی سے لے کر موت تک کے سبھی سامان فراہم وموجود ہیں، غرضیکہ پرائیویٹ وسرکاری اسکول، کالج ودیگر دفاتر، اسپتال، بینک، پوسٹ آفس، بلاک، پنچایت گھر اور تھانہ وغیرہ موجود ہیں، پیدل اور مختلف سواریاں جانے کے لئے بہترین ڈامر روڈ ہے، بازار میں پہونچنے کے لئے ہر طرح کی سہولتیں ہیں، کسی قسم کی کوئی دشواری و پریشانی حائل نہیں، یہاں سے لوگ برابر نماز جمعہ ادا کرنے بازار جایا کرتے ہیں، مگر چند نفوس بغیر کسی تصدیق وفتویٰ کے مسلک احناف کے گلے کو گھونٹ کر فسطائی طاقتوں کے لئے دروازہ کھول کر اسلاف واکابر دیوبند کی توہین کر کے ایسے پوروہ میں نماز جمعہ قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ طریقۂ کار کہاں تک جائز اور درست ہے؟ کتاب وسنت وخلفاء راشدین کے زریں قول وعمل اور مسلک احناف کے فتاوی سے مدلل جواب دیجئے، تاکہ لوگ صحیح مسئلہ پر عمل کر سکیں۔

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی، گوالیار گرنٹ پورہ، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے پوروہ میں جمعہ کا قیام جائز نہیں ہے، اگر ایسے پوروہ میں جمعہ پڑھ لیا جائے گا تو وہ جمعہ نہیں ہوگا، وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز کا فریضہ باقی رہ جائے گا۔

عن حذیفۃ رضی قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٦٤، رقم: ٥١٠٠)

لاتجوز في الصغيرة......لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ .

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹۴۹/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

دس گھروں کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آبادی دس گھروں کی ہے، جس میں رہنے والے مسلم، غیر مسلم چھوٹے بڑے سب ۸۰/ ۸۵ نفر ہیں اور اس کے پورب ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر دوسری آبادی ہے، جس میں ۱۸/ ۲۰ گھر ہوں گے، ایسے ہی ۳/ ۳ فرلانگ کے فاصلہ پر اور گاؤں ہیں، جن کی آبادی ۱۸/ ۲۰ گھروں سے زیادہ نہ ہوگی اور ہر آبادی میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہیں اور ایک آبادی سے دوسری آبادی تک درمیان میں کاشت کی زمین ہے اور کاشت ہوتی ہے۔ زید پہلی آبادی میں جو صرف دس گھروں کی ہے جمعہ کی نماز قائم کر رہا ہے، تو ایسی چھوٹی بستی میں جمعہ کا قائم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ دلائل کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: مولانا نثار احمد، مدرس مدرسہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جن آبادیوں کا ذکر ہے، ان میں سے ہر ایک آبادی شرعی طور پر الگ الگ شمار ہوگی اور زید جس آبادی میں جمعہ قائم کرنا چاہتا ہے، اس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوگی اور اس گاؤں کے لوگوں پر ظہر کی نماز ادا کرنا فرض ہوگا؛ لہٰذا اگر وہاں کے لوگ ظہر کی نماز نہ پڑھ کر جمعہ کی نماز اس گاؤں میں جس پڑھیں گے، تو ان کا جمعہ صحیح نہ ہوگا اور ان پر ظہر کی نماز کا فریضہ باقی رہ جائے گا۔

أما شروط الأداء فستة أيضاً. الشرط الأول: المصر، أو فناؤه، فلاتجوز في القرىٰ عندنا. وهو مذهب علي بن أبي طالبؓ، وحذيفة، وعطاء، والحسن بن أبي الحسن، والنخعي، ومجاهد و ابن سيرين،والثورى، وسحنون الخ (غنية المستملي، باب صلوة الجمعة، جديد اشرفية ديو بند ص:٥٤٩، قديم ٥١٠)

ومن لاتجب عليهم الجمعة من أهل القرىٰ والبوادي لهم أن يصلوا الظهر بجماعة يوم الجمعة بأذان وإقامة الخ. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم ١٤٥/١، جديد ٢٠٥/١، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٢٤٥/١، قديم ١٦٥/١)

لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٧/٣، كراچي ١٣٨/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۴/۵ھ

چالیس مکان کی آبادی والے گاؤں میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس گاؤں میں چالیس مکان، چھوٹی تین دو کانیں اور ایک مسجد ہو، اس میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو پھر جمعہ کی ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا، جو اس مسجد میں تقریباً ۴۰ سال سے پڑھی گئی ہیں؟ گاؤں کی مردم شماری تقریباً ۵۰۰ سو ہے۔

المستفتی: عبداللہ عبادہ، سیتامڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں میں صرف چالیس مکان ہیں اور اس میں

بسنے والے لوگوں کی مردم شماری چند سو افراد پر مشتمل ہے وہ بہت چھوٹا دیہات ہے، اس میں نماز جمعہ جائز نہیں ہے، جو لوگ اس میں نماز جمعہ پڑھیں گے ان کے اوپر ظہر کا فرض باقی رہے گا، وہاں پر اگر جمعہ کی نماز پڑھی گئی ہے تو پڑھنے والوں پر ظہر کی نماز کا اعادہ لازم ہے۔
(مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰، امداد الفتاوی ۱/ ۶۱۸، ۶۲۰، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۸/ ۱۴۷، ۱۴۸)

عن إبراهيمؒ قال: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامعٍ. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة . من قال: لاجمعة، ولا تشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/ ٤٧، رقم: ٥١٠٥)

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٣٨، زكريا ٣/ ٦)

صرح به في التحفة: عن أبي حنيفةؒ أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ الخ. (شامي، كراچي ٢/ ١٣٧، زكريا ٣/ ٥)

لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/ ٧، كراچي ٢/ ١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ر صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۹۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/ ۲/ ۱۴۳۴ھ

دوسو کی آبادی پر مشتمل گاؤں میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں جو دو محلّہ پر مشتمل ہے، جس میں ایک جامع مسجد ہے اور ایک پنجوقتہ مسجد ہے جامع مسجد کی تعمیر کو سو سال ہو گئے ہیں اور پنجوقتہ مسجد کی تعمیر کو بیس سال ہوئے؛ لیکن آپسی تفرقہ بازی کی وجہ سے ایک محلّہ کے نمازی چھوٹی مسجد یعنی پنجوقتہ مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں اور دوسرے محلّہ کے نمازی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں؛ جبکہ پنجوقتہ مسجد میں

نمازیوں کی تعداد چالیس پینتالیس ہے اور جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد پینتیس ہے؛ حالانکہ تفرقہ بازی سے قبل نماز جمعہ میں نمازیوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہونچ جاتی تھی، اب مسئلہ درپیش یہ ہے کہ آیا پنجوقتہ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: اس گاؤں کی کل آبادی ۲۰۰/افراد پر مشتمل ہے، تو اس گاؤں کی دونوں مسجدوں میں یا ایک میں نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟ جبکہ جامع مسجد میں عرصۂ دراز سے نماز جمعہ ہوتی چلی آرہی ہے۔

المستفتی: مولانا عبدالودود قاسمی، ساکن: گڑھی، پورنیہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ گاؤں میں چونکہ صرف دوسو کی آبادی ہے، جو شرعاً قریۂ صغیرہ میں داخل ہے؛ اس لئے وہاں جمعہ کی نماز مسلک حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے؛ بلکہ ایسی جگہ ظہر کی نماز واجب ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۳۵/۵، امداد الفتاوی قدیم ۲۷۰/۱، جدید زکریا ۶۱۸/۱، فتاوی دارالعلوم مع امداد المفتیین ۲۷۸/۲) لابن

عن حذیفة رضـ قال: ليس على أهل القرية جمعة، إنما الجمعة على أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٥، رقم: ٥١٠٠)

ثم ظاهر رواية أصحابنا لاتجب إلا على من يسكن المصر، أومايتصل به، فلاتجب على أهل السواد ولو قريباً، وهذا أصح ما قيل فيه، وبه جزم في التجنيس. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة، زكريا ٣/٢٧، كراچي ٢/١٥٣، هداية، كتاب الصلاة، باب الجمعة، اشرفي ديوبند ١/١٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۲۱۶/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۸/۳/۷ھ

چار سو کی آبادی میں جمعہ

سوال [۳۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: موضع مڑھیاقصبہ پہانی ضلع ہردوئی میں نماز جمعہ کا قیام کم وبیش سترہ سال پہلے عمل میں آیا تھا اوراب تک باقی ہے؛ جبکہ گاؤں کی آبادی کم وبیش چار سو (۴۰۰) افراد پر مشتمل ہے، تو کیا ایسی صورت میں نماز جمعہ درست ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو ہم مصلیاں جمعہ کو سمجھائیں تو کس انداز سے سمجھائیں؟ اس کا جواب مدلل ومفصل تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد اسلم پہانی، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں میں ہندو مسلم، بچے، بوڑھے، مردوعورت کل مردم شماری چار سو افراد پر مشتمل ہے وہ چھوٹا گاؤں اور دیہات ہے، اس میں شہر کی طرح گلی کوچے بھی نہیں ہیں، بازار، ہسپتال، تھانہ وغیرہ بھی نہیں ہیں، تو ایسے دیہات میں جمعہ جائز نہیں ہے، وہاں کے لوگوں کو جو بھی حکمت عملی مناسب ہو اس سے سمجھایا جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۸-۶۲۰، بہشتی زیور ۱۱/۸۰)

عن حذيفة رضـ قال: ليس على أهل القرىٰ جمعة، إنما الجمعة على أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٦، رقم: ٥١٠٠)

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. صرح به في التحفة: عن أبي حنيفة رحـ أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ الخ . (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٨، زكريا ٣/٥-٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۰۹۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۳ھ

پانچ سو کی آبادی میں نماز جمعہ قائم رکھیں یا بند کر دیں؟

سوال[۳۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں جس میں سالہا سال سے جمعہ ہوتا رہا ہے، جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں کی کل آبادی پانچ سو مسلم غیر مسلم سب کو ملا کر ہے، جن میں سے دو سو پچاس مرد بالغ ہیں اور اس گاؤں میں نہ تو بازار ہے، نہ کوئی بڑی دوکان؛ بلکہ چھوٹی موٹی دو چار دکانیں ہیں اور نہ وہاں کوئی شفا خانہ ہے، نہ ڈاکخانہ اور نہ پنچایت؛ بلکہ وہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور ہے، آنے جانے کے لئے سرکاری گاڑیوں کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے، تو اس گاؤں میں جمعہ باقی رکھا جائے یا بند کر دیا جائے؟

المستفتی: محمد یوسف، گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت حال میں مذکورہ دیہات میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، ان کے اوپر ظہر کی فرض نماز پڑھنا لازم ہے، ورنہ ظہر کی نماز ان کے ذمہ باقی رہ جائے گی۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/۶۳۵، فتاوی عثمانی ۱/۵۰۹)

يشترط لصحتها سبعة أشياء. الأول: المصر...... وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير، وقاض، يقدر على إقامة الحدود. وتحته في الشامية: عن أبي حنيفةؒ أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أو علم غيره، يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا هو الأصح. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۵، كراچي ۲/۱۳۷، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۲/۲٤٦، كوئٹه۲/۱٤۱)

وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب، كما في المضمرات. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹۵/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۱۱/۱۴۳۴ھ

چھ سو افراد پر مشتمل آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۴۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلمانوں کی ایک بستی ہے، جس میں چالیس سال قبل سے نماز پنجوقتہ و جمعہ ادا کی جاتی ہے؛ لیکن مسجد کچی اور لوگوں کے لئے ناکافی ہے اور امام متعین نہ ہونے کی وجہ سے جمعہ بند ہے، اب الحمدللہ مسجد کی آبادی کے اعتبار سے توسیع ہوچکی ہے، نماز پنجوقتہ تو اول سے ہی ہورہی ہے، روزافزوں افراد کی زیادتی ہوتی جارہی ہے۔ فی الوقت اس بستی کی آبادی پانچ سو سے چھ سو تک ہے، بڑے قصبہ میں یہ بستی شمار ہوتی ہے؛ چونکہ اس بستی میں پرچون کی دوکان، کپڑے کی دوکان، آٹا چکی مشین، تیل نکالنے کی مشین، دیگر ضروریات کی اشیاء بسہولت بر وقت دستیاب ہوتی ہیں، امام بھی اب متعین ہے، گاؤں کے لوگوں کا اصرار اور خواہش ہے کہ اب جمعہ قائم ہو۔ نیز نماز جمعہ قائم کرنے میں کسی قسم کا خلفشار کا امکان قطعی نہیں ہے، اس بستی میں تجارت پیشہ، کاشتکار، نوکری پیشہ، رکشہ چلانے والے لوگ بھی بستے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس بستی میں جمعہ قائم کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ امید کہ تفصیل وتشریح کے ساتھ جواب سے نوازا جائے گا، اس فتوی کے سارے گاؤں کے لوگ منتظر ہیں۔

المستفتی: شیخ سلطان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ بستی صرف پانچ یا

چھ سوافراد پر مشتمل آبادی ہے، شرعاً جس آبادی کی مردم شماری اتنی کم ہو اور اس میں باقاعدہ گلی کوچے اور بازار نہ ہو اور نہ ہی سرکاری عملہ کے دفاتر ہوں اور نہ ہی تھانہ، ہسپتال، ڈاکخانہ وغیرہ ہوں، وہاں جمعہ جائز نہیں؛ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ جائز نہ ہوگا، اگر جمعہ پڑھ لیا جائے تو ان پر ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا؛ اس لئے وہاں پر ہرگز جمعہ قائم نہ کریں۔ نیز ایسی آبادی کو قصبہ نہیں کہا جاتا؛ بلکہ وہ دیہات اور گاؤں ہی ہے۔

عن أبي عبد الرحمنؓ قال: قال عليؓ: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامعٍ. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة. من قال: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٨)

ولا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، وخطيب ومنبر (وقوله لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۴۶)

ایک ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً ایک ہزار ہے اور کچھ پرچون کی دوکانیں ہیں، جہاں پرانی ایک مسجد ہے، جس میں پچاس ساٹھ سال پہلے سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے، اب لوگوں میں کچھ اختلاف ہو گیا ہے، بعض لوگوں نے اس پرانی مسجد کے تھوڑے سے فاصلہ پر ایک نئی مسجد بنائی ہے، اب اس نئی مسجد میں جمعہ شروع کرنا چاہتے ہیں، تو کیا اس نئی مسجد میں جمعہ قائم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور پرانی مسجد میں جو جمعہ پڑھا جا رہا ہے، اس میں پڑھنا

درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: نوید الحسن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک ہزار کی آبادی جس گاؤں میں ہو وہ بہت چھوٹا اور دیہات کے حکم میں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس میں جمعہ جائز نہیں ہوگا، وہاں والوں پر ظہر کی نماز پڑھنا واجب اور فرض ہے، چند پرچون کی دوکانوں سے شہر اور قصبہ کی حیثیت نہیں ہوسکتی، نہ پرانی مسجد میں جمعہ جائز ہوگا اور نہ ہی نئی مسجد میں؛ بلکہ دونوں جگہ اذان واقامت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے۔

عن علي رضی اللہ عنہ قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلاة فطر، ولاأضحىٰ، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة. من قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت٤/٤٦، رقم:٥٠٩٩)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) وفيما ذكرنا إشارة إلىٰ أنها لا تجوز في الصغيرة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٨، زكريا ٣/٦-٧)

ومن لاتجب عليهم الجمعة، من أهل القرىٰ والبوادي لهم أن يصلوا الظهر بجماعة يوم الجمعة، بأذان، وإقامة الخ. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم١/١٤٥، جديد ١/٢٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف۳۸؍۸۸۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۷/۵ھ

ایک ہزار کی آبادی میں نمازِ جمعہ، نیز امام کی امامت اور مسجد میں تالا لگانا

سوال [۳۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ ایک گاؤں کی کل آبادی تقریباً ۸۰؍ گھر کی ہے، اس گاؤں میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں زید تقریباً پچیس سال سے جمعہ اور وقتیہ نمازوں کی امامت کرتا ہے، زید حافظ قرآن قاری ہے اور مسائل نماز اچھی طرح جانتا ہے باشرع ہے، زید کی لڑکی دوسال سے سرکاری نوکری کر رہی ہے، کچھ دنوں سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ اب زید کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، تو اس مسئلہ کی کیا حقیقت ہے بتائیں؟ یہ بات بکر اور ان کے بھائیوں نے پیدا کی ہے؛ چونکہ مسجد بکر کی زمین پر ہے اور یہ لوگ اپنا حق جتاتے ہیں، تو مسجد میں حق جتانا کیسا ہے؟

اسی وجہ سے بکر اور ان کے بھائیوں نے مل کر مسجد میں تالا لگا دیا اور چابی اپنی بیوی کے حوالہ کر کے گاؤں سے باہر نکل گئے، اپنی بیویوں سے یہ کہا کہ اگر زید اور ان کے بھائی لوگ جمعہ کی نماز کے لئے آئیں تو تم سب مل کر گالی گلوچ کرنا اور حملہ کرنا، جب زید اور ان کے بھائی اور دوسرے مقتدی حضرات جمع ہوئے تو دیکھا کہ مسجد میں تالا لگا ہوا ہے، تالا توڑنا چاہ رہے تھے؛ لیکن زید نے منع کر دیا اور جمعہ کی نماز باہر صحن میں ادا کی گئی، جب جمعہ کی نماز پڑھ کر سب چلے گئے تو بکر کی بیوی نے آکر تالا کھولا، اگر زید تالا کھولنے کے لئے کہتا تو بات آگے بڑھتی، بکر اور ان کے بھائی مل کر یہ کہہ کر کیس کرتے کہ ہم لوگ گھر میں موجود نہیں تھے ہماری عورتوں پر حملہ کرنے آیا تھا۔ اب معاملہ ذاتی دشمنی کا رخ اختیار کر چکا ہے، اب کیا کیا جائے؟ اسی بنا پر زید اور اس کے بھائی اور دیگر لوگ مل کر دوسری مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، درمیان میں کتنا فاصلہ ہو اس کے لئے کیا شرائط ہیں؟

المستفتی: منظر عالم، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں تین مسئلے سامنے آئے ہیں۔

(۱) جس گاؤں کی آبادی ۸۰؍ گھروں پر مشتمل ہو اور مردم شماری کی تعداد ایک ہزار ہو، وہاں جمعہ درست نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱؍۶۲۰ تا ۶۷۰، بہشتی زیور جزء ۱۱؍۸۰)

ہاں البتہ پنج وقتہ نماز ہر مسلمان پر لازم ہے اور جمعہ کے دن ایسے چھوٹے دیہاتوں کے رہنے

والوں پر جمعہ کی نماز فرض نہیں ہے۔

عن إبراهيم قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة. من قال: لا جمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤ /٤٧، رقم: ٥٠٩٩)

عن أبي حنيفةؒ: أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أوعلم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا هو الأصح. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٧، زكريا٣/٦)

(۲) امام صاحب نے جب اپنی لڑکی کو بے پردگی کے ساتھ ملازمت کی ترغیب نہ دی ہو اور وہ اس کے عمل سے خوش بھی نہ ہوں، تب ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے؛ لیکن اگر خود امام صاحب نے بیٹی کو اس کی ترغیب دی ہو اور وہ بے پردگی کے ساتھ اس کے ملازمت کرنے پر راضی بھی ہوں، تو پھر ان کی امامت مکروہ ہے، بشرطیکہ اس سے بہتر کوئی شخص امامت کے لئے موجود ہو۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۶/ ۲۴۶، کفایت المفتی قدیم ۳/ ۸۰، جدید زکریا ۳/ ۱۲۱، جدید زکریا مطول ۴/ ۲۰۵)

وفي الترمذي عن الحسن قال: سمعت أنس بن مالكؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم؛ ثلاثة رجل أم قوما وهم له كارهون، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، أو رجل سمع حي على الفلاح، ثم لم يجب. (ترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء من أم قوماً هم له كارهون، النسخة الهندية ١/٨٣، دارالسلام رقم: ٣٥٨)

وفي الدر المختار: ويكره إمامة...... فاسق. وقال العلامة ابن عابدين تحته: وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه، بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعاً، ولايخفىٰ أنه إذا كان

أعلم من غيره لاتزول العلة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، قبيل مطلب: البدعة خمسة اقسام، زكريا ۲/ ۲۹۹، كراچي ۱/ ۵۶۰)

(۳) امام صاحب سے ناراضگی کی بناپر مسجد میں تالا لگانا ناجائز عمل ہے؛ اس لئے کہ مسجد میں صرف امام صاحب نماز نہیں پڑھیں گے، آنے والے تمام نمازیوں کونماز پڑھنا ہے، اگر امام صاحب میں شرعی قباحت ہواوروہ اس سے باز نہ آئیں، تو دوسرا امام رکھ لیں، مسجد میں تالا نہ لگائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا. [البقرة: ۱۱٤] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۸۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۱/۱۴۳۱ھ

تیرہ سو افراد کی آبادی والے گاؤں میں نماز جمعہ پڑھنا جائز نہیں

سوال [۳۴۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے موضع ملک سادات میں ایک سو چالیس سال پرانی پختہ مسجد ہے، کافی عرصہ تک مسجد میں نماز جمعہ ادا ہوتی رہی، تقریباً ۲۴؍سال کا عرصہ ہوا، گاؤں میں ایک تبلیغی جماعت آکر قیام پذیر ہوئی، انہوں نے کہا کہ یہاں نماز جمعہ جائز نہیں ہے، اسی روز سے نماز جمعہ بند ہے، اس وقت گاؤں میں کوئی پینٹھ وغیرہ نہیں لگتی تھی، موضع ہذا کی کل آبادی ۱۳۱۰؍ اور مسلم آبادی تقریباً چھ سو افراد پر مشتمل ہے، ہفتہ میں دو دن منگل اور جمعرات کو پینٹھ بھی لگتی ہے، جس میں اکثر بیرونی دوکاندار آتے ہیں، مسجد میں تقریباً ایک سو ستر نمازی نماز پڑھ سکتے ہیں، گاؤں میں کئی مقامی دوکانیں بھی ہیں، گاؤں سے چار کلومیٹر دور قصبہ جھالو ہے، آمد ورفت کے لئے گھوڑا بوگی ملتی ہے، ایک مدرسہ بھی قائم ہونے جارہا ہے، جس کا قیام ہو چکا ہے صرف

رجسٹریشن باقی ہے، ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے احادیث وقرآن پاک کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں کہ اس گاؤں میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے، تو کن شرائط کے ساتھ ہے؟

المستفتی: ریاست حسین، ملک سادات، ملک گنگوڑا، پوسٹ: بیہل پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس دیہات کی آبادی صرف بارہ تیرہ سوافراد پر مشتمل ہے، وہ چھوٹا گاؤں ہے، اس میں جمعہ کا قیام حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، وہاں والوں پر ظہر کی نماز فرض ہے؛ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں قیام جمعہ مشروع نہ ہوگا۔

عن حذیفةؓ، قال: لیس علیٰ أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشریق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/٦، رقم: ٥١٠٠)

ولا یجوز في الصغیرة التي لیس فیها قاض، ومنبر، وخطیب (إلی قوله) لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۷، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۲۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۲۹ھ

تقریباً پندرہ سو کی آبادی میں نماز جمعہ کا قیام

سوال [۳۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں جس کی آبادی پندرہ سو ہے تقریباً، گاؤں میں پردھان ممبر کوٹا، نیز ضروریات کے ہر سامان مل جاتے ہیں، اس میں آج سے ۳۰ یا ۳۵؍ سال پہلے سے لوگ جمعہ پڑھتے آرہے ہیں، تو کیا ایسی جگہ جمعہ پڑھ لینے سے نماز ظہر ساقط ہوجائے گی یا نہیں؟

اگرنہیں تو کیا جمعہ پڑھنے سے روک دیا جائے؟ اگر نہ روکیں تو پھر ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا؟ مدلل جواب با حوالہ چاہئے۔

المستفتی: عبدالمجید، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس آبادی میں صرف پندرہ سو کی مردم شماری ہے، وہاں نہ بازار ہے، نہ تھانہ ہے، نہ سرکاری دفاتر ہیں، تو ایسی آبادی میں شرعاً جمعہ جائز نہیں، اگر وہاں کے لوگ اس جگہ جمعہ پڑھتے رہیں گے، تو ان کے اوپر اتنے دنوں کی ظہر کی نماز کی ذمہ داری باقی رہ جائے گی جتنے دن وہاں پر جمعہ کی نماز پڑھیں گے، اگر پہلے سے وہاں جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، تو فتنہ سے بچتے ہوئے جمعہ ختم کرنے کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان ماحول بنانے کی ضرورت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵۱۶/۱۶، جدید ڈابھیل ۱۷۰/۸، امدادالاحکام ۳۳۸/۲، فتاوی دارالعلوم ۳۸/۵، عزیز الفتاوی ۲۷۹/۱، ایضاح المسائل ۶۵)

عن حذیفة ؓ قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، و لاتشریق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

لاتجوز في الصغیرة –إلی– لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ.

(شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۷، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۶۲۴/۳۵)	۱۴۲۱/۴/۲۹ھ

پندرہ سو کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی پندرہ سو کی ہے اور وہاں پر اس طرح کا

کوئی بازار بھی نہیں ہے، جہاں روزمرہ کی ضروریاتی سامان فراہم ہوجائیں، دوایک پرچون اورکپڑے کی دوکانیں ہیں۔ نیز ڈاکخانہ بھی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں وہاں پر جمعہ کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ واضح رہے کہ وہاں پر ۲۵ر۳۰ رسال سے جمعہ کی نماز پڑھی جارہی ہے، اگر جمعہ کی نماز پڑھنے سے روکا جائے تو مسلمانوں کے درمیان انتشار اور افتراق پیدا ہوجائے گا، ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد سعید ہردوئی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس آبادی میں صرف پندرہ سوکی مردم شماری ہے، وہاں نہ بازار ہے، نہ تھانہ ہے، نہ سرکاری دفاتر ہیں، تو ایسی آبادی میں شرعاً جمعہ جائز نہیں ہے، اگر وہاں کے لوگ ایسی جگہ جمعہ پڑھتے رہیں گے، تو ان کے اوپر اتنے دنوں کے ظہر کی نماز ان کے ذمہ میں باقی رہ جائے گی، جتنے دن وہاں پر جمعہ کی نماز پڑھیں گے، اگر پہلے سے وہاں جمعہ ہوتا آرہا ہے، تو فتنہ سے بچتے ہوئے جمعہ ختم کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کے درمیان ماحول بنانے کی ضرورت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۶/۵۱۶، جدید ڈابھیل ۸/۱۷۹، امداد الاحکام ۲/۳۳۸، فتاوی دارالعلوم ۵/۳۸، عزیز الفتاوی ۱/۲۷۹، ایضاح المسائل ص: ۱/۶۵)

عن أبي عبد الرحمنؒ قال: قال عليؓ : لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة. من قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٨)

لاتجوز في الصغيرة –إلى– لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۶۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۴/۱۴۲۱ھ

ڈیڑھ ہزار کی آبادی میں جمعہ اور جامع مسجد کا اطلاق

سوال [۳۴۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جامع مسجد کا اطلاق شریعت میں کس مسجد پر ہوتا ہے؟ کیا جامع مسجد ہر اس مسجد کو کہا جاتا ہے جس میں نماز جمعہ ہوتی ہو یا جو گاؤں میں بڑی مسجد ہو، اس پر بھی جامع مسجد کا اطلاق ہوگا، مثلاً ایک گاؤں ہے، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کی آبادی ہے، جس میں دو مسجدیں ہیں، ایک بڑی، ایک چھوٹی، دونوں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ کیا دونوں کو جامع مسجد کہا جائے گا یا ان میں جو بڑی ہو اس کو جامع مسجد کہا جائے گا؟

المستفتی: عبدالناصر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں میں صرف ڈیڑھ ہزار کی آبادی ہے اور اس میں مصر اور شہر کے آثار یعنی بازار وغیرہ بھی نہیں ہے، تو ایسے چھوٹے گاؤں میں جمعہ ہی جائز نہیں؛ لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک کو بھی جامع مسجد نہیں کہا جا سکتا۔

عن عليؓ قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلاة فطر، ولا أضحى، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لاجمعة، ولاتشريق إلافي مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٩)

لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب (وقوله) لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٧، كراچي ٢/١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍۶۲۳۵۷)

ڈیڑھ ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ کی نماز

سوال [۳۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس گاؤں اور قریۂ صغیرہ کی آبادی تقریباً ہندو مسلم کو شامل کر کے ڈیڑھ ہزار زیادہ سے زیادہ ہو، ایسے گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی محتاط شخص اپنے گاؤں کو چھوڑ کر کسی شہر یا بڑے گاؤں جس کی آبادی چار ہزار سے بھی زائد ہو، وہاں جا کر جمعہ پڑھتا ہے، تو ایسے شخص کو لعن وطعن کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

نوٹ: جس گاؤں اور دیہات کے متعلق مسئلہ دریافت کیا جارہا ہے، اس گاؤں میں کوئی بھی ایک دوکان ایسی نہیں ہے جہاں ضروری تمام اشیاء ملتی ہوں؛ لیکن واضح ہو کہ وہ بازار بھی دوسرے گاؤں کے نام سے موسوم ہے؛ لہٰذا براہ کرام حنفی المسلک کے مطابق جواب بالدلائل وبالتفصیل تحریر فرما کر عند اللہ ماجور اور عند الناس مقبول ہوں۔

المستفتی: ابوالحسن، متوطن باچپٹی، سیتامڑھی (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حنفیہ کے نزدیک ایسے چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز درست نہیں ہوتی، وہاں والوں پر ظہر کی نماز پڑھنا فرض ہے، اگر جمعہ پڑھ کر ظہر نہ لوٹاویں، تو ان پر ظہر کا فرض باقی رہ جائے گا؛ اس لئے اگر جمعہ کے دن وہاں رہ کر جمعہ کی نماز نہ پڑھنے میں فتنہ کا خطرہ ہے، تو وہاں سے دوسری جگہ چلے جانا چاہئے اور اگر دوسری جگہ جانے میں بھی لعن وطعن کیا جائے، تو اس کا کوئی اثر نہیں لینا چاہئے، ملعون تو وہی ہے جو اللہ تعالی کے یہاں ملعون ہوگا، کسی کے لعنت کرنے سے کوئی ملعون نہیں ہوتا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۱۹/۲، جدید ڈابھیل ۱۰۵/۸)

سوال نامہ میں مذکورہ گاؤں کی جو ہیئت وآبادی بتلائی گئی ہے، اس سے اس گاؤں میں جمعہ کی

نماز امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہرگز درست نہیں ہے، جمعہ پڑھیں گے تو ظہر کا فرض سب پر باقی رہ جائے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۷/۲۱۲، ۳۱۰۲ جدید ڈابھیل ۸/۱۴۹، ۹۷)

عن حذيفة رضـ قال: ليس على أهل القرىٰ جمعة، إنما الجمعة على أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥١٠٠)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق (إلى قوله) وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض (إلى قوله) والظاهر: أنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، ألاترىٰ أن في الجواهر: لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٨، زكريا ٣/٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ررمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۴۱۷)

اٹھارہ سو کی آبادی پر مشتمل قصبہ میں نماز جمعہ

سوال [۳۴۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع محمود پور کامل عرف نوادہ، جس کی آبادی تقریباً اٹھارہ سو افراد پر مشتمل ہے، موضع ہذا میں تین چھوٹی دوکانیں ہیں، جن میں ضروریات زندگی کی کل چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں اور تین دوکانیں ڈاکٹروں کی ہیں اور موضع ہذا میں دو اسلامی مکتب اور ایک پرائمری اسکول بھی ہے، پانچ سال سے جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، اس کو قائم رکھا جائے یا نہیں؟ صحیح جواب سے مستفید فرمادیجئے۔ بینوا توجروا.

المستفتی: حافظ اصغر علی، موضع محمود پور کامل عرف نوادہ، پرگنہ نہٹور، دھام پور، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ گاؤں قصبہ نما قصبہ نہیں ہے اور نہ وہاں بازار ہے، جس میں روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں مل سکتی ہوں تو وہ قریۂ صغیرہ ہے، وہاں حنفیہ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہوگا، ظہر پڑھنا فرض ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۹)

عن أبي عبد الرحمن السلمیؓ، عن عليؓ قال: لاتشریق، ولاجمعة، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة. من قال: لاجمعة، ولاتشریق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/٤٧، رقم: ٥١٠٦)

لاتجوز في الصغیرة التي لیس فیها قاض. (إلی قوله) لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۷، کوئٹه ۱/۵۹۰)

البتہ اگر دیکھنے میں قصبہ نما ہے اور وہاں بازار اور روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں، تو وہ شہر کے حکم میں ہے، وہاں جمعہ جائز ہوگا۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق الخ. (شامي، زکریا ۳/۷، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/۸۴۳)

دو ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وہ گاؤں جس کی آبادی دو ہزار پر مشتمل ہے، اس میں جمعہ قائم کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کریں تو کن شرطوں پر؟ نہ کریں تو ظہر کے چار فرض پڑھیں یا نہ پڑھیں؟ اگر پڑھیں

تو جماعت سے پڑھیں یا بغیر جماعت کے؟ اگر جماعت کریں تو اسی مصلیٰ پر جس پر دوفرض پڑھے تھے یا الگ ہٹ کر۔ اس گاؤں میں دوکانیں بازار، ڈاکخانہ وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے؟ ضروریات زندگی کی اشیاء کو دوسری جگہ سے لانا ہوتا ہے۔

المستفتی: محمد مرتضی حسن، پھول پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چونکہ آپ کے گاؤں میں ضروریات زندگی کے لئے روز مرہ کی اشیاء یا ڈاکخانہ، تھانہ وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے اور آبادی بھی ہندو مسلم، بوڑھے، بچے سب ڈھائی تین ہزار بھی نہیں ہیں؛ اس لئے آپ کے گاؤں میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہے، وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے اور ظہر کی نماز روزانہ کی طرح مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۶۴)

عن الحارث عن عليؓ قال: لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحىٰ، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة . من قال: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/ ٤٦، رقم: ٥٠٩٩)

وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لا تجوز في الصغيرة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ٢/ ١٣٨، زكريا ٣/ ٦)

ومن لا تجب عليهم الجمعة لبعد الموضع صلوا الظهر بجماعة. (شامي، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة، كراچي ٢/ ١٥٧، زكريا ٣/ ٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶؍ ۷۵۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۲۳ھ

دو ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی گاؤں میں بسنے والوں کی تعداد مرد وعورت، بچے، بوڑھے سب کو ملا کر ڈیڑھ ہزار سے لے کر دو ہزار تک ہو، تو کیا اس گاؤں میں جمعہ کی نماز صحیح ہوگی؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس گاؤں کے اندر طویل عرصہ سے جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے آرہے ہیں، اب فی الحال اس گاؤں میں ایک عالم صاحب شاہی مدرسہ سے فراغت کر کے گئے ہیں، انہوں نے جا کر جمعہ کی نماز کے بارے میں روکا تھا کہ جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو حال یہ ہے کہ گاؤں کے تمام آدمی اس کی مخالفت کرتے ہیں، اگر وہ مسئلہ مسائل کی کسی بات کو بتلاتے ہیں تو نہیں مانتے، تو اب کیا کرنا چاہئے؟ اگر جمعہ کی نماز صحیح نہ ہو تو کیا وہ مولانا تنہا ظہر کی نماز پڑھیں گے یا ان لوگوں کے ساتھ جمعہ کی نماز بھی پڑھیں اور ظہر کی نماز الگ پڑھیں، اگر وہ ان لوگوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھیں تو کیا ان کا امامت کرنا صحیح ہوگا؟

المستفتی: حمید اللہ، مدنا پور (بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر شدہ گاؤں اگر دیکھنے میں قصبہ نما ہے اور وہاں بازار بھی ہے اور روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں، تو وہ شہر کے حکم میں ہے، وہاں جمعہ جائز ہوگا۔

عن ابن جریجؒ، قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، القصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ بعضها ببعض کهیئة جدة، قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا کنت في قریة جامعة، فنودي للصلاة من یوم الجمعة، فحق علیک أن تشهدها إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، الجمعة، باب

القری الصغار، المجلس العلمي ۳/ ۱۶۸، رقم: ۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق الخ.

(شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۶، مطبوعة کوئٹه ۱/ ۵۹۰)

اور اگر مذکورہ گاؤں قصبہ نما نہیں ہے اور نہ وہاں بازار ہے اور نہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں، تو وہ قریۂ صغیرہ ہے، وہاں حنفیہ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہوگا، ظہر پڑھنا فرض ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۶۱۱)

عن حذیفةؓ قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شیبة، کتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشریق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٤/ ٤٦، رقم: ۵۱۰۰)

لاتجوز في الصغیرة التي لیس فیها قاض (إلی قوله) لو صلّوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۷، کوئٹه ۱/ ۵۹۰)

اگر وہ قریۂ صغیرہ ہے تو فاضل مدرسہ شاہی کا تنہا یا باجماعت ظہر پڑھنا درست ہے، جہاں شرعاً نماز جمعہ ناجائز ہے وہاں جمعہ پڑھائے تو وہ نفل ہوجاتی ہے اور نفل نماز باجماعت مکروہ ہے؛ اس لئے جمعہ جائز نہ ہونے کی صورت میں جمعہ کی امامت نہ کرنا چاہئے۔

الکراهة لکراهة النفل بالجماعة الخ. (شامي، کراچي ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۷، کوئٹه ۱/ ۵۹۰)

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تجربہ کار علماء ومفتی کو وہاں لے جاکر گاؤں کا مشاہدہ کرایا جائے، وہ گاؤں کی ہیئت کا معائنہ فرماکر جو حکم کردیں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۸۱)

دو ہزار کی آبادی والے کس طرح کے گاؤں میں نماز جمعہ جائز ہے؟

سوال [۳۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں میں مسجد ہے، وہاں پہلے ہی سے جمعہ ہوتا ہے، جب مسئلہ سامنے آیا کہ دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا ہے اگر ہم جمعہ کی نماز پڑھنے کے بجائے ظہر کی نماز پڑھنے کو کہتے ہیں تو اندیشہ اس بات کا ہے کہیں جھگڑا فساد نہ ہوجائے اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں مسجد کو ہی شہید نہ کردیں۔ اور جمعہ کی نماز درست ہونے کے لئے جو شرطیں بیان کی گئی ہیں، اس میں سے کچھ شرطیں پائی جارہی ہیں، مثلاً ڈاکٹر کا ہونا اور کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے مہیا ہوجانا اور ڈاکخانہ نہیں ہے اور آبادی مسلم وغیر مسلم کی قریب قریب دو ہزار ہے، تو ایسے دیہات میں جمعہ کی نماز ہوگی کہ نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: اختر حسین قاسمی، مدرسہ اشرفیہ روضۃ العلوم کاس گنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردم شماری میں مسلم وغیر مسلم، بچے و بوڑھے سب شامل ہوتے ہیں، اگر اس کی آبادی دو ہزار افراد کی ہے اور علاقہ میں اس کو بڑا گاؤں سمجھا جاتا ہے اور جمعہ قائم نہ ہونے میں فتنہ بھی ہے، تو ایسی صورت میں وہاں جمعہ کی نماز صحیح ہوجائے گی ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں؛ جبکہ وہاں ضروریات کی اشیاء بھی بآسانی ملتی ہوں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم دیوبند ۵/۵۶، عزیز الفتاوی ۲۷۸/۱)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۱۱/۱۴۱۸ھ

اکیس سو کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع بسہا معافی کی آبادی تقریباً ۲۱۰۰/سو ہے، بستی میں بہت سے پختہ مکانات ہیں، سرکاری اسکول، ہسپتال، سرکاری بینک خستہ حالت میں موجود ہیں، اسلامی مکتب، پوسٹ آفس، شکر وتیل کوٹہ، بغیر ڈگری کے تین ڈاکٹر، تیل نکالنے والی اور پسائی کی مشین، پالیشر، پرچون کی بہت سی دوکانیں ہیں، جن میں ایک تھوک کی بھی دوکان ہے، سڑک پر کھڑنجا بھی لگا ہے، مگر کوئی بڑا سامان، مثلاً کفن وغیرہ نہیں ملتا ہے، اس کے لئے گاؤں سے دو کلومیٹر دور ایک بستی ''تیراسی'' ہے وہاں جانا پڑتا ہے، وہاں ضروریات زندگی کا اکثر سامان مہیا ہوجاتا ہے، مگر اس بستی کا ہماری بستی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا پردھان وغیرہ سب الگ ہوتا ہے، پہلے بیچ گاؤں میں ایک مسجد تھی جس میں تقریباً ستر سال سے جمعہ قائم ہے، مگر کچھ لوگوں کا ہمیشہ کہنا رہا کہ مذکورہ بستی میں شرائط جمعہ نہ پائے جانے کی وجہ سے یہاں نماز جمعہ ادا کرنا صحیح نہیں ہے، لگ بھگ بیس سال قبل گاؤں کے کنارے ایک نیا محلّہ بسا تھا، اس میں ایک مسجد بھی بنائی گئی ہے، کچھ لوگوں کے کہنے کی وجہ سے کہ یہاں جمعہ صحیح نہیں ہے، ہم نئی مسجد میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھتے ہیں، اب آپ سے دریافت ہے کہ ہم لوگوں کو نماز جمعہ پڑھنی چاہئے یا نماز ظہر؟ قرآن وحدیث کی روشنی مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: احمد حسین، موضع: بسہا معافی، لکھیم پور کھیری (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس آبادی کی صرف اکیس سو کی مردم شماری ہو، وہاں نہ بازار ہے، نہ تھانہ ہے، نہ سرکاری دفاتر ہیں اور نہ ہی ضروریات زندگی کی اشیاء مہیا ہیں، تو ایسی آبادی میں شرعاً جمعہ جائز نہیں، اگر وہاں کے لوگ ایسی جگہ جمعہ پڑھتے رہیں گے، تو ان کے اوپر اتنے دنوں کی ظہر کی نماز کی ذمہ داری باقی رہے گی؛ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ قائم کرنا

درست نہیں؛ بلکہ ظہر کی ہی نماز ادا کرنا ضروری ہے اور نئی مسجد میں جوظہر پڑھی جارہی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۶۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۳۰۴/۲، جدید ڈابھیل ۹۷/۸، فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۲۰، جدید زکریا ۳۹۵، عزیز الفتاوی ۲۷۸/۱، احسن الفتاوی ۱۵۷/۴، امداد الاحکام ۳۳۸/۲)

عن أبي عبد الرحمنؓ قال: قال عليؓ: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة . من قال: لا جمعة، ولا تشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/ ٤٦، رقم: ٥٠٩٨)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق...... لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، و خطيب...... لو صلوا في القرىٰ لزمهم اداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٣٨، زكريا ٣/ ٧، عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٥، جديد ١/ ٢٠٥، البحرا الرائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، زكريا ٢/ ١٤٥، كوئٹه ٢/ ١٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۱۷۷/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۱۹ھ

دوہزار سے زائدآبادی جس میں ضرورت کے سامان ملتے ہوں قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے

سوال [۳۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک چوک ہے جس میں تقریباً پچیس دوکانیں ہیں، جن میں عمومی ضروریات کے سامان فراہم ہوجاتے ہیں، چوک کے اندر بمشکل دوسو کی آبادی ہے، مگراس کے اطراف جو قدرے فاصلہ پر ہیں وہاں کم وبیش دوہزار کی آبادی ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ جانب مغرب آدھا کلومیٹر کے فاصلہ پر دوہزار کی آبادی ہے ان کے درمیان کھیت ہیں اور

جانب جنوب دوسو فٹ کے فاصلہ پر پانچ سو کی آبادی ہے، جن کے درمیان بانس اور درخت وغیرہ قائم ہیں اور جانب مشرق تقریباً پانچ سو فٹ کے فاصلہ پر ایک ہزار کی آبادی ہے جن کے درمیان کھیت اور جھاڑیاں ہیں اور درمیان میں بھی دس پندرہ آدمی آباد ہیں اور جانب شمال خالی ہے، تو ایسے چوک پر نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟ اور یہاں عیدین کی نماز بھی ہوتی ہے، تو عیدین کا ادا کرنا کیسا ہے؟

نیز ایک گاؤں جس میں تقریباً سات سو کی آبادی ہے، جس میں پچاسوں سال سے جمعہ کی نماز ہوتی چلی آرہی ہے، اس گاؤں کے متعلق کیا حکم فرماتے ہیں؟ حالانکہ یہاں کے سردا ران جمعہ کی نماز پر پابندی لگانے کی قدرت رکھتے ہیں، تو کیا یہ سرداران قابل مواخذہ عند اللہ ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: ضیاء الحق، کماتی، کشن گنج (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو صورت لکھی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوک کے ارد گرد قدرے قدرے فاصلہ پر مختلف آبادیاں ہیں اور اس چوک سے تمام ضروریات کے سامان فراہم ہوتے ہیں اور آبادی بھی دو ہزار یا اس سے زائد ہے، تو اگر وہ مختلف آبادیاں آپ کے یہاں عرفاً ایک سمجھی جاتی ہیں، تو یہ قریۂ کبیرہ میں داخل ہیں؛ اس لئے اس چوک پر نماز جمعہ وعیدین دونوں درست ہیں اور اگر وہ آبادیاں آپ کے یہاں الگ الگ سمجھی جاتی ہیں، تو پھر وہاں نماز جمعہ وعیدین درست نہیں۔ آپ اپنے یہاں کے حالات و عرف سے زیادہ واقف ہیں؛ اس لئے آپ خود فیصلہ کرلیں کہ وہ ایک آبادی مانی جاتی ہے یا الگ الگ۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۶۸، فتاوی دارالعلوم ۵/۵۶، ۵/۵۸)

عن عليؓ، قال: لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحیٰ، إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب

الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤٦/٤، رقم: ٥٠٩٩)

وعن القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٧/٣، كراچي ١٣٨/٢)

أنها تصح إقامتها في الفناء، ولو منفصلاً بمزارع، فإذا صحت في الفناء؛ لأنه ملحق بالمصر يجب على من كان فيه أن يصليها؛ لأنه من أهل المصر الخ (شامي،كتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة،زكريا ٢٧/٣، كراچي ١٥٣/٢)

جس گاؤں میں سات سو کی آبادی ہے وہ قریۂ صغیرہ ہے، وہاں نماز جمعہ عندالاحناف جائز نہیں ہے، اگر عرصۂ دراز سے وہاں جمعہ کی نماز ہوتی آرہی ہے تو سرداران قوم کو تدبیر سے روکنا چاہئے، اگر قدرت کے باوجود نہیں روکتے ہیں تو وہ عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔

إن عبد الله بن عمرؓ يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: كلكم راعٍ وكلكم مسئول عن رعيته. (بخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرىٰ و المدن ١٢٢/١، رقم: ٨٨٣، ف:٨٩٣)

وفي مسند الإمام أحمد بن حنبل: فالأمير الذي على الناس راعٍ عليهم، وهو مسئول عنهم. (مسند أحمد بن حنبل٥٤/٢،رقم:٥١٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵؍صفر المظفر ۱۴۱۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۱۹۱/۳۳)	۱۴۱۸/۲/۲۵ھ

ڈھائی ہزار کی آبادی میں جمعہ قائم کرنا جائز ہے؟

سوال [۳۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری مسجد بہت پرانی اور قدیم مسجد ہے اور ہماری بستی کی آبادی دو ہزار پانچ سو

ہے؛ لہٰذا دیگر دو مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے اور تمام ساز و سامان کی دوکانیں بھی ہیں اور عیدگاہ ہے اور سرائے بھی ہے، تو اس صورت میں جمعہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ لوگ طرح طرح کے دباؤ ڈالتے ہیں، تو جمعہ قائم ہوگا کہ نہیں؟

المستفتی: عمران

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈھائی ہزار کی آبادی میں جمعہ قائم کرنا جائز ہے، مگر اتنی چھوٹی جگہ میں دو تین مسجدوں میں جمعہ قائم کرنے میں جمعہ کا مقصد اور روح ختم ہوجاتی ہے؛ اس لئے ایک سے زائد مسجدوں میں ایسی جگہ جمعہ قائم کرنا خلاف اولیٰ ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/۲۴۰، جدید زکریا ۳/۲۸۸، جدید زکریا مطول ۵/۱۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۴۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۵/۸ھ

ڈھائی ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع مجاہد پور ضلع سہارنپور کی کل آبادی تقریباً ڈھائی ہزار افراد پر مشتمل ہے ضروریات زندگی اور تجہیز وتکفین کی چیزیں سب دستیاب ہوجاتی ہیں، تین مساجد ہیں، ایسی آبادی میں جمعہ کی نماز ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: (مولانا) محمد عمر، مجاہد پور، سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تقریباً ڈھائی ہزار کی آبادی قریۂ صغیرہ میں داخل ہے، اس میں جواز جمعہ کے لئے ہسپتال، اسکول اور روز مرہ کے لئے باقاعدہ بازار کی شکل میں

دکانیں ہونا بھی لازم ہے، سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ ضروریات کی ایک آدھ دوکان ہے، جس سے وقتی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں گی، ضروریات کی ہر طرح کی چیزیں ہر وقت ملنے کا ذکر نہیں ہے؛ اس لئے وہ چھوٹا گاؤں اور دیہات ہے، وہاں جواز جمعہ کی بات ثابت نہیں ہوسکتی، جواز جمعہ کے لئے اگر بازار کی شکل نہیں ہے اور ہسپتال، تھانہ وغیرہ نہیں ہے تو کم از کم تین ہزار کی مردم شماری ہونی چاہئے اور یہ تعداد بھی مذکورہ گاؤں میں نہیں ہے؛ اس لئے اس گاؤں میں جواز جمعہ کی بات ہم کو سمجھ میں نہیں آتی، بہتر ہے کہ وہاں سے مظاہر علوم سہارنپور قریب ہے اور ریڑھی تاج پورہ بھی قریب ہوگا، وہاں کے تجربہ کار مفتیوں سے معائنہ کروالیا جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۸، ایضاح المسائل ص: ۶۴، کتاب المسائل ۱/۴۲۲)

لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب، كما في المضمرات. والظاهر: أنه أريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، ألا ترى أن في الجواهر: لو صلّوا في القرى لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۷، كراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۶۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۵/۷ھ

پچیس سو کی آبادی میں نماز جمعہ پڑھنا

سوال [۳۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں ہے، جس میں ساڑھے ۱۲؍سو ووٹ ہیں اور تقریباً ڈھائی ہزار کی آبادی ہے اور روزمرہ کی ضروریات گاؤں میں ہی پوری ہوجاتی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

اس گاؤں میں تقریباً بیس پچیس پرچون کی دوکانیں ہیں، جس میں سے چار پانچ دوکانیں بڑی ہیں۔ نیز آٹا، چاول، گیہوں، دال وغیرہ فراوانی کے ساتھ دستیاب ہوجاتے ہیں۔

نیز سبزی وغیرہ بھی مل جاتی ہے؛ البتہ باضابطہ گاؤں میں بازار نہیں لگتا ہے، گوشت قریب کے قصبہ سے بکنے کے لئے آجاتا ہے، عام بیماریوں کے لئے مثلاً نزلہ، کھانسی، بخار وغیرہ کے لئے دوتین ڈاکٹر بھی ہیں، ایک سرکاری اسکول، ایک مدرسہ جہاں حفظ تک کی تعلیم ہے اور ساٹھ ستر بچے، بچیاں زیر تعلیم ہیں، دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک زیر تعمیر ہے۔ نیز گاؤں میں پکی سڑکیں اور پکی نالیاں ہیں، گاؤں میں لائٹ بھی دستیاب ہے؛ لہٰذا مذکورہ احوال کے پیش نظر ایسے گاؤں میں جمعہ درست ہے یا نہیں؟

نوٹ: واضح رہے کہ مذکورہ گاؤں میں عید کی نماز ہوتی ہے، جس کی بناء پر عیدین کے موقعہ پر اختلاف کی صورت پیش آجاتی ہے۔

المستفتی: عبدالمتین، ہردوئی

بندہ نے مذکورہ گاؤں کا معائنہ کیا ہے، جو احوال سوال میں درج ہیں بالکل صحیح اور درست ہیں

ریاست علی عفا اللہ عنہ

خادم شعبۂ افتاء جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

۲۲/ رجب المرجب ۱۴۳۳ء

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جمعہ جائز ہونے کے لئے آبادی کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حیثیت آبادی، یعنی آبادی کی حیثیت شہر یا قصبہ جیسی ہو کہ اس میں باضابطہ بازار ہو اور تھانہ ہو، ہسپتال ہو، مذکورہ گاؤں میں باضابطہ بازار اور تھانہ وغیرہ نہیں ہے؛ اس لئے حیثیت آبادی کے اعتبار سے اس گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے۔

(۲) کمیت آبادی کہ مردم شماری کے اعتبار سے وہاں کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو جو آبادی تین ہزار یا اس سے زیادہ ہو وہ قریۂ کبیرہ ہوتا ہے اور مذکورہ گاؤں سوال نامہ کے اعتبار سے قریۂ کبیرہ بھی نہیں ہے؛ اس لئے وہاں پر مردم شماری کے اعتبار سے بھی جمعہ جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵/ ۶۲ا، بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰)

عن حذیفةؓ، قال: لیس علی أهل القریٰ جمعة، إنما الجمعة علی أهل

الأمصار مثل المدائن. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/٦٤، رقم: ٥١٠٠)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق......وفيما ذكرنا إشارة إلىٰ أنه لا تجوز في الصغيرة، التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب كما في المضمرات. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ١٣٨/٢، زكريا ٣/٦-٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۶۰ ۱۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۷/۲۵ھ

ڈھائی تین ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صوبہ راجستھان ضلع جھنجھنوں میں ایک بڑا گاؤں جاکھل ہے، یہاں اکثر آبای غیر مسلموں کی ہے اور مسلمانوں کی آبادی تقریباً ایک سو پچاس گھر کی کم وبیش ہوگی اور ایک مسجد ہے اور ایک مکتب بھی ہے، نماز جمعہ میں بوڑھے، بچے، جوان ملا کر سو کی تعداد نہ ہو پاتی ہے، پنجوقتہ نماز باجماعت میں دس بارہ نمازی بڑی مشکل سے شریک ہوتے ہیں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر مسجد کا امام نہ ہو تو اذان بھی نہ ہو، دو چار نمازی ایسے ہیں جن کو پوری نماز ثنا، فاتحہ، سورتیں، التحیات، درود، دعاء قنوت وغیرہ صحیح ڈھنگ سے یاد ہوں گی، ورنہ بقیہ نمازی اس سے کورے ہیں؛ بلکہ کلمۂ طیبہ بھی صحیح یاد نہ ہوگا۔

رمضان شریف میں دو چار پانچ نمازی بڑھ جاتے ہیں، ایسے ہی روزوں کا حال ہے، بچوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے، پوری مسلم آبادی علم دین سے کوری ہے، دنیاوی تعلیم سبھی حاصل کرتے ہیں، دینی تعلیم اپنے بچوں کو نہیں دلاتے ہیں، اپنی مرضی سے بچہ مکتب جائے تو

ٹھیک ہے تاکید نہیں کرتے، انگریزی اسکولوں میں جانے کی تاکید اور نگرانی کرتے ہیں، اِن اَن پڑھ لوگوں کے سامنے حافظ، قاری، عالم، سب برابر ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعت مطہرہ ان کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

المستفتی: مصلیان مسجد ضلع جھنجھنوں (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس گاؤں کی کل آبادی جوان، بوڑھے، بچے، عورت مرد سب ملاکر اگر ڈھائی تین ہزار سے کم نہیں ہے تو یہاں جمعہ ادا کرنا جائز ہے، اگرچہ جمعہ میں کم افراد حاضر ہوتے ہوں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۲۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۳۱۴، جدید ڈابھیل ۸/۱۰۲، ۱۰۳)

لاتصح الجمعة إلا في مصر جامع، أو في مصلى المصر، ولاتجوز في القرىٰ. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة اشرفی دیوبند ۱/ ۱۶۸)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ٦، هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في الجمعة، زكريا قديم ۱/ ۱٤٥، جديد ۱/ ۲۰٥)

اور گاؤں کی صورت حال دیکھتے ہوئے بہت محنت کی ضرورت ہے، خود بھی محنت کریں اور لوگوں کو دین سے آشنا کرائیں اور دہلی نظام الدین سے تبلیغی جماعت بلالیں، اس کے ذریعہ سے بھی محنت کرائیں۔ اللہ پاک آپ کی محنت کو قبول فرمائے اور ہمت عطا فرمائے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۳۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۸/۸ھ

دو، تین ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ کا قیام

سوال [٣٥٠٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع ککرالہ اپنے نواح کی کئی بستیوں مثلاً رسول پور، ناگل، بیگ، پہاڑی، پچپلڑی وغیرہ میں بڑی آبادی شمار کی جاتی ہے، اس اکیلی آبادی کی تعداد کی تقریباً دو ہزار ہے؛ جبکہ اس آبادی میں سے چھوٹی چھوٹی آبادیاں جن کو یہاں کی اصطلاح میں ''باس'' کہا جاتا ہے، ککرالہ کے جنگل میں اپنے اپنے کھیتوں پر آباد ہیں، جن کی نفری ککرالہ کی نفری کے علاوہ ایک ہزار سے کچھ زائد بتائی جاتی ہے، اس طرح ککرالہ کی آبادی کا تخمینہ ٣ر ہزار ہے، مذکورہ سب آبادیوں کی سرکاری پنچایت ککرالہ میں ہی ہے، سرکاری اسکول اور ڈاک خانہ بھی ہے، سڑک اور بجلی بھی ہے، اول الذکر آبادی رسول پور جو مستقل ککرالہ سے علیحدہ آبادی ہے، مگر اتنی قریب ہے کہ درمیان میں صرف تین چار کھیت کا فاصلہ ہے، تو ایسی صورت میں ککرالہ میں جمعہ پڑھنے کی شرعاً گنجائش ہے یا نہیں؟ یہاں کے تمام لوگ ککرالہ میں کافی عرصہ سے عیدین کی نماز پڑھتے آرہے ہیں، جو ایک مولوی صاحب مرحوم نے شروع کرادی تھی، ککرالہ گاؤں میں تین مسجدیں ہیں، جن میں بڑی مسجد بہت شاندار اور وسیع وعریض ہے، یہاں سے تین کلومیٹر دور ایک قصبہ میں جمعہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں عند الاحناف ککرالہ گاؤں میں جمعہ پڑھ لینا کیسا ہے؟

المستفتی: اہالیان موضع ککرالہ، بھرت پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موضع رسول پور جو ککرالہ سے دو تین کھیت کے فاصلہ پر ہے وہ کھیت کے درمیان میں آنے کی وجہ سے مستقل الگ آبادی ہے، اسی طریقہ پر ککرالہ کے اطراف واکناف میں جو لوگ کھیتوں میں آباد ہیں، ان آبادیوں کے نام بھی الگ الگ ہیں، ان کو بھی ککرالہ سے متصل نہیں سمجھا جائے گا؛ بلکہ وہ بھی شرعاً الگ الگ آبادیاں سمجھی

جائیں گی، اگران تمام آبادیوں کو الگ کرنے کے بعد صرف ککرالہ کی آبادی دوتین ہزار کی تعداد سے کم ہے،تو ایسی صورت میں موضع ککرالہ میں جمعہ وعیدین کی نماز جائز نہ ہوگی۔
(مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/ ۲۸، ایضاح المسائل ص: ۶۵، فتاوی دارالعلوم ۵/ ۴۴، محمودیہ قدیم ۲/ ۳۰۴، ۲/ ۳۱۴، جدید ڈابھیل ۸/ ۹۸، ۱۰۲)

عن أبي عبد الرحمن السلميؓ، عن عليؓ قال: لاتشريق، ولا جمعة، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ٤/ ٤٧، رقم: ٥١٠٦)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. هذا بلاخلاف –وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة– لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/ ٦، كراچي ٢/ ١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ۱/ ۱۴۲۲ھ

۲۷۰۰/ آبادی والے گاؤں میں نماز جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضلع ہردوئی میں تحصیل شاہ آباد سے تقریباً دس کلومیٹر کی دوری پر ایک بڑا گاؤں ہوسے پور ہے اور اس سے برابر ہی میں نصف کلومیٹر کی دوری پر اسی کے بقدر سرومن نگر ہے، ہوسے پور کی آبادی مسلم ہے، سرومن نگر میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور مسلم نہ ہونے کے درجہ میں ہیں، ہوسے پور کی آبادی مردم شماری کے مطابق دو ہزار سات سو گیارہ ہے اور گاؤں میں جگہ کی قلت کی وجہ سے جانب جنوب میں پیدل پانچ

منٹ کی دوری پر چھیالیس گھر بنالئے ہیں، گاؤں میں دو مدرسہ اور پرائمری اسکول، پرچون کی دس دوکانیں، دوڈاکٹر بھی موجود ہیں۔

عرض یہ ہے کہ ضروریات کی تمام چیزیں کھانا، کپڑا وغیرہ گاؤں ہی میں مل جاتا ہے، غلہ وغیرہ کی پیداوار اتنی ہوجاتی ہے کہ گاؤں والوں کو فروخت کرنا پڑتا ہے، سبزیوں کی بھی پیداوار ہوتی ہے، گاؤں میں ٹیلیفون، موبائل، ٹریکٹر ٹرالی، موٹر سائیکلیں وغیرہ سب کچھ لوگوں کے پاس ہے اور گاؤں کی عیدگاہ بھی ہے، جو تقریباً ستر سال سے زیادہ قدیم ہے اور اتنے ہی سالوں سے جمعہ اور عید کی نماز ہوتی چلی آرہی ہے، دو چار لوگوں کو جمعہ کی نماز سے اختلاف ہے، ایک تو امیر جماعت ہیں، جو عیدین کی نماز میں امامت فرماتے ہیں اور جمعہ کو ناجائز کہتے ہیں، دوتین لوگ ان کے ساتھ ہیں، گاؤں میں عالم حافظ، قاری سبھی لوگ ہیں اور گاؤں کے عالم صاحب بھی یہ کہتے ہیں کہ جمعہ پڑھنا جائز ہے اور انہوں نے ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند سے جواز جمعہ کے فتاوے بھی حاصل کئے ہیں اور مؤرخہ ۲۱؍جون ۲۰۰۸ء کو گاؤں والوں نے حضرت مفتی محمد لقمان صاحب دارالعلوم جامع الہدیٰ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسان متعلم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند کو اپنے پورے گاؤں کا معائنہ کرایا اور انہوں نے پورا گاؤں گھوم پھر کر دیکھا اور کہا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی، اس کے باوجود امیر جماعت اور دو چار لوگ جو ان کے ساتھ ہیں ناجائز کہتے ہیں؛ لہٰذا موجودہ صورت حال میں جمعہ کی نماز پڑھنا اس گاؤں میں جائز ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں تاکہ انتشار ختم ہوجائے۔

نوٹ: سوال نامہ میں تحریر کردہ باتیں درست ہیں۔

المصدق: محمد لقمان القاسمی، دارالعلوم جامع الہدیٰ، مرادآباد

۲۱؍جون ۲۰۰۸ء

المستفتی: باشندگان ہوسے پور، تحصیل شاہ آباد، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جواز جمعہ کے لئے آبادی کو دو پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔

(۱) حیثیت آبادی: اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مردم شماری کم ہو یا زیادہ، مگر اس کی حیثیت قصبہ یا شہر نما ہو، مثلاً سرکاری آفیسر، تھانہ، اسکول، ہسپتال، بازار گلی کوچے، یہ سب کچھ موجود ہوں، تو ایسی صورت میں آبادی چاہے تعداد میں کم ہو، مثلاً تین چار سو کی آبادی ہو، تب بھی اس کو قصبہ اور شہر کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور وہاں جمعہ جائز اور لازم ہوجاتا ہے۔

(۲) دوسرا پہلو: کثرت آبادی کے اعتبار سے ہے، چاہے آبادی کی حیثیت کمزور ہو؛ لیکن مردم شماری کی تعداد کثرت کی حیثیت رکھتی ہو، حضرات اکابر نے ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) سے اوپر کی مردم شماری کو کثرت میں شمار فرمایا ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں جس گاؤں کی آبادی کا ذکر ۲۷۰۰ بتایا گیا ہے، اس کو کثرت آبادی کی حیثیت حاصل ہے؛ اس لئے وہاں شرعی طور پر جمعہ جائز ہوجائے گا؛ لہٰذا وہاں کے لوگوں کو جواز جمعہ کے بارے میں اختلاف سے گریز کرنا چاہئے اور جمعہ پڑھنے والوں پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

عن ابن جریج ؒ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة، فنودى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار ۳/۱٦۸، رقم:۵۱۷۹)

في الدر: ويشترط لصحتها سبعة أشياء. الأول: المصر، وهو مالايسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها، وعليه فتوى أكثر الفقهاء. وتحته في الشامية: عن أبي حنيفة ؒ: أنه بلدة كبيرة فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه،أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا

هو الأصح. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ٢/١٣٧، زكريا ٣/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۶۵۲)	۱۴۲۹/۶/۲۷ھ

دو ہزار نو سو ساٹھ افراد کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قصبہ محمدی سے تقریباً پونے دو کلو میٹر پر ایک گاؤں ڈھمولہ ہے، جس کی آبادی دو ہزار نو سو ساٹھ افراد پر مشتمل ہے، کوئی بازار اور پوسٹ آفس وغیرہ نہیں ہے؛ لیکن ضرورت زندگی کی اشیاء فراہم ہو جاتی ہیں، مثلاً سبزیاں، کپڑا، چھوٹی موٹی ادویہ وغیرہ اور کیرانہ وغیرہ کی سبھی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں اور کپڑا فروخت کرنے والے گاؤں کے لوگ ہیں؛ لیکن پختہ دوکانیں نہیں ہیں، پھیری اور چل کر سائیکلوں کے ذریعہ گاؤں اور دوسرے گاؤں میں فروخت کرتے ہیں اور لکڑی وغیرہ کی ٹھیکی بھی ہیں، کیا اس گاؤں کو کثرت آبادی یا حیثیت آبادی میں سے کسی اعتبار سے قریۂ کبیرہ شمار کیا جاسکتا ہے، جس میں جمعہ جائز ہو؟ جبکہ فتاوی دار العلوم ۵/۶۶ پر اسی طرح کا ایک مسئلہ ہے جس میں گاؤں سوجڑو کی آبادی تقریباً تین ہزار یا اس سے کچھ کم بیان کی گئی ہے، اس میں جمعہ کو واجب قرار دیا گیا ہے اور ایضاح المسائل ص: ۶۴ پر تحریر ہے کہ جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے اتنا بڑا گاؤں کافی ہے کہ عورت ومرد، مسلم غیر مسلم تین ہزار افراد پر مشتمل ہوں؛ حالانکہ دار العلوم دیوبند سے فتوی آیا ہے کہ یہ گاؤں قریۂ صغیرہ ہے، اس میں جمعہ جائز نہیں ہے، جس کی فوٹو کاپی سوالنامہ کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ قریۂ کبیرہ کے لئے مکمل تین ہزار افراد کی آبادی ضروری ہے یا کچھ کم بھی نماز جمعہ کے لئے کافی ہے، اگر کچھ افراد کی کمی قریۂ کبیرہ کے لئے مانع نہیں ہے، جیسا کہ فتاوی دار العلوم

۶۶/۵ کے سوال وجواب سے معلوم ہوتا ہے،تو ایسی صورت میں مذکورہ گاؤں جس کی آبادی دوہزارنوسوساٹھ افراد پر مشتمل ہے،قریۂ کبیرہ کہلائے گا یانہیں؟اورنماز جمعہ صحیح ہوگی یانہیں؟

المستفتی: حافظ مشیراحمد،موضع دھمولہ، پوسٹ: قصبہ محمدی، لکھیم پورکھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حنفیہ کے نزدیک دیہات اورچھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے،صحت جمعہ کے لئے شہر یاقصبہ اورقریۂ کبیرہ یعنی بڑاگاؤں ہوناضروری ہےاورتقریباً ساڑھےتین ہزارآبادی والے گاؤں بڑے گاؤں میں شامل ہیں؛ اس لئےصورت مذکورہ میں دو ہزارنوسوساٹھ افراد جس گاؤں میں بستے ہیں وہ گاؤں شرعی طور پر بڑے گاؤں میں شامل ہے۔ سوال نامہ میں درج کردہ دھمولہ گاؤں میں نماز جمعہ کاقیام جائز اوردرست ہے۔

حضرت تھانویؒ نے تین ہزارکی آبادی کوقریۂ کبیرہ میں شامل کیا ہےاوردو ہزارنوسوساٹھ وتین ہزارمیں کوئی خاص فرق نہیں ہے،بہشتی زیور ۱۱/۸۰ میں فرمایا ہے کہ جس گاؤں کی آبادی قصبہ کے برابرہو،مثلاً تین چارہزارکی آبادی ہووہاں جمعہ درست ہے۔حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے جس گاؤں میں تقریباً تین ہزار مردم شماری یا کچھ کم ہےاوراس میں بازاربھی نہیں ہے،کوئی سودا اورغلہ وغیرہ نہیں ملتاہے،ایسے گاؤں کو بھی قریۂ کبیرہ قراردیاہے،آج سے تقریباً اسی نوے سال پہلے موضع سوجڑوگاؤں شہرمظفرنگرکی حدود سے کافی فاصلہ پرتھا،اس وقت اس کی آبادی تقریباً تین ہزارتھی اورآج سوجڑوگاؤں مظفرنگرکے پیٹ میں داخل ہے؛اس لئے آج کل کی حیثیت کودیکھ کرموضع سوجڑوکے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہئے،اس وقت کی حیثیت کے اعتبار سے حضرت مفتی صاحب نے تین ہزارسے کچھ کم آبادی میں جمعہ کودرست قراردیا،جیسا کہ سوال نامہ میں اس فتوی کا حوالہ بھی دیا گیاہے؛ لہٰذا اکابرکی رائے کے مطابق گاؤں دھمولہ کوقریۂ کبیرہ اور بڑے گاؤں میں شمارکیاجائے گا؛ لہٰذا اس میں نماز جمعہ بلاشبہ جائزاوردرست ہے۔اورکبھی جواز جمعہ کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ کثرت آبادی اورمردم شماری کونہ دیکھا جائے؛ بلکہ حیثیت آبادی کو

دیکھا جائے، مثال کے طور پر کسی جگہ کی ہزار پانچ سو کی مردم شماری ہو؛ لیکن وہ جگہ ہر طرف سے ضروریات زندگی پوری کرنے کی ہے، وہاں سے مختلف گاؤں، مختلف قصبات میں راستہ جارہا ہو اور گاؤں دیہات قصبات کے لوگوں نے وہاں ہر طرح کی دوکانیں بنالی ہوں، دور دور تک دوکانیں گلی کوچے اس میں ہوں، اسپتال، تھانہ، ڈاکخانہ، اسکول بھی ہو اور ہر قسم کی ضروریات زندگی کی دوکانیں ہوں، تو ایسی جگہ مردم شماری کا اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ حیثیت آبادی اور گلی کوچے کا اعتبار ہے۔

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. إلى أن قال: فيما ذكرنا أشارة إلى أنه لا تجوز في الصغيرة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۰۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۵/ ۱۴۲۴ھ

غیر مسلموں کی آبادی میں مزدوروں کا نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہاں کے باشندے غیر مسلم ہیں اور ابھی دو سال کے واسطے مسلم مزدور کام کرنے کے واسطے آئے ہوئے ہیں اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور اب چاہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز بھی ادا کریں، کیا جمعہ کی نماز قائم کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فیروز عالم مدرسہ الفرقان شیخ پورہ چوپڑہ، جلگاؤں (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس آبادی کا سوال نامہ میں ذکر کیا جارہا ہے، اگر وہ بڑی آبادی ہے اور اس کی مردم شماری تین ہزار سے اوپر ہے چاہے غیر مسلموں کو شمار کر کے ہی

یہ آبادی پوری ہوتی ہو، وہاں نماز جمعہ قائم کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۳۰۴، جدید ڈابھیل ۸/۹۸)

عن ابن جريجؓ، قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنودى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الآذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۳/۱٦۸، رقم:۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۵۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۴/ ۱۴۲۱ھ

تقریباً تین ہزار آبادی میں نماز جمعہ کا جواز

سوال [۳۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا گاؤں گنگ داس پور شہر امروہہ سے تقریباً سولہ کلومیٹر کے فاصلہ پر آباد ہے، جس کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے، جس میں لگ بھگ دوسو پچاس ہندو باقی سب مسلمان ہیں، گاؤں میں دو مسجدیں اور ایک مدرسہ اور سات دوکانیں ہیں، جن پر روزمرہ اور ضروریات زندگی کا اکثر سامان مل جاتا ہے، اس کے علاوہ میت کے کفن دفن کا سامان وغیرہ بسہولت سب چیزیں مل جاتی ہیں اور ڈاکٹر وغیرہ بھی موجود ہیں اور دوسری مسجد میں بھی سیکڑوں سال پہلے سے جمعہ ہوتا ہے، تو کیا ہماری مسجد میں جمعہ درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: گنگ داس پور، امروہہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ گاؤں میں تین ہزار سے کم کی مردم شماری نہیں ہے؛ بلکہ تین ہزار یا اس سے زائد ہے، تو وہاں جمعہ کی نماز جائز ہے اور دوسری مسجد میں بھی جمعہ جائز ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۸۰، امداد الفتاوی ۱/۶۲۱)

عن ابن جریجؒ، قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ بعضها ببعض کهیئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا کنت في قریة جامعة، فنودی للصلوة من یوم الجمعة، فحق علیک أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعة. (مصنف عبد الرزاق، کتاب الجمعة، باب القری الصغار، المجلس العلمي بیروت ۳/۱۶۸، رقم:۵۱۷۹)

عن أبي حنیفةؒ: أنه بلدة کبیرة، فیها سکک، وأسواق، ولها رساتیق، وفیها والٍ یقدر علی إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أوعلم غیره یرجع الناس إلیه فیما یقع من الحوادث، وهذا هو الأصح. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۷، زکریا ۳/۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۹۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۴/۱۴۱۵ھ

تین ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع ٹانڈہ ضلع بلند شہر یوپی میں بابت جمعہ جس کے تفصیلی حالات یہ ہیں:

۱. آبادی 3037۔ ۲. پرچون کی دوکان گیارہ، جن سے روزمرہ کی ضروری چیزیں ملتی ہیں اور سبزی بھی۔ ۳. کپڑا بھی ملتا ہے گھروں میں اور باہر کے بھی آتے ہیں۔ ۴. جنرل اسٹور کی دوکان تین۔ ۵. میڈیکل اسٹور۔ ۶. نل وغیرہ کے مختصر سامان کی ایک دوکان اور اس پر ویلڈنگ بھی ہوتی ہے۔ ۷. لوہے کی جالی وغیرہ بنانے کی دوکان ایک۔ ۸. ٹائر پنچر کی دوکان ایک۔ ۹. دودھ کی ڈیری دس۔ ۱۰. ٹیلر ماسٹر کی دوکانیں تین۔ ۱۱. موبائل فون وغیرہ کی دوکان ایک۔ ۱۲. سرکاری اسکول ایک۔ ۱۳. پرائیویٹ اسکول ایک۔ ۱۴. لوہار، بڑھئی کی دوکان دو۔ ۱۵. مویشی ڈاکٹر دو۔ ۱۶. کھلی چوکر کی دوکان دو۔ ۱۷. ڈاکٹروں کی دوکان چار۔ ۱۸. ڈیزل و پیٹرول کی دوکان دو۔ ۱۹. مرغی فارم ایک۔ ۲۰. آٹا چکی چھ۔ ۲۱. سرکاری راشن کی دوکان ایک۔ ۲۲. صابن وغیرہ بنانے کی فیکٹری ایک۔ ۲۳. دو مسجد ایک مدرسہ ایک عیدگاہ۔ ۲۴. مچھلی فارم دو۔

نوٹ: زمانہ قدیم سے نماز جمعہ جاری رہا؛ لیکن کافی وقت بند رہا، اب تقریباً چار سال سے نماز جمعہ ہو رہا ہے اور عید کی نماز بھی مسلسل ہو رہی ہے شروع سے ہی اور اب آٹھ دس افراد ہیں جو کہ جمعہ کی نماز کو ادا نہیں کرتے؛ لیکن اسی مسجد میں کبھی تو ظہر کی جماعت کرتے ہیں اور کبھی اپنی اپنی پڑھتے ہیں، کیا ایسی صورت میں اور ان تمام باتوں کے باوجود نماز جمعہ صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی آس محمد، موضع: ٹانڈہ، بلند شہر (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موضع احمد پور ٹانڈہ ضلع بلند شہر یوپی، جس کی آبادی تین ہزار سے زائد ہے۔ نیز اس میں ضروریات زندگی بھی کافی حد تک دستیاب ہیں، تو یہ شرعاً ایسا بڑا گاؤں ہے، جو قصبات کے حکم میں ہے، وہاں والوں پر جمعہ پڑھنا لازم ہے اور عید کی نماز بھی واجب ہے اور جو لوگ ایسے بڑے گاؤں میں جمعہ نہ پڑھ کر ظہر کی نماز الگ پڑھتے ہیں

وہ شرعی مسائل سے واقف نہیں ہیں، ان کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۸۰، امداد الفتاوی ۱/۶۱۸، ۶۲۰، فتاوی دارالعلوم ۵/۴۵، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۸/۱۷، امداد المفتیین ۲/۱۹۵، امداد الاحکام ۲/۴۱۶، ۴۱۷)

و عبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي على الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۹۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۲/۱۴۳۴ھ

کیا تین ہزار کی آبادی میں قیام جمعہ جائز ہے؟

سوال [۳۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسے گاؤں میں قیام جمعہ درست ہے، جس کی آبادی تقریباً تین ہزار کے اوپر ہے اور ضروریات زندگی کی کچھ اشیاء دستیاب ہیں، مثلاً کرانہ کا سامان اور ادویات، اس کے علاوہ سارا سامان قصبہ محمدی سے لانا پڑتا ہے، جس کی دوری ایک کلومیٹر ہے، اس مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرما کر تمام مسلمانان دھمولہ کو مطمئن فرمائیں؟

المستفتی: محمد ضمیر المظاہری، نزد محمدی لکھیم پور کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے لئے آبادی کی دو حیثیت ہوتی ہیں۔

(۱) کمیت آبادی جس میں مردم شماری کا اعتبار ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جس آبادی میں بسنے والے افراد کی تعداد بچے، بوڑھے، عورت، مرد، ہندو مسلم سب ملا کر تین ہزار یا اس سے اوپر ہو، تو اس کو ایسا بڑا گاؤں شمار کیا جاتا ہے، جو قصبہ کے حکم میں ہوتا ہے، اس میں جمعہ و

عیدین جائز ہوجاتے ہیں اور اس میں عید کی نماز سے پہلے قربانی جائز نہیں ہوتی۔

(۲) حیثیت آبادی کہ مردم شماری کے اعتبار سے اس آبادی میں بسنے والے لوگوں کی تعداد کم ہو، مثلاً ہزار بارہ سو کی آبادی ہو، مگر وہ جگہ ایسے موقع پر واقع ہے کہ اس میں بازار لگتا ہو اور شہر کی گلیوں کی طرح دوکانیں بنی ہوئی ہوں، اس میں ہسپتال، تھانہ اور ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود ہو، ایسی جگہ پر حیثیت آبادی کی وجہ سے جمعہ وعیدین جائز ہوجاتے ہیں؛ اس لئے کہ یہ بھی قصبہ کے حکم میں ہوجاتا ہے اور سوال نامہ میں جس گاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں حیثیت آبادی اگرچہ کم ہے؛ لیکن کمیت آبادی کے اعتبار سے قصبہ کے حکم میں ہے؛ اس لئے وہاں جمعہ جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۶۱۸، ۶۲۰، بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰)

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۷، زكريا ۳/ ۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۲/۲۷ھ

تین ہزار کی آبادی پر مشتمل گاؤں میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے گاؤں میں تین ہزار کی آبادی ہے، تقریباً پندرہ سال پہلے یہاں پر جمعہ کی نماز ہوتی تھی، بعد میں کچھ علماء کے کہنے سے کہ جمعہ یہاں پر فرض نہیں ہے ختم کردیا گیا تھا۔ نیز ضروریات زندگی کے تمام سامان ۵/ کلومیٹر دور شہر سندیلہ سے دستیاب ہوجاتے ہیں، اب ایسی صورت میں مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

نیز صاحب نور الایضاح کی بیان کردہ صحت جمعہ کے لئے شرائط ستہ کی ہمارے زمانہ میں

کیا توجیہ ہوگی۔

مذکورہ کتاب کی عبارت درج ذیل ہے: عبارت کا مطلب بیان کرنے اوروضاحت کرنے کی زحمت فرمائیں۔

ویشترط لصحتها (الجمعة) ستة أشياء: المصر، أوفناؤه، والسلطان، أو نائبه، ووقت الظهر فلا تصح قبله، وتبطل بخروجه والخطبة قبلها بقصدها في وقتها، وحضور أحد لسماعها ممن تنعقد بهم الجمعة، ولو واحداً في الصحيح، والإذن العام، والجماعة، وهم ثلاثة رجال غير الإمام. (نور الإیضاح۱۱۷، ۱۱۸)

المستفتی: مظفرحسین، اہل میر نگراجگواں، ہردوئی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی صحت کے لئے شہر یاقصبہ یابڑا گاؤں ہونا شرط ہے، مذکورہ گاؤں کی آبادی چونکہ تین ہزار پر مشتمل ہے جو کہ بڑے گاؤں اورقریۂ کبیرہ کے درجہ میں ہے؛ اس لئے مذکورہ گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنا درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۶۴، عزیز الفتاوی ۱/۲۸۰)

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، کراچي ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۷)

ممکن ہے کہ سائل کوسوال میں درج کردہ عبارت کے شرط نمبر۲ / پر کچھ ذہنی خلجان ہوا ہو کہ ہمارے ہندوستان میں ایک شرط یعنی مسلم بادشاہ یااس کا نائب مفقود ہے،تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان بادشاہ نہ ہو، وہاں مسلمانوں کی آپسی رضامندی سے جس کوامام جمعہ مقرر کرلیں وہ امام جمعہ ہوجاتا ہے اور وہاں نماز جمعہ واجب اور ادا ہوجاتی ہے، چاہے اس امام کومنجانب حکومت کسی قسم کی قوت حاصل نہ ہوئی ہو۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/۲۳۹، زکریا جدید ۳/۲۸۷، زکریا جدید مطول ۵/۱۱۲، فتاوی دار العلوم ۵/۴۱، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۲۶۲، ۹/۱۱۱،

جدید ڈابھیل ۸/۴۷، ۱۵۳)

فلو الولاة كفاراً يجوز للمسلمين إقامة الجمعة، ويصير القاضي قاضياً بتراضي المسلمين. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في جواز استنابة الخطيب، كراچي ٢/١٤٤، زكريا ٣/١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۸۲۵/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۵ھ

تین ہزار والی آبادی میں جمعہ جائز ہے

سوال [۳۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں ایک گاؤں سرائے سلطان نام کا ہے، جس کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے اور عموماً روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بھی ملتی ہیں اور بڑا گاؤں شمار ہوتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے گاؤں میں جمعہ وعیدین کی نماز فرض وواجب ہے یا نہیں؟ اور کیا ایسے گاؤں والے اگر جمعہ وعیدین کی نماز نہ پڑھیں تو گنہگار ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الغنی، مدرسہ انوار العلوم، بلگرام، ہردوئی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تین ہزار کی آبادی والا گاؤں جس میں روزمرہ کی ضروریات کے سامان ملتے ہوں، قصبات کا حکم رکھتا ہے، اس میں جمعہ وعیدین کی نماز جائز ہے؛ بلکہ وہاں والوں پر جمعہ وعیدین کی نماز پڑھنا واجب ہے، نہ پڑھنے کی صورت میں گنہگار ہوں گے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۷۱، بہشتی زیور اختری ۱۱/۸۰، ایضاح المسائل ص: ۶۴)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق.
(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٨، زكريا ٣/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۰۱۶/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۲ھ

تین ہزار کی آبادی والا گاؤں قریہ کبیرہ ہے

سوال [۳۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسی جگہ جمعہ ہوسکتا ہے، جس کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے اور ضروریات زندگی کا سارا سامان ملتا ہے اور دوسری جگہ جمعہ پڑھنے کی مسافت تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر ہے، جہاں لوگوں کو جانے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور لوگ برائے نام جاپاتے ہیں، اگر ایسی جگہ جمعہ ہونے لگے تو یقیناً مصلیان میں ان شاء اللہ اضافہ ہوگا۔

المستفتی: مصلیان مدینہ مسجد، ڈھمولہ محمدی، کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ آبادی کی تین ہزار مردم شماری ہے، تو وہ شرعاً بڑا گاؤں ہے، جو قصبہ کے حکم میں ہے، ایسے بڑے گاؤں میں شرعی طور پر نماز جمعہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۸)

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۷، زكريا ۳/۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۸۳۷/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۱۹ھ

تین ہزار سے زائد کی آبادی میں جمعہ جائز ہے

سوال [۳۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم دینی احباب بن میں رہ کر اپنی معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں، جو عرف عام میں گوجر کے نام سے مشہور ہے؛ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے ہم نے بن کے قریب اپنی کوشش سے زمین الاٹ کرالی ہے وہیں ہماری رہائش ہے، ہم نے وہیں پر ایک پکی مسجد تیار کرالی ہے اور مدرسہ بنانے کا ارادہ ہے، الیکشن میں بھی ہم حصہ لیتے ہیں، جس گرام سے ہمارا تعلق ہے، اس کی آبادی ۳۰۰۰/ ہزار سے زائد ہے، ہم نے بعض علماء دین سے یہ سنا ہے کہ جس گرام کی آبادی ۳۰۰۰ ہزار سے زائد ہو وہاں جمعہ ہوسکتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعض علماء کا یہ مذکورہ قول درست ہے؟ اگرچہ شرائط جمعہ نہیں ہو پارہے ہیں، تو کیا ہم ایسے قریہ میں جس کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو جمعہ ادا کریں یا نماز ظہر؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب سے نوازیں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: علی حسین، بریا منجھولہ، اودھم سنگھ نگر (اترا کھنڈ)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں جس آبادی کی مردم شماری تین ہزار سے زائد ہے، اس کو قریۂ کبیرہ کی حیثیت حاصل ہے، اس میں جمعہ کی نماز ادا کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰)

عن ابن جریج ؒ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنؤدى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۳/ ۱٦۸، رقم: ۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۳/۵۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۱۱ھ

3150 کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بستی جو کہ قصبہ کوتوالی دیہات بجنور کے قریب واقع ہے، جس کی آبادی اعداد و شمار کے اعتبار سے 3150 افراد پر مشتمل ہے، بستی میں حوائج ضروریہ مثلاً پرچون کا سبھی سامان، تجہیز وتکفین کا سامان نیز ڈاکٹر اور ہائی اسکول وغیرہ بھی موجود ہیں، اس کے علاوہ ہفتہ واری بازار لگتا ہے، بستی میں ایک مدرسہ اور تین مساجد ہیں، جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا اس بستی میں شرعی نقطہ نظر سے جمعہ درست ہوگا؟

المستفتی: مفتی محفوظ الرحمٰن قاسمی، مدرس جامعہ دار العلوم محمدیہ گدرپور، یوایس نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس آبادی میں تین ہزار سے زیادہ افراد کی مردم شماری ہو وہ شرعاً قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے؛ اس لئے اس میں جمعہ اور عیدین بلاشبہ جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۱۷۶، بہشتی زیور ۱۱/۸۱)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۱۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱۱/۳ھ

تین ہزار سے زائد آبادی والی بستی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ کی کتاب ایضاح المسائل ص:۶۴ر پر لکھا ہے، جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے لازم ہے کہ شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں ہو کہ عورت مرد مسلم غیر مسلم تین ہزار افراد پر مشتمل ہوں، اس سے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے، وہاں کے لوگوں پر ظہر کی نماز فرض ہے، اگر ظہر چھوڑ کر جمعہ پڑھیں گے تو ان پر ظہر کی نماز کا فریضہ باقی رہ جائے گا، اس میں چند امور کی تفصیل مطلوب ہے۔ غیر مسلم مرد اور عورت میں نابالغ بچے بھی داخل ہیں یا نہیں؟ اتنے افراد پر مشتمل گاؤں میں اگر مسلمان تھوڑے ہوں اور غیر مسلم زیادہ تو بھی یہی حکم ہے یا بصورت زیادتی کفار حکم نفی میں ہوگا؟

نیز تین ہزار افراد پر مشتمل گاؤں میں جمعہ صرف جائز ہے یا واجب ہے؟ اور ایسے گاؤں کے افراد ترک جمعہ سے گنہگار ہوں گے یا نہیں؟ حضرت والا سے درخواست ہے کہ مذکورہ بالا امور کی وضاحت فرمادیں؟ نیز گاؤں میں جواز جمعہ کے لئے تین ہزار افراد کی آبادی کی دلیل سے بھی نوازدیں تاکہ اطمنان قلب حاصل ہوجائے، احقر نے گذشتہ سال دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی ہے اور حصول علم میں مصروف ہے، مجھے یہ امید قوی ہے کہ حضرت والا ضرور میرے عریضہ کا جواب مرحمت فرمائیں گے؟

المستفتی: اشتیاق احمد قاسمی، مدرس مدرسہ دارالعلوم اشرفیہ، بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تین ہزار کی آبادی میں مسلم وغیر مسلم بالغ ونابالغ، عورت ومرد سب شامل ہیں، غیر مسلموں کے نابالغ بچے بھی شمار میں آئیں گے اور اگر مسلمان کم ہوں اور غیر مسلم کی تعداد مسلمانوں سے کافی زائد ہو تب بھی جمعہ جائز ہوجائے گا، تین ہزار کی آبادی والوں پر جمعہ کی نماز واجب ہے ظہر ساقط ہوجائے گی اور تین ہزار کی آبادی پر جمعہ لازم یا ثابت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ شہر یا قصبہ کی طرح بڑی آبادی ہے، فتح مکہ کے موقعہ

پر مکۃ المکرّمہ کی آبادی بھی کم وبیش اتنی ہی تھی؛ اس لئے شہر یا قصبہ کے حکم میں داخل کر کے جمعہ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۳۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍۷؍۱۴۱۸ھ

تین ساڑھے تین ہزار کی آبادی میں جمعہ

سوال [۳۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع سنہولی جس کی آبادی (تعداد انسانی) تین ساڑھے تین ہزار ہے، شہر بھاگل پور سے یہ گاؤں بارہ کیلومیٹر کی دوری پر ہے، موجودہ سہولت یا دقت اتنی ہے کہ مذکورہ شہر جانے کے لئے ٹرین اسٹیشن گاؤں سے دو کیلومیٹر اور بس اسٹینڈ تین کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، شہر بھاگل پور کا معروف قصبہ پورینی مذکورہ گاؤں سے تین، چار کیلومیٹر دوری پر واقع ہے، شہر بھاگل پور کا معروف قصبہ ہے جہاں ضروریات کی تمام اشیاء پائی جاتی ہیں۔

گاؤں سنہولی میں پرچون (کرانہ دوکان) تین چار ہیں، جن سے تمام ضروریات پوری نہیں ہوتی ہیں، اس گاؤں ہی کے نام سے صرف ایک کیلومیٹر کی معمولی دوری پر ایک ہاٹ ہفتہ کے دوران لگایا جاتا ہے، ہفتہ دس دن میں کپڑا بیچنے والا کوئی نہ کوئی آجاتا ہے، تہوار اور لگن کے موقعہ پر کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا ہے، گاؤں ہذا میں دو فون اور ایک وائرلیس سسٹم فون بھی موجود ہے اتنے بڑے گاؤں میں البتہ کوئی معقول اور بڑا ڈاکٹر موجود نہیں ہے، معمولی بخار اور نزلہ کے وقت دوا مل جاتی ہے اور ڈائریا وغیرہ کے وقت سلائن ہوتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے، جب سے مسجد قائم ہوئی ہے تقریباً پچاس ساٹھ سال سے لوگ بلا اختلاف جمعہ وعیدین پڑھتے تھے اور جس کی مرضی نہ ہوتی تھی نہ پڑھتے تھے؛ لیکن تقریباً آٹھ سال سے علماء سنہولی میں اختلاف ہوا اور لوگ دو حصوں میں منقسم ہوگئے، گاؤں ہذا میں گیہوں اور دھان کٹنے،

پینے کے لئے تین چار مل مشین بھی ہے، گاؤں ہذا میں تقریباً ۴۰/فارغین اور ۵۰/حفاظ کرام بھی ہیں، جو اکثر و بیشتر مدارس سے منسلک ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ جمعہ و عیدین پڑھنا باشندگان سنہولی پر واجب ہے یا ناجائز؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فتویٰ عنایت فرمائیں تاکہ فتوی کے کسی لفظ اور جملہ سے علماء کے طبقہ میں بحث ومباحثہ پیدا ہی نہ ہوسکے؟

المستفتی: محمد اختر حسین، سنہولی، بھاگل پور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تین ساڑھے تین ہزار کی آبادی ہے، تو وہ شرعاً بڑا گاؤں ہے جو قصبہ کے حکم میں ہے، ایسے گاؤں میں شرعی طور پر جمعہ وعیدین کی نماز جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور اختری ١١/٨٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
١٨/محرم الحرام ١۴١٨ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٣/ ۵١٣٨)	١٨/١/١۴١٨ھ

چار ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [٣۵٢٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں کی بستی فلوسہ نامی تحصیل اوڑی تین پٹیوں ١۔فلوسہ ٢۔ ریشہ واڑی ٣۔قاضی پور پر مشتمل ہو کر کل آبادی بالغ ونابالغ زن ومرد تعداد چار ہزار نفوس پر مشتمل ہے، جس کے اندر تین مساجد، ضروریات زندگی کے لئے کافی دوکانات، ایک رنگ روڈ کے ذریعہ نیشنل ہائے وے منسلک ہے اور چند سرکاری ادارے، ١. اسکول درجہ پنجم تک ٢. ایک پرائمری ہیلتھ سینٹر ہے، عوام الناس مختلف ذرائع ملازمت تجارت اور ٹھیکیداری، زمینداری روزینہ مہیا کرتے ہیں، اس بستی کے لوگوں کو نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے بستی سے دو کیلو میٹر

دور جانا پڑتا ہے، بایں وجہ بستی کے تمام بالغ مرد اس بستی میں ایک مسجد شرعی فلوسہ کو مرکز قرار دینا چاہتے ہیں، کیا اس بستی میں جمعہ پڑھنا پڑھانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو تفصیلاً جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: فراست علی قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کے گاؤں میں عورت و مرد، بچے، بوڑھے، ہندو مسلم چار ہزار انسانوں کی آبادی ہے، تو وہ قصبہ اور بڑے گاؤں کے حکم میں ہے، وہاں کے لوگوں پر جمعہ پڑھنا واجب ہے؛ اس لئے آپس کے مشورہ سے وہاں پر جامع مسجد کی تعیین ہو جانا ضروری ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵/۶۶)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق (إلی قوله) لاتجوز في الصغیرة التی لیس فیها قاض، ومنبر، وخطیب. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۲۳۹)

چار پانچ ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اقوال فقہاء سے مصرح ہے کہ قریہ (گاؤں) میں جمعہ درست نہیں، جمعہ کے لئے مصر (شہر) یا قریہ کبیرہ (بڑا گاؤں) کا ہونا شرط ہے، تو بڑے گاؤں سے کیا مراد ہے؟

نیز وہ گاؤں جس میں جمعہ مشکوک ہو اور وہاں علماء واعظین نے کبھی نہ کہا نہ بتایا ہو کہ یہاں جمعہ جائز نہیں؛ البتہ تحریراً بتایا جاتا رہا ہو، ماحصل یہ کہ اس گاؤں میں جمعہ عرصۂ دراز سے ہوتا

آرہا ہو اور اس کے سبب مسلمانوں میں جمعیۃ قائم ہو، اب اگر جمعہ ختم کیا جائے تو افتراق جمعیۃ مسلمین کا قوی خدشہ ہے، اس صورت میں جمعہ پڑھنا بہتر ہوگا یا ترک جمعہ یا اولاً جمعہ بعدہ ظہر احتیاطی باجماعت یا انفراداً؟ اس گاؤں کی کل آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے اور اس میں انسان کی ضروریات بھی بآسانی پوری ہوتی ہیں۔

المستفتی: اسرار الحق، سیفنی رامپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ گاؤں کی آبادی چار پانچ ہزار کے درمیان ہے تو وہ قریۂ کبیرہ ہے، ایسے بڑے قریہ پر فقہاء احناف نے قصبہ اور شہر کا حکم لگا کر جمعہ کو جائز قرار دیا ہے؛ اس لئے مذکورہ گاؤں میں بلاشبہ جمعہ جائز اور درست ہوگا، احتیاط الظہر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۵/۵۴، جدید زکریا ۶/ ۹۰ امداد الفتاوی ۱/۴۵۵، فتاوی دارالعلوم ۵/۱۵۲، بہشتی زیور اختری ۱۱/۸۰)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرۃ التي فیھا أسواق (إلی قولہ) لاتجوز في الصغیرۃ التی لیس فیھا قاض، ومنبر، وخطیب. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۱۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۳۰۲۸)	۲۰/۲/۱۴۱۳ھ

تقریباً پانچ ہزار کی آبادی میں جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع اترّ یا نیپال میں ہے، یہاں کی کل آبادی تقریباً ۵/ ہزار ہے، جس میں مسلم آبادی کے ۲۵/ لوگ ہیں، یہاں پر بازار ہے اور پرائیویٹ ہسپتال بھی ہے، بینک بھی ہے اور

سرکاری آفس بھی ہیں شہروں کی طرح تمام سہولیات موجود ہیں، کیا ہم ۲۵ رلوگ یہاں پر نماز جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ فقہ کی روشنی میں بالدلائل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: شبیرحسین، ٹنکپورمنڈی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب وہاں کی آبادی تقریباً پانچ ہزار کی ہے، اور تمام سہولیات بازار پرائیویٹ ہسپتال، بینک اور سرکاری آفس وغیرہ موجود ہیں، تو وہ قریۂ کبیرہ ہے؛ لہٰذا اگرچہ وہاں مسلمان کل ۲۵ رلوگ رہتے ہیں، پھر بھی بلاشبہ جمعہ جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۷، عزیز الفتاوی ۲۸۰)

بأن المصر موضع يندفع فيه حاجة الإنسان الضرورية من الأكل بأن يكون هناك من يبيع طعامًا، والكسوة الضرورية، وأن يكون هناك أهل حرف يحتاج إليهم كثيراً. (رسائل الأركان ١١٤، بحواله فتاوى رحيمية قديم، جديد زكريا ٦/ ٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ررجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ر)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۷/۱۴۲۰ھ

پانچ ہزار سے زائد آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں ہے جس میں ساڑھے پانچ سو گھر ہیں اور مسلمانوں کے کل گھر ساٹھ ہیں، اس میں پندرہ دوکانیں ہیں، گاؤں کے لوگوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے اور گاؤں سے آٹھ کلومیٹر دور ایک قصبہ ہے جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، لوگوں کو وہاں تک پہونچنے میں تکلیف ہوتی ہے، سواری کا نظم نہیں ہے تو کیا ان تمام صورتوں میں جمعہ کی نماز جائز ہے؟

المستفتی: محمد سہیل، چلاشنی، فیروزآباد(یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال مذکورہ گاؤں جس میں بسنے والے افراد ہندو مسلم، بچے، بوڑھے سب ملاکر پانچ ہزار سے زائد ہیں، تو ایسا بڑا گاؤں شرعاً قصبہ کے حکم میں ہے، جہاں جمعہ وعیدین بلا شبہ جائز اور درست ہے۔(مستفاد: امداد الفتاوی۱/۶۱۸،۶۲۰، بہشتی زیور۱۱/۸۰، فتاوی دارالعلوم۵/۴۵،۵۴، امداد المفتیین ۲/۱۹۵، امداد الاحکام۲/۴۱۶،۴۱۷، محمودیہ ڈابھیل۸/۱۷)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرۃ التي فیها أسواق (إلی قوله) لاتجوز في الصغیرۃ التی لیس فیها قاض، ومنبر، وخطیب. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۲۲۷)

تقریباً ساڑھے چھ ہزار کی آبادی میں جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مادھوپور بستی شہر رڑکی سے تقریباً ۴؍کیلومیٹر دور مغرب جانب واقع ہے، یہاں کا ڈاکخانہ سالیر ہے اور تھانہ وتحصیل رڑکی ہے، یہاں کی ووٹر لسٹ 2181 عدد ہے، اس حساب سے اس کی کل آبادی کا تخمینہ ساڑھے چھ ہزار ہے، یہاں کے اکثر مکانات پختہ، گلیاں کشادہ ہیں، اس میں کھڑنجے بچھے ہوئے ہیں، بعض سمینٹیڈ اور ڈامر والے بھی ہیں، رڑکی سے یہاں تک پختہ ڈامر روڈ بنا ہوا ہے، سواریوں کی آمد ورفت کی سہولت حاصل ہے، یہاں پانچ مسجدیں، دو عربی مدرسے، دو پرائمری اسکول، ایک جونیر ہائی اسکول ہے، یہاں

ستر سے زیادہ دوکانیں ہیں، جن میں پرچون کی چھوٹی بڑی اکتیس دوکانیں ہیں، علاوہ ازیں راشن کی سرکاری دوکانیں اور ہریجنوں میں چار دوکانیں ہیں، گوشت کی چھ، جلیبی کی ایک، یہاں کپڑے کی کوئی دوکان نہیں ہے؛ البتہ پھیری کرنیوالے روزانہ کپڑے لے کر آتے ہیں، یہاں کے دو آدمی معمولی طریقہ پر اپنے گھروں میں کپڑے رکھتے ہیں، جو پھیری کر کے فروحت کرتے ہیں، ڈاکٹر کی سات، نیز دو ڈاکٹر روزانہ جانوروں کو دیکھنے آتے ہیں، عورتوں کی ڈلیوری کے لئے ایک ڈاکٹرنی بھی سرکاری طور پر ہر ہفتہ ایک بار آتی ہے، ٹیلرس کی دوکان ایک، نائی کی دو، آٹا پیسنے کی چکی چار، جانوروں کے سامان کی ایک، لحاف بھرنے کی مشین ایک، چاول نکالنے کی دو، بجلی کے سامان کی ایک، لکڑی کی ٹال دو، سنٹرنگ کی ٹال ایک، ولڈنگ مشین ایک، ایس ٹی ڈی تین، مسالے کی پسائی کی ایک، سائیکل پنچر کی ایک، بستیٔ مذکورہ کے مندرجہ بالا تفصیلی کیفیت کے بعد دریافت طلب امر یہ ہے کہ قیام نماز جمعہ کے سلسلہ میں شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد اختر مادھو پور، روڑ کی، ہری دوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ قائم ہونے کے لئے حنفیہ کے نزدیک شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے اور ہر ایسا گاؤں بڑا ہے جس میں گلی کوچے اور اپنے پھیلاؤ اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے اعتبار سے قصبہ کے مثل ہو اور آپ کے بیان کے مطابق آپ کا گاؤں قریۂ کبیرہ ہے؛ اس لئے اس گاؤں میں جمعہ قائم کرنا واجب اور فرض ہوگا وہاں کے باشندوں پر جمعہ پڑھنا لازم اور فرض ہے۔

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرۃ التي فیها أسواق إلی ما قال فیما ذکرنا إشارۃ إلی أنه لا تجوز في الصغیرۃ. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶)

ولاشک في جواز الجمعة في البلاد، والقصبات، وهذا الذي قاله

من حيث كون الموضع مصراً أولا. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في صلوة الجمعة اشرفيه ديوبند ص: ۵۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۰۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۴ھ

سات ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس گاؤں یا دیہات کی آبادی ۶ یا ۷/ ہزار کی ہو اور چھ مساجد ہوں اور علماء بھی موجود ہوں اور اکثر اشیاء اس بستی میں فراہم ہوتی ہوں، انسان کے لئے ہر چیز ملتی ہو اور پوسٹ آفس، دینی ادارہ، سرکاری اسکول بھی ہو، تو وہاں جمعہ کی نماز صحیح ہے؟

المستفتی: ماسٹر محمد عاشق حسین، سرائے کھجور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس گاؤں یا دیہات کی آبادی چھ یا سات ہزار کی ہو اور ضرورت کی اشیاء بھی فراہم ہوتی ہوں، تو یہ قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہوتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/ ۳۴)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۶، كراچي ۲/ ۱۳۸، نعمانيه ۱/ ۵۳۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۵۵۷)

سات ہزار آبادی والا گاؤں قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے

سوال [۳۵۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں حکومت کا ایسا کوئی نظم نہیں ہے، جس سے مظلوم شخص فوری طور پر مدد حاصل کرسکتا ہو، مگر چھوٹا سا ایک بازار ہے، جس سے روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں اور آبادی تقریباً چھ سات ہزار یا اس سے کچھ زائد ہے اور اس گاؤں میں چھ سات محلے ہیں اور ہر محلے میں الگ الگ مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں جمعہ قائم ہوتا ہے اور ہر محلے میں لوگوں نے ایک ایک قابل اعتماد آدمی کو متعین کر رکھا ہے تاکہ لوگوں کے درمیان اختلاف اور لڑائی ہو تو فیصلہ کرسکے اور اگر فیصلہ نہ کرسکے تو کم از کم معاملہ کو تھانہ تک پہونچا سکے اور تھانہ اس گاؤں سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس گاؤں میں پوسٹ آفس بھی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ

(۱) اس گاؤں کو قریۂ کبیرہ میں شامل کرکے ہر محلے کی مسجد میں جمعہ ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ نیز لوگوں نے ہر محلے میں ایک ایک قابل اعتماد آدمی متعین کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اختلاف اور لڑائی ہو تو فیصلہ کرسکے، اگر نہ کرسکے تو اس معاملہ کو تھانہ تک پہونچا سکے، یہ حکومت کے اس نظم کے قائم مقام ہوسکتا ہے جس سے مظلوم شخص مدد حاصل کرسکے؟ واضح رہے کہ اگر اس میں جمعہ ادا نہ کیا جائے تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہوسکتا ہے، تو کیا اس سے مسئلہ میں کوئی فرق پڑے گا؟

(۲) نیز فقہاء نے قریۂ کبیرہ کی جو تحدید لکھی ہے کہ اس میں بازار ہو یا حکومت کا ایسا کوئی نظم ہو جس سے مظلوم شخص مدد حاصل کرسکتا ہو وغیرہ وغیرہ، اگر ان میں سے ایک جز نہ پایا جائے اور بقیہ چیزیں پائی جائیں تو وہ قریۂ کبیرہ میں شامل ہوگا یا نہیں؟

(۳) نیز اس گاؤں کے آس پاس چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ہیں، جن کو قریۂ کبیرہ میں کسی بھی صورت میں داخل نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن وہاں بہت دن سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے اور مفتیان کرام کے منع کرنے کی بناء پر بعض گاؤں والے جمعہ ادا کرنے سے رک گئے اور بعض

گاؤں والوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، بعض نماز جمعہ ادا کرتے رہے اور بعض نماز ظہر ادا کرتے رہے، اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے جمعہ ادا کرنا چھوڑ دیا، تو پہلے جو جمعہ ادا کر چکے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ اور جو لوگ اب بھی جمعہ ادا کرتے رہے ان کا کیا حکم ہے؟ مذکورہ مسائل کے بارے میں ہمارے یہاں کوئی حل نہیں ہو پا رہا ہے؛ اس لئے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ دلائل کی روشنی میں مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مفتی عبدالرشید، استاذ دارالعلوم جئ بوم، چونماری پارہ (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جس گاؤں میں چھ، سات ہزار کی آبادی ہے بلاشبہ وہ گاؤں قریۂ کبیرہ میں داخل ہے، اس گاؤں میں جمعہ پڑھنا بلاشبہ جائز ہے، چاہے اس میں بازار اور حاکم وغیرہ نہ ہوں؛ اس لئے کہ جواز جمعہ کے لئے دو چیزوں میں سے ایک چیز کا ہونا کافی ہے۔

(۱) کثرت آبادی، اگر آبادی کی کثرت ہے، تو پھر بازار اور حاکم وغیرہ کی شرط نہیں۔

(۲) حیثیت آبادی کہ آبادی کی کثرت تو نہیں ہے؛ بلکہ معمولی آبادی ہے، جس میں ہزار پانچ سو کی مردم شماری ہے؛ لیکن وہاں پر تھانہ بھی ہے، اسکول بھی ہے، ہسپتال بھی ہے اور ضروریات زندگی کے لئے ہر چیز کے مہیا ہونے کا بازار بھی ہے اور آس پاس کے گاؤں دیہات کے لوگ وہاں آکر ضروریات زندگی کا سامان خرید کر لیجاتے ہیں، تو اگرچہ مردم شماری کے اعتبار سے وہ جگہ چھوٹی آبادی کی ہے؛ لیکن حیثیت کے اعتبار سے اس جگہ کو قصبہ کا حکم حاصل ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں درج کردہ گاؤں میں کثرت آبادی کی وجہ سے جمعہ جائز اور درست ہے۔

إن شرطه المصر فمسلم–إلى قوله–وقيل ما فيه أربعة ألاف رجال إلى غير ذلك، وليس هذا كله تحديداً له؛ بل إشارة إلى تعيينه و تقريب له إلى الأذهان، و حاصله إدارة الأمر على رأي أهل كل زمان في عدهم المعمورة مصراً، فما هو مصر في عرفهم جازت الجمعة فيه، و ماليس بمصر

لم يجز فيه. قال المحشي: لم أجده في الكتب المعروفة عندي؛ ولكنهم لما اختلفوا في تعريف المصر على أقوال كثيرة فلا بعد في أن يكون هذا أيضاً قولاً، لاسيما إذحكي في جامع الرموز عن المضمرات قول ألف رجل أيضاً.

(الكوكب الدري، بحث الجمعة في ديارنا، مطبوعة اشاعت الإسلام، سهارنپور ۱/۱۹۹)

(۲) کا جواب بھی اسی میں آچکا ہے۔

(۳) آس پاس میں جو چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہات ہیں ان دیہاتوں میں شرعی طور پر جمعہ جائز نہیں، وہاں کے لوگ جمعہ پڑھیں تو درست نہ ہوگا، ان کے اوپر ظہر کا فرض باقی رہ جائیگا اور جن دیہاتوں میں پہلے سے جمعہ ہوتا چلا آرہا ہے، ان کے بارے میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے یہ لکھا ہے اگر جمعہ بند کرنے کی صورت میں فتنے اور سخت اختلاف کا خطرہ ہو تو انہیں ویسے ہی چھوڑ دیا جائے؛ لہٰذا وہاں کے جو پڑھے لکھے علماء ہیں ان کو وہاں جمعہ پڑھنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، مطبوعہ کوہ نور، دہلی ۳/۱۸۹، زکریا جدید ۳/۲۳۵، زکریا جدید مطول ۵/۱۶۲)

لاتجوز في الصغيرة–إلى قوله–وصلّوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶–۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۵/۱۴۳۱ھ

آٹھ ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا گاؤں جو ضلع سہارن پور میں واقع ہے، جس کی آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے اور اس گاؤں میں کافی سہولت فراہم ہے، ایک انٹر کالج اور پانچ چھ ڈاکٹر ہیں اور پانچ کپڑے کی دوکانیں ہیں اور اس گاؤں کے دو پردھان رہتے ہیں، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس

گاؤں میں جمعہ قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عادل، سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں کی آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہو، وہاں بلاتردد جمعہ کا قیام واجب ہے؛ کیونکہ یہ گاؤں قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے اور ہمارے تمام اکابر کا اس پر اتفاق ہے، جیسا کہ فتاوی دارالعلوم میں ہے کہ تین ہزار آبادی والے گاؤں میں جمعہ جائز ہے ۔فتاوی دارالعلوم ۶۶/۵، عزیز الفتاوی میں ہے کہ جس گاؤں کی آبادی تین ہزار ہو وہ قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے، قریۂ کبیرہ میں بتصریح فقہاء جمعہ درست ہے۔ عزیز الفتاوی ۲۸۰ اور امداد الاحکام ۲/۷۴۱ رمیں ہے کہ جس گاؤں کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو وہ قریۂ کبیرہ ہے، جس میں بالاتفاق جمعہ جائز بلکہ واجب ہے۔ اور امداد الفتاوی ۱/۷۶۱ رمیں ہے کہ اگر ایک قریہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں تین چار ہزار کی مردم شماری ہے اور اس میں ضروری حوائج کے لئے بازار بھی ہیں، تو وہاں جمعہ بلاتکلف جائز ہے۔ اور امداد الفتاوی ہی میں ۱/۶۷۳ رمیں ہے کہ چار ہزار کی آبادی مصریت کا اثر اعظم ہے، یہ صحت جمعہ کے لئے کافی ہے۔

کذا في الشامي ناقلا عن القهستاني: وتقع فرضاً في القصبات، والقرى الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۱۳۸/۲، زكريا ۶/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رصفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۴۴)

قصبہ میں نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ زید ایک ایسے قصبہ کا رہنے والا ہے جس کی آبادی تقریباً تین ہزار سے زائد ہے اور قریب قریب اشیاء ضروریہ بھی مہیا ہو جاتی ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے قصبہ میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کتنی مساجد میں جائز ہے اور ایک مسجد کے کچھ لوگ نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، پھر فوراً نماز ظہر بھی با جماعت ادا کرتے ہیں، ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عارف مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کے قصبہ میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے، نیز جمعہ ایک ہی مسجد میں ادا کرنا چاہئے، متعدد مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنا مناسب نہیں ہے، ہاں کوئی مجبوری ہو جیسے ایک ہی مسجد میں سبھی افراد نہ سما سکیں، تو دو جگہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

وإقامة الجمعة من أعلام الدين فلا يجوز القول بما تؤدي إلى تقليلها. (مبسوط سرخسي، باب الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۱۲۱)

ان لوگوں کی نماز جمعہ درست ہو جاتی ہے؛ لہٰذا بعد میں نماز ظہر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ان کو ظہر پڑھنا جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/۲۴۰، جدید زکریا ۳/۲۸۸، جدید زکریا مطول ۵/۱۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۹۱۹)	۱۴۱۷/۶/۲۱ھ

قریۂ کبیرہ میں مسجد کی جگہ بیٹھک میں نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ کسی گاؤں میں ایک مسجد ہے اوراس میں پہلے سے جمعہ قائم ہے، اس گاؤں کی آبادی تقریباً چار ہزار ہےاوراس مسجد میں لوگوں میں آپس میں لڑائی ہوگئی ہے، تو کچھ لوگ وہاں مسجد چھوڑ کر دوسری ایک بیٹھک میں نماز پڑھنے لگےاور بیٹھک میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور یہ لوگ دوسری مسجد بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مسجد کی جگہ بھی تجویز ہوچکی ہے،تو دوسری مسجد بنانا اور فی الحال بیٹھک میں نمازادا کرنا اور جمعہ کی نماز بیٹھک میں پڑھنا درست ہے یانہیں اور اگر اب تک پڑھ لی تو ان نمازوں اور جمعہ کی نمازوں کی جگہ دوسری نمازیں پڑھنی ہوں گی یانہیں؟

المستفتی: محمداسلم سبل پور،بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مذکورہ گاؤں میں مردم شماری تقریباً چار ہزار ہے،تو وہ شرعاً قریۂ کبیرہ ہےاور ایسے گاؤں میں جمعہ کی نماز جائزاور درست ہوجاتی ہے۔

عن ابن جریجؓ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنودى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۳/۱۶۸، رقم:۵۱۷۹)

اور ایسے گاؤں کے میدان اورکسی ایسی بیٹھک میں بھی جمعہ کی نماز صحیح ہوجاتی ہے جس میں ہر نمازی کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ نیز جھگڑے اور نزاعات سے بچنے کے لئے دوسری مسجد بنانا جائز اور درست ہے، وہ بھی شرعی مسجد ہوجائیگی اوراس میں جمعہ وغیرہ بھی جائز ہو جائے گا۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۰/۱۹۷،جدید ڈابھیل ۱۴/۴۱۲)

السلطان إذا أراد أن يجمع بحشمه في داره، فإن فتح باب الدار وأذن

إذنًا عاماً جازت صلوته شهدها العامة، أو لم يشهدوها كذا في المحيط.

(هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم ١/١٤٨، جديد ٢٠٩/١)

لو صلى الجمعة في قرية بغير مسجد جامع، والقرية كبيرة لها قرىٰ، وفيها والٍ، وحاكم، جازت الجمعة بنوا المسجد أو لم يبنوا. (حلبي كبير، فصل في صلوة الجمعة، اشرفية ديوبند ١/٥٥١)

أهل محلة قسموا المسجد وضربوا فيه حائطا ولكل منهم إمام على حدة ومؤذنهم واحد، لا بأس به، والأولىٰ أن يكون لكل طائفة مؤذن.

(هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد، زكريا قديم ٥/٣٢٠، جديد ٥/٣٧٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۲۵۴)	۱۴۱۵/۱۲/۷ھ

قریۂ کبیرہ میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم افراد مختلف اضلاع کے ملک نیپال کی ایک منڈی میں آباد ہیں، ہم لوگوں نے اپنے ذاتی مکانات بھی نیپالی منڈی میں بنا رکھے ہیں، ہندوستان میں بھی ہمارے مکانات ہیں اور ۴/۶ ماہ میں ہفتہ عشرہ کے لئے یا شادی، غمی میں شریک ہونے کے لئے چلے جاتے ہیں، ہم لوگ تقریباً چالیس پچاس افراد ہیں، اس منڈی میں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہے، غیر مسلم آبادی تقریباً چار ہزار سے زائد ہے، یہاں باقاعدہ مسجد نہیں ہے، مسجد کی تعمیر میں قانونی رکاوٹیں ہیں، اس وجہ سے ایک پختہ مکان کو جماعت گاہ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، پنجوقتہ جماعت یہیں ہوتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ صورت بالا میں ہم لوگوں پر نماز جمعہ واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی شمشاد حسین، وارڈ نمبر ۱، ٹنک پور چمپاوت نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس آبادی میں ہندو وغیر مسلم اور مسلم بچے، بوڑھے سب کی مردم شماری تین ہزار سے زائد ہو، وہ شرعی طور پر شہر اور قصبہ کے حکم میں ہے، اس میں نماز جمعہ بلاتر دد جائز ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو صورت درج ہے، اس میں بلاتر دد جمعہ جائز ہوگا۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۶)

عن ابن جریج ؓ قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ بعضها ببعض کهیئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا کنت في قریة جامعة فنودی للصلوة من یوم الجمعة، فحق علیک أن تشهدها، إن سمعت الأذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، کتاب الجمعة، باب القری الصغار، المجلس العلمي بیروت ۳/ ۱۶۸، رقم: ۵۱۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴؍ ۶۳۲۳)

بڑے گاؤں میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا گاؤں پموڑہ، قصبہ جانسٹھ، ضلع مظفر نگر ایک بڑی بستی ہے، جس کی آبادی ۳۵۰۰؍ سے زائد ہے، اکثر مکانات پختہ ہیں، دیہات کی مناسب ضروری چیزیں فراہم ہوجاتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ یہاں جمعہ پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: سعید الزماں مظفر نگری، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ساڑھے تین ہزار کی آبادی والا گاؤں قریۂ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے، ایسے بڑے گاؤں میں محض کثرت آبادی کی وجہ سے جمعہ جائز ہوجاتا ہے؛ لہٰذا آپ کے گاؤں پموڑہ میں بلا شبہ جمعہ جائز ہوجائے گا۔ نیز وہاں عیدین کی نماز بھی جائز اور درست ہوجائے گی۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۲۲، بہشتی زیور ۱۱/۸۰، فتاوی دارالعلوم ۵/۴۴-۵/۱۳۶)

عن ابن جریجؒ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنؤدى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الآذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمية بيروت ۳/۱٦۸، رقم: ۵۱۷۹)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۷۲/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۷/۲۵ھ

بڑی آبادی میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ شہر ساگر ایم، پی کے محلہ شکرواری ٹوری کی مسجد شیخ گھنسو منشی میں نماز جمعہ کی ادا جارہی ہے، اس کے متعلق اول بات یہ ہے کہ شکرواری اور درزیانہ محلے مسلم اکثریت والے محلے ہیں، جس کی وجہ سے کافی لوگوں کی نماز جمعہ اکثر چھوٹ جاتی ہے، جس کی وجہ سے

کافی لوگوں کونماز جمعہ اکثر دور والی مسجد میں جا کرادا کرنی پڑتی ہے۔
(۲) دوسرے یہ کہ ان محلوں میں بذریعۂ ٹرین آنے والے لوگوں کی نماز جمعہ بھی جاتی رہتی ہے۔
(۳) تیسرے یہ کہ جمعہ کے دن مسجد درزیانہ میں دوپہر میں کسی بھی نماز کا اہتمام نہیں ہوتا۔
(۴) چوتھے یہ کہ درزیانہ مسجد میں مدرسہ کی شروعات کے واسطے اوپری منزل کی توسیع کا کام ادھورا پڑا ہے، مسجد درزیانہ میں ادائے گی نماز جمعہ ہونے پر دیگر محلوں کے افراد کے آنے سے انشاءاللہ اس توسیع کے کام میں بھی فروغ ہوگا۔
مندرجہ بالا مسئلوں کا حل تجویز یہ ہے کہ محلّہ درزیانہ مسجد میں شیخ گھنسو منشی مسجد سے بڑھے ہوئے وقت پر نماز جمعہ شروع کی جائے؛ اس لئے آپ علماء حضرات سے گذارش ہے کہ شرع کے مطابق نماز جمعہ کی ادائیگی کی اجازت عنایت فرمائیں؟ غور طلب امر یہ ہے کہ
(۱) درزیانہ اور شکرواری محلوں کے ۹۵ر فیصد سے زیادہ لوگ مندرجہ بالا تجویز پر رضامند ہیں۔
(۲) مسجد درزیانہ میں جگہ پانی وغیرہ کا انتظام معقول ہے۔
(۳) مسجد درزیانہ میں نماز جمعہ کی دیگر شرائط پوری ہیں۔
(۴) مسجد درزیانہ اور شیخ گھنسو منشی مسجد میں تقریباً ۲۰۰ر گز کا فاصلہ ہے۔

المستفتی: محمد خلیل کوثر کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محلّہ درزیان کی مسجد میں بھی جمعہ کی نماز صحیح اور درست ہو جائے گی، مگر جہاں تک ہو سکے جمعہ کی تعداد نہ بڑھائی جائے تو بہتر ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۴۰/۳، جدید زکریا ۲۸۸/۳، جدید زکریا مطول ۱۷۳/۵، احسن الفتاوی ۱۱۳/۴)

وتؤدي في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً على المذاهب، وعليه الفتوى. وقال ابن عابدين: وبما ذكر اندفع ما في البدائع من أن ظاهر الرواية جوازها في موضعين لا في أكثر وعليه الإعتماد، فإن المذهب

الجواز مطلقاً. (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، قبيل مطلب في نية آخر ظهر بعد صلوة الجمعة، كراچي ۲/ ۱٤٤، زكريا۳/ ۱٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۴۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۸/۹ھ

قریۂ کبیرہ میں نماز جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: موضع عمر سیڈھا (ہردوئی) لکھیم پور، ہردوئی روڈ سے تقریباً دو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، موضع کو اس روڈ سے ایک پختہ سڑک ملاتی ہے، قرب وجوار کے تین گاؤں سرکاری طور پر اس موضع سے ملحق ہیں، موضع کی آبادی ہندو، مسلم مخلوط تقریباً ساڑھے تین ہزار ہے اور اس سے متعلق گاؤں کی مجموعی آبادی تقریباً پندرہ سو ہے، اس طرح موضع اور اس کے متعلقات کی کل آبادی تقریباً پانچ ہزار تک پہونچتی ہے، موضع میں دور حاضر کے وسائل زندگی، بجلی، ٹیلیفون لائن، (جو ابھی زیر تکمیل ہے) ذرائع نقل وحمل، دوکانیں بھی موجود ہیں قابل ذکر یہ ہے کہ موضع میں ایک مسجد ہے، جس میں پانچ وقت باجماعت نماز ہوتی ہے، جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھی جاتی ہے، عیدین کی نماز پڑھنے کے لئے موضع کے لوگ چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک قصبے میں جاتے ہیں، کیا اس موضع میں جمعہ کا قیام درست ہے؟

قیام جمعہ کا یہ خیال مسجد کے متولی اور نمازیوں کے دل میں اس پاک جذبے کے تحت آیا کہ موضع میں پابندی سے نماز پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ صرف عیدین کی نماز پڑھ لیتے ہیں اور کبھی باہر سے آنے والی تبلیغی جماعت کے لانے پر مسجد میں آجاتے ہیں اور ایک یا دو وقت کی نماز پڑھ جاتے ہیں ورنہ کبھی مہینے گذر جاتے ہیں، وہ مسجد کا رخ نہیں کرتے، اگر موضع میں قیام جمعہ کی شرائط کی بنیاد پر جمعہ کا قیام ہوجاتا ہے

،تو ایسی صورت میں دین سے دور یہ مسلمان کم ازکم جمعہ کی نماتو پڑھ لیا کریں گے اور دین کی کچھ باتیں ان کے کان میں پڑجایا کریں گی، جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ دیہاتوں میں لوگ جمعہ کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور اس طرح ان تک دین کی بات پہنچتی رہتی ہے۔

المستفتی: محمد صابر، متولی مسجد عمر سیڈھا، ضلع ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مذکورہ گاؤں کی آبادی ساڑھے تین ہزار؛ بلکہ اس سے بھی زائد ہے، ایسے بڑے گاؤں شریعت میں قصبہ کا حکم رکھتے ہیں؛ اس لئے ایسے گاؤں میں جمعہ کا قیام بلا تردد و بلا شبہ جائز ہے۔ نیز مذکورہ گاؤں ہر طرح کی سہولیات اور ضروریات زندگی اور ذرائع نقل وحمل کی وجہ سے مکمل طور پر بڑے قصبہ اور شہر کے حکم کے دائرہ میں داخل ہو چکا ہے؛ اس لئے وہاں کے لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/۲۸۰، فتاوی دارالعلوم ۵/۳۴، ایضاح المسائل ص:۶۴، محمودیہ قدیم ۲/۳۰۴، ۳/۳۱۴، جدید ڈابھیل ۸/۹۸، ۱۰۲، بہشتی زیور اختری ۱۱/۸۱)

عن ابن جریجؓ قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ بعضها ببعض کهیئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا کنت في قریة جامعة فنؤدی للصلوة من یوم الجمعة، فحق علیک أن تشهدها، إن سمعت الآذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، کتاب الجمعة، باب القری الصغار، المجلس العلمي بیروت ۳/۱۶۸، رقم:۵۱۷۹)

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ررربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۶۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۸ھ

قریۂ کبیرہ میں جمعہ کے بجائے ظہر پڑھنا

سوال [۳۵۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں سنہولی میں تقریباً ساڑھے تین ہزار کی آبادی ہے، روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بھی ملتی ہیں، تین ڈاکٹر بھی ہیں۔ نیز پوسٹ آفس بھی ہے، ایک جامع مسجد اور ایک چھوٹی مسجد ہے، جامع مسجد میں بہت زمانہ سے نماز جمعہ وعید ہوتی آرہی ہے؛ لیکن بعض حضرات نماز جمعہ وعید کر کی ادائیگی کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس گاؤں میں نماز جمعہ کی شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے جمعہ وعیدین جائز نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو جو حضرات نماز جمعہ ادا نہیں کرتے اور ظہر پڑھتے ہیں، ان سے ظہر کی فرضیت ساقط ہوتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طاہر حسین، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس گاؤں کی آبادی ساڑھے تین ہزار ہے، وہ قریۂ کبیرہ ہے، اس میں بلا شبہ جمعہ جائز ہے؛ بلکہ واجب ہے اور عدم جواز ثابت کرنا درست نہیں ہے، جو لوگ ظہر پڑھتے ہیں ان سے ظہر تو ساقط ہو جائے گی، مگر جمعہ نہ پڑھنے کا گناہ ہوگا۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۸۰، امداد الفتاوی ۱/۶۲۲)

عن ابن جریجؒ قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ بعضها ببعض کهیئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا کنت في قریة جامعة فنؤدی للصلوة من یوم الجمعة، فحق علیک أن تشهدها، إن سمعت الأذان أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، کتاب الجمعة، باب القری الصغار، المجلس العلمي بیروت ۳/۱۶۸، رقم:۵۱۷۹)

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة الخ. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۱۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۷/ ۱۴۱۵ھ

بڑے گاؤں میں نماز جمعہ جائز ہے

سوال [۳۵۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے گاؤں میں تقریباً ڈھائی تین ہزار کی آبادی ہے اور کرانے وغیرہ کی دوکانیں ہیں، سرکاری اسکول اور مکتب بھی ہے، مگر کپڑے کی دوکان، لوہے کی دوکان نہیں ہے، عرف میں اس کو دیہات ہی کہتے ہیں، شہر اور قصبہ نہیں کہتے اور تقریباً چالیس پچاس برس سے میرے یہاں جمعہ کی نماز ہو رہی ہے، اب منع کرنے پر فتنہ کا شدید اندیشہ ہے، تو اس صورت میں ان کو منع کیا جائے یا چھوڑ دیا جائے؟

خلاصہ یہ کہ میرے گاؤں میں صرف آبادی ہے، بازار وغیرہ کچھ نہیں، تو کیا میرے گاؤں میں جمعہ وعیدین جائز ہے اور ظہر کی نماز ذمہ سے ساقط ہو جائے گی؟ اور اگر ساقط نہ ہوگی تو کیا جو جمعہ گاؤں میں پڑھے گئے ہیں، ان کی جگہ ظہر کی قضاء لازم ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: عبد اللہ خان قاسمی، ریاض العلوم، گورینی، جون پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ڈھائی تین ہزار کی آبادی کو قصبہ کا حکم دیا گیا ہے، چاہے وہاں باقاعدہ بازار نہ ہو؛ لہٰذا آپ کے گاؤں میں جمعہ وعیدین کی نماز جائز ہے اور ظہر ساقط ہو جائے گی۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/ ۵۸)

عن ابن جریج رضؓ قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ

بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنؤدى للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۳/۱٦۸، رقم:۵۱۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۱٦ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۴۱۵/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱٦/۴/۱۹ھ

قصبہ سے دو میل دور آبادی میں جمعہ جائز نہیں

سوال [۳۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس بڑی آبادی میں عندالاحناف جمعہ وعیدین پڑھنا درست ہے، اس کی حدود میں کتنی دور تک جمعہ وعیدین کی ادائے گی جائز ہوگی اور حدود سے مراد ''فناء'' ہے یا اس آبادی کا زمینی رقبہ کہ جہاں تک وہ پھیلا ہوا ہو وہاں تک کہیں بھی جمعہ پڑھ سکتے ہیں، استفتاء ہذا کے ساتھ منسلک دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کے فتاوی میں بڈیڈ کی حدود میں دو میل تک جہاں کہ ایک پہاڑ بھی حائل ہے جمعہ پڑھنے کی اجازت تحریر فرمائی گئی ہے، فناء میں جو چیزیں شامل ہیں وہ بڈیڈ کے آس پاس قریبی حصہ میں ہیں نہ کہ دو میل دور تک، بڈیڈ کے مضافات میں جو چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں وہ بڈیڈ میں سے ہی بسی ہیں اور بعض مستقل طور پر ہیں اور بڈیڈ کا زمینی رقبہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے، اگر قصبہ کی حدود مراد لی جائیں گی تو ہر آبادی والے اپنے نزدیک جمعہ وعیدین پڑھنا شروع کر دیں گے، جیسا کہ منسلک فتاوی میں گنجائش کی بنیاد پر ایک مدرسہ والوں نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے، خلاصۂ سوال یہ ہے کہ حدود سے زمینی رقبہ مراد ہے یا فناء؟

المستفتی: عبدالرحیم بڈیڈوی، گھڑ گاؤں (ہریانہ)

دارالعلوم دیوبند کا جواب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بستی ہے موضع بڈیڈ جس میں کافی عرصہ سے نماز جمعہ وعیدین ہوتی چلی آرہی ہے، اسی گاؤں کی کاشت کی زمین ہے جو تقریباً گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اور اسی زمین میں ایک پہاڑ بھی درمیان میں حائل ہے، پہاڑ کی دوسری جانب بڈیڈ کے بیس پچیس گھر آباد ہیں، ان گھروں کے قریب بڈیڈ ہی کی زمین میں ایک دینی مدرسہ بھی قائم ہے، مدرسہ کے قریب چھوٹے چھوٹے کئی گاؤں پڑتے ہیں، اکثر یہ لوگ جمعہ کی نماز سے محروم رہتے ہیں، ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں جمعہ وعیدین جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڈیڈ اگر قصبہ یا بڑی آبادی ہے اور اسی وجہ سے وہاں جمعہ ہوتا آرہا ہے، یعنی وہاں شرائط جمعہ پائے جاتے ہیں، تو بڈیڈ کے دوسرے حصہ میں جو آبادی ہے، وہاں بھی جمعہ پڑھنا اور عیدین کی نماز جائز ہے۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (رد المختار، کتاب الصلوة، باب الجمعة کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶)

وتؤدیٰ في مصر واحدٍ بمواضع کثیرة. (درمختار، کراچي ۲/۱۴۴، زکریا ۳/۱۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد ظفیر الدین عفا اللہ عنہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: ۱۲۳۴/۵۶۹۹)

الجواب صحیح:
کفیل الرحمٰن نشاط غفرلہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ

مدرسہ امینیہ دہلی کا جواب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیس پچیس گھر جو آباد ہیں اگر ایک ہی بستی کے ہیں، اس کو اور ان کو ایک ہی بستی شمار کیا جاتا ہے، تو ان گھروں میں یا ان کے پاس جو مدرسہ ہے، اس میں جمعہ کی

نماز پڑھ سکتے ہیں؛ اس لئے کہ جمعہ کی نماز میں تعدد جائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

دارالافتاء مدرسہ شاہی کا جواب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس قصبہ اور بڑی آبادی میں شرعاً نماز جمعہ جائز ہوتی ہے، اس کے فناء میں تو نماز جمعہ جائز ہے، مثلاً قبرستان، کھیل کا میدان وغیرہ، مگر اس قصبہ کی ملکیت کی زمین جو ایک ایک دو دو میل کے فاصلہ پر ہے اور قصبہ والوں نے اپنی جائیداد کی بناء پر وہاں رہائشی مکانات بھی بنالئے ہیں، ایسے فاصلہ اور اتنی دوری کی آبادی کو قصبہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے؛ اس لئے ان آبادیوں میں نماز جمعہ جائز نہیں ہے؛ کیونکہ جواز جمعہ کے لئے اتصال آبادی شرط ہے۔ اور سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ اتصال نہیں ہے؛ بلکہ کافی فاصلہ ہے؛ اس لئے بڈیڈ کے مضافات کی مذکورہ آبادیوں میں نماز جمعہ جائز نہیں ہے؛ کیونکہ زمینی رقبہ کا اعتبار نہیں؛ بلکہ فناء ہی کا اعتبار ہے اور دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ کا جواب ہم کو سمجھ میں نہیں آیا۔ جزئیہ ملاحظہ فرمائیں:

من كان مقيمًا في أطراف المصر ليس بينه وبين المصر فرجة؛ بل الأبنية متصلة إليه، فعليه الجمعة، وإن كان بينه وبين المصر فرجة من المزارع والمراعي فلا جمعة عليه، وإن كان يسمع النداء. (شرح كبيري، فصل في صلوة الجمعة، اشرفية ديوبند ٥٥٢، وهكذا في البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، زكريا ٢/٢٤٧، كوئٹه ٢/١٤١، قاضيخان على الهندية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعه، زكريا ١/١٧٤، جديد زكريا ١/١٠٩، الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس و العشرون في شرائط الجمعة، زكريا٢/٥٥٣، رقم: ٣٢٧٦، هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم١/١٤٥، جديد ١/٢٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۶۹۹/)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۴/۱ھ

ملے ہوئے دو گاؤں کو ایک شمار کر کے جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں دو گاؤں بالکل ملے ہوئے ہیں، ایک گاؤں کے اندر جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور دوسرے گاؤں میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی ہے؛ لیکن عیدین کی نماز ہوتی ہے، جو دونوں گاؤں ملے ہوئے ہیں ان کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے، ان دونوں گاؤں کو ملا ہوا تصور کر کے وہاں پر جمعہ کی نماز قائم کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: گلشاد احمد فیض آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اتحاد آبادی کا اعتبار یوں ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والا دونوں گاؤں کو ایک ہی تصور کرے، چاہے گاؤں والے الگ الگ شمار کرتے ہوں؛ چونکہ مذکورہ دونوں گاؤں کی کیفیت آبادی اسی طرح کی ہے اور دونوں گاؤں کی مجموعی آبادی؛ چونکہ پانچ ہزار ہے؛ لہٰذا یہ قصبہ کے حکم میں ہوگا اور اس میں بلا تردد جمعہ جائز ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/ ۳۰۴، ۲/ ۳۱۴، جدید ڈابھیل ۸/ ۹۱، ۱۰۶، امداد الفتاویٰ ۱/ ۶۲۴، بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰، ایضاح المسائل ص: ۶۵)

أنه بلدة كبيرة فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٣٧، زكريا ٣/ ٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۳۰۹/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۸/۱۱ھ

دو متصل آبادیوں میں جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو آبادی ہیں جو بالکل متصل ہیں، اس طرح کہ ناظر یہ نہیں سمجھتا کہ یہ دو آبادی ہیں؛ حالاں کہ سرکاری اعتبار سے دونوں کا الگ الگ نام ہے اور دونوں کے پردھان الگ الگ ہیں، دونوں کی ووٹر لسٹ الگ الگ ہے، تو کیا ہم دونوں میں اتحاد پیدا کر کے جمعہ کو قائم کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد طارق، مدرس مدرسہ ہدایت العلوم، مدار پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دونوں آبادیاں اس قدر متصل ہیں کہ باہر سے آنے والے اجنبی لوگ دونوں کے درمیان امتیاز نہ کر سکیں، تو وہ شرعی طور پر ایک ہی آبادی شمار ہوگی، اگر چہ سرکاری کاغذات و پردھان وغیرہ الگ الگ کیوں نہ ہوں اور دونوں آبادی کی مردم شماری جس میں ہندو مسلم، بچے، بوڑھے سب شامل ہیں تین ہزار سے تجاوز کر جاتی ہے، تو وہ بڑے گاؤں اور قصبہ کے حکم میں ہے اور ایسے قصبہ میں جمعہ پڑھنا واجب ہے۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/۴۱۱)

والقريتان المتدانيتان المتصل بناء إحداهما بالأخرىٰ، أو التي يرتفق أهل إحداهما بالأخرىٰ فهما كالقرية الواحدة. (الموسوعة ۲۷/۲۷۹)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق، وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶-۷، امداد الفتاوى ۱/۶۷۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ ؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۷۳۸)	۶/۷/۱۴۲۳ھ

تین چار بستیوں کا ایک جگہ مل کر جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے وطن میں مختلف بستیاں ہیں اور ہر بستی کی آبادی مختلف ہے، کسی بستی میں پانچ سو مسلم وغیر مسلم مرد وعورتیں ہیں اور کسی بستی میں ایک ہزار مسلم وغیر مسلم مرد وعورتیں ہیں؛ لیکن ضروریات کے سامان دستیاب ہونے کے اعتبار سے مذکورہ بستیوں میں سے کوئی بھی بستی ایسی نہیں ہے کہ ضرورت کے سارے سامان دستیاب ہوسکیں، یعنی شہر یا قصبہ کی کوئی شکل نہیں ہے، کیا ایسی بستیوں میں جمعہ یا جمعہ کے لئے مسجد قائم کرسکتے ہیں؟

دو تین یا چار پانچ بستی والے مل کر کسی ایک بستی کی مسجد کو جامع مسجد بنا کر نماز جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ مکمل ومدلل جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: عبداللہ حساس، جینتی پور روڈ، سرسید نگر کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بستی میں **۵۰۰** یا **۶۰۰** رسو مسلم غیر مسلم مرد وعورت، بچے، بوڑھے انسان رہتے ہوں، اس میں شرعی طور پر جمعہ جائز نہیں ہے، جمعہ کے جائز ہونے کے لئے کم از کم یہ لازم ہے کہ ڈھائی تین ہزار انسانوں کی آبادی ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے، نیز تین چار بستیاں مل کر ایک ساتھ ایک جگہ جمعہ قائم کریں تو یہ بھی جائز نہیں ہے؛ جبکہ ان بستیوں کے درمیان کھیت یا باغات وغیرہ کا فاصلہ ہو۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم دیوبند ۵/۵۶)

تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق، وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التى ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. كما في المضمرات. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶)

لاتجوز في القرىٰ. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، باب الجمعة، امداديه ملتان ۱/۱۰۶، دارالكتاب ديوبند ۱/۱۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۸۵/۳۸)

متصل چار گاؤں میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک ایسا قریہ ہے جس کا اصل نام مؤمن پور ہے، جس کے تحت چار قریہ ہیں۔ ۱. رسول پور ۲. مؤمن پور ۳. ہیرا پور ۴. پریتم پور، ان چاروں گاؤں کا پردھان ایک ہے، آرائش وضرورت کی ہر چیز ہر وقت ملتی ہے، ان چاروں گاؤں میں سے بعض میں صرف عیدین کی نماز ہوتی ہے جمعہ نہیں ہوتا، ان چاروں کی آبادی اگر ملائی جائے تو تین ہزار سے کہیں زائد ہوگی، ان چاروں گاؤں کے بالکل بیچ سے ایک ہمہ وقت چلتا ہوا پختہ روڈ ہے، اس میں ایک ڈاکخانہ ہے، جو چاروں گاؤں کا ہے، اس میں ایک بازار چوراہہ ہے، سات آٹھ شفا خانہ ہیں، میڈیکل، جنرل اسٹور، ہوٹل، پنکھا، نل، کپڑا، جوتا، چپل، سلائی مشین، سیمنٹ، کھاد، سریا، پلائی کی مشین، آرا مشین، رائس مل وغیرہ میں سے ہر ایک کی چھ چھ، سات سات دوکانیں موجود ہیں، تو آیا اس گاؤں میں نماز جمعہ اور عیدین جائز ہوگی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ ان چاروں گاؤں کا حکم الگ الگ لگے گا یا ڈاکخانہ اور پردھان کی وجہ سے ایک ہی کا حکم لگے گا؟

المستفتی: محمد اسعد، مینڈ پورہ، فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر چاروں گاؤں کے درمیان باقاعدہ کھیتوں کا فاصلہ ہے، ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہیں، تو سب الگ الگ آبادی ہیں، سب کا حکم بھی الگ الگ ہوگا، سب کا پردھان ڈاکخانہ ایک ہونے کی وجہ سے ایک آبادی کا حکم نہ ہوگا؛ بلکہ آبادی ایک ہونے کے لئے اتصال آبادی شرط ہے؛ لہٰذا اگر دو گاؤں متصل ہو گئے ہیں اور

ان کی آبادی تین ہزار یا اس سے زائد ہے، تو ان میں جمعہ جائز ہوگا ورنہ نہیں اور اگر متصل نہیں ہے، تو جس کی آبادی تین ہزار یا اس سے زائد ہے اس میں جمعہ جائز ہوگا اور جس میں کم ہے اس میں جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۵)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الكبيرة التي فيها أسواق، وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر، وخطيب. كما في المضمرات. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۱۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۱۸ھ

متصل دو آبادی میں جمعہ کی نماز کا حکم

سوال [۳۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ کے جواز کے متعلق بستی میں کشمکش کا ماحول ہے، کچھ لوگ دوبارہ فتوی حاصل کر کے اختلاف کے خاتمہ کے متمنی ہیں، نئی تحقیق کے مطابق بستی کے حالات مندرجہ ذیل ہیں۔

موضع شاہ پور کے کل چار موضع ہیں، دو میں کاشتکاری ہوتی ہے، دو میں آبادی ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں پر ایک ہی مسجد تھی اور قبرستان تو اب بھی دونوں موضعوں کا مشترکہ ہی ہے، پردھان بھی ایک ہی ہوا کرتا ہے، برساتی ندی سے گھر بہتے گئے اور دوبارہ بستے گئے، اس طرح پرانی مسجد سے بھی گھر دور ہوتے چلے گئے اور آبادی بھی بڑھتی گئی، گلی کوچوں سے مقامی لوگ ہی جانتے ہیں کہ موضع شاہ پور اور حسین ملک پور کی حدود کہاں کہاں ہیں، فاصلہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر کے آدمی کو اب بھی بغیر بتلائے معلوم نہیں ہوسکتا، مشہور بھی یہ بستی شاہ پور کے نام

سے ہے، موضع حسین ملک پور سے بہت کم لوگ واقف ہیں، ہر ایک کی آبادی اس طرح ہے کہ موضع شاہ پور کی آبادی تین ہزار سے زیادہ ہے، پرچون کی چھ دوکانیں ہیں، دو سرکاری اسکول ہیں، ایک کرانے کی دوکان، تین باہر کے ڈاکٹر ہیں، سرکاری کوٹہ بھی ہے، جہاں سے چینی اور مٹی کا تیل ملتا ہے، کپڑے کی مستقل دوکان تو نہیں ہے؛ لیکن معمولی ضرورت تو باہر سے بیچنے آنے والوں کے ذریعہ سے پوری ہو جاتی ہے، بیاہ شادی اور میت کے لئے کپڑا قصبہ بہٹ سے لانا پڑتا ہے، اہم ضروریات دونوں بستیوں کی قصبہ بہٹ ہی سے پوری ہوتی ہیں جو تقریباً تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، موضع حسین ملک پور کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے، پانچ، چھ پرچون کی دوکانیں، ایک مقامی، ایک بیرونی ڈاکٹر کی دوکان ہے، عام راستے کشادہ ہیں، ایک مدرسہ اور مدرسہ کی ایک مسجد اور ایک مسجد علیحدہ ہے؛ جبکہ موضع شاہ پور میں ایک ہی مسجد ہے، ان حالات میں کس بستی میں نماز جمعہ واجب ہے یا دونوں میں جائز ہے؟ اور نماز عید بھی دونوں بستی کے لوگ ایک ہی جگہ پڑھیں یا علیحدہ علیحدہ انتظام کریں؟ عیدگاہ گرام پنچایت کی جگہ میں پردھان اور ممبروں کی مرضی سے بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یونس، احمد گڈھ (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں بستیاں اس طرح مل چکی ہیں کہ دیکھنے والے دونوں کو ایک ہی سمجھیں گے تو ایسی صورت میں دونوں کی آبادی اقامت جمعہ کے لئے ایک ہی شمار ہوگی؛ لہٰذا ایسی شکل میں آبادی پانچ ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے؛ اس لئے وہاں پر نماز جمعہ وعیدین بلاشبہ جائز ہو جائیں گی۔

نیز دونوں کے لئے ایک عید اور ایک ہی جامع مسجد ہو تو زیادہ بہتر ہوگا اور متعدد مساجد میں بھی جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور عیدگاہ ایک ہی رہے تو بہتر ہے اور تعدد عیدگاہ اور تعدد جمعہ کے لئے پردھان کے تعدد کا اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ اقامت جمعہ وعیدین کے لئے صرف آبادی کی کثرت

اورقصبہ کی حیثیت ہونا کافی ہے۔

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرۃ التي فیھا أسواق الخ

(شامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۲۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ

مختلف گاؤں کو ایک مان کران میں جمعہ ہوسکتا ہے؟

سوال [۳۵۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کے گاؤں کی مجموعی آبادی مردم شماری کے اعتبار سے ۴۶۰۰/ رہے اور ووٹر لسٹ کے اعتبار سے دو ہزار پانچ سو سے زائد ہے، ان میں سے کچھ لوگوں نے ممبئی اور دوسرے مقامات پر گھر بنالئے ہیں، جن کی تعداد چھ سات سو سے زائد نہیں ہے، گاؤں کے اندران حضرات کا کبھی اہل وعیال کے ساتھ اور کبھی بغیر اہل وعیال کے آنا جانا ہوتا رہتا ہے، کچھ لوگ اپنے بچوں کی شادیاں وغیرہ بھی گاؤں ہی میں آکر کرتے ہیں، تو کیا مذکورہ گاؤں میں جمعہ کا قیام درست ہے؟ مدلل واضح فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

نوٹ: ضروریات کی چیزوں میں گوشت، مچھلی، کپڑا، چپل وغیرہ نہیں ملتا ہے، بقیہ چیزیں گاؤں کی دوکانوں میں دستیاب ہیں، گاؤں میں ڈاکخانہ ہے؛ لیکن پولس چوکی نہیں ہے اور گاؤں کا محل وقوع کچھ اس طرح ہے کہ وہ مختلف چھوٹے چھوٹے گاؤں پر مشتمل ایک بڑا گاؤں ہے اوران گاؤں کے اندر ہر ایک کو الگ الگ نام سے پکارا جاتا ہے؛ لیکن گاؤں سے باہر اور سرکاری کاغذات میں وہ سب بڑے گاؤں کے نام سے موسوم ہوتے ہیں اور ہر ایک چھوٹا گاؤں بڑے گاؤں سے کچھ کھیتوں کے فاصلہ پر ہے، ہر ایک کے مابین کم وبیش سو، دوسو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ گاؤں میں دو مسجدیں ہیں، ان میں سے ایک مسجد میں ۲۰/ سال سے زائد

عرصہ سے جمعہ کی نماز ادا کی جارہی ہے، اس وقت گاؤں کی آبادی بمشکل تمام ڈیڑھ ہزار رہی ہوگی اور گاؤں کے اکثر لوگ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں اور کچھ لوگ دوسری مسجد میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں۔ نیز ان تمام گاؤں کا پردھان بھی ایک ہی ہے۔

المستفتی: سہیل احمد، علی گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں طرز تحریر اور موقع وقوع کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک گاؤں نہیں ہے؛ بلکہ الگ الگ مختلف گاؤں ہیں، جن کی مجموعی آبادی اور مردم شماری ایک ساتھ بیان کی گئی ہے، جواز جمعہ کے لئے بغیر فصل کے متصل آبادی کا اعتبار ہے اور سوال نامہ میں ذکر کردہ الگ الگ کسی بھی گاؤں کی آبادی ڈھائی تین ہزار نہیں ہورہی ہے؛ لہٰذا شرعی طور پر ہر ایک گاؤں کو الگ الگ شمار کیا جائے گا؛ اسی لئے کھیتوں کے فاصلہ کے ساتھ مختلف آبادیوں کو ایک شمار کرکے ان گاؤوں میں جمعہ جائز نہ ہوگا؛ بلکہ جب بھی ان میں سے جس گاؤں کی تنہا آبادی ڈھائی تین ہزار کو پہنچ جائے، اس میں جمعہ جائز ہوسکتا ہے، ورنہ ان میں سے کسی بھی گاؤں میں جمعہ درست نہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ نے اس مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے عدم جواز کا حکم لکھا ہے؛ اس لئے ہم بھی اس میں عدم جواز ہی کی بات سمجھتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۱۵)

لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض، ومنبر و خطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۷)

ومن كان مقيماً بموضع بينه وبين المصر فرجة من المزارع والمراعي نحو القلع بنجاریٰ لاجمعة على أهل ذلك الموضع. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكرياقديم ۱/۱۴۵، جديد ۱/۲۰۵)

ولو كان بين ذلك الموضع و بين عمران المصر فرجة من المزارع والمراعي لاجمعة على أهل ذلك الموضع، و إن كان النداء يبلغهم.

(تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في شرائط الجمعة، زكريا ۲/۵۵۳، رقم: ۳۲۷۶)

وروي عن أبي حنيفةؒ: وهو بلدة كبيرة فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أو علم غيره ويرجع الناس إليه فيما وقع لهم من الحوادث، وهذا هو الأصح. (تاتار خانية، ۲/ ۵۴۹، رقم: ۳۲۶۶، شامي، زكريا ۳/ ۵، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۴۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۵۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۶ھ

شہر سے متصل ہونے والی آبادی میں نماز جمعہ وعیدین

سوال [۳۵۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندۂ ناچیز کو ایک مسئلہ میں بہت تردد ہے، ویسے چند کتابوں مثلاً امداد الفتاوی، امداد الاحکام، فتاوی رحیمیہ، فتاوی محمودیہ، احسن الفتاوی، فتاوی دار العلوم، شامی، البحر وغیرہ میں دیکھا مسئلہ سمجھ میں نہ آیا، وہ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے شہر کامٹی اور شہر ناگپور کے درمیان ۱۵؍ کلومیٹر کا فصل ہے اور دونوں میں شرائط جمعہ وعیدین کے پائے جانے کی وجہ سے جمعہ وعیدین ہوتی ہیں؛ لیکن ان دونوں شہروں کے درمیان اور شہر کامٹی سے بالکل متصل صرف ایک نالا حائل ہے ایک آبادی ہے جس کا نام بھی الگ ہے اور اس کا انتظام بھی الگ ہے، شہر کامٹی میونسپلٹی کے تحت ہے اور وہ متصل آبادی نگر پالیکا کے تحت ہے، وہ دیکھنے میں اتنی متصل ہے کہ اگر نیا آدمی دیکھے اور پہلے سے اس آبادی کے متعلق معلوم نہ ہو تو وہ شہر کامٹی ہی سمجھے گا، اس کی آبادی مسلم وغیر مسلم کل ملا کر ۷۰۰۰؍ سات ہزار ہے، ضرورت زندگی کی اکثر چیزیں مہیا ہیں، صرف ڈاکخانہ، ریلوے اسٹیشن نہیں ہے اور بازار

نہیں ہے، اس آبادی میں اہل ایمان نے ایک اچھی مسجد بنائی ہے، تو اس آبادی میں نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟

نوٹ: یہ آبادی فناء کامٹی نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ اس کا جواب جلد دے دیں تو بہت اچھا ہوگا۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، استاذ دارالعلوم کامٹی، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شہر کامٹی سے متصل جو آبادی ہے، وہ شرعی طور پر شہر کامٹی ہی کا حصہ قرار پائے گی، اس پر شہر کا حکم لاگو ہوگا، اگرچہ قانون حکومت کے اعتبار سے اس کا نام اور ذمہ دار الگ الگ کیوں نہ ہوں؛ اس لئے اس میں جمعہ قائم کرنا فرض ہوگا۔

نیز خود اس کی آبادی اتنی کثیر مقدار کو پہونچ چکی ہے کہ اگر یہ بالکل الگ ہوتی تب بھی اس پر شہر اور قریۂ کبیرہ کا حکم لگایا جاتا، ایسی بڑی آبادی میں یوں ہی جمعہ لازم ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس آبادی میں جامع مسجد بنا کر جمعہ قائم کرنا بلا شبہ جائز اور درست ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۶۷)

أو كان إحدهما تبعاً للآخر بحيث تجب الجمعة على ساكنه للاتحاد حكماً الخ (در مختار، کتاب الصلاة، باب صلوة المسافر، کراچي ۲/۱۲۶، زکریا دیوبند ۲/۶۰۷)

يجب على أهل المواضع القريبة إلى البلد التي هي توابع العمران الخ (البحر الرائق، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا دیوبند ۲/۲۴۸، کوئٹه ۲/۱۴۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۲۳۲/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۶ھ

درمیان میں دو تین کلومیٹر کے فاصلے والی دو بستیوں کو ایک شمار کر کے جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں بعض بستیوں کا بساؤ ایک ایک، دو دو، تین تین کلومیٹر فاصلہ پر ہیں، جس میں بعض بستیوں کی مردم شماری چار سو، بعض کی پانچ سو، بعض کی اس سے کم وزیادہ ہے، تقریباً سبھی بستیوں میں مساجد ومکاتب ہیں جو آباد ہیں۔

نیز گورنمنٹ ان میں سے تین تین، چار چار کو ملا کر ایک گاؤں اور پنچایت قرار دے کران میں سرپنچ، وارڈ ممبر کے ووٹ کرواتی ہے، اس طرح تین چار بستیوں کو ملانے سے بعض کی مردم شماری تین چار ہزار کو پہنچ جاتی ہے اوران میں کچھ ضروریات انسانی (کرانہ وغیرہ) بھی دستیاب ہوتی ہیں، اس علاقہ کے عرف میں چھوٹی ایک بستی کو ڈھانی اور گورنمنٹ کی ملا کر گاؤں پنچایت قرار دی ہوئی بستی کو ایک گاؤں سمجھا اور کہا جاتا ہے؛ لہٰذا گورنمنٹ اور عرف کی اتباع میں اس طرح کی بستیوں کو ملا کر ایک بڑا گاؤں مان کران میں جمعہ کا جواز قرار دینا شرعاً کیسا ہے؟

نوٹ: فصل اور وصل کتنا معتبر ہے، یعنی کتنی دور کی آبادی کو ایک قرار دیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: مختار احمد قاسمی، خادم مدرسہ خادم الاسلام بھاکری (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن گاؤں کے درمیان دو دو، تین تین کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور درمیان میں کھیتی وغیرہ ہے ان کو بالکل الگ الگ دیہات شمار کیا جاتا ہے؛ لہٰذا ایسے مختلف گاؤں کو ملا کر ایک آبادی شمار کرکے جمعہ کا قیام درست نہیں ہے۔

ألا ترى أنهم لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۱۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۸/ ۱۴۲۷ھ

شہر سے ڈیڑھ کلومیٹر دوری پر واقع مدرسہ کی مسجد میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا مدرسہ جس میں تقریباً دوسو پچاس طلبہ مقامی و بیرونی زیرِ تعلیم ہیں، جنگل میں گاؤں سے (جس کی آبادی کم وبیش ۲۴۰۰۰) سے ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر لب سڑک واقع ہے اورقدرے فاصلہ پر ایک دوسرا مدرسہ اسکول اور گنوں کا میل بھی ہے، بعض مرتبہ ان جگہوں بھی نماز جمعہ پڑھنے کے لئے لوگ تشریف لاتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمارے اس مدرسہ کی مسجد میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد لقمان قاسمی، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چوبیس ہزار کی آبادی والے گاؤں سے ڈیڑھ کلومیٹر دوری پر لب سڑک جنگل میں مدرسہ ہے، مدرسہ اور آبادی کے درمیان اس ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ میں جنگلات اور کھیت وغیرہ ہیں اور مدرسہ کے آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے، تو ایسے مدرسہ کی مسجد میں جمعہ پڑھنا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ جمعہ کی شرائط میں سے اہم ترین شرط یہ ہے کہ جمعہ شہر یا قصبہ یا بڑے گاؤں میں ہو، یہاں چھوٹا گاؤں بھی نہیں ہے۔

ویشترط لصحتها سبعة أشياء: الأول المصر......أو فناؤه الخ (وتحته في الشاميه:) في ما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض......ألا ترىٰ أن في الجواهر: لو صلّوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۱۳۷/۲، زكريا۳/ ٤-۷)

لاتصح الجمعة إلا في مصر جامع، أو في مصلى المصر، ولاتجوز في القرىٰ. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة اشرفی ديو بند۱ /۱٦۸)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي،

كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۱۳۸/۲، زكريا ۶/۳)

عن علي رضي الله عنه أنه قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة من قال: لاجمعة، ولاتشريق، إلا في مصر جامع، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۴/۴۶، رقم:۵۰۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۰۲۷/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۴/۱۴ھ

جنگل میں واقع مدرسہ میں جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا مدرسہ شہر سے سات کلومیٹر دوری پر جنگل میں واقع ہے، مدرسہ ہذا میں ایک سو ساٹھ طلبہ زیر تعلیم ہیں، گیارہ اساتذہ اور پانچ ملازمین ہیں، مدرسہ سے جنوب کی سمت پانچ کلو میٹر دوری پر ایک گاؤں واقع ہے، جس میں تقریباً پچاس مسلم گھر ہیں اور وہاں نماز جمعہ بھی ہوتی ہے اور مدرسہ سے مغرب کی سمت تین کلومیٹر پر ایک دیہات واقع ہے، وہاں بھی دس مسلم گھر ہیں، ویسے ہم یہاں نماز جمعہ ادا کر رہے تھے؛ لیکن ایک عالم دین کے کہنے کی وجہ سے بند کر دیا ہے، اگر نماز جمعہ نہیں پڑھ سکتے تو جو چند جمعہ کی نمازیں اس سے پہلے پڑھی گئی ہیں ان کا کیا مسئلہ ہے؟ اور اگر پڑھ سکتے ہیں، تو جو ہم ظہر ادا کر رہے ہیں اس کا کیا مسئلہ ہے؟

المستفتی: منجانب مدرسہ بیت العلوم سندگی، بیجاپور (کرناٹک)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ شہر، قصبہ، بڑے گاؤں میں جائز ہے، اس کے علاوہ دیہات، چھوٹے گاؤں یا جنگل میں جائز نہیں اور آپ کا یہ مدرسہ چونکہ آبادی سے دور جنگل میں واقع ہے؛ اس لئے اس مدرسہ میں جمعہ جائز نہیں؛ بلکہ ظہر پڑھنا لازم ہے، وہاں رہتے ہوئے جمعہ پڑھنے سے فریضۂ ظہر ذمہ سے ساقط نہ ہوگا؛ اس لئے چند مرتبہ جو جمعہ

پڑھ لیا گیا ہے، اس کی جگہ ظہر کی قضاء نماز پڑھ لیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/۱۹۳، جدید زکریا ۳/۲۳۹، جدید زکریا مطول ۵/۱۲۰، دار العلوم ۵/۵۸)

لا جمعة بعرفات في قولهم جميعاً؛ لأنها قضاء. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة اشرفي ديو بند ١/١٦٨)

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة...... لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٣٨، زكريا ٣/٦-٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۶۱/۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۸/۱۷ھ

فرم میں جہاں اذن عام نہ ہو نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دہلی روڈ پر ایک فرم میں تین وقت ظہر، عصر اور مغرب کی نماز ہوتی ہے، فرم میں نماز پڑھنے کی جگہ متعین ہے، اس میں صرف فرم کے لوگ ہی نماز پڑھتے ہیں، فرم کے ملازمین یا ذمہ داران کے علاوہ باہر کے لوگوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تو کیا اس جگہ میں نماز جمعہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: منشی جی، وینش انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر فرم کے اندر نماز کی جگہ بنائی گئی ہے اور اس فیکٹری میں وہاں کے عملہ کے علاوہ ہر طرح کے مسلمانوں کی آمد و رفت پر پابندی ہے اور صرف عملہ ہی کے نماز پڑھنے کا انتظام ہے، تو ایسی جگہ اذن عام نہ ہونے کی وجہ سے جمعہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، جمعہ ایسی جگہ جائز ہوتا ہے جہاں پر ایمان والے کو بلا کسی روک ٹوک کے آنے

جانے کی اجازت ہوتی ہے، چاہے اس جگہ سے متعلق ہوں یا کہیں اور سے آرہے ہوں، آدمی دیندار ہوں یا نہ ہوں صرف مسلمان ہونا کافی ہے۔

والإذن العام: أي شرط صحتها الأداء على سبيل الاشتهار؛ حتى لو أن أميراً أغلق أبواب الحصن وصلى فيه بأهله، وعسكره صلاة الجمعة لاتجوز.

(البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، زكريا ٢/ ٢٦٣، ٢٦٤، كوئٹه٢/ ١٥١)

ومنها الإذن العام، وهو أن تفتح أبواب الجامع، فيؤذن للناس كافة حتى أن جماعة لو اجتمعوا في الجامع وأغلقوا أبواب المسجد على أنفسهم وجمعوا لم يجز. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكرياقديم ١/ ١٤٨، جديد ١/ ٢٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۸۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱/۱۴۳۱ھ

فناءِ شہر میں قیام جمعہ درست ہے

سوال [۳۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رامپور دوراہہ کبیر نگر کالونی میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے، اس مسجد میں نماز جمعہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، لوگوں کی نماز جمعہ کے لئے اکثریت بھی کم ہے، نماز جمعہ کے لئے مسئلہ میرے خیال سے ایک یہ بھی ہے کہ چالیس جوان آدمیوں کا ہونا بھی شرط ہے، کبھی اس مسجد میں چالیس آدمی ہوجاتے ہیں، کبھی کم ہوجاتے ہے، کبیر نگر کالونی سے قریب ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر جامعہ امدادیہ کی جامع مسجد ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں جاتے ہوئے پریشانی ہوتی ہے، بارش کے موسم میں بارش بھی ہے، گرمی کے موسم میں گرمی بھی ہے، تو کیا ایسی صورت میں نماز جمعہ جائز ہے؟ اور اس مسجد میں اب تک دو جمعہ ہوچکے ہیں۔

المستفتی: جناب قاری لیاقت حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ مسجد آبادی ٹاؤن ایریا کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لئے یہاں نماز جمعہ شرعاً درست ہوجائے گی، چالیس آدمی ہونا شرط نہیں ہے۔

السادس: الجماعة وأقلها ثلاثة رجالٍ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في قول الخطيب، كراچي ١٥١/٢، زكريا ٢٤/٣)

نیز نماز جمعہ شہر اور فناء شہر میں جائز ہے۔

ويشترط لصحتها المصر، أو فناؤه. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ١٣٨/٢، زكريا ٣/٥-٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۴۴۹/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۱۹ھ

فناء شہر میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مقام ہٹوارہ جے پور شہر سے ۱۲؍ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں بھینسوں کا کاروبار ہوتا ہے اور یہاں مسلمانوں کے تقریباً پچاس ڈیرے ہیں اور کچھ ڈیرے غیر مسلموں کے بھی ہیں، یہ علاقہ جے پور نگر نگم کی ماتحتی میں آگیا ہے اور یہاں کی ضروریات بھی شہر ہی سے پوری ہوتی ہیں اور یہاں سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر شہر کی جانب پوسٹ آفس اور بینک بھی ہے، اس سے کچھ فاصلہ پر جامعۃ الہدایۃ ہے، تو کیا ایسی صورت میں ہٹوارہ میں نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالسلام، ہٹوارہ، جے پور (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر موضع ہٹوارہ میں ڈیرا اور آبادی ملا کر ڈھائی تین ہزار افراد پر مشتمل نہیں ہے اور جے پور شہر کی آبادی یا شہر کے میدان قبرستان اور فناء شہر کا سلسلہ ہٹوارہ تک نہیں پہونچا ہے؛ بلکہ درمیان میں بڑے بڑے کھیتوں کا فاصلہ ہے، تو وہاں جمعہ کی نماز صحیح نہ ہوگی اور اگر کھیتوں کا فاصلہ نہیں ہے؛ بلکہ شہر کے ملوں اور فیکٹریوں کا سلسلہ وہاں تک پہونچ گیا ہے، تو جمعہ جائز ہوگا۔

وإذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه، فليحفظ، أو فناؤه وهو ما حوله اتصل به الخ (درمختار، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۷، کراچي ۲/۱۳۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۵۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۶/ ۱۴۱۶ھ

جیل میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم یہاں جیل میں دوسو نمازی ہیں، پنج وقتہ نمازیں ایک برآمدہ میں پڑھتے ہیں، نماز جمعہ بھی پڑھنا چاہتے ہیں؛ اس لئے کہ جیل سے باہر نہیں جاسکتے، تو قیدیوں میں سے کسی قیدی کو جو پڑھا لکھا مشرع ہو اسے یا مشرع نہ ہو تو کسی کو امام بنا کر نماز جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: سخاوت حسین، جیل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہاں پر کسی کی روک ٹوک نہ ہو؛ بلکہ ہر ایک کو وہاں پہونچ کر نماز میں شرکت کی عام اجازت ہو اور جیل میں ہر ایک کو آنے جانے کی عام اجازت نہیں ہوتی؛ اس لئے جیل میں جمعہ جائز نہیں؛ بلکہ ان لوگوں پر ظہر کی نماز فرض ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۲/۷۵ ۲۷، امداد الاحکام ۲/۱۷ ۳)

والإذن العام: أي شرط صحتها الأداء على سبيل الاشتهار؛ حتى لو أن أميراً أغلق أبواب الحصن وصلى فيه بأهله، وعسكره صلاة الجمعة لاتجوز. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلوٰة الجمعة، زكريا ۲/ ۲٦۳، ۲٦٤، كراچي ۲/ ۱٥۱، بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، باب الجماعة من شروط الجمعة، زكريا ۱/ ۳۰٦، كبيري، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، سهيل اكيڈمي ص: ٥٥۸، قديم ٥۱۸، درمختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، قبيل مطلب في وجوب الجمعة، كراچي ۲/ ۱٥۱، زكريا ۳/ ۲٦)

اگر قیدیوں میں کوئی شخص مشرع ہے جو قرآن پڑھنا جانتا ہو تو پنج گانہ نماز میں اسی کو امام بنایا جائے گا اور اگر کوئی مشرع نہیں تو موجودہ افراد میں سے جو شخص بھی بقدر ضرورت قرآن پڑھ کر نماز پڑھا سکتا ہو، تو اس کو امام بنا کر نماز پڑھ لینے سے بھی نماز درست ہو جائے گی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲/ ۲٦٤، دارالعلوم ۲/ ۲۲٤، ۳/ ۱۸۱)

ويكره تقديم العبد والأعرابي والفاسق، فإن تقدموا جاز (قدوري) وفي الجوهرة: لقوله عليه السلام: صلّوا خلف كل بر و فاجر؛ لأن ابن عمرو أنس بن مالك وغيرهما من الصحابة، والتابعين كانوا يصلون خلف الحجاج مع أنه كان أفسق أهل زمانه. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، دارالكتاب جديد ۱/ ۷۱، امدادية ملتان ۱/ ۷۰)

صلى خلف فاسق، أو مبتدع نال فضل الجماعة. أفاد أن الصلوٰة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لاينال كما ينال خلف تقي ورع. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، قبيل مطلب في إمامة الأمرد، كراچي ۱/ ٥٦٤،

زکریا۲/ ۳۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ر شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۹۳۵۸)

کیا جیل میں جمعہ پڑھنا جائز ہے؟

سوال[۳۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیل میں نماز جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ یہاں کوئی امام نہیں ہے، کیا ہم قیدی کسی بھی قیدی کو اپنا امام بنا سکتے ہیں؟

المستفتی: عبدالقدیر، ضلع کاراگار (جیل) مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہاں پر کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہو؛ بلکہ ہر ایک کو وہاں پہونچ کر نماز میں شرکت کی عام اجازت ہو اور چونکہ جیل میں ہر ایک کو آنے جانے کی عام اجازت نہیں ہوتی؛ اس لئے جیل میں جمعہ جائز نہیں؛ بلکہ ان لوگوں پر ظہر کی نماز فرض ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۲۷۵، جدید ڈابھیل ۸/ ۱۸۲، امداد الاحکام ۲/ ۳۷۱)

والإذن العام: أي شرط صحتها الأداء على سبيل الاشتهار؛ حتى لو أن أميراً أغلق أبواب الحصن وصلى فيه بأهله، وعسكره صلاة الجمعة لاتجوز. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة،، زكريا ٢/ ٢٦٣، ٢٦٤، كراچي ٢/ ١٥١، بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، باب صلوة الجماعة شروط الجمعة من شروط الجماعة، زكريا ١/ ٦٠٣، قديم ١/ ٢٣٩، كتاب الصلاة، باب الجمعة سهيل اكيڈمي، ٥٥٨، قديم ٥١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ ارشعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۳۵۷/۳۶)

جیل میں جمعہ

سوال [۳۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیلوں میں جمعہ کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟ ہم تو فی الحال جیل میں جمعہ کی نماز ادا کررہے ہیں، اگر جیل کے قیدی یا بندی میں سے کوئی آدمی جمعہ کی نماز پڑھانے کے قابل ہوتو وہ جمعہ کی نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ مرادآباد جیل میں پانچ احاطے ہیں ہر احاطہ کے آدمی دوسرے احاطے میں جاتے رہتے ہیں۔ اور فجر کے علاوہ باقی چار نمازیں ہر احاطے کی مسجد میں باجماعت ادا ہوتی ہیں اور جمعہ کی نماز ادا کرنے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے؟

المستفتی: محمد رئیس خاں، سالارپوری، بیرک ۹، احاطہ ۱۱، جیل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جیل میں جواز جمعہ سے متعلق اہل فتاوی کے درمیان کچھ اختلاف ہے، حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے فتاوی محمودیہ میں اور حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے احسن الفتاوی میں کافی لمبی بحث کرنے کے بعد اخیر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بڑی جیل، بڑی فیکٹری اور شہر کے اندر ایئرپورٹ وغیرہ کو مستقل آبادی کے حکم میں قرار دے کر جمعہ کو جائز قرار دیا ہے؛ لیکن حضرات فقہاء نے جواز جمعہ کے لئے اذن عام کو جو شرط قرار دیا ہے اس کے پیش نظر مذکورہ بزرگوں کے جواز کے دلائل ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

نیز قلعہ پر قیاس کی بات بھی ہم کو سمجھ میں نہیں آئی؛ اس لئے کہ قلعہ میں جس طرح آنے جانے کی اجازت ہوتی ہے جیل خانہ میں اس طرح اجازت نہیں ہوتی ہے۔ نیز حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی نے مذکورہ بند جگہوں میں رہنے والوں کو یہ جو کہا ہے کہ وہاں آباد ہیں، یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی؛ اس لئے کہ مذکورہ جگہوں میں جو لوگ رہتے ہیں، ان کے اوپر آبادی کی

تعریف کو ثابت کرنا ہماری سمجھ سے بالا تر ہے، اس کے برخلاف مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تعلیم الاسلام حصہ چہارم ۷۴؍ میں مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے فتاوی دارالعلوم ۵/ ۹۰/ اور ۵/ ۱۰۸ میں اور حضرت مفتی عبدالکریم گمتھلوی اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے امداد الاحکام ۲/ ۱۷۳ تا ۲۷۲ میں تفصیلی بحث کے ساتھ اور حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ فتاوی رحیمیہ قدیم ۵/ ۴۲ تا ۴۸، میں مفصل وضاحت کے ساتھ اور شیخ الاسلام، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مکتوبات شیخ الاسلام ۱/ ۳۰۸؍ میں اور سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے نور الاصباح ۱۲۵ میں صاف وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ جیل خانہ میں اذن عام نہ ہونے کی وجہ سے نماز جمعہ جائز نہیں ہے اور مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے علامہ شامی کی اس توجیہ کا جواب بھی واضح فرمایا ہے: جس میں تعدد جمعہ کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، کہ اگر شہر کی صرف ایک جامع مسجد میں جمعہ کی بات ہے، تو جس شہر کے قلعہ کے اندر نماز جمعہ پڑھی جارہی ہو، تو اس شہر کی جامع مسجد میں بھی نماز جمعہ ضرور ہوتی ہوگی؛ لہٰذا تعدد کا ثبوت ہوا اور تعدد کے باوجود اذن عام کی شرط اس میں لگائی گئی ہے، اسی طرح حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور ۱۱/ ۸۰ میں اور امداد الفتاوی ۱/ ۶۱۳ میں اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ نے علم الفقہ ۲/ ۱۱۶ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ جہاں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، وہاں جمعہ جائز نہیں ہے، مولانا مفتی یوسف صاحب لدھیانویؒ نے آپ کے مسائل اور ان کے حل میں بھی صراحت کے ساتھ جیل میں اذن عام نہ ہونے کی وجہ سے نماز جمعہ کو ناجائز لکھا ہے، ان تمام اکابر اہل فتاوی کی رائے کے مطابق نہ جیل خانہ میں نماز جمعہ جائز ہے اور نہ ہی شہر کے ایر پورٹ کے اندر کے حصہ میں جس میں ہوائی جہاز سے سفر کرنے والوں کے علاوہ دیگر لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، نماز جمعہ جائز نہیں ہوگی۔ اور یہی بات اکثر کتب فقہ کی عبارات سے واضح ہوتی ہے؛ لہٰذا جیل خانہ میں اور ایر پورٹ کے اندر کے حصہ میں نماز جمعہ ان دلائل اور عبارات کی روشنی میں جائز نہیں ہے؛ ہاں البتہ ایر پورٹ میں سیکورٹی سے باہر کے حصہ میں نماز جمعہ جائز ہوسکتی ہے، جہاں عام لوگوں کے آنے جانے میں

کوئی رکاوٹ نہیں ہے؛ لہٰذا حنفیہ کے نزدیک جیل خانہ میں اذن عام کے فقدان اور عام لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے نماز جمعہ جائز نہیں ہوگی۔

در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، قبيل مطلب في شروط وجوب الجمعة، زكريا۳/۲۵، كراچي ۲/۱۵۱، تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في شرائط الجمعة، زكريا ۲/۵۷۷، هندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ۱/۱۴۸، جديد زكريا ۱/۲۰۹، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، منحة الخالق على البحر الرائق، كراچي ۲/۱۵۱، زكريا ۲/۲۶۳، ۲۶۴، بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، باب الجمعة من شروط الجمعة، زكريا ۱/۶۰۳، الدر المنتقي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، مجمع الأنهر، وسكب الأنهر، بيروت ۱/۲۴۶، در مختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة اشرفية ۱/۱۱۲، كنز الدقائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة ۱/۴۴، تبيين الحقائق، وحاشية چلپي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۱/۵۳۳، امدادية ملتان ۱/۲۲۱، المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون، صلاة الجمعة، كراچي ۲/۱۹۷، دار الكتب العلمية بيروت ۲/۴۶۴، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دارالكتاب ۵۱۰، فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريادارالكتاب ۲/۴۹، كوئٹه ۲/۲۲۱، عناية و نهايه مع الفتح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ۲/۴۸، كوئٹه ۲/۲۲، حلبي كبيري، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، سهيل اكيڈمي ۵۵۸، المبسوط للسرخسي، الصلاة، باب صلاة الجمعة بيروت ۲/۲۳، نقاية للقهستاني، كتاب الصلاة، باب الجمعة قديم ۱/۱۷۷، الموسوعة الفقهية ۲۷/۲۰۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۴۸)

جیل میں نماز جمعہ وعیدین کے قیام کا حکم

سوال[۳۵۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ افسران جیل کی اجازت سے مسلم قیدیوں کو جیل کے اندر نماز جمعہ وعیدین پڑھائی جائے، تو کیا یہ نماز درست ہوگی؟ بہشتی گوہر ص:۳۷ (کتب خانہ رحیمیہ دیوبند) میں بعنوان ”جمعہ کی نماز صحیح ہونے کی شرطیں“ کے ذیل میں لکھا ہے۔ ”عام اجازت کے ساتھ علی الاشتہار نماز جمعہ کا پڑھنا“ پس خاص مقام پر چھپ کر نماز پڑھنا درست نہیں، اگر کسی ایسے مقام میں نماز جمعہ پڑھی جائے، جہاں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو یا جمعہ کے دن مسجد کے دروازے بند کر لیئے جائیں تو نماز نہ ہوگی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیل میں بھی نماز جمعہ درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ جیل میں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، کئی کئی تالے پڑے ہوتے ہیں اور پولیس کا پہرہ مزید برآں اور اگر جیل میں نماز جمعہ درست ہے تو بہشتی گوہر کی مندرجہ بالا عبارت کا کیا مطلب ہے؟ بصورت جواز صلوۃ في المحلبس حوالہ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: شریف احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحت جمعہ کے لئے اذن عام بھی شرط ہے؛ لہٰذا جس مقام میں ہر شخص کے آنے جانے کی اجازت نہیں ہے، وہاں نماز جمعہ مشروع نہیں ہے؛ لہٰذا اگر حکومت کی طرف سے جیل میں آنے جانے کی اجازت نہیں ہے تو اس میں نماز جمعہ مشروع نہیں ہوگی؛ بلکہ جیل کے اندر لوگ ظہر کی نماز پڑھیں گے، بہشتی گوہر کی عبارت صحیح ہے۔

ویشترط لصحتها سبعة أشیاء (إلی قوله) والسابع: الإذن العام. وتحته في الشامیة: أي أن یأذن للناس إذنا عاما بأن لا یمنع أحدا ممن تصح منه الجمعة عن دخول الموضع الذي تصلی فیه، وهذا مراد من فسر الإذن العام بالاشتهار. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، قبیل مطلب في شروط وجوب الجمعة، زکریا۳/۵-۲۵، کراچي ۱۵۱/۲، هکذا في البحر،

كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا۲/ ۲٦٣، كوئٹه ۲/ ١٥١، وهكذا في مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة بيروت ١/ ٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رمحرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۸۰)

فرم کے اندر بنائی گئی مسجد میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی فرم کے اندر پنج گانہ نماز کے لئے مسجد بنائی گئی ہے، مسجد میں تین ٹائم کی نماز تو پابندی سے ہوتی ہے اور نمازی بھی تقریباً ۳۵/ ۴۰ رہو جاتے ہیں، ظہر، عصر اور مغرب میں، مگر عشاء اور فجر کی جماعت مستقل نہیں ہوتی ہے اور اتوار کو بھی پانچوں نمازیں جماعت سے نہیں ہوتی ہے، زید اپنی ضرورت کے مطابق مسجد کی تبدیلی کرتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں زید فرم والی مسجد میں جمعہ کی نماز کروانا چاہتے ہیں صحیح کیا ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: ایم، ایچ ایکسپورٹ، سرسید نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں اگر چہ شرائط جمعہ موجود ہیں؛ لیکن مقاصد جمعہ فوت ہو جانے کی وجہ سے مکروہ ہے اور ایسا کرنے والوں کو مسئ اور برا کام کرنے والے سے فقہاء نے تعبیر فرمایا ہے اور جمعہ کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں ایک مرتبہ مسلمان ایک عام عبادت گاہ میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور فیکٹری کے اندر جمعہ قائم کرنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ نیز فیکٹری کے اندر جمعہ قائم کرنا اللہ کی عبادت کو اپنے کاروبار کے تابع کرنا ہے؛ جبکہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ اور اللہ کی عبادت کے تابع ہو جائے، ان مقاصد کی بناء پر حضرات فقہاء نے ایسی مخصوص جگہ اور فیکٹری میں قیام جمعہ کو

مکروہ اور برا کہا ہے اور جہاں فقہاء نے غیر مسجد میں جمعہ کے جواز کو لکھا ہے، وہ صرف اتفاقی ہے یا کسی عذر کی بنا پر اس کی گنجائش لکھی ہے، مستقل اور ہمیشگی کے طور پر شہر کی عام مسجد کو چھوڑ کر کسی کے گھر یا فیکٹری میں جمعہ کا سلسلہ جاری کرنے کی فقہاء اجازت نہیں دیتے۔

ولو أن أميراً فتح أبواب القصر، وأمر المؤذن، فأذن فجمع بالناس في قصره، فإنه يجزيهم، والمراد من فتح أبواب القصر الإذن للعامة بالدخول وقد أدي الجمعة، وهو مستجمع لشرائطها؛ ولكنه مسئ فيما صنع؛ لأن الموضع المعد لإقامة الجمعة فيه المسجد، وقد جفا ذلك الموضع و في فعله نوع ترفع حيث لم يخرج من قصره إلى المسجد، ففعله هذا مخالف فعل السلف، فكان مسيئاً في ذلك الخ (المبسوط للسرخسي، كتاب الصلاة، باب الجمعة ۲/ ۱۲۰، مطبع بيروت) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۱۴۱/ ۷)

فرم میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فرم کے اندر مسجد میں باہر کے کسی آدمی کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اتوار کو یعنی چھٹی والے دن مسجد میں کوئی نماز نہیں ہوتی اور روزانہ نماز فجر نہیں ہوتی۔ فرم کے سامنے ہی ایک مسجد ہے، جس میں ساری نمازیں باہتمام ہوتی ہیں، ان ساری صورتوں میں نماز جمعہ فرم کے اندر والی مسجد میں ہوگی یا نہیں؟ تفصیلی جواب دے کر عنداللہ ماجور رہوں۔

المستفتی: حافظ محمد زبیر صاحب، کرولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی مخصوص جگہ میں نماز جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، جہاں پر باہر کے لوگوں کو جمعہ پڑھنے کے لئے اجازت نہ ہو؛ لہٰذا ایسے فرم اور فیکٹری میں نماز جمعہ جائز نہیں ہوگی، جہاں پر مسلمانوں کو جمعہ پڑھنے کے لئے داخل ہونے کی عام اجازت نہ ہو؛ اس لئے کہ جمعہ کے جائز ہونے کے لئے جو شرائط شریعت نے قائم اور مقرر کئے ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس جگہ پر ہر مسلمان کو آنے جانے کی عام اجازت ہو۔

الشرط السادس: الإذن العام، وهو أن تفتح أبواب الجامع فيؤذن بالناس كافّة؛ حتى أن جماعةً لو اجتمعوا في الجامع، وأغلقوا أبواب المسجد على أنفسهم، وجمعوا لم يجزهم. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في شرائط الجمعة، زكريا ٢/ ٥٧٧، رقم: ٣٣٤٥)

من شرائط الجمعة: هو أداء الجمعة بطريق الاشتهار، حتى أن أميراً لو جمع جيشه في الحصن، وأغلق الأبواب وصلى بهم الجمعة لاتجزئهم...... ولو لم يأذن للعامة وصلى مع جيشه لاتجوز. (بدائع الصنائع، الصلاة الجماعة من شروط الجمعة، زكريا ١/ ٦٠٢)

والإذن العام، أي شرط صحتها الأداء على سبيل الاشتهار؛ حتى لو أن أميراً أغلق أبواب الحصن وصلى فيه بأهله وعسكره صلاة الجمعة لاتجوز...... وعللوا الأول بأنها من شعائر الاسلام وخصائص الدين، فيجب إقامتها على سبيل الاشتهار. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٥١، زكريا ٢/ ٢٦٤)

وفي الدر المنتقى: الجمعة...... لاتصح إلا بستة شروط شرطت لأدائها...... والإذن العام لأنها من شعائر الإسلام، فتؤدى بالشهرة بين الأنام، وهو يحصل بفتح باب الجامع، أو دار السلطان، أو القلعة بلا ممانع. (الدر المنتقي، كتاب الصلاة، باب الجمعة بيروت ١/ ٢٤٥، ٢٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۴۰۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۶/ ۱۴۳۲ھ

فرم اور مکانوں میں نماز جمعہ سے متعلق سوالات

سوال [۳۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ شہر مرادآباد اور پاکبڑا کے درمیان دونوں طرف آبادی کا اتصال ہے، اب ان دونوں جگہوں کے درمیان کوئی مسجد ہو تو وہاں جمعہ کی نماز درست ہے یا نہیں؟

(۲) اور اگر مسجد نہیں ہے؛ بلکہ درمیان میں جو فرم ہیں ان کے اندر جمعہ کی نماز درست ہو سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) نیز مکان کے اوپر حصے میں کاروبار ہو اور نیچے کوئی جگہ نماز کے لئے منتخب کر لی جائے یا نیچے کے حصے میں کاروبار ہو اور اوپر کوئی جگہ منتخب کر لی جائے، اس میں نماز جمعہ کا کیا حکم ہے؟ حالانکہ یہ کوئی مسجد نہیں ہے اور جن حالات کے تحت یہ معلومات درکار ہیں وہاں پر نماز جمعہ کے علاوہ دیگر ۵/ وقت کی نماز ایک جگہ ادا نہیں کی جاتی ہیں؛ بلکہ کبھی نیچے، کبھی اوپر، کبھی صحن میں اور کبھی آنگن میں۔

(۴) نیچے کاروبار ہے تو اوپر کوئی مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے یا اوپر کاروبار ہے تو نیچے مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز اگر ایسا ہو جائے تو وہ مسجد کہلائے گی یا نہیں اور کیا وہاں پر جمعہ ادا ہو جائیگا؟ گذارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر امت مسلمہ کو فیض بخشیں اور صحیح راستہ دکھائیں۔

المستفتی: محمد نسیم، ہرتھلا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرادآباد اور پاکبڑا کے درمیان اگر بغیر فصل کے اتصال آبادی ہے تو پاکبڑا تک شہر مرادآباد اور اس کے فنا میں داخل ہے؛ لہٰذا درمیان میں جو بھی مسجد

ہو،اس میں جمعہ قائم کرنا جائز اور درست ہو جائے گا۔

وتؤدي في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة،باب الجمعة، مطلب في جواز استنابة الخطيب، كراچي ۲/ ۱٤٤، زكريا۳/ ۱۵)

وتؤدي الجمعة في مصر واحد في مواضع كثيرة، وهو قول أبي حنيفةؒ، ومحمدؒ وهو الأصح. (هندية، الباب السادس عشر في صلوة الجمعة، زكريا قديم ۱/ ۱٤۵، جديد ۱/ ۲۰۵)

(۲) نماز جمعہ حدود شہر کے اندر مسجد اور غیر مسجد میں ہر جگہ صحیح اور جائز ہو جاتی ہے؛ لیکن جہاں پر جمعہ قائم کیا جائے، وہاں پر اذن عام کا ہونا شرط ہے اور اذن عام کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ہر مسلمان کو آنے جانے کی اجازت ہو، چاہے چور ڈکیت فاسق کیوں نہ ہو، مگر وہ نماز کے ارادے سے آرہا ہو، تو اسے بھی اجازت ملنی ضروری ہے اور فرموں اور فیکٹریوں میں اذن عام نہیں ہوتی، دربان ہر شخص کو اندر جانے نہیں دیتا؛ حالانکہ اذن عام کے لئے کھلی ہوئی اجازت شرط ہے، جو فیکٹریوں میں نہیں ہوتی؛ اس لئے نیچے اوپر کہیں بھی فیکٹریوں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں، وہاں البتہ اگر فیکٹری والوں نے کوئی جگہ ایسی متعین کردی ہے کہ جس میں آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، ہر قسم کے لوگوں کی آمد ورفت کی اجازت ہے، تو جمعہ جائز ہو جائے گا۔

الإذن العام: أي أن يأذن للناس إذنا عاماً، بأن لا يمنع أحداً. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، قبيل مطلب في شروط وجوب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۵۱، زكريا ۳/ ۲۵)

الشرط السادس: الإذن العام، حتى لو أن السلطان، أو الأمير إذا أغلق باب قصره، وصلى فيه بحشمه لاتجوز جمعته، وإن فتحه وأذن للناس بالدخول جازت سواء دخلوا أولا. (كبيري، كتاب الصلاة، باب الجمعة، اشرفية جديد ۵۵۸، قديم ۵۱۸)

ولايشترط الصلوة في البلد با لمسجد فتصح بفضاء فيها. (حاشية الطحطاوي على المراقي، الصلاة، باب الجمعة، دارالكتاب ديوبند ٥١٣، قديم ٢٧٩)

(۳) حدود شہر کے مکانوں میں بھی جمعہ پڑھنے کا وہی حکم ہے جو سوال نمبر۲ رمیں فرم اور فیکٹریوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

(۴) اگر عمارت پہلے سے بنی ہوئی نہیں ہے؛ بلکہ خالی میدان ہے اور ابھی مسجد نہیں بنائی گئی ،تو ایسی صورت میں تعمیر کی ابتداء میں نیچے کاروبار کے لئے عمارت بنالی جائے،جس کی آمدنی ضروریات مسجد میں صرف ہواور بعد میں اس کی چھت پر مسجد تعمیر کی جائے تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن مسجد بن جانے کے بعد اس کے اوپر کسی طرح کاروبار یا رہائشی عمارت وغیرہ بنانا جائز نہیں ہے؛ اس لئے مسجد بن جانے کے بعد اوپر عبادت ہی کی جگہ بن سکتی ہے، اس کے علاوہ نہیں، ایسی صورت میں عمارت کی وہ چھت جس کے اوپر مسجد تعمیر ہوئی ہے، وہ مسجد کے لئے وقف شمار ہوتی ہے،اوپر اور نیچے جتنی بھی چیزیں بنائی جائیں گی مسجد یا مصالح مسجد ہی کے لئے بنائی جاسکتی ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/ ۶۸۳)

أما لو تمت المسجدية، ثم أراد البناء منع. (شامي، الوقف، باب أحكام المساجد، قبيل مطلب فيما لو خرب المسجد أو غيره، كراچي ٤/ ٣٥٨، زكريا ٦/ ٥٤٨)

وإذا جعل تحته سردابًا لمصالحه: أي المسجد جاز. (در مختار مع الشامي، كراچي ٤/ ٣٥٨، زكريا ٦/ ٥٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۸۸۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۷/ ۱۴۲۶ھ

شہر سے خارج فیکٹری میں جمعہ کی نماز کا حکم

سوال [۳۵۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ آپ حضرات کے سامنے بھی ہم نے جمعہ کی نماز فیکٹری میں ادا کرنے کے بارے میں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق فیکٹری کا پورا جائزہ اور دارالعلوم دیوبند سے آیا جواب منسلک چٹھی میں درج ہے، آپ حضرات سے گذارش ہے کہ اس چٹھی کو پوری طرح سمجھ کر اس کا خلاصہ وضاحت کرنے کی مہربانی کریں تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔

المستفتی: عبدالاحد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مرادآباد سے قصبہ پاکبڑا دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور پاکبڑہ کی اصل آبادی سے مذکورہ فیکٹری دہلی روڈ پر دہلی کی طرف ڈیڑھ یا سوا کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور احقر نے مدرسہ شاہی کے نائب مہتمم حضرت مولانا محمد عمر صاحب اور دیگر علماء کرام کی معیت میں مرادآباد سے جویا تک تقریباً تیس کلومیٹر دہلی روڈ کا معائنہ کیا ہے۔ مرادآباد سے تیس کلومیٹر دور قصبہ جویا تک دہلی روڈ کی دونوں طرف کی ساری آراضی مرادآباد کے سرمایہ دار لوگوں نے خرید لی ہے اور کسی نے اپنی زمین پر صرف چہار دیواری کر رکھی ہے اور کسی نے کچھ تعمیر بھی کر لی ہے اور کسی نے باقاعدہ فیکٹری بنا کر کاروبار شروع کر رکھا ہے، مگر ان عمارتوں میں باضابطہ رہائش کسی کی بھی نہیں ہے؛ بلکہ مالکان اور ملازمین سب اپنے اپنے گھروں سے صبح کو جاتے ہیں اور شام کو فیکٹری بند کر کے اپنے اپنے گھر واپس چلے آتے ہیں اور اس مسافت میں کہیں کہیں دو تین گاؤں بھی واقع ہیں اور قصبہ پاکبڑا سے دہلی کی طرف چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر چودھر پور گاؤں واقع ہے، پھر وہاں سے چودہ کلومیٹر کے فاصلہ پر قصبہ جویا واقع ہے، تو اگر مذکورہ فیکٹری کو پاکبڑا کی فناء میں شامل کر کے اس میں جمعہ کی اجازت دی جائے گی، تو پاکبڑا سے چودھر پور تک اور پھر چودھر پور سے جویا تک سب جگہ جمعہ کی اجازت دینی پڑے گی، جہاں اسی طرح کی عمارت یا فیکٹری بنی ہوئی ہے۔ نیز مذکورہ فیکٹری میں صرف ایک وقت ظہر کی نماز ہوتی ہے باقی نمازیں نہیں ہوتیں، مذکورہ وجوہات کی بناء پر فی الحال اس فیکٹری میں جمعہ کی مشروعیت کی بات سمجھ میں نہیں آتی؛ بلکہ وہاں والوں کو جمعہ

کے دن اگر جمعہ پڑھنا ہے، تو قصبہ پاکبڑا میں آکر جمعہ پڑھنا چاہئے۔

إن كان مقيماً في عمران المصر، وأطرافه، وليس بين مكانه و بين المصر فرجة، فعليه الجمعة، ولو كان بين ذلك الموضع و بين عمران المصر فرجة من المزارع والمراعي لاجمعة على أهل تلك الموضع، وإن كان النداء يبلغهم. (تاتارخانية، الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في شرائط الجمعة، زكريا ٢/ ٥٥٣، رقم:٣٢٧٦، قديم ٢/ ٥٣، حلبي كبير، فصل في صلوة الجمعة اشرفيه ديوبند ص:٥٥٢، قاضي خان على الهندية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٧٤، زكريا جديد ١/ ١٠٩، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، كوئٹه ٢/ ١٤١، زكريا ٢/ ٢٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۶۵۰/۳۵)	۱۴۲۱/۵/۷ھ

پرانی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز بند کر کے نئی مسجد میں پڑھنا

سوال [۳۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اتر یہر پاڑہ گاؤں میں فی الحال لوگوں کی تعداد ۲۵۵۰/ ہے اور ضرورت کی تمام چیزیں مہیا ہیں، تقریباً سو سال پہلے سے اس گاؤں میں صرف ایک ہی جامع مسجد تھی، فی الحال اس گاؤں کے کچھ لوگوں نے پرانی جامع مسجد سے تقریباً دوسو گز کی دوری پر ایک وقتیہ مسجد مکتب کی شکل میں بنوا کر اس میں جمعہ کی نماز پڑھنی شروع کر دی ہے اور پرانی مسجد کی جائیداد بیچ کر، اسی طرح اس کی جمع شدہ رقم لے کر اس نئی مسجد کی تعمیر میں لگا رہے ہیں، فی الحال پرانی مسجد میں مصلیوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے پرانی مسجد میں جمعہ کی نماز بند ہوگئی، کسی طرح پانچ وقت کی نماز ہو رہی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ نئی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنا

درست ہے کہ نہیں؟ پرانی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز بند کر دینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ربیع الحق، مرشدآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جواز جمعہ کے لئے شہر یا قصبہ یا کافی بڑا گاؤں کا ہونا لازم ہے، جس گاؤں کی آبادی لگ بھگ تین ہزار ہو، جس میں ہندو مسلم، بچے، بوڑھے سب شامل ہوں گے اور اگر ایسی آبادی ہے، جس میں باضابطہ بازار اور گلی کوچے ہوں اور دیکھنے میں شہر نما ہو، تو ایسی آبادی میں کثرت افراد کی شرط نہیں ہے؛ بلکہ شہر نما ہونا کافی ہے، اب آپ کے یہاں کی آبادی کس نوعیت کی ہے، وہاں کے تجربہ کار علماء اور مفتیان کرام سے معائنہ کرایا جائے، وہ جو فیصلہ کریں اس پر عمل ہونا چاہئے اور دو ہزار پانچ سو پچاس کی مردم شماری جس دیہات اور گاؤں میں ہو وہ چھوٹا گاؤں شمار ہوتا ہے، ہاں البتہ اگر شہر نما ہو تو اس کو قصبہ کا حکم حاصل ہو جاتا ہے اور اگر آبادی شہر نما ہے، تو دونوں مسجدوں میں سے ایک ہی میں جمعہ ہونا بہتر ہوگا چاہے پرانی میں ہو چاہے نئی میں، اس بارے میں وہاں کے لوگ خود فیصلہ کریں، ہم اتنی دور رہ کر کے فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتے اور اگر آپ کے یہاں کی آبادی شہر نما نہیں ہے، تو دونوں مسجدوں میں سے کسی میں بھی جمعہ جائز نہ ہوگا؛ بلکہ دونوں میں جمعہ بند کر دینا ضروری ہوگا اور اذان واقامت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہوگا۔

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق (إلی قوله وفیما ذکرنا إشارة إلی أنه لا تجوز في الصغیرة. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۷)

عن عليؓ قال: لاجمعة، ولاتشریق، إلا في مصر جامع. (مصنف عبد الرزاق، کتاب الجمعة، باب القری الصغار، المجلس العلمي بیروت ۳/۱۶۷، رقم: ۵۱۷۵)

عن ابن جریجؒ قال: قلت لعطاء: ما القریة الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمیر، والقصاص، والدور المجتمعة غیر المفترقة الآخذ

بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة، والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنؤدي للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليك أن تشهدها، إن سمعت الأذان أو لم تسمعه. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۱۶۸/۳، رقم:۵۱۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۴۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۱۰ھ

مسجد سے متصل پارک میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد کی تعمیر ہورہی ہے اور مسجد سے دس قدم پر یا پندرہ قدم پر ایک پارک ہے، اس میں نماز جمعہ ادا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ پارک نگر پالیکا والوں کا ہے، عوام کے لئے بنایا ہے۔

المستفتی: متولی زکریا مسجد، محلّہ عیدگاہ، رام نگر نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعمیر کے زمانہ میں احاطہ مسجد کے اندر اگر جگہ کی گنجائش ہو تو جمعہ بھی وہیں ادا کیا جائے، بصورت دیگر مسجد سے متصل پارک میں نماز جمعہ ادا کی جاسکتی ہے۔

عن حذيفة رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فضلنا على الناس بثلاثٍ: جُعلت صفوفنا كصفوف الملائكة، وجعلت لنا الأرض كلها مسجداً. الحديث (صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، النسخة الهندية ۱۹۹/۱، بيت الأفكار رقم:۵۲۲)

ولو صلى الجمعة في قرية بغير مسجد جامع، والقرية كبيرة لها قرى، وفيها والٍ، وحاكم جازت الجمعة بنوا المسجد أو لم

ینو......والمسجد الجامع لیس بشرط؛ ولهذا أجمعوا علی جوازها بالمصلی في فناء المصر. (حلبي کبیري، فصل صلاة الجمعة، اشرفیة دیو بند ص:۵۵۱)

ولا یشترط الصلاة في البلد بالمسجد فتصح بفضاء فیها. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالکتاب دیوبند ۵۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۶۷۵/۳۵)

کبھی کبھار جماعت ہونے والی مسجد میں نماز جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی نماز کے شرائط میں سے کیا یہ شرط بھی ہے کہ جس مسجد میں جمعہ کی نماز ہو اس میں پنجوقتہ نماز با جماعت بھی ہو، اگر پانچوں وقت جماعت نہ ہوتی ہو؛ بلکہ کسی کسی وقت میں ہوتی ہو، تو جمعہ کی نماز ہوگی یا نہیں؟ نیز بعض مساجد ایسی بھی ہیں، جس میں ہفتہ بھر میں کبھی کبھی باجماعت نماز ہو جاتی ہے اور جمعہ میں کم وبیش دس پندرہ آدمی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی جمعہ میں بھی امام صاحب پنجوقتہ نمازوں کی طرح اکیلے ہی ظہر کی نماز پڑھ لیتے ہیں، ایسی صورت میں ایسی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد ہاشم قاسمی، چیرولی، ضلع کھمم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسی مسجد میں بھی جمعہ پڑھنا جائز اور درست ہے۔ نیز خارج مسجد کھلی جگہ پر جمعہ پڑھنا جائز ہوتا ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۹۸/۱۰، جدید ڈابھیل ۵۶،۵۳/۸)

عن حذیفة رضی قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: فضلنا علی

الناس بثلاثٍ: جُعلت صفوفنا كصفوف الملائكة، وجعلت لنا الأرض كلها مسجداً. الحديث (صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، النسخة الهندية ۱۹۹/۱، بيت الأفكار رقم:۵۲۲)

والحكم غير مقصور على المصلي؛ بل يجوز في جميع أفنية المصر؛ لأنها بمنزلته في حوائج أهله. (الهداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة اشرفي ۱۶۸/۱)

ولو صلى الجمعة في قرية بغير مسجد جامع، والقرية كبيرة لها قرى، وفيها والٍ، وحاكم جازت الجمعة بنوا المسجد أو لم يبنوا......والمسجد الجامع ليس بشرط؛ ولهذا أجمعوا جوازها بالمصلى في فناء المصر. (حلبي كبير، فصل صلاة الجمعة، اشرفية ديوبند ص:۵۵۱)

ولايشترط الصلاة في البلد بالمسجد فتصح بفضاء فيها. (حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ص:۵۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۲/۴۳۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۳/۱۴۱۶ھ

ہندو کی کمپنی کی تعمیر کے دوران عبادت خانہ بنا کر نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے گاؤں اور شہر بہت دور ہے، اتنی دور ہے کہ بس سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ جانے میں لگ جاتا ہے، اس گاؤں اور شہر سے بہت دور ایک کمپنی ہندو کی بن رہی ہے، اس کمپنی میں کام پانچ سال کا ہے، اس کمپنی میں مسلمان ہندو سب مل کر کام کرتے ہیں، مسلمانوں نے مل کر ہندو کی کمپنی میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی ہے اور گرمی، بارش اور گاڑی چھوٹنے کی وجہ سے اس مسجد میں پانچ وقت کی نماز، جمعہ وعیدین کی نماز بھی

ادا کرتے ہیں اور وہ جگہ جب کمپنی والوں کو ضرورت پڑے گی یا مسلمان دو تین سال کے بعد چلے جائیں گے، تو وہ مسجد کو منہدم کر دیں گے، ایسی جگہ مسجد تعمیر کر کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالواحد، بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوصورت حال سوال نامہ میں درج ہے، اس میں مسجد شرعی بنانے کی گنجائش نہیں ہے؛ البتہ پنج وقتہ نماز اور جمعہ کے لئے جو جگہ متعین کی گئی ہے، اسے جماعت خانہ یا عبادت گاہ کہا جاسکتا ہے، اس میں باجماعت نماز پڑھنے کی صورت میں جماعت کا ثواب تو مل جائے گا؛ لیکن مسجد شرعی کے حدود میں نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ملے گا اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس فیکٹری میں جمعہ وعیدین کی نماز اس وقت جائز ہوگی، جب اس میں لوگوں کو آنے کی عام اجازت ہو اور شہر کی مسلسل آبادی فیکٹری تک متصل ہو اور سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی سے ڈیڑھ گھنٹہ بس کی مسافت پر فیکٹری واقع ہے، تو گویا کہ فیکٹری دیہات اور جنگل میں ہے، ایسی جگہ جمعہ کی نماز درست نہیں ہوتی؛ اس لئے اس فیکٹری کے لوگوں پر جمعہ کی نماز پڑھنا لازم نہیں؛ بلکہ ظہر کی نماز باجماعت ادا کی جائے گی اور عیدین کی نماز پڑھنا بھی درست نہ ہوگا۔

كما يجوز أداء الجمعة في المصر، يجوز أداؤ ها في فناء المصر، وهو الموضع المعد لمصالح المصر متصلاً بالمصر. (هندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/١٤٥، زكريا جديد ١/٢٠٥)

ويشترط للعيد، ما يشترط للجمعة. (هندية، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، زكريا ١/١٥٠، جديد ١/٢١١)

ولو اتخذ في بيته موضعاً للصلاة، فليس له حكم المسجد أصلاً. (حلبي كبير، فصل في أحكام المساجد، اشرفية ديوبند ص:٦١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۷۲/۳۹)

چندہ کی وجہ سے عیدگاہ میں جمعہ پڑھنا

سوال [۳۵۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بابوگنج ایک گاؤں ہے، جس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار کی ہے، اس گاؤں میں چار مسجدیں ہیں اور ایک بڑی عیدگاہ ہے۔ ۳ر مساجد میں نماز جمعہ ہمیشہ ہوتی ہے، عیدگاہ کی نئی تعمیر ہورہی ہے، روپیوں کی ضرورت ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک باریا دوبار نماز جمعہ عیدگاہ پر ادا کی جائے تاکہ نماز جمعہ میں تمام لوگ جمع ہوں اور لوگوں سے چندہ کے بارے میں کہا جائے، تو عیدگاہ میں نماز جمعہ محض چندہ کی وجہ سے پڑھنا کیسا ہے؟ نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد ہارون بابوگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح عیدگاہ میں جمعہ کی نماز ادا کرنا جائز ہے۔

لاتصح الجمعة إلا في مصر جامعٍ، أو في مصلى المصر الخ (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/١٦٨)

وكما تجوز إقامة الجمعة في المصر، تجوز إقامتها خارج المصر قريباً منه مصلى العيد. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في شرائط الجمعة، زكريا ٢/٥٥٠، رقم: ٣٢٦٩، كوئٹه ٢/٥١)

لاتجب الجمعة عندنا إلا في مصر، أومما هو في حكمه كمصلى العيد.
(البناية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، اشرفية ٣/٤٢)

ويشترط لصحتها: أي صلاة الجمعة ستة أشياء. الأول: المصر، أو فناؤه، سواء مصلى العيد وغيره؛ لأنه بمنزلة المصر. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،

کتاب الصلاۃ، باب صلوۃ الجمعة، دارالکتاب دیوبند ص:۵۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸۷/۱۷)

تعمیر مسجد کے دوران حدود مسجد سے باہر جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے شہید کرلیا ہے، اس وقت مسجد کے اندرون اتنی جگہ نہیں ہے کہ جماعت ہو سکے؛ اس لئے وقتی طور پر پنج وقتہ نماز وضوخانہ کی جگہ پر پڑھ رہے ہیں؛ لیکن نماز جمعہ مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر فیکٹری میں ادا کرر ہے ہیں، کیا نماز جمعہ ادا کرنا فیکٹری میں درست ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مولانا محمد احسان، محلّہ تھانہ ٹین، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعمیر مسجد کے دوران حدود مسجد سے باہر فیکٹری یا کسی ہال میں وقتی طور پر عارضی جمعہ قائم کرنا جائز اور درست ہے، جب مسجد کی تعمیر مکمل ہو جائے، تو پھر مسجد میں جمعہ کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

أخبرنا جابر بن عبد الله، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أعطيت خمسًا لم يعطهن أحد قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الأرض مسجداً وطهوراً. الحديث (صحيح البخاري، كتاب التيمم ۱/۴۸، رقم:۳۳۳، ف:۳۳۵)

ولا يشترط الصلوة في البلد بالمسجد فتصح بفضاء فيها.

(طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دارالكتاب ديوبند

ص:۵۱۳، قدیم ۲۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵ / ۱۵۷)

مستقل امام اور کبھی کبھار جماعت نہ ہونے والی مسجد میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی مسجد میں جو کہ جامع مسجد ہے، اگر امام نہ ہو اور اس میں گاہے گاہے جماعت نہ ہوتی ہو، تو کیا اس جامع مسجد میں جمعہ کی نماز درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ملا جنگو، متولی جامع مسجد لا تھروپورہ، پوسٹ: اقبال پور، ضلع سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہ مسجد حدود شہر میں واقع ہے اور عام لوگوں کو نماز ادا کرنے کی اجازت ہے کوئی روک ٹوک نہیں ہے، تو جمعہ ادا کرنا درست اور صحیح ہے، کبھی کبھار جماعت نہ ہونا صحت جمعہ کے لئے مضر نہیں۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الكبيرة التي فيها أسواق. قال أبو القاسم: هذا بلا خلاف إذا أذن الوالي، أو القاضي ببناء المسجد الجامع، وأداء الجمعة؛ لأن هذا مجتهد فيه، فإذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۷، كراچي ۲/ ۱۳۸، کوئٹہ ۱/ ۵۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷ / ۷۷۳)

مدرسہ میں نماز جمعہ پڑھنا

سوال [۳۵۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضلع بریلی کے قصبہ میر گنج میں ایک مسجد ہے، جس میں امام مسلک دیوبند کے تھے؛ لیکن بریلوی خیالات کے کچھ شرپسندوں نے مسلک دیوبند کے امام کو مسجد سے نکال دیا، میر گنج ہی میں امام صاحب نے ایک مدرسہ بنوایا ہے، جب امام صاحب کو لوگوں نے نکال دیا، تو امام صاحب اوران سے تعلق رکھنے والے مقتدی حضرات مدرسہ ہی میں جماعت کے ساتھ پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں اوراس مدرسہ میں جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی ہے، کیا اس طرح سے دیگر بریلوی خیالات کی مسجدوں کے ہونے کے باوجود مدرسہ میں ان لوگوں کا جماعت کرنا صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو مدلل جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد راشد بریلوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بریلوی بدعتیوں کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے؛ اس لئے جب تک دیوبندی اہل سنت والجماعت کی مسجد قائم نہیں ہوجاتی، اس وقت تک مذکورہ مدرسہ میں پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنا درست ہے، اسی طرح جمعہ بھی پڑھا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ جمعہ کی صحت کے لئے مسجد کا ہونا شرط نہیں ہے؛ بلکہ بڑا گاؤں، قصبہ یا شہر ہونا شرط ہے اور میر گنج قصبہ ہے۔

ولو صلى الجمعة في قرية بغير مسجد جامع، والقرية كبيرة لها قرى، وفيها والٍ، وحاكم جازت الجمعة بنوا المسجد أو لم يبنوا. (حلبي كبير، فصل صلاة الجمعة، اشرفية ديو بند ۵۵۱)

وتؤدىٰ في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً على المذهب وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۴۴، ۱۴۵، زكريا ۳/۱۵)

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۰۶۴)

شہر کی بڑی مسجد کے خالی رہنے کے باوجود چھوٹی مسجد میں جمعہ

سوال [۳۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ ایک شہر میں ایک ہی مسجد میں مشروع ہے اور بتایا جاتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ بغداد شہر کا درمیانی پل اٹھا دیا کرتے تھے؛ کیونکہ دوسری طرف جمعہ الگ ہوتا تھا، فی زماننا بعض شہروں میں؛ بلکہ اکثر شہروں میں جمعہ چھوٹی چھوٹی مساجد میں قائم کیا جارہا ہے؛ بلکہ بعض قصبات میں تو حال یہ ہے کہ مسجدیں قریب قریب ہیں اور جمعہ میں پوری بھرتی بھی نہیں ہیں پھر بھی دونوں میں جمعہ ہوتا ہے؛ حتی کہ بڑی مسجد جو علاقہ کی جامع مسجد کی حیثیت رکھتی ہے، آدھی سے زائد خالی رہتی ہے، اس صورت میں فقہ حنفی کے ضوابط وقواعد کے مطابق قیام جمعہ کن کن مساجد میں درست ہے؟ اور کیا قریب ترین مساجد میں جمعہ میں باوجود خالی رہنے کے چھوٹی مساجد میں جمعہ جائز ہے؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں؟

المستفتی: محمد میاں قاسمی، ہلالی سرائے، سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک شہر کے اندر متعدد مساجد میں نماز جمعہ ادا کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ البتہ مسئولہ صورت میں جب بڑی مسجدیں خالی رہتی ہیں، تو چھوٹی مسجدوں میں جمعہ بند کر کے بڑی مسجدوں میں جمعہ کی نماز ادا کرنا بہتر اور اولیٰ ہے؛

کیونکہ اسلامی شان اور شرعی مصلحت یہی ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں جمعہ قائم ہوں، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعہ قائم نہ کئے جائیں؛ ہاں البتہ بڑی بڑی تمام مسجدوں میں نمازی ہر اعتبار سے بھر جائیں اور بہت سے مسلمانوں کو جمعہ کے لئے جگہ نہ مل رہی ہو، تو ایسی صورت میں چھوٹی مسجدوں میں بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؛ تا کہ شہر کا کوئی بھی مسلمان جمعہ سے محروم نہ رہ جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی، زکریا ۴/۱۱۳)

وتؤدي الجمعة في مصر واحد في مواضع كثيرة وهو الأصح.

(هندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ۱/ ۱٤٥، زكريا جديد ۱/ ۲۰٥، عزيز الفتاوى ۲۷۸/۳۹٦، ۱/ ۳۱۲، امداد المفتيين ٤۰٤)

وتصح في مصر واحد في مواضع كثيرة، فإن كان لا مشقة في اجتماع أهله في موضع واحد لاتجوز فيه الزيادة......لأنها من أعلام الدين. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲٤۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۲۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۶/۲۹ھ

میدان میں جمعہ کی نماز ادا کرنا

سوال [۳۵۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کورٹ اور ڈی سی آفس مسلم آبادی سے قریب ڈھائی کلومیٹر دوری پر ہے، یہاں پر ہم لوگ جمعہ کی نماز سرکاری زمین میں ایک چھوٹے سے میدان میں ادا کرتے ہیں، یہاں پر پانچوں وقت نماز نہیں ہوتی ہے، جمعہ میں وکیل، کرم چاری اور مؤکل وغیرہ ملا کر مجموعی طور پر ۲۵/ ۴۰/ تک ہو جاتے ہیں، اگر جمعہ کی نماز یہاں پر ادا نہ کی جائے تو ۳/ ۵/ آدمی

تک ہی ڈھائی کلومیٹر کی دوری کی مسجد جاکر نماز ادا کرتے ہیں، نماز ادا کرنے کے لئے سرکار سے کوئی اجازت نہیں لی گئی، اس کے پہلے دو تین نماز ادا کرنے میں مخالفت کرنے کی وجہ سے جگہ بدل دی گئی ہے، جب بارش یا چھٹی ہوتی ہے، تو اس جگہ جمعہ کی نماز نہیں ہوتی ہے، مندرجہ بالا صورت میں نماز جمعہ ادا ہوتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: عمیم الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز ادا کی جا رہی ہے، وہاں پر کورٹ و کچہری سب کچھ ہے اور یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ آبادی پورا قصبہ ہے، مگر مسلم آبادی نہیں ہے؛ اس لئے آس پاس میں مسجد نہیں ہے، اگر یہ بات صحیح ہے جو ہم نے سوال نامہ سے سمجھی ہے، تو جواب یہ ہے کہ صحت جمعہ کے لئے مسلم آبادی ہونا شرط نہیں ہے؛ بلکہ شہر یا قصبہ یا اتنا بڑا گاؤں ہونا شرط ہے، جو قصبہ نما ہو؛ لہٰذا جس میدان میں نماز جمعہ ہوتی ہے، اگر وہ غیر مسلم آبادی والے قصبہ کے اندر ہے، تو اس میدان میں بلا شبہ نماز جمعہ صحیح ہو جائے گی، باضابطہ تعمیر شدہ مسجد کا ہونا لازم نہیں ہے؛ اس لئے کہ وہاں پر تعمیر مسجد کا مسئلہ آسان نہیں ہے؛ لہٰذا اگر جامع مسجد میں جاکر نماز پڑھی جا سکتی ہے تو یہی بہتر ہے اور اگر دو ڈھائی کلومیٹر دور جامع مسجد جانا دشوار ہے، تو اس میدان میں بھی جمعہ کی نماز ہو جائے گی، بشرطیکہ یہ میدان ایسی آبادی کے اندر ہو، جس کی مردم شماری کم از کم تین ہزار ہو یا کورٹ، کچہری، بازار وغیرہ کی وجہ سے شہر جیسا معلوم ہوتا ہو۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۳۸، زكريا ۳/ ۶-۷)

عن ابن جريج ؓ قال: قلت لعطاء: ما القرية الجامعة؟ قال: ذات الجماعة، والأمير، والقصاص، والدور المجتمعة غير المفترقة الآخذ بعضها ببعض كهيئة جدة. قال: والقصاص؟ قال: فجدة جامعة،

والطائف. قال: وإذا كنت في قرية جامعة فنؤدی للصلوة من يوم الجمعة، فحق عليک أن تشهدها، إن سمعت الآذان، أو لم تسمعه. (مصنف عبدالرزاق، كتاب الجمعة، باب القرى الصغار، المجلس العلمي بيروت ۱٦۸/۳، رقم: ۵۱۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

کثرت کی وجہ سے دیوار حائل مکانات پر نماز جمعہ پڑھنا

سوال [۳۵۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ حیات الاسلام پانی پت کے احاطہ میں پنجوقتہ نماز ہوتی ہے، جمعہ بھی، تو جمعہ کے دن لوگوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے دیگر مکانات پر نماز ہوتی ہے، تو بیچ میں دیوار حائل ہے، تو کیا نماز لوگوں کی ادا ہوجائے گی؟

المستفتی: مدرسہ حیات العلوم، پانی پت (ہریانہ)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسجد میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے حدود مسجد سے باہر متصل مکانوں کی چھتوں پر مکانوں کے کمروں میں سڑکوں پر اقتداء کی جائے اور درمیان درمیان دیواریں اور چھتیں بیچ میں آجاتی ہیں اور امام کی تکبیر کی آواز یا مکبر کی تکبیر کی آواز کے ذریعہ سے دیواروں کے پیچھے کے لوگوں کو امام کی تکبیرات انتقالیہ کا پتہ چلتا ہے یا متصل صفوں کے ذریعہ سے پتہ چلتا ہے، تو ایسی صورت میں اس امام کی اقتداء میں تمام لوگوں کی نماز صحیح ہوجائے گی، دیواروں کا حائل ہوجانا یا چھتوں کا حائل ہونا مانع اقتداء نہیں ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو صورت ذکر کی گئی ہے، اس میں اگر دیوار کی آڑ میں مکانات میں اور مکانات کی چھتوں پر جو لوگ نماز پڑھتے ہیں، ان کو امام کی تکبیر یا مکبر کی آواز سنائی دیتی

ہے، توان سب کی نماز درست ہوجائے گی۔

وعلى هذا الاقتداء في المساكن المتصلة بالمسجد الحرام وأبوابها من خارجه صحيح إذا لم يشتبه حال الإمام بسماع، أو رؤية، ولم يتخلل إلا الجدار. كما ذكر شمس الأئمة: فيمن صلى على سطح بيته المتصل بالمسجد، أو في منزله بجنب المسجد، وبينه و بين المسجد حائط مقتديًا بإمام في المسجد، وهو يسمع التكبير من الإمام، أو من المكبر تجوز صلوته. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٦/ ٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۶/ ۱۴۲۳ھ

قریۂ کبیرہ میں متعدد مساجد میں جمعہ کا حکم

سوال [۳۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موضع گنگوار جس کی مردم شماری موجودہ حالت میں تقریباً ڈھائی ہزار ہے، جس میں چار مسجد ہیں کاروباری کام، نیز ضروریات زندگی کے جملہ سامان مہیا ہیں، ایک مدت سے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز اور بستی سے باہر عید کی نماز ہوتی چلی آرہی ہے، مگر رمضان کے مہینہ میں جمعہ کی نماز ایک مسجد میں ناکافی ہوجاتی ہے؛ لہٰذا دوسری جگہ نماز جمعہ کا ارادہ ہورہا ہے، تو کیا متعدد جگہوں پر جمعہ کی نماز ہوسکتی ہے؟

المستفتی: محلہ ساکنان گنگوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اتنی بڑی آبادی میں جمعہ جائز ہوسکتا ہے؛ اس لئے کہ یہ قریۂ کبیرہ اور قصبوں کے حکم میں ہے اور اگرچہ سب مساجد میں جمعہ جائز ہوسکتا ہے، مگر ایسے گاؤں میں صرف ایک مسجد میں جمعہ ہونا چاہئے، جو مسجد سب سے بڑی ہو؛ لہٰذا بہتر صورت

یہی ہے کہ ان مساجد میں سے جو سب سے بڑی ہو، اس میں سب لوگ جمع ہو کر جمعہ کی نماز ادا کیا کریں۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/۵۷)

وتؤدیٰ (أي الجمعة) في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً على المذهب......وعليه الفتوى. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ۲/۱۳۷، زكريا ۳/۵، وكذا في مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۲٤۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵۹۳/۳۱)

قصبہ کی تینوں مسجدوں میں جمعہ کی نماز کا حکم

سوال [۳۵۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی قصبہ میں تین مسجدیں ہیں، تو ان تینوں مسجدوں میں جمعہ کی نماز جائز ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد عباس، رائے پور، مقام و پوسٹ: رانی پور، جھانسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس جگہ اقامت جمعہ جائز ہے، وہاں تعدد جمعہ بھی جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/۱۷۵، زکریا جدید ۳/۲۲۱)

وتؤدیٰ في مصر واحدٍ في مواضع كثيرة الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۳/۵، كراچي ۲/۱۳۷، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، بيروت ۱/۲٤۷)

البتہ اگر چھوٹا شہر ہو یا قصبہ ہو تو اس میں ایک ہی مسجد میں جمعہ زیادہ افضل ہے، اگرچہ جائز سب میں کیوں نہ ہو۔

لو كان المصر صغيراً لا مشقة في اجتماع أهله في موضع واحدٍ لا تجوز فيه الزيادة على واحدٍ (إلى قوله) لأنها من أعلام الدين. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، بيروت ۱/۲٤۷، قديم ۱/۱٦۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۴۴)

ایک محلّہ کی دو مسجد میں نماز جمعہ

سوال [۴۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک محلّہ ہے اور اس میں دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک مسجد بڑی کہلاتی ہے اور ایک چھوٹی ہے اور محلّہ کے باہر ایک جامع مسجد ہے، جس میں جمعہ کی نماز ہوتی تھی اور اوپر کی دونوں مسجدوں میں نماز جمعہ نہیں ہوتی تھی، سارے لوگ اسی جامع مسجد میں جمعہ نماز ادا کرتے تھے، اتفاق ایسا ہوا کہ جامع مسجد کے امام صاحب چلے گئے اور اب محلّہ کی دونوں مسجدوں میں نماز جمعہ ادا ہونے لگی، جن میں پہلے نہیں ہوتی تھی اور دونوں مسجدوں کے درمیان غیر مسلموں کی آبادی بھی ہے اور ایک مسجد میں کل نمازی آٹھ، نو ہوتے ہیں اور ایک مسجد میں نمازیوں کی تعداد پندرہ، سولہ ہوتی ہے، اب اس چھوٹی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور ادا کی ہوئی نمازوں کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل مدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: اعجاز احمد، محلّہ گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ دونوں مسجدیں ایسی جگہ ہیں، جہاں صحت جمعہ کی شرائط ہیں، تو ان مسجدوں میں جمعہ کی نماز صحیح ہوچکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۱۰)

وتؤدیٰ (أي الجمعة) في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً على المذهب وعليه الفتوى. ...... (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ۱۳۷/۲، زكريا ۵/۳، وكذا في مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دار الكتب العلمية بيروت ۲۴۷/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۲۹۶/۲۶)

ایک شہر میں متعدد مساجد میں نماز جمعہ

سوال [۳۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد ہے، جب سے یہ مسجد قائم ہوئی ہے، اس دن سے آج تک جمعہ کی نماز نہیں ہوئی ہے، اب اس میں لوگ جمعہ کی نماز قائم کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن اس مسجد کے آگے پیچھے تین تین منٹ کے فاصلے پر مسجد میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے پانچ منٹ کے فاصلے پر ایک جامع مسجد ہے۔ بہرحال کئی مساجد میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور جس میں جمعہ کی نماز قائم کرنا چاہتے ہیں وہ شہر میں داخل ہے، تو ایسی صورت میں اس مسجد میں جمعہ کی نماز قائم کرسکتے ہیں یا نہیں؟ دلائل کے ساتھ جواب مطلوب ہے؟

المستفتی: مولوی فضل الرحمٰن، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قائم کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۵۰/۵)

وتؤدیٰ (أي الجمعة) في مصر واحدٍ بمواضع كثيرة مطلقاً على المذهب ......**وعليه الفتوى.** (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ۱۳۷/۲، زكريا ۱۵/۳، مصرى ۷۵۵/۱، وكذا في مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، بيروت ۲۴۷/۱)

لیکن اگر زیادہ ضرورت نہ ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہاں جمعہ قائم نہ کیا جائے تا کہ اختلاف فقہاء سے محفوظ رہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱/۶۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۵۴۷)

شہر کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعہ

سوال [۳۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن شہر کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کو بند کر کے نماز جمعہ کے لئے بڑی بڑی مساجد میں جاتے ہیں، کیا بارش وغیرہ کے موقع پر اگر جامع مسجد یا بڑی مسجد میں نہ جایا جاسکے، تو چھوٹی مسجد میں نماز جمعہ پڑھ سکتے ہیں؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شہر کے اندر جہاں جمعہ کی شرائط موجود ہیں کہیں بھی جمعہ پڑھنا جائز ہے، اس لئے اگر بارش کی وجہ سے جامع مسجد جانا دشوار ہو جائے تو مقامی پنجگانہ مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، بشرطیکہ وہ مقام اداء جمعہ کی شرائط پوری کرتا ہو۔

ولو صلى الجمعة في قرية بغير مسجد جامع، والقرية كبيرة لها قرى، وفيها والٍ، وحاكم جازت الجمعة بنوا المسجد أو لم يبنوا......والمسجد الجامع ليس بشرط؛ ولهذا أجمعوا على جوازها بالمصلى في فناء المصر. (حلبي كبير، فصل صلاة الجمعة، اشرفية ديوبند ۵۵۱)

عن حذيفة رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فضلنا على الناس بثلاثٍ: جُعلت صفوفنا كصفوف الملائكة، وجعلت لنا الأرض كلها

مسجداً. الحدیث (صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، النسخة الهندية ۱/۱۹۹، بيت الأفكار رقم:۵۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شوال المکرم ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۲۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۱۰؍۱۴۳۴ھ

شہر کی چھوٹی مسجد میں نماز جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پٹھانوں والی مسجد محلّہ بھٹی میں جمعہ کی نماز قائم کرنا چاہتے ہیں، تقریباً ۱۵۰؍آدمی نماز کے لئے آجائیں گے، تو کیا جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحسیب، شیدی سرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شہر کے اندر ہر چھوٹی بڑی مسجد میں جمعہ قائم کرنے سے جمعہ کی فرضیت تو ادا ہوجاتی ہے، مگر جمعہ قائم کرنے کا مقصد اور حکمت شریعت میں یہی ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ شہر کے مختلف مقامات اور مختلف محلوں کے مسلمان کسی بڑی مسجد میں جمع ہوجائیں تاکہ اسلام کی شوکت کا اظہار ہوجائے؛ اس لئے شہر کی صرف بڑی بڑی مسجدوں میں جمعہ قائم ہونا چاہئے، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعہ قائم نہیں کرنا چاہئے، اگر ہر چھوٹی مسجد میں قائم کیا جائے، تو جمعہ کا اصل مقصد اور اس کی روح ختم ہوجاتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۶۳/۳، جدید زکریا ۱۰۴/۶)

وإقامة الجمعة من أعلام الدين، فلا يجوز القول بمايؤدي إلى تقليلها. (مبسوط سرخسي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱۲۱/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۶۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۲/۱۹ھ

محلّہ کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری مسجد پٹھانوں والی میں عرصہ سے جمعہ کی نماز نہیں ہوئی، اب مسجد کے مقتدی چاہتے ہیں کہ اس مسجد میں جمعہ کی نماز ہونی چاہئے، آپ کی اجازت چاہئے؟

المستفتی: بلال احمد، محلّہ شیدی سرائے مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بڑی مساجد میں شہر کے اندر مختلف جگہوں پر نماز جمعہ ہوتی ہے اوران مساجد کے ذریعہ لوگ نماز جمعہ بآسانی ادا کر لیتے ہیں، تو پھر اس صورت میں محلّہ کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں نماز جمعہ نہ پڑھنا بہتر ہے، اسی وجہ سے مولانا عبد الحق مدنیؒ نے شہر مراد آباد کی تمام چھوٹی مسجدوں سے نماز جمعہ ختم کروا دیا تھا، صرف بڑی مسجدوں میں جمعہ پڑھنے کی پابندی کروائی تھی تاکہ جمعہ کی روح باقی رہے۔

ولأن الحرج يندفع عند كثرة الزحام بموضعين غالباً فلا يجوز أكثر من ذلك. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، شرائط الجمعة، كراچي ١/٢٦١، زكريا ١/٥٨٧)

واجتمع الناس على رجل فصلى بهم جاز للضرورة. وروي ذلك عن محمدؒ في العيون وهو الصحيح. (مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ٥٠٧، قديم ١/٢٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۰۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۴ھ

ایک شہر میں متعدد مساجد میں جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی قصبہ اور شہر میں نماز جمعہ چند مساجد میں ادا کرنے میں کیا حکمت ہے، اگر قصبے اور شہر کی اکثر مساجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کی اجازت یا فتوی نافذ کردیا جائے تو کوئی قباحت تو نہیں، نماز جمعہ کے انعقاد کی حکمت تحریر فرمائیں اور اکثر مساجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے فتوی دینے میں قباحت ہے تو کیا ہے؟

المستفتی: مسعود الحسن رشیدی، سہسپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی شہر یا قصبہ کے متعدد مقامات پر جمعہ قائم کرنا جائز ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ شہر میں مقیم دور دراز کے لوگوں کو نماز جمعہ ادا کرنے میں دشواری نہ ہو اور جمعہ جیسے عظیم الشان دن کے فضائل سے مکمل طور پر مستفیض ہوسکیں، مگر بلا ضرورت تعدد جمعہ مکروہ ہے، اب رہی یہ بات کہ نماز جمعہ منعقد کرنے کی حکمت تو ایک طرف اتحاد واخوت کے رشتہ کو مضبوط کرنے میں مدد ملے گی اور دوسری جانب اس جماعت کی بدولت مسلمانوں کے عقائد واعمال تحریف وفساد سے محفوظ رہیں گے ۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۴۳/۳، جدید زکریا ۲۹۱/۳، زکریا مطول ۱۷۵/۵، ارکان اربعہ ۲۷)

وتؤدي في مصر واحدٍ بمواضع كثيرة مطلقاً. (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۱٤٤/۲، زكريا ۱٥/۳)

لأن في المصر في موضع أو موضعين حرجاً في المدن الكبيرة وهو مدفوع. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل صلاة الجمعة، اشرفية ديوبند ٥٥۲، حجة الله البالغة ۲۸۳/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۳۱۵)

چھ ہزار کی آبادی میں متعدد مقامات پر نماز جمعہ قائم کرنا

سوال [۳۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں جس کی آبادی ایک ہزار گھروں کی ہے، اس گاؤں میں جمعہ کی نماز ایک مسجد میں پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، اب اسی گاؤں میں دوسرے محلے میں ایک عالم دین نے جمعہ کی نماز دوسری مسجد میں قائم کیا اور تقریباً دوسال سے ہورہی ہے، اب مسئلہ دریافت یہ ہے کہ ان لوگوں کی جمعہ کی نماز ہورہی ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نوٹ: جن کی مردم شماری چھ ہزار ہوگی۔

المستفتی: حافظ عبداللہ، مقام: جونکا، وایہ تین پہاڑ، صاحب گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حنفیہ کے یہاں دوقسم کی آبادی میں جمعہ کی نماز پڑھنا فرض ہے۔

(۱) وہ آبادی جس میں شہر کی ساری علامات موجود ہوں، مثلاً گلی کوچے ہوں، بازار ہوں، اس کے ماتحت دوسری چھوٹی آبادیاں ہوں، اس میں عدل وانصاف کے لئے صاحب اقتدار ذمہ دار ہوں۔

عن أبي حنيفةؒ: أنه بلدة كبيرة، فيها سكك، وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته، وعلمه، أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث، وهذا هو الأصح.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶)

(۲) وہ آبادی جو بہت بڑی ہو، جس میں روزمرہ کی ضروریات کا سامان فراہم ہوتا ہو، تو اس میں جمعہ جائز ہوگا، ورنہ جائز نہ ہوگا؛ بلکہ لوگوں پر ظہر پڑھنا لازم ہوگا۔

وعبارة القهستاني: تقع فرضاً في القصبات، والقرىٰ الكبيرة التي فيها أسواق الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۸، زكريا ۳/۶، كوئٹه ۱/۵۹۰)

(وقوله) لا تجوز في الصغيرة (إلى قوله) لزمهم أداء الظهر الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/۷، كراچي ۲/۱۳۸، كوئٹه ۱/۵۹۰)

سوال نامہ میں درج شدہ گاؤں بظاہر دوسری قسم کی آبادی میں شامل ہے، جس کی آبادی چھ ہزار بتلائی جارہی ہے، وہاں جس مسجد میں پہلے سے جمعہ ہورہا ہے، اس میں اور جس میں قائم کرنا ہے اس میں بھی جمعہ جائز ہوگا، بہتر یہی ہے کہ کسی عالم دین فقیہ کو بلاکر معائنہ کرادیا جائے، وہاں کے حالات دیکھ کر جو وہ تجویز کریں اس پر عمل کیا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۰۷)

ایک شہر میں متعدد جگہوں پر جمعہ کا جواز

سوال [۳۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہسپتال دلی کینٹ میں ایک مسجد ہے، جو نصف صدی قبل مسلم ڈاکٹروں اور مسلم سپاہی مریضوں کی سہولت کے پیش نظر تعمیر کی گئی تھی، مگر ماضی قریب میں یہ مسجد غیر آباد تھی، مسلم فوجیوں کی کوشش اور توجہ سے ایک سال سے زائد عرصہ سے یہ مسجد دوبارہ آباد ہوگئی ہے اور انہیں کے اصرار پر وقف بورڈ نے اس میں مستقل امام کا تقرر کردیا ہے، استنجاء خانہ اور وضوخانہ کا بھی

یہاں معقول انتظام ہے، یہاں چونکہ مسلم بستی نہیں ہے اور نمازی فوجی لوگ ہیں یا راہ گیر شریک صلاۃ ہوجاتے ہیں، یہ لوگ نماز پنجگانہ کے ساتھ ساتھ نماز جمعہ بھی اسی مسجد میں ادا کرتے ہیں اور دو سال سے نماز عید بھی یہیں ادا کرتے ہیں؛ جبکہ نصف کلومیٹر یا اس سے کچھ زائد فاصلہ پر جامع مسجد ہے، مگر فوجیوں کو سرکاری ڈیوٹی کی بنا پر جامع مسجد میں پہونچ کر نماز جمعہ یا نماز عیدین ادا کرنے میں پریشانی ہوتی ہے؛ اس لئے نماز جمعہ اور نماز عیدین بھی یہ فوجی لوگ اور مسلم سپاہی، مریض ہسپتال سے متصل اسی مسجد میں ادا کرتے ہیں، کیا شرعی نقطۂ نظر سے اس مسجد میں نماز جمعہ اور نماز عیدین ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شمشاد خان، دلی کینٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں! شرعی نقطۂ نظر سے دلی جیسے عظیم شہر میں ایسی مسجد میں بلا شبہ و بلا تردد نماز جمعہ اور عیدین صحیح اور جائز ہوجائے گی، ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ و عیدین جائز ہے۔

إن صلاة العيدين في موضعين جائزة بالاتفاق. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، زكريا ۳/۴۹، كراچي ۲/۱۶۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شوال المکرم ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶۶۵/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۰/۱۷ھ

برابر کی دو مسجدوں میں جمعہ کا قیام

سوال [۳۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو مسجدیں برابر برابر ہیں، دونوں کے درمیان حد فاصل صرف دیوار ہے، ایک مسجد بڑی ہے اور دوسری چھوٹی ہے، بڑی مسجد میں پنجوقتہ نماز کے ساتھ جمعہ بھی ہوتا ہے اور چھوٹی

مسجد میں پنجوقتہ نمازیں ہوتی ہیں جمعہ نہیں ہوتا ہے، اب چھوٹی مسجد والے جمعہ شروع کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے لئے ایسی صورت میں اسلامی رو سے جمعہ قائم کرنا کیسا ہے؟ جبکہ بڑی مسجد سبھی لوگوں کے لئے کافی ہوجاتی ہے۔ جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد اعظم، نگر نگم مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں مسجدیں اتنی قریب قریب ہیں کہ دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ ہے اور بڑی والی مسجد میں پہلے ہی سے جمعہ ہوتا آرہا ہے، وہ اتنی بڑی مسجد ہے کہ مسجد کے متعلق پورے محلّہ کے لوگ آسانی سے جمعہ پڑھ سکتے ہیں، کوئی تنگی اور پریشانی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں متصل والی چھوٹی مسجد میں جمعہ قائم کرنا مقصد جمعہ کی روح کو ختم کردینا ہے اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف کی بنیاد قائم کرنا ہے؛ اس لئے فقہاء نے اس طرح کے مواقع میں دوسری مسجد میں جمعہ قائم کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

لو کان المصر صغیراً لا مشقة في اجتماع أهله في موضع واحدٍ لاتجوز فیه الزیادة علی واحدٍ. (مجمع الأنهر، کتاب الصلاة، باب الجمعة، دارالکتب العلمیة بیروت ۱/۲۴۸، قدیم ۱/۱۶۷، المغني لابن قدامه ۲/۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

ایک مسجد میں دو مرتبہ جمعہ پڑھنا

سوال [۳۵۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں کئی مسجدیں ہیں، ان میں سے صرف بڑی مسجد میں جمعہ

ہوتا ہے، جو آبادی کی کثرت کی وجہ سے جمعہ کے دن ناکافی ہوجاتی ہے، جتنے آدمی جمعہ پڑھتے ہیں، اتنے ہی باقی رہ جاتے ہیں، تو کیا اس مسجد میں دوبارہ جمعہ پڑھ سکتے ہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد قاسم، محمد پور، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایک مسجد میں صرف ایک ہی مرتبہ جمعہ ہوسکتا ہے، دوبارہ اس میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، اگر اس میں گنجائش نہیں ہے، تو دوسری مسجدوں میں بھی جمعہ کا سلسلہ شروع کردیں۔

والظاهر أنه يغلق أيضاً بعد إقامة الجمعة؛ لئلا يجتمع فيه أحد بعدها.
(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۳۳، كراچي ۲/ ۱۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۷۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

کیا ایک ہی مسجد میں دو مرتبہ نماز جمعہ جائز ہے؟

سوال [۳۵۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر ممبئی میں ایک جگہ ایسی ہے، جہاں دیوبندی مکتب فکر کی صرف ایک مسجد ہے اور وہاں دور دور تک کوئی دوسری مسجد نہیں ہے، ہاں ایک مسجد بریلوی حضرات کی ہے جو مسجد دیوبندی مکتب فکر کی ہے وہ اتنی وسیع نہیں ہے کہ اس میں تمام حضرات ایک ہی مرتبہ نماز جمعہ پڑھ سکیں، تو کیا ایسی مجبوری کی حالت میں اس میں دوبارہ نماز جمعہ ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت ضرورت ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ قائم کرنا جائز اور درست ہے؛ اس لئے جو علاقہ ایسا ہو کہ اس میں صرف ایک ہی مسجد ہو اور اس میں علاقہ کے تمام لوگ یکبارگی جمعہ نہ ادا کر سکیں، تو اس علاقہ کے تمام لوگوں کا دینی فریضہ ہے کہ وہ مسجد کی توسیع کریں اور جب تک مسجد کی توسیع یا بڑی مسجد نہ بن سکے اس وقت تک کسی کھلے میدان میں یا کسی پارک میں نماز جمعہ ادا کر سکتے ہیں، ایک مسجد میں دو بار جمعہ ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/۷۶۳، فتاوی دار العلوم ۵/۱۵)

وتؤدیٰ في مصر واحدٍ بمواضع كثيرة مطلقاً. وعليه الفتوى.

(درمختار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، کراچي ۲/ ۱۴۴-۱۴۵، زکریا ۳/ ۱۵)

ويكره تحريمًا تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد. وفي الشامية تحته: وإقامة، ومقتضي هذا الاستدلال كراهة التكرار في مسجد المحلة، ولو بدون أذان و يؤيده ما في الظهيرية: لو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى فيه أهله يصلون وحدانًا، وهو ظاهر الرواية الخ. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الإماقامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، کراچي ۱/ ۵۵۲، ۵۵۳، زکریا ۲/ ۲۸۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۹۷)	۱۴۲۴/۳/۱۵ھ

ایک ہی مسجد میں مقتدیوں کی کثرت کی بناء پر دومرتبہ نماز جمعہ ادا کرنا

سوال [۳۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک ایسی مسجد جو تین منزلہ ہے شہر میں واقع ہے، اس میں نماز ہوتی ہے، لوگ اتنی

کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہیں کہ مسجد اپنے وسیع ہونے کے باوجود تنگ پڑ جاتی ہے، جس کی بناء پر نماز جمعہ اس کے اندر دو مرتبہ ہوتی ہے، دو مرتبہ نماز جو ہوتی ہے اس کے امام الگ الگ ہیں اور دونوں ہم مسلک ہیں، تو دونوں کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں، اگر نہیں ہوتی ہے تو پہلے والے کی نہیں ہوتی یا دوسرے کی نہیں ہوتی اور کیوں نہیں ہوتی؟ شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسعد فیض آبادی، خان گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر شہر میں اس مسجد کے علاوہ کوئی دوسری مسجد دور دور تک نہیں ہے جہاں جا کر یہ لوگ اپنا فریضہ ادا کر سکیں اور دوسری جماعت کرنے کے لئے کوئی دوسری جگہ بھی نہیں ہے اور دوسری جماعت نہ کرنے کی صورت میں لوگوں کی ایک بھاری تعداد جمعہ سے محروم ہو جاتی ہے اور اس تعداد کو وقت پر حاضر ہونے میں کوئی تاخیر بھی نہیں ہوتی ہے، تو ایسی شدید ضرورت کے تحت اس مسجد میں دو مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھی جانے کی گنجائش ہے، مگر جماعت ثانیہ کے لئے باقاعدہ اذان نہ دی جائے، اس کی گنجائش اس وقت تک ہے کہ جب تک دوسری مسجد کا نظم نہ ہو، سب لوگوں پر ضروری ہے کہ دوسری مسجد قائم کرنے کا انتظام کریں، تکرار جماعت کی ممانعت اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے اصل جماعت متاثر ہو جاتی ہے، یہاں سوال نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متاثر نہیں ہے۔ نیز یہاں تکرار نہ کیا جائے تو شہر کے لوگوں کی بھاری تعداد کو جمعہ سے محروم ہونا پڑے گا۔

ولأن في الإطلاق هكذا تقليل الجماعة معنى، فإنهم لا يجتمعون إذا علموا أنها لاتفوتهم الخ. (شامي، كتاب الصلاة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، زكريا ٢/ ٢٨٩، كراچي ١/ ٥٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۱۳۲)

جمعہ کے دن چار رکعت احتیاط الظہر پڑھنا

سوال [۳۵۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص جمعہ کی نماز پڑھتا ہے؛ لیکن جمعہ کے فرائض وسنن کے بعد پھر چار رکعت احتیاط الظہر کے نام سے پڑھتا ہے آیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ مع دلائل وحوالۂ کتاب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: حمید الرحمٰن، ۲۴/ پرگنہ، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احتیاط الظہر شہر میں اس لئے مکروہ ہے کہ عوام الناس جمعہ کی فرضیت میں شک کرنے لگیں گے اور دیہات میں؛ اس لئے کہ وہاں جمعہ جائز نہیں؛ بلکہ نماز ظہر ہی فرض ہے تو جمعہ کو صحیح سمجھ کر احتیاط الظہر کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۳۸/۵، فتاوی رشیدیہ ص: ۳۳۰-۳۴۹-۳۵۰)

و في البحر وقد أفتيت مراراً بعدم صلوة الأربع بعدها بنية آخر ظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة، وهو الاحتياط في زماننا. (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۵، كراچي ۲/ ۱۳۷، مصري ۱/ ۵۸۹)

وهو اعتقاد الجهلة أن الجمعة ليست بفرض (إلى قوله) فكان الاحتياط في تركها الخ. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۲/ ۲۵۲، كوئٹه ۲/ ۱۴۳)

علامہ شامیؒ نے مختلف دلائل سے جائز لکھا ہے؛ لیکن وہ سب دلائل ہمارے نزدیک مخدوش ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۴۳۵)

احتیاط الظہر

سوال[۳۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں میں احتیاط الظہر پڑھنے کا معمول ہے، ہمیں معلوم یہ کرنا ہے کہ ان کا یہ عمل کہاں تک درست ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن، ۲۴/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شہر یا قصبہ میں جہاں جمعہ کی صحت کے تمام شرائط پائے جاتے ہیں، وہاں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ہی ادا کی جائے، جمعہ کی نماز کے بعد احتیاط الظہر کی نیت سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ نیز جمعہ جیسی فرض نماز کی ادائیگی میں شک پیدا کرنا ہے جو شرعاً درست نہیں ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/۴۷۱، جدید زکریا ۳/۲۲۰، جدید زکریا مطول ۵/۲۶۵، محمودیہ ڈابھیل ۸/۳۵۳، عزیز الفتاوی ص:۲۷۳)

ليس الاحتياط في فعلها؛ لأن الاحتياط هو العمل بأقوى الدليلين، وأقواهما إطلاق جواز تعدد الجمعة، وبفعل الأربع مفسدة اعتقاد الجهلة عدم فرض الجمعة، أو تعدد المفروض في وقتها. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ص:٥٠٦، هكذا في البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كوئٹه ٢/١٤٣، زكريا ٢/٢٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۷۷/۳۸)

جمعہ کے بعد احتیاط الظہر پڑھنا

سوال [۳۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی نے جمعہ کی نماز ادا کر لی پھر بطور احتیاط ظہر کی نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد طارق انور رشیدی، مغلپورہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن مقامات پر جمعہ جائز ہے، جیسے فناء شہر، قصبہ وغیرہ تو وہاں پر احتیاط الظہر پڑھنا جائز نہیں اور جہاں پر جمعہ جائز نہیں جیسے قریۂ صغیرہ تو ان میں جمعہ جائز نہیں؛ بلکہ وہاں والوں پر ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے؛ لہٰذا احتیاط الظہر پڑھنا درست نہیں ہے۔

وفي البحر: وقد أفتيت مراراً بعدم صلاة الأربع بعدها بنية آخر ظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة، وهو الاحتياط في زماننا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۳۷، زكريا۳/۵)

فيتكاسلون عن أداء الجمعة، فكان الاحتياط في تركها. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا۲/۲۵۲، كوئٹه۲/۱۴۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۹۱)

بڑی آبادی میں جمعہ کے بعد کچھ لوگوں کا جماعت سے ظہر کی نماز پڑھنا

سوال [۳۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جس گاؤں میں رہتا ہے، اس کی آبادی تقریباً اٹھائیس سو سے کچھ اوپر ہے، چھوٹی

چھوٹی کافی دوکانیں ہیں، روزمرہ کی ضروریات کے لئے باہر نہیں جانا پڑتا، اسی گاؤں سے پوری ہوجاتی ہیں، قرب وجوار کے لوگ بھی آکر اپنی ضروریات کا سامان لے جاتے ہیں، یہ گاؤں شہر سے تقریباً ۱۸؍کلومیٹر اور قصبہ سے تقریباً تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، قصبہ وشہر چھوڑ کر قرب وجوار میں سب سے بڑا گاؤں یہی ہے؛ اس لئے لوگ اپنی گفتگو میں اس کو بڑا گاؤں شمار کرتے ہیں اور اسی گاؤں سے حکومت نے تین اور گاؤں جوڑ رکھے ہیں، جن کا پردھان ایک ہوتا ہے، ان کی دوری گاؤں سے تقریباً ڈھائی تین فرلانگ ہوگی۔ درمیانی حصہ پر کھیت، تالاب، نہر وغیرہ موجود ہے، ووٹر لسٹ تقریباً پندرہ سو سے کچھ اوپر ہے اور مجموعی آبادی تقریباً پانچ ہزار کے قریب ہوگی، گاؤں کے مکانات کچھ خام، کچھ پختہ اور راستے تقریباً سارے پختہ ہیں اور زید کے گاؤں سے ملحق ایک اور گاؤں ہے، جس کے کچھ مکان مکمل وغیر مکمل زید کے گاؤں سے ملے ہوئے ہیں، پرانی آبادی اور ان مکانوں کے درمیان تقریباً ڈھائی تین سو قدم یا میٹر کا فاصلہ ہے، یہ گرام کی زمین ہے، جو اسی ملحق گاؤں کی ہے، اس درمیانی حصہ پر اسی گاؤں کے مسلمانوں کا قبرستان اور تالاب بھی واقع ہے اور کچھ حصہ پر گھورے کھلیان بھی ڈالے جاتے ہیں، اسی زمین پر ہفتہ میں دو دن بازار بھی لگتا ہے، جو کافی بڑا بازار ہے، اسی گاؤں میں ڈاکخانہ، پنچایت گھر، ٹیلی فون اور دورویا دوکانیں بھی موجود ہیں، زید کے گاؤں اور اس گاؤں کا ڈاکخانہ ایک ہی ہے، اگر اس کی آبادی بھی جوڑ دی جائے، تو تقریباً چھ ہزار کے قریب پہونچ جائے گی، مگر دونوں بستیوں کے پردھان الگ الگ ہیں، کیا صورت مسئولہ میں زید اپنے گاؤں میں جمعہ وعیدین پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

اگر کچھ لوگ احتیاطاً جمعہ نہ پڑھیں تو کیا مسجد میں اسی مصلیٰ پر جماعت ثانیہ سے ظہر ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا ظہر پڑھنے والے ترک جمعہ کی وجہ سے گنہگار تو نہیں ہوں گے؟ اسی طرح جمعہ پڑھنے والے ترک ظہر کی وجہ سے گنہگار تو نہیں ہوں گے؟

نوٹ: مسجد طول وعرض میں کافی بڑی ہے، اس کے باوجود بستی کے سارے لوگ اس میں سما نہیں سکتے قرب وجوار میں رہنے والے مسلمان بھی زید کے یہاں آکر جمعہ وعیدین میں شریک ہوتے

ہیں، جس سے ان میں تبلیغ دین کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

المستفتی: ابواشرف، خادم مدرسہ تعلیم القرآن، حاجی گنج، قنوج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید کے گاؤں کی آبادی ۲۸۰۰ رہے اور اس میں ضروریات زندگی کی اشیاء بھی مل جاتی ہیں، تو ایسی صورت میں وہ گاؤں قصبہ کے حکم میں ہے، ایسے گاؤں میں جمعہ جائز ہے۔ نیز سوال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے متصل دوسرے گاؤں ایسے ملے ہوئے ہیں کہ دیکھنے میں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں گاؤں ایک ہیں، اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اور زیادہ جواز جمعہ میں قوت آجائے گی، پھر اس میں احتیاط الظہر پڑھنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ صرف جمعہ پڑھنا کافی ہے۔

وتقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. قال أبو القاسم: هذا بلا خلاف. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۳۸، زکریا ۳/۶)

لأنهما متحدان حکما. (کتاب الصلاة، باب المسافر، کراچي ۲/۱۲۶، زکریا ۲/۶۰۷، الموسوعة الفقهیة، الکویتیة ۲۷/۲۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
ار یکم ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۰۸۶)

نماز جمعہ کے بعد ظہر کی جماعت

سوال [۳۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں بہاری پور ضلع گونڈہ میں ہے، وہاں ایک سلسلے میں جانا ہوا، حیرت ہوئی اور کافی تکرار ہوئی، مگر وہاں کے مولوی جو اپنا مدرسہ جمائے ہوئے ہیں ماننے کو تیار نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ جمعہ ہوا، پھر فرض جمعہ کے بعد تکبیر ہو کر نماز ظہر باجماعت ہوئی، ہم لوگوں نے نماز ظہر ادا نہیں کی؛ جبکہ فرنگی محل مولانا ہاشم میاں نے منع کیا ہے، نماز ظہر نہیں ہونی چاہئے۔

مفتی ظہور صاحب نے بعد جمعہ نماز ظہر سے منع کیا ہے، گاؤں کی آبادی ڈیڑھ دوہزار ہے، چھوٹی موٹی چیزیں ضرورت کی مل جاتی ہیں، کیا نماز جمعہ کے بعد نماز ظہر ادا کرنی ناجائز ہے یا نہیں؟ ہاں تو کیا صورت ہے اور نہیں تو کیا صورت ہے؟ مبارک پور لکھا، مگر جواب نہیں آیا برائے کرم ہم مریدوں کو اطمینان دلائیں تاکہ ہم لوگ ان سے گفتگو کریں، جو کبھی نہیں تھا وہ اب کیوں؟

المستفتی: غلام احمد عزیزی، حکمت بخش صابری، جمال خاں مبارک پوری لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہ ایسی آبادی ہے، جس میں صحت جمعہ کی شرائط موجود نہیں ہیں، تو نماز ظہر باجماعت مع تکبیر کے ادا کرنا درست ہے؛ کیونکہ جمعہ صحیح نہیں ہوا ہے اور اگر ایسی آبادی ہے کہ جس میں صحت جمعہ کی شرائط موجود ہیں، تو نماز جمعہ کے بعد باجماعت ظہر کی نماز صحیح و درست نہیں ہے۔

لو صلوا في القریٰ لزمهم أداء الظهر الخ (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸)

تقع فرضاً في القصبات، والقریٰ الکبیرة التي فیها أسواق. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۶، کراچي ۲/۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۱۱/ ۱۴۱۰ھ

احتیاط الظہر کا ثبوت اور شرائط

سوال [۳۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احتیاط الظہر ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو اس کے شرائط بیان کریں کہ کب اور کہاں ادا کی جائے؟

المستفتی: مہدی حسن،۲۴؍ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احتیاط الظہر کے نام سے جمعہ کے بعد چار رکعت نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے، اس کی وجہ سے ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز جو پڑھی گئی ہے، اس کے صحیح ہونے میں شک ہے، جبکہ جن علاقوں میں جمعہ کی نماز صحیح ہوتی ہے، وہاں پر فرض کی ادائے گی بھی ہوتی ہے اور فرض کی ادائیگی کے بعد اس میں شک اور تردد پیدا کر کے ۴؍ رکعت دوبارہ پڑھنا اپنی عبادت کے اندر شک پیدا کرنا ہے؛ اس لئے احتیاط الظہر پڑھنا درست نہیں۔

ومنشأ جهلهم صلاة الأربع بعد الجمعة بنية الظهر، وإنما وضعها بعض المتأخرين عند الشك في صحة الجمعة بسبب رواية عدم تعددها في مصر واحد وليست هذه الرواية بالمختارة، وليس هذا القول أعني اختيار صلاة الأربع بعدها مروياً عن أبي حنيفةؒ وصاحبيه حتى وقع لي أني أفتيت مراراً بعدم صلاتها خوفًا على اعتقاد الجهلة بأنها الفرض وإن الجمعة ليست بفرض. (البحر الرائق، باب صلاة الجمعة، زكريا ٢/٢٤٥، كوئٹه ٢/١٣٩، وهكذا في حاشية الطحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كوئٹه ١/٣٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۹۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۱۱ھ

(٣) فصل في أذان الجمعة

جمعہ کی اذان اول کا وقت زوال کے فوراً بعد

ایک دوست نے بار بار فون پر یہ مسئلہ احقر کے سامنے دہرایا کہ جمعہ کی اذان اول زوال کے فوراً بعد دینا لازم ہے یا نہیں؟
حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ کی طرف لزوم اور وجوب کو منسوب کیا ہے (جو قابل تردد ہے) اور آنے والی تحریر سے بات واضح ہو جائے گی اور اس مسئلہ پر دارالافتاء دارالعلوم کراچی اور جامعہ مدنیہ لاہور اور حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذیؒ کے مفصل جوابات ہیں اور بعد میں حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ وغیرہ کی تائیدی تحریر ہے، جو فتاوی عثمانی ۱/۵۳۰ تا ۵۴۶ میں موجود ہے، ان سب تحریرات کو مستفتی کے سوال کے مطابق یہاں بھی درج کر دیا گیا ہے، اخیر میں دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کا جواب ہے ملاحظہ فرمائیے:

سوال [۳۵۹۲]: حضرت مفتی صاحب سے ایک اہم مسئلہ کے متعلق دریافت کرنا ہے، جب سے یہ مسئلہ نظر سے گذرا الجھن ہی رہی، مسئلہ یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے فتاوی عثمانی میں یہ لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان اول بعد زوال متصلاً فوراً دینا واجب ہے، ورنہ اس کا گناہ ہوگا اور بہت لمبا فتویٰ ہے، آخر میں مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی اور مولانا سحبان محمود صاحب کی تائید بھی موجود ہے اور اس مضمون کا فتوی دارالعلوم کراچی کی طرف سے لکھا گیا ہے، جس میں بہت سارے مفتیان کرام کے دستخط موجود ہیں اور مفتی عبدالواحد صاحب جامعہ مدنیہ لاہور اور مفتی عبدالشکور ترمذی کی طرف سے بھی لکھا گیا ہے؛ اس لئے ہم بڑی تشویش میں مبتلا ہیں؛ کیوں کہ ہمارے ہندوستان میں اکثر مساجد میں جمعہ کی اذانِ اول زوال کے فوراً بعد نہیں دی جاتی ہے، آپ سے گذارش ہے کہ اس بارے میں اپنا تحقیقی جواب تحریر فرمائیں، اگر فتاویٰ عثمانی میں جو مسئلہ لکھا گیا ہے، وہی صحیح ہے تو پورے ہندوستان میں جمعہ کے دن اکثر مسجدوں میں اذان اول وقت پر نہ دینے کے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں، امید کہ جواب باصواب سے نوازیں گے۔

فتاوی عثمانی میں اس سلسلے میں جو فتوے ہیں، وہ اس سوال سے منسلک ہیں، آپ سے فون پر بھی اس سلسلے میں تفصیلی بات ہوئی ہے اور دو مرتبہ ہوئی ہے اور آپ نے کہا کہ کتاب کی مراجعت کے بعد کوئی جواب دینا مناسب ہوگا؛ اس لئے یہ تحریر پیش خدمت ہے، تحقیق سے جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبداللہ، سردھنہ، میرٹھ

حافظ صغیر احمد کا سوال اور دارالافتاء دارالعلوم کراچی کا جواب

ترک سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے اذان اول کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم

(سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق حافظ صغیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے درج فتوی جاری کیا گیا)

جمعہ کی اذان اوّل کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب

سوال [۳۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن اذان اول کے بعد فقہائے کرام کے نزدیک "**سعي إلى الجمعة**" واجب ہے، جس کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ نمازی مسجد کی طرف چل پڑے اور مسجد کی طرف چلنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے، اِلا یہ کہ جمعہ کی تیاری میں مشغول ہو، یعنی غسل کرر ہا ہو، کپڑے تبدیل کرر ہا ہو، تیل، سرمہ یا عطر لگا رہا ہو اور پھر اس سے فارغ ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑے۔

نیز اگر کبھی اذان اول سے قبل جمعہ کی مذکورہ تیاری سے فارغ نہ ہوسکا ہو یا تیاری شروع نہ کر سکا ہو، تو اذان اول پر فوراً تیاری میں مشغول ہو جائے، بشرطیکہ خطبے کی اذان سے اتنا قبل فارغ ہو کر مسجد میں پہنچ سکے کہ بہ سہولت سنتیں ادا کر سکے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جمعہ کی تیاری

(غسل وغیرہ) کی سنتوں کو موقوف کر کے واجب (مسجد) کی طرف چل پڑے۔
نیز مصلی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ کی مذکورہ تیاری اذان اول کے ساتھ شروع کرنے کی عادت نہ بنائے اور یہ جانے کہ تیاری کی صرف اذان اول کے بعد اجازت ہے اور اصل یہی ہے کہ اذان اول کے بعد سعی الی الجمعۃ کے تحت فوراً مسجد کی طرف چل پڑے کہ یہ عمل واجب ہے اور تاخیر سے واجب کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ ہوگا۔
۲: یہ بات بھی سب فقہائے کرام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اذان اول سے قبل یا اذان اول کے ساتھ کوئی مصلّی تیاری سے فارغ ہو کر بجائے مسجد میں آنے کے گھر میں ہی صلوۃ التسبیح، نوافل ادا کرتا ہے یا تلاوت میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مشغولی ناجائز ہے۔
اب جواب طلب امر یہ ہے کہ اکثر مساجد میں اذان اول اور اذان خطبہ کے درمیان نصف گھنٹہ تا زائد از ایک گھنٹہ بھی وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران ہمارے بلاد اپنے اندر سننے والوں کے لئے پسند و ناپسند کی بہت سی وجوہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقاریر کے سننے اور نہ سننے میں نمازیوں کا ذوق و مزاج مختلف ہوتا ہے؛ اس لئے اکثر نمازی اس تقریر کئے جانے والے وقت کو دیگر اپنے نجی کاموں کو پورا کرنے میں صرف کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔
آیا صوت مذکورہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ نمازی، جمعہ کی تیاری سے فارغ ہو کر گھر میں ہی تلاوت، صلوۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول رہیں؟ گھر کے یا نجی کاموں میں شامل رہیں اور سنتیں بھی گھر ہی میں ادا کریں اور خطبے کی اذان سے قبل یا خطبے کی اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں پہنچ جائیں؟ اگر اس کی گنجائش نہیں تو ایسا کرنے والا کس درجہ کا گنہگار ہوتا ہے؟ جواب سے جلد مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: صغیر احمد
احسان منزل، امیر معاویہ روڈ، راج گڑھ،
چوبرجی، لاہور ۵۴۰۰۰

(اس استفتاء کا دارالافتاء دارالعلوم کراچی کی جانب سے یہ جواب دیا گیا جو ''البلاغ'' کراچی کے شوال

۱۴۱۵ھ کے شمارے میں بھی شائع ہوا)

جواب: جن لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے، ان کے لئے جمعہ کے دن جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر نماز جمعہ سے فارغ ہونے تک مفتی بہ قول کے مطابق خرید وفروخت کرنا ،سونا ،کسی سے باتوں میں مشغول ہونا، یہاں تک کہ بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور کسی کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرنا وغیر ذلک ،غرض وہ سارے کام اور مشاغل جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہوں ،سب کے سب مکروہ تحریمی یعنی ناجائز ہیں ،صرف کھانے کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کھانے کی طرف رغبت اتنی غالب ہو کہ نماز کے دوران دل اس میں لگا رہنے کا اندیشہ ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذت ہو جانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ خطبۂ جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو،اس کے علاوہ جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہیں وہ کئے جاسکتے ہیں، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا،لباس پہننا وغیرہ؛ لیکن قصداً ان کاموں کو اذان اول تک مؤخر نہ کرنا چاہئے۔

البتہ ایک اہم بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ ﷺ زوال شمس کے بعد جلد نماز جمعہ پڑھ لیتے تھے اور ایسا ہی حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بشمول خلفائے راشدینؓ نماز جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی؛ لہذا جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اذان اول شروع ہوئی تو اس اذان اول اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا تھا؛ لیکن آج کل نماز جمعہ عموماً زوال کے بعد تاخیر سے ادا کی جاتی ہے اور پھر خطبۂ جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہو جانے کی وجہ سے خطبہ ونماز جمعہ میں مزید تاخیر ہو جاتی ہے اور اذانِ اول اور خطبے کے درمیان بہت وقفہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ غفلت پائی جاتی ہے کہ لوگ اذان اوّل کے بعد سعی الی الجمعۃ کا اہتمام نہیں کرتے کہ ابھی خطبے میں بہت وقت ہے،لوگوں کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا ایک سبب ان کی اپنی کوتاہی اور سستی کے علاوہ مساجد کے منتظمین بھی ہیں؛ اس لئے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اذان اوّل کے بعد جلدی جمعہ ادا

کرنے کا اہتمام کریں؛ کیونکہ اگر چہ نماز جمعہ کا اصل وقت (یعنی ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے) ظہر والا ہی ہے؛ لیکن ظہر کی نماز کی طرح جمعہ میں ابراد کرنا اولیٰ نہیں ہے؛ بلکہ جمعہ میں تعجیل افضل ہے؛ چنانچہ فتاوی رشیدیہ میں ہے کہ:-

جمعہ وظہر کا وقت ایک ہے، مگر جمعہ کو ذرا پہلے پڑھنا کہ لوگ سویرے سے آئے ہیں، ان کو جلد فراغت ہو جائے تو بہتر ہے، فقط۔ (فتاوی رشیدیہ ص: ۲۵۳، زکریا جدید ۲۷۸)

اسی طرح مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ اپنے فتاوی عزیز الفتاوی میں اس سوال کے جواب میں کہ جمعہ کو سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں یا ڈھائی بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:

جمعہ میں تعجیل افضل ہے، ایک بجے، سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں۔

(عزیز الفتاوی، دارالاشاعت کراچی ص: ۲۷۴)

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ میں تعجیل مستحب ہے، ابراد یعنی تاخیر جو کہ ظہر کی نماز میں موسم گرما میں مستحب ہے وہ جمعہ میں نہیں ہے؛ بلکہ جمعہ کو جلد ادا کرنا مستحب ہے اور احادیث سے بھی جمعہ کی تعجیل ہی ثابت ہوتی ہے، پس زوال کے بعد مثلاً ساڑھے بارہ بجے اذانِ جمعہ ہونی چاہئے، پھر دس پندرہ منٹ بعد خطبہ اور اس کے بعد نماز ہونی چاہئے، مثلاً ایک بجے تک یہ سب کام ہو جائیں یا کسی قدر کم وبیش ہو۔ (عزیز الفتاوی، مکتبہ دارالاشاعت، کراچی ص: ۲۹۸)

لہٰذا منتظمین کو چاہئے کہ وہ زوال کے بعد جلدی جمعہ ادا کیا کریں اور نیز اذان اول اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ کیا کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ اذان اوّل کے کافی دیر بعد تقریر شروع کرنے کے بجائے اذان اول کے فوراً بعد تقریر شروع ہو جائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے یا اذان اول، تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے، وہ مسجد میں آ کر

سنتیں پڑھ سکیں اوراس کے بعداذان ثانی اورخطبہ ونماز ہو۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ آج کل معروف نہیں ہے؛ اس لئے اس کوشروع کرنے سے پہلے لوگوں کو مسئلہ بتا کر ذہنی طور پر تیار کرلیا جائے تاکہ وقت پر لوگوں کو تشویش نہ ہو؛ لیکن بہرحال اذان اول کے بعد گھر کے کام کاج میں رہ کر تلاوت یا صلوۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول ہونا جائز نہیں ہے اور ایسا کرنے والا مکروہ تحریمی کا مرتکب ہوگا۔

قال الله تعالى: يٰٓاَيُّها الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اِذَا نُوْدِیَ لِلصّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ. [سورة الجمعة:۹]

وفي تنوير الأبصار ۱۶۱/۲ (طبع سعيد) ۳۸/۳ (زكريا ديوبند) ووجب سعى إليها و ترك البيع بالأذان الأوّل. و في الشامية: تحت (قوله و ترك البيع) أراد به كل عمل ينافي السعي و خصه إتباعاً للآية، نهر.

و في بدائع الصنائع: ۲۶۵/۱ (طبع ايچ ايم سعيد) زكريا ديوبند ۵۹۵/۱، لما روي عن عمرؓ أنه كان يخطب يوم الجمعة، فدخل عليه عثمانؓ، فقال له أية ساعة هذه؟ فقال: ما زدت حين سمعت النداء يا أمير المؤمنين! على أن توضأت، فقال: والوضوء أيضاً؟ وقد علمت أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بالاغتسال.

و في الدر المختار: ۱۶۳/۲، (طبع سعيد زكريا ديوبند ۴۱/۳) سمع النداء وهو يأكل تركه إن خاف فوت جمعة أو مكتوبة لا جماعة. وفي الشامية: والأكل أي الذي تميل إليه نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر في ترك الجماعة، كما مر في بابها لكن يشكل ما مر من وجوب السعي إلى الجمعة بالأذان الأول وترك البيع ولو ماشيًا، والمراد به كل عمل ينافي السعي، فتأمل.

و في تقريرات الرافعي بتقييد ما مر بما هنا يندفع الإشكال، وذلك

لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذراً في سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلّي يكون عذراً في سقوط واجب السعي؛ إذ لا فرق بين واجب وواجب بخلاف ما إذا خاف فوت الجمعة، أو الوقت لفوات الفرض لا الواجب. (باب الجمعة ۱۱۳، جديد زكريا ۱۵۲/۳)

وفي صحيح البخاري ۱۲۳/۱، (طبع قديمي كتب خانه) عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس، وعنه أيضاً قال: كنا نبكر بالجماعة ونقيل بعد الجمعة. (النسخة الهندية، رقم: ۸۹۵، ف:۹۰٤)

وفي المصنف لعبد الرزاق (۱۸۵/۳، رقم الحديث: ۵۲۱۲) **عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع، ثم يقيل الناس بعد الصلاة.** (مصنف ابن أبي شيبة، باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار، ٤٤٤/۱، رقم:۵۱۲۳، طبع مكتبة الرشد، رياض)

و في مصنف لابن أبي شيبة (۱:٦:۲) أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه، قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفانؓ ثم نرجع فنقيل. (تحقيق شيخ عوامه ٦۰/٤، رقم:۵۱٦٤)

وفيه أيضاً (۱:۸:۲) عن أبي رزين قال: كنا نصلي مع عليؓ الجمعة فأحيانًا نجد فيئاً وأحيانا لا نجده. (تحيقيق شيخ عوامه ٦٤/٤، رقم: ۵۱۸٦)

وفي الدر المختار (۲٦۷/۱) (وجمعة كظهر أصلا واستحبابًا) في الزمانين؛ لأنها خلفه (مكتبة زكريا ديوبند ۲۵/۲)

و في الشامية (قوله أصلا) أي من جهة أصل وقت الجواز وما وقع في اٰخره من الخلاف (وقوله استحباباً في الزمانين) أي الشتاء، والصيف ح، لكن جزم في الأشباه من فن الأحكام أنه لا يسن لها الإبراد. وفي جامع

الفتاوی لقارئ الهداية: قيل أنه مشروع؛ لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه، وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض إلى الحرج ولا كذلك الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (شامي، مكتبه زكريا ديوبند ۲/ ۲۵) **واللہ اعلم بالصواب**

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد رفیع عثمانی عفااللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفااللہ عنہ	سحبان محمود	عبیداللہ انور میرپوری
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفراللہ لہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

(ان ہی دنوں میں اس مسئلے سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے ایک فتوی تحریر فرمایا جو رجب ۱۴۱۵ھ کے رسالہ ''انور مدینہ'' میں شائع ہوا، یہ فتوی درج ذیل ہے)

جمعہ کی اذان اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذان اول کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

سوال [۳۵۹۴]: جمعہ کی اذان اوّل کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے؛ لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذان اول کے وقت مسجد میں آجائیں؛ اس لئے ترک واجب کے مرتکب ہوتے ہیں، لوگ اس معصیت سے بچ جائیں، اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذان اول کو تاخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے مابین فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سنتیں پڑھ لیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مثلاً دوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذن ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے؛ جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو، اردو میں تقریر اذان اول سے پہلے ہی ہوجائے، اس طرح بہت زیادہ لوگ اذان اول کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے، بعض

مساجد میں اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے۔

مفتی عبدالواحد صاحب جامعہ مدینہ لاہور کا جواب

جواب: جمعہ کی اذان اول کا وقت زوال کے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتب حدیث وفقہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

(۱) المغنی لابن قدامہؒ ۲/ ۲۹۷ میں ہے:

ويبدأ وجوب السعي إليها......وعند الحنفية بالأذان الأول عند الزوال.

(طبع دارالفکر، بحواله الفقه الإسلامي وأدلته ۲/ ۲٦۲، طبع الهدى انٹر نیشنل دیوبند ۲/ ۲۳٤-۲۳۳)

(**ترجمہ**: حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذان اول سے شروع ہوتا ہے)

(۲) معارف السنن میں مولانا یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

وبالجملة فهذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب وكان في أول وقت الظهر متصلاً بالزوال. (طبع ایچ ایم سعید، ۳/ ۳۹٦، اشرفية ديوبند ٤/ ۳۹٦)

(**ترجمہ**: اذان اول خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی اور ظہر کے اول وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی)

(۳) **مجمع الأنهر في شرح ملتقي الأبحر میں ہے:**

(ويجب السعي وترك البيع بالأذان الأول) عقيب الزوال.

(۱/ ۱۷۱، جدید بیروت ۱/ ۲۵۳)

(ترجمہ: جمعہ کے لئے سعی اور ترک بیع، زوال کے بعد اذان اول سے واجب ہوتی ہے)

(۴) عمدة القاري میں علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

قوله زاد النداء الثالث إنما سمى ثالثًا باعتبار كونه مزيداً؛ لأن الأول هو الأذان عند جلوس الإمام على المنبر، والثاني: هو الإقامة للصلوة عند نزوله، والثالث عند دخول وقت الظهر. (طبع دار الفكر ٦/ ۲۱۱،

مکتبه زکریا دیوبند ۵/۷۳)

(ترجمہ: پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا؛ کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے، جب وہ منبر پر بیٹھا ہوتا ہے اور دوسری سے مراد نماز کے لئے اقامت ہے، جو امام کے منبر سے اترنے پر ہوتی ہے اور تیسری اذان وہ ہے، جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے)

(۵) فتح الباری میں علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

وتبين بما مضى أن عثمان أحدثه لإعلام الناس بدخول وقت الصلوة الخ

(طبع دار نشر الكتب الإسلامية لاهور، ۲/۳۹٤، طبع زكريا ۲/۵۰۱)

(ترجمہ: سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمان نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہو جائے)

(٦) تبیین الحقائق میں علامہ زیلعیؒ لکھتے ہیں:

وقال بعض العلماء: يجب السعي وترك البيع بدخول الوقت؛ لأن التوجه إلى الجمعة يجب بدخول الوقت، وإن لم يؤذن لها أحد؛ ولهذا لا يعتبر الأذان قبل الوقت. (طبع مكتبه امداديه ملتان، ۱/۲۲۳، مكتبه زكريا ديوبند ۱/۵۳۷)

(ترجمہ: بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترک بیع کا وجوب، جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے: کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب، وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، اگرچہ کسی نے بھی اس کے لئے اذان نہ کہی ہو، اسی لئے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے)

(۷) تفسیرات احمدیہ میں حضرت ملا جیونؒ لکھتے ہیں:

وقال الإمام الزاهد: المراد بالنداء دخول الوقت إذبه يحرم البيع دون الأذان نفسه. (تفسيرات أحمدية، سورة الجمعة ص:۷۰۵-۷۰٦، مطبع الكريمي، ممبئ، ٤۷۵)

(ترجمہ: امام زاہد نے کہا کہ ''نداء'' سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے عین اذان مراد نہیں ہے)

(۸) احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

قوله تعالى: وذروا البيع: اختلف السلف في وقت النهى عن البيع، فروي عن مسروق، والضحاک ومسلم بن يسار أن البيع يحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهري: يحرم بالنداء، وقد قيل: إن اعتبار الوقت في ذلک أولیٰ إذا کان عليهم الحضور عند دخول الوقت، فلايسقط ذلک عنهم تأخير النداء، ولما لم يكن للنداء قبل الزوال معنى دل ذلک على أن النداء الذي بعد الزوال، إنما هو بعد ما قد وجب إتيان الصلاة. (طبع إدارة القرآن کراچي، ٥/٦٣)

(ترجمہ: ارشاد باری تعالیٰ: ''وذروا البیع'' بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسارؒ سے روایت ہے کہ زوال آفتاب سے ہی بیع حرام ہوجاتی ہے، مجاہدؒ اور زہریؒ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اولی ہے؛ کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لئے حاضری واجب ہوتی ہے؛ لہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے واجب کو ساقط نہیں کرے گا......)

اس عبارت سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں۔

الف: جمعہ کی اذان اول کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

ب: بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقت زوال سے ہے، تنہا اذان سے نہیں، اگر زوال کے وقت ہی اذان ہو تب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکم ممانعت کا تعلق ہوا اور اگر اذان اول کو تاخیر سے کہا گیا تو حکم ممانعت کا تعلق وقت زوال کے ساتھ ثابت ہوگا، اذان کہے جانے تک مؤخر نہیں ہوگا، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوگا کہ اصلاح احوال کے لئے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے انتہائی غیر

مناسب ہے کہ اس میں ترک واجب کے ارتکاب سے بچاؤ تو کیا ہوتا الٹا عملی تو ارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہورہی ہے، یعنی اذان اول کی اس کے اصل وقت سے تاخیر۔

جن مساجد میں اذان اول کو مؤخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کردیا جائے۔

اصلاح احوال کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اذان اول کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذان ثانی کو جہاں تک ہوسکے مقدم کرلیا جائے؛ لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذان اول کو سن کر مسجد میں جمع ہوجائیں اور فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھ سکیں؛ کیونکہ ایک روایت میں ہے:

فأحدث عثمان التأذينة الثالثة على الزوراء ليجتمع الناس.

(عمدة القاري، ٦/٢١١، مطبع دار الفكر، مكتبه زكريا ديوبند ٥/٧٢، مصنف ابن أبي شيبة، تحقيق شيخ عوامه ٤/١٣٣، رقم: ٥٤٨٢)

(حضرت عثمانؓ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہوجائیں)

اور ایک روایت میں ہے۔

فأذن بالزوراء قبل خروجه ليعلم الناس أن الجمعة قد حضرت.

(فتح البارى ٢/٣٩٤، مكتبه زكريا ٢/٥٠١، المعجم الكبير ٧/١٤٦، رقم:٦٦٤٣)

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہوجائے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا ہے)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہئے، یعنی اذان اول تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹہ بعد اذان ثانی کہہ دی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ:
محمد قاسم	عبد الحمید	عبد الواحد غفرلہ جامعہ مدنیہ لاہور

(اس فتوی کی اشاعت کے بعد حافظ صغیر احمد صاحب کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کو درج ذیل تحریر بھیجی گئی)

محترم ومکرم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد زید مجدہ! سلام مسنون

عرض یہ ہے کہ جناب کے علم میں ہے کہ بندہ ایک کوشش میں مشغول ہے کہ نماز جمعہ ادا کرنے والے مسلمان (بالعموم) اذان اول اور اذان ثانی کے درمیانی وقفے پر سعی الی الجمعہ کے منافی امور میں مشغول رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ترک واجب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی سلسلے میں ایک استفتاء مرتب کر کے پاکستان کے اہم اہم مدارس سے جواب بھی منگایا، جناب کے یہاں سے بھی جواب موصول ہوا تھا، مگر ''انوار مدینہ'' کے جلد:۳ شمارہ:۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ (دسمبر ۱۹۹۴ء) میں اسی ذیل میں ایک مضمون (استفتاء اور اس کا جواب) دیکھا جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں اس کو روانہ کر کے رہنمائی چاہوں اور اس کی تیاری بھی کرلی (تیاری کا ایک صفحہ بھی لف ہے) مگر ایک مشفق و محبّ عالم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اپنے اشکال کے حل کے لئے جناب کی خدمت میں پہلے عرض کردوں، خدا کرے جناب ہی توجہ فرما کر حل فرمادیں، اشکال یہ ہے کہ:

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ زوال سے نماز جمعہ کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور فضیلت بھی اسی میں ہے کہ اس سے یعنی زوال سے بھی قبل یا زوال پر تیاری شروع کرے، مگر فتوی کس پر ہے کہ وجوب سعی الی الجمعہ کا اطلاق زوال کے فوراً بعد ہوگا یا جہاں (جس مسجد میں) جس نمازی نے نماز پڑھی ہے، وجوب کا اطلاق اس نمازی پر اس مسجد کی پہلی اذان سے ہوگا؟ اگر وجوب کا اطلاق زوال سے ہوگا تو پھر سارے عالم کے مسلمانوں کو اس گناہ کبیرہ سے بچانے کی سعی کیا ہو؟

امید ہے جناب والا مفتی بہ قول کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ تعالی۔

جواب: (از مفتی عبدالواحد صاحب)

جناب کی جانب سے پہلے جو سوال نامہ آیا تھا اس کا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اذان اول

کے بعد سعی الی الجمعۃ واجب اور دنیوی کاموں میں لگنا یا ایسے شغل میں مشغول ہونا جس سے سعی الی الجمعۃ میں خلل آتا ہونا جائز ہے۔

لیکن ایک بات قابل غور تھی اور وہ یہ کہ اذان اول کا وقت کیا ہے؟ کیا زوال ہوتے ہی کہی جائے یا جب مناسب خیال کیا جائے کہی جائے؟ خواہ زوال کے پندرہ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی زیادہ تاخیر سے۔

اس بابت سے نہ تو جناب کے سوال نامے میں کچھ تعرض تھا اور نہ ہی اس کے جواب میں اس سے کچھ بحث کی گئی تھی، ''انوار مدینہ'' میں اسی بات کے بارے میں تحقیق پیش کی گئی تھی۔

حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اذان اول کا وقت زوال ہوتے ہی ہے (لہٰذا اذان اول کے وقت کے بارے میں یہی مفتی بہ قول ہے) فتح الباری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے، معارف السنن کے حوالے سے معلوم ہوا کہ دور سلف میں اسی وقت اذان ہوتی تھی اور اسی پر توارث عملی چلا آرہا ہے۔

ایک متوارث عمل کو تبدیل کرنا جبکہ:

(۱) اذان اول اس لئے شروع ہوئی کہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کے شروع ہونے کا علم ہوجائے۔

(۲) اذان اول کا وقت زوال ہوتے ہی ہے۔

(۳) بعض حضرات کے نزدیک بیع وغیرہ کی حرمت زوال شمس سے ہے (اور اس قول کے قوی ہونے کا علم اس سے ہوتا ہے کہ علامہ زیلعیؒ نے تبیین میں اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے احکام القرآن میں یہ قول نقل کرکے نہ تو اس کی تضعیف کی اور نہ ہی اس کے خلاف کیا)

(۴) جو مصلحت جناب کے پیش نظر ہے، اس کی تفصیل کا متبادل طریقہ موجود ہے، جو کہ ''انوار مدینہ'' ہی میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک غیر مناسب اور قابل ترک بلکہ واجب الترک اور واجب الاحتراز طریقہ ہے۔

یہ تو ایک اتفاقیہ بات (Accidental) ہوگی کہ اذان اول زوال ہوتے ہی نہ کہی گئی؛ بلکہ

کچھ تاخیر سے کہی گئی ہو، اس وقت یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ وجوب سعی زوال سے ہو یا اذان سے؛ لیکن اس اتفاقیہ بات کو ہم عملی معمول نہیں بنا سکتے، عملی معمول وہی ہوگا جو حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ زوال ہوتے ہی اذان اول کہی جائے اور اس طرح عملاً (Practically) وجوب سعی، زوال اور اذان اول دونوں ہی کے ساتھ مقترن ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد غفرلہ

۲۰ر شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ

(اس کے بعد ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوار مدینہ'' میں شائع ہونے والی تحریرات ایک سوال کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو حضرت موصوفؒ نے اس کا درج ذیل جواب تحریر فرمایا)

حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذیؒ کا جواب

جواب: جمعہ کے خطبے سے پہلے تقریر کا متعدد صحابہ کرامؓ سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جمعہ کے دن خطبے سے پہلے اپنی تقریر میں آں حضرت ﷺ کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جب امام خطبے کے لئے آتے تو وہ اپنی تقریر موقوف کر دیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم ۱/۱۰۸ و ۳/۵۱۲، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز ۱/۴۱۶، رقم: ۱۰۶۱، دار الکتب العلمیة ۱/۴۲۴-۴۲۵)

قال الحاکم والذهبي صحيح. (ازراہ سنت محمد سرفراز خان صاحبؒ)

اسی طرح اسی مستدرک میں حضرت عبداللہ بن بسرؓ کا جمعہ کے دن خطبے سے قبل وعظ کہنا منقول ہے اور اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ۱/۱۸۴ میں ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے ان کو اجازت دے دی تھی کہ جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں تقریر کر سکتے ہو۔

مستدرک حاکم اور اصابہ میں ذکر کردہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا معمول خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریر و وعظ کہنے کا تھا۔

اور یہ بھی صحیح احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ زوال شمس کے بعد جلد نماز جمعہ ادا کر لیتے تھے اور یہی طریقہ خلفائے راشدینؓ کا تھا کہ نماز جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے:

عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس وعنه أيضاً. قال: نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة. (۱/۱۲۳، رقم: ۸۹۶/۸۹۵، ف:۹۰۵/۹۰۴)

وفي المصنف لعبد الرزاق (۳/۱۷۵) عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع، ثم يقيل الناس بعد الصلاة. وفي المصنف لابن أبي شيبة (۲/۱۰۶) أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفان، ثم نرجع فنقيل: و فيه أيضاً. (۲/۱۰۸) عن أبي رزين قال: كنا نصلي مع عليؓ الجمعة فأحياناً نجد فيئاً و أحياناً لانجده.

اور فقہائے کرام کی عبارات سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے۔

وفي الشامية: لكن جزم في الأشباه من فن الأحكام، أنه لا يسن لها الإبراد، و في جامع الفتاوى لقارئ الهداية: قيل إنه مشروع لأنها تؤدي في وقت الظهر و تقوم مقامه، و قال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض إلى الحرج و لا كذلك الظهر و موافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (۱/۳۶۷)

اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اذان اول جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانے میں نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک یہ تقریر اور وعظ یقیناً اذان اور خطبے سے پہلے ہی ہوتی تھی؛ کیونکہ

اذان ثانی اور خطبے کے درمیان تقریر و وعظ کی نفی صراحتہً اوپر کی روایات سے ہورہی ہے، ان میں تصریح ہے کہ جب امام خطبے کے لئے آتا تھا تو یہ تقریر و وعظ موقوف کردیا جاتا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جمعہ میں تبکیر کا لحاظ بھی بہت تھا، اکثر لوگ جمعہ میں تبکیر کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے صبح سے ہی مسجد میں آجاتے تھے، تو ان کے لئے وعظ وتقریر اذان سے پہلے ہی مناسب تھی؛ لیکن جب لوگوں میں سستی ہوئی تو اذان اول، زوال کے وقت لوگوں کو وقت جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی تو اب جبکہ زوال کے وقت اذان اول کی ابتداء زوراء پر ہوئی اور اذان ثانی عندالمنبر خطبے سے قبل ہونے لگی تو معلوم نہیں اس وقت یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں؟

لوگوں کے تکاسل اور سستی پر نظر کرتے ہوئے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء کے بعد ہوتی ہوگی کہ اب تبکیر کی فضیلت کی تحصیل پر لوگ اتنے حریص نہیں رہے تھے کہ اذان سے پہلے خود بخود جمع ہوجاتے ہوں؛ اس لئے ان کو جمع کرنے اور وقت جمعہ کے ایذان کے لئے ہی تو یہ اذان علی الزوراء مشروع ہوئی۔

جب لوگوں کا اجتماع اذان کے بعد ہی ہوتا ہوتو پھر اجتماع سے پہلے تقریر و وعظ کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے اور اذان سے پہلے اجتماع کا معمول جب زمانۂ خیر القرون میں کم ہوگیا تھا تو اب اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

اس لئے ”البلاغ“ کی یہی تجویز متعین اور سلف کے عمل کے موافق ہے کہ ”اذان اول کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے“ (۵۳)

دوسری تجویز کہ ”اذان اول تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں، اس کے بعد اذان ثانی اور خطبہ و نماز ہو“، یہ طریقہ علاوہ اس کے کہ معروف نہیں اس پر ہر جگہ اور ہر مسجد کے لوگوں کو جمع کیا جانا

مشکل ہے، اذان اول سے پہلے لوگوں کا مسجد میں آنا اس حرص اور دنیا میں انہماک کے زمانے میں ازبس دشوار ہے، سلف کے معمول کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے اور اذان اول کی مشروعیت سے جو ایذان اور جمعہ کی دعوت تھی اس کے بھی خلاف ہے۔

جمعہ کے لئے اصل داعی اذان ہی ہے "إذا نودی للصلوة" پر ہی "فاسعوا إلی ذکر الله" مرتب ہے، اس تجویز ثانی میں اصل داعی وعظ وتقریر ہوگی، لوگ اس کے لئے جمع ہوں گے، پھر اس صورت میں تقریر و وعظ کا اذان اول کے ساتھ اتصال ہوگا، جو معمول سلف کے خلاف ہے، ان کا معمول تقریر و وعظ کا اذان خطبہ سے پہلے اور اس کے ساتھ اتصال کا تھا، پھر اس صورت میں اذان کا اپنے اصل وقت سے مؤخر کرنا ہے؛ کیونکہ اس کا اصل وقت "عند الزوال" ہے، اس تجویز میں پہلے تقریر ہوگی اس کے بعد اذان اول ہوگی، اذان اول کو اپنے وقت زوال پر ہی کہنا چاہئے، اس کو اپنی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہئے، جمعہ کی اذان اول کا وقت زوال سے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتب حدیث وفقہ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔

المغنی لابن قدامہ ۲/ ۲۹۷ میں ہے:

(۱) **ویبدأ وجوب السعي إلیها......عند الحنفیة بالأذان الأول عند الزوال.** (بحواله الفقه الإسلامي و أدلته ۲/ ٦۲٦، الهدی انٹر نیشنل دیوبند ۲۳٦)

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذان اول سے شروع ہوتا ہے۔

(۲) **مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر** میں ہے: **(ویجب السعي وترک البیع بالأذان الأول عقیب الزوال).** (۱/ ۱۷۱، جدید بیروت ۱/ ۲۵۳)

جمعہ کے لئے سعی اور ترک بیع، زوال کے بعد اذان اول سے واجب ہوتی ہے۔

(۳) فتح الباری میں علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

وتبین بما مضی أن عثمان أحدثه لإعلام الناس بدخول وقت الصلاة.

(۲/ ۳۹٤، مکتبة زکریا دیوبند ۲/ ۱۰۵)
سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔
(۴) معارف السنن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

وبالجملة فهذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب، وكان في أول وقت الظهر متصلاً بالزوال. (اشرفية ديوبند٤/ ٣٩٦)

اذان اول خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر اور ظہر کے اول وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔
مذکورہ بالا حوالہ جات میں فتح الباری کی عبارت سے واضح ہے کہ اذان اول کی مشروعیت کی غرض ہی یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کو نماز جمعہ کے داخل ہونے کی اطلاع ہوجائے اور دوسرے حوالوں میں بھی اس اذان کو "عند الزوال"، "عقب الزوال" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے واضح ہورہا ہے کہ اس اذان کا اصل وقت زوال کے فوراً بعد متصل ہی ہے؛ کیونکہ عرف میں "عند" اور "عقب" کو گھنٹے کے بعد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا اور علامہ بنوریؒ نے تو "في أول وقت الظهر متصلاً بالزوال" لکھ کر کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی؛ اس لئے جن مساجد میں اذان اول کو اس کے اصل وقت سے مؤخر کر کے کہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو ختم کردینا ضروری ہے؛ کیونکہ یہ عمل توارث اور تصریحات سلف کے خلاف ہونے کے ساتھ اس اذان کی غرض مشروعیت کے بھی خلاف ہے۔ **کما مر**
اس لئے پہلی تجویز پر عمل کرنا چاہئے، اذان اول ظہر کے وقت شروع ہوتے ہی کہہ دی جایا کرے اور پندرہ بیس منٹ کا وقفہ نمازیوں کے مسجد میں آنے اور وضو وغیرہ کے لئے مختص کردینے کا اعلان کردیا جائے، اس کے بعد آدھا گھنٹہ مختصر ضروری وقتی مسائل پر مشتمل وعظ ہوجایا کرے، پھر اذان ثانی، خطبہ اور نماز ہوجایا کرے، لمبی چوڑی تقریروں اور بے ضرورت

مضامین بیان کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے، اس کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہے، نہ یہ کہ اصل وعظ وتقریر ہی کو بند کر دیا جائے یا عمل توارث سلف سے ہٹ کر نیا طریقہ جاری کیا جائے۔

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب کا دلدادہ گروہ چاہتا ہے کہ ہر ہفتے جو کلمۂ خیر تمام مسلمانوں کے کانوں میں خطبہ جمعہ سے پہلے پڑ جاتا ہے اس کا موقع نہ رہے؛ حالانکہ ان مواعظ سے بہت بڑے طبقے کی اصلاح ہورہی ہے اور بکثرت مسلمان اس سے استفادہ کر کے اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کرتے ہیں اور یہ بھی ہفتہ وار تبلیغ عام اور عوامی اصلاح کا پروگرام ہے، مگر ہر چیز میں حدود شریعت کی پابندی اور اعتدال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور غلو سے احتیاط کرنا لازم ہے، خطباء اور مبلغین وواعظین کو اپنے منصب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر حدود شریعت میں رہتے ہوئے ہمارے خطباء اس پر عمل کریں تو یہ " یتخولنا بالموعظة " پر امتثال کا ذریعہ ہوسکتا ہے، آزاد طبقہ اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کئی قسم کے اعتراضات سے اس عمل خیر پر قدغن لگانا چاہتا ہے، اصل یہ ہے کہ وہ علمائے کرام اور خطبائے عظام کی بات سننا گوارا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور ہمیں اپنی اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

۱۶/شوال ۱۴۱۵ھ

(یہ تمام تحریرات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، حضرت دامت برکاتہم نے ان سب تحریرات کے مطالعے کے بعد درج ذیل جواب تحریر فرمایا جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحبؒ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی تائیدی دستخط فرمائے)

جواب: (از حضرت ولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد:

احقر نے اس موضوع پر مرسلہ تمام تحریروں کا مطالعہ کیا، ان تمام تحریروں میں احقر اس تحریر سے حرف بہ حرف متفق ہے، جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری ہوئی اور ''البلاغ'' میں شائع ہوئی۔

خرابی یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ جمعہ کو اس کے وقت مستحب (تعجیل) سے بہت موٴخر کردیا گیا ہے، اولاً اس بات کی ترغیب کی ضرورت ہے کہ تعجیل جمعہ کی سنت کو زندہ کیا جائے۔

دوسرے اذان اول اور اذان ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو، جس کی صورت یا تو یہ ہے کہ تقریر زوال سے پہلے کی جائے اور زوال کے متصل بعد اذان اول اور دس پندرہ منٹ کے بعد اذان ثانی ہو یا پھر تقریر اذانین کے درمیان ہو تو وہ پندرہ بیس منٹ سے زائد نہ ہو اور مفصل تقریر جمعہ کے بعد یا زوال سے پہلے ہو، اذان اول سے پہلے اردو تقریر کے بارے میں یہ اندیشہ کہ لوگ تقریر سننے نہیں آئیں گے، تجربہ سے درست ثابت نہیں ہوا۔

جو لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی آجاتے ہیں اور جو سننا نہیں چاہتے وہ محض اذان اول کی وجہ سے عموماً نہیں آتے؛ بلکہ اذان ثانی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۶/۱۲/۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۸/۳۳)

مذکورہ بالا تحریر ناچیز کی رائے میں درست ہے اور دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے جو فتویٰ جاری ہوا اور ''البلاغ'' میں شائع ہوا ہے وہ بھی درست ہے؛ البتہ احقر کے نزدیک اذانین کے درمیان وقفہ اگر نصف گھنٹے کا بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں، جس میں بیس پچیس منٹ تقریر اور ۵/منٹ سنتوں کے لئے مل سکتے ہیں اور لوگوں کے لئے اس میں ان شاء اللہ دشواری

بھی نہیں ہوگی اور جو گناہ سے بچنا چاہے گا وہ دشواری کے بغیر بچ سکے گا۔

واللہ اعلم

سحبان محمود ناچیز محمد رفیع عثمانی عفااللہ عنہ

۱۴۱۵/۱۲/۲۳ھ

دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد الہند کا جواب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فتاوی عثمانی میں جمعہ کی اذان اول سے متعلق جو فتاوی موجود ہیں، ان سب کو دیکھ لیا گیا ہے، دارالعلوم کراچی سے مفتی عبیداللہ انور میر پوری کے قلم سے لکھا گیا فتوی، جس میں دارالعلوم کراچی کے تمام بڑے علماء اور مفتیان کرام کے دستخط بھی ہیں، اس فتوی میں سعی الی الجمعہ کی بنیاد اذان اول پر رکھی گئی ہے کہ اذان اول کے فوراً بعد سعی الی الجمعہ لازم ہو جاتا ہے، کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جانا مکروہ تحریمی ہے حتی کہ قرآن کریم کی تلاوت اور کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہنے کو بھی مکروہ تحریمی لکھا ہے۔

حضرت مفتی عبدالواحد صاحب جامعہ مدنیہ نے سعی الی الجمعۃ کی بنیاد زوال شمس پر رکھی ہے کہ زوال کے فوراً بعد جمعہ کے لئے روانہ ہو جانے کو واجب لکھا ہے ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اذان اول کا وقت ہی زوال کے فوراً بعد ہے اور یہ اذان حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں شروع ہوئی ہے، جس کا مقصد جمعہ کا وقت شروع ہونے کا اعلان ہے اور حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی نے کتب فقہ کے حوالہ کے ساتھ ساتھ کتب حدیث کے حوالوں سے بھی اپنی بات کو مدلل فرمایا ہے اور انہوں نے بھی اذان اول کا مقصد ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے ”اذان اول زوال کے وقت لوگوں کو وقت جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی ہے“ اور اس اذان اول کی ابتداء زوال کے وقت مقام زوراء پر شروع ہوئی ہے اور اس مدعی کو مفتی صاحب دامت برکاتہم نے فقہی جزئیات اور حدیث وآثار سے مدلل فرمایا ہے، پھر آخر میں حضرت مفتی مولانا

محمد تقی عثمانی صاحب نے ان الفاظ سے تائید فرمائی ہے کہ اذان اول اور اذان ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو اور وعظ وتقریر زوال سے پہلے کی جائے اور زوال کے متصل بعد اذان اول ہو دس پندرہ منٹ کے بعد اذان ثانی ہو، پھر اگر دونوں اذانوں کے درمیان تقریر کرنا ہو تو صرف پندرہ بیس منٹ سے زائد نہ ہو اور حضرت مولانا مفتی رفیع صاحب عثمانی نے اپنے تائیدی نوٹ میں دارالعلوم کراچی کے فتوی کی تائید کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ دونوں اذانوں کے درمیان نصف گھنٹہ کا فاصلہ ہو جائے، تو میرے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں یہ انہوں نے اپنی رائے پیش کی ہے، ان تمام حضرات کی تحریروں کا حاصل یہی ہے، ان میں سے کسی کی بھی تحریر میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ جمعہ کی اذان اول زوال کے فوراً بعد دینا واجب ہے؛ ہاں البتہ سبھی لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اذان اول کا وقت زوال کے فوراً بعد ہے، واجب ہونے کی بات کسی نے نہیں کہی ہے؛ لیکن یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم کراچی کے فتوی میں اذان اول کے بعد سعی الی الجمعہ کو واجب کہا ہے اور اذان اول کے بعد کسی بھی کام میں مشغول ہونے کو مکروہ تحریمی لکھا ہے اور پھر اذان اول زوال کے متصلا بعد دینے کی بات مفتی محمد تقی صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور مفتی عبدالواحد صاحب نے اذان اول کا وقت زوال کے فوراً بعد ہونے کو جزئیات سے ثابت فرمایا اور سعی الی الجمعہ کے وجوب کو بھی زوال کے بعد ثابت کیا ہے، تو ان تمام تحریروں کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جمعہ کی اذان اول زوال کے فوراً بعد دینی چاہئے اور اذان کے فوراً بعد سعی الی الجمعہ لازم ہو جائے گا، خرید وفروخت کی ممانعت کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جانے کی بھی ممانعت ہے اور یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں، ہمارے ہندوستان کی اکثر مساجد میں جمعہ کی اذان اول اس کے اصل وقت پر نہیں ہوتی ہے، اس میں یا تو عمومی طور پر منتظمین کی طرف سے غفلت ہے، مسئلہ شرعی سے ناواقفیت کا نتیجہ بھی ہے اور دونوں اذانوں کے درمیان لمبا وقفہ بھی سلف وخلف سے ثابت نہیں ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی نے

لکھا ہے کہ پندرہ بیس منٹ کا وقفہ ہو اس سے زائد نہ ہو یہی صحیح ہے، ہندوستان کے مساجد کے منتظمین کو مسئلہ بتا کر کے واقف کا رہنا ضروری ہے ناواقفیت کا یہ حال ہے کہ ہماری شاہی مسجد میں ڈیڑھ بجے جمعہ کا خطبہ ہوتا ہے۔

سابق مہتمم حضرت اقدس مولانا رشید الدین صاحبؒ کے زمانہ میں ڈیڑھ بجے کے بجائے ایک بجے جمعہ کا اعلان کیا گیا، تو آس پاس کے لوگوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا، جس کے نتیجہ میں شاہی مسجد میں جمعہ کی نماز کا سلسلہ آج بھی ڈیڑھ بجے جاری ہے؛ لیکن اس کے برخلاف دارالطلبہ لالباغ کی مسجد میں شہر والوں کا کوئی دخل نہیں؛ چنانچہ زوال کے بعد جلد ہی ساڑھے بارہ بجے اذان ہوتی ہے اور پون بجے خطبہ شروع ہوجاتا ہے، اس درمیان میں خطیب دس منٹ کا بیان بھی کر دیتا ہے، کبھی سلام پھیر کر دعاء سے پہلے پانچ سات منٹ کا بیان ہوجاتا ہے؛ اس لئے ہندوستان کی مساجد کے ذمہ داروں کو مسئلہ سے واقف کرانے کی ضرورت ہے کہ جمعہ کی نماز ہر جگہ اول وقت میں ہوجایا کرے اور زوال کے بعد جلد ہی جمعہ کی اذان اول ہوجائے اور اس کے پندرہ بیس منٹ کے بعد خطبہ شروع ہوجائے یہی مسنون طریقہ ہے اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جمعہ کا وقت وہی ہے، جو ظہر کا وقت ہے؛ لیکن گرمیوں کے زمانہ میں ظہر میں ابراد افضل ہے؛ جبکہ جمعہ میں ابراد افضل نہیں ہے؛ بلکہ جمعہ میں تعجیل ہی افضل ہے اور ان ساری باتوں کے دلائل دارالعلوم کراچی، جامعہ مدنیہ لاہور اور مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی کے جوابات میں مفصل طور پر موجود ہیں، فقہی عبارات بھی ہیں اور حدیث و آثار بھی موجود ہیں؛ اس لئے ان دلائل کا تکرار اپنی تحریر میں غیر مناسب سمجھا گیا ہے، بریں بناء عربی عبارات لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴؍ صفر المظفر ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍ ۱۱۹۱۱)	۱۴۳۶/۲/۱۴ھ

جمعہ کی اذان اول ''إذا نودی للصلوۃ'' کا مصداق کیسے؟

سوال [۳۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی اذان اول ''إذا نودی للصلوۃ'' کی مصداق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیسے؟ جبکہ اذان اول آیت کریمہ کے نزول کے وقت مشروع ہی نہیں ہوئی تھی؟

المستفتی: محمد ہارون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آیت کریمہ ''إذا نودي للصلوۃ'' کا مصداق اذان اول ہی ہے، رہا یہ سوال کہ آیت کے نزول کے وقت اذان اول مشروع نہیں ہوئی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تفسیر کا قاعدہ ہے " **العبرۃ لعموم اللفظ، لالخصوص المورد**'' یعنی اگر آیت کے الفاظ عام ہوں اور شان نزول خاص ہو تو الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے اور مذکورہ بالا آیت کے الفاظ عام ہیں اور مراد وہ اذان ہے، جو غائبین کو جمعہ کے لئے بلانے کے واسطے دی جائے اور اب غائبین کے لئے اذان اول ہوتی ہے؛ لہٰذا وہی آیت کا مصداق ہوگی۔ (مستفاد: معارف القرآن ۸/۴۴۲، تحفۃ القاری ۳/۲۳۲)

قد قال علماؤنا: أنه إذا أذن الأذان الأول تركوا البيع وسعوا، لقوله تعالى: إذا نودي للصلاة الخ. قال الطحطاوي: إنما يجب السعي وترك البيع، إذا أذن الأذان، والإمام على المنبر؛ لأنه الذي كان على عهده عليه السلام وزمن الشيخين، وهو الأظهر؛ لكن قال غيره هو الأذان على المنارة الآن الذي أحدث في زمان عثمانؓ، قال الشمني: وهو الأصح، واختاره شمس الأئمة، ولعلهم أخذوا بعموم لفظ الآية. (مرقاة المفاتيح، يجب السعي بالنداء الأول خلافا للطحاوي، مكتبه امداد يه ملتان ۳/ ۲٦٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۵۸/۴۰)

جمعہ کی اذان اول کا مسنون وقت اور اذان ثانی کے درمیان کتنا فاصلہ

سوال [۳۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی اذان اول جو عام طور پر ایک گھنٹہ قبل ہوتی ہے، بعض علاقوں میں لوگ اس کو اذان ثانی سے متصل کرنا چاہتے ہیں، اس طرح کہ دونوں کے درمیان صرف دس منٹ کا فاصلہ رہے گا۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اذان اول کے بعد عام طور پر لوگ فوراً جمعہ کے لئے سعی نہیں کرتے، جس کی وجہ سے وہ گنہگار ہو رہے ہیں، اگر ایسا کر لیا جائے کہ اذان اول کے فوراً بعد اذان ثانی ہو جائے تو لوگ اذان اول سے پہلے مسجد میں آنے کی کوشش کریں گے اور اذان اول کے بعد سعی کے ترک کی وجہ سے جو گناہ ہو رہا تھا وہ نہیں ہوگا۔ فتویٰ اور مشورہ دونوں ہی مطلوب ہیں۔

المستفتی: شمیر الدین املی بازار کھجنیر، ضلع: راج گڈھ (ایم پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کی اذان اول اور خطبہ کے درمیان ایک گھنٹہ کا فاصلہ خلاف سنت ہے، ایسی صورت میں اذان اول کا مصلیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور اذان اول کے فوراً بعد لوگ کاروبار چھوڑ کر نہیں آئیں گے؛ اس لئے اذان اول اور خطبہ کے درمیان ۱۵-۲۰ منٹ کا فاصلہ مناسب ہے، اس سے زیادہ مناسب نہیں ہے۔

نیز جمعہ کی اذان اول کا مسنون وقت زوال کے فوراً بعد ہے اور حضور ﷺ، خلفاء راشدین اور سلف صالحین کے زمانہ میں جمعہ کی نماز اول وقت میں ہوا کرتی تھی، ہمارے ہندوستان میں عملی طور پر جمعہ کی اذان اول مسنون وقت پر نہیں ہوتی ہے اور جمعہ کی نماز بھی جتنی جلد ہونی

چاہئے نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں مساجد کے ذمہ داران اور خواص کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ جمعہ کی اذان زوال کے فوراً بعد ہو، اس کے ۱۵-۲۰ منٹ کے بعد خطبہ شروع ہوجائے اس دوران لوگ آسانی سے سنتیں پڑھ سکتے ہیں، اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ اذان اول کے فوراً بعد اذان ثانی کہہ دی جائے؛ بلکہ اذان اول اور اذان ثانی کے درمیان اتنا فاصلہ رہنا چاہئے کہ جس میں لوگ آسانی کے ساتھ وضو کر کے جمعہ کی سنن قبلیہ ادا کرسکیں، اس کے لئے ۱۵-۲۰ منٹ کافی ہیں۔

حدثني إياس بن سلمة بن الأكوع عن أبيه قال: كنا نصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة، وليس للحيطان فيئ يستظل به. (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الجمعه، باب استحباب التعجيل بصلاة الجمعة، دار الفكر بيروت ٤/ ٤٢١، رقم: ٥٧٧٠)

عن أنس بن مالك ؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس. (بخاري شريف، كتاب الجمعة، باب وقت الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١٢٣، رقم:٨٩٤، ف:٩٠٤)

عن إياس بن سلمة بن الأكوع عن أبيه قال: كنا نجمع مع النبي صلى الله عليه وسلم: إذا زالت الشمس، ثم نرجع نتتبع الفيئ. (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الجمعة، باب وقت الجمعة٤/ ٤٢٠، دار الفكر رقم:٥٧٦٧)

لكن جزم في الأشباه من فن الأحكام أنه لايسن لها الإبراد. وفي جامع الفتاوى لقارئ الهداية: قيل إنه مشروع؛ لأنها تؤدي في وقت الظهر وتقوم مقامه، وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض إلى الحرج. (شامي، كتاب الصلاة، مطلب في طلوع الشمس من مغربها، زكريا ٢/ ٢٥، كراچي ١/ ٣٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍۱۱۹۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍؍ھ

کیا جمعہ کی اذان اول کے بعد کھانا کھانا حرام ہے؟

سوال [۷۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ایک بجے جمعہ کی اذان ہوتی ہے، ڈیڑھ بجے خطبہ ہوتا ہے، بعض مرتبہ جمعہ کے دن ولیمہ کا کھانا ہوتا ہے، پوری بستی کی بھی دعوت ہوتی ہے اور مہمان بھی کافی ہوتے ہیں اور مہمانوں کا کھانا اور بستی والوں کا کھانا بھی ۱۲؍ بجے سے کھلانا شروع کردیتے ہیں اور جمعہ کی اذان کے بعد تک کھانے سے فارغ ہوتے ہیں، جمعہ کے خطبہ میں سب شریک ہوجاتے ہیں، ہماری مسجد کے امام صاحب نے جمعہ میں اعلان کردیا کہ جو لوگ جمعہ کی اذان کے بعد کھانا کھا کر آرہے ہیں، وہ حرام کھا کر آرہے ہیں؛ کیونکہ جمعہ کی اذان اول کے بعد کھانا حرام ہے، اس اعلان سے بستی والوں میں بے چینی ہے؛ کیونکہ شادی کے موقع پر یا مہمان زیادہ آجائیں، تو ایسے موقع پر کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ کھانا تیار ہوتا ہے، بھوک کا تقاضہ ہوتا ہے، میزبان پر کھلانے کا بوجھ ہوتا ہے، تو اذان اول کے بعد تک کھانا کھالیتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ جمعہ کی اذان اول کے بعد کسی کے لئے بھی کسی موقع پر کھانا جائز نہیں ہے؟ اگر کھالیا تو کیا حرام کھانے کا گناہ ہوگا؟ اس سلسلہ میں ہمیں تفصیل سے وضاحت فرما کر سامان راحت مہیا فرمائیں؟

المستفتی: حاجی محمد شفیق احمد سیڈھا، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کھانا کھانے کا تقاضہ غالب ہو اور کھانا کھا کر آرام سے جمعہ کی نماز مل جاتی ہو تو جمعہ کی اذان اول کے بعد کھانا کھانا جائز ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں

ذکر کردہ صورت میں جن لوگوں نے اذان اول کے بعد کھانا کھایا ہے، ان کے اس فعل کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

نیز ان کو حرام کھانے والا نہیں کہا جائے گا اور امام صاحب کا یہ اعلان کہ ’’جو لوگ جمعہ کی اذان کے بعد کھانا کھا کر آرہے ہیں، وہ حرام کھا کر آرہے ہیں‘‘ مسئلہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/ ۱۱۷)

سمع النداء وهو يأكل تركه إن خاف فوت جمعة. وفي الشامية: والأكل أي الذي تميل إليه نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر في ترك الجماعة، كما مر في بابها؛ لكن يشكل ما مر من وجوب السعي إلى الجمعة بالأذان الأول، وترك البيع و لو ماشيًا، والمراد به كل عمل ينافي السعي فتأمل. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچي ٢/ ١٦٣، زكريا ٣/ ٤١)

وفي تقريرات الرافعي: قوله لكن يشكل ما مر من وجوب السعي الخ بتقييد ما مر بما هنا يندفع الإشكال، وذلك لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذراً في سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلى يكون عذراً في سقوط واجب السعي، إذا لا فرق بين واجب وواجب.

(تقريرات رافعي قديم ٣/ ١١٣، جديد ٣/ ١٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۸ھ

مسجد کی کون سی اذان پر دوکان بند کی جائے؟

سوال [۳۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ زید کا تعلق تین مساجد سے ہے، بایں طور کہ زید کے بالکل گھر کے متصل ایک مسجد ہے، مگر وہ مسجد زید کے محلہ کی نہیں، دوسرے محلہ کی کہلاتی ہے، زید اس میں نماز بھی زیادہ تر نہیں پڑھتا، دوسری مسجد جو گھر سے کچھ دور ہے، جو محلہ کی اور زید کے خاندان سے متعلق ہے اور زید بازار کا دکاندار ہے، بازار میں بھی مسجد ہے، زید اکثر نمازیں بازار کی مسجد ہی میں ادا کرتا ہے، تینوں مساجد میں جمعہ ہوتا ہے، جو گھر کے متصل ہے اس میں ۱۲ر بجکر ۳۵ر منٹ پر اذان ہوتی ہے، جو محلہ کی مسجد ہے اس میں پون بجے اذان ہوتی ہے، بازار کی مسجد میں ایک بجے اذان ہوتی ہے ڈیڑھ بجے جمعہ کی نماز ہے، جمعہ کی نماز زید بازار کی مسجد میں ادا کرتا ہے، تو زید کو کونسی اذان پر اپنی دوکان بند کر دینا چاہئے، محلہ کی یا پڑوس کی یا بازار کی اذان پر؟

المستفتی: دوکاندار بازار شیر کورٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر ’’ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع‘‘ فرمایا ہے، یعنی ترک بیع کا حکم فرمایا ہے، ترک شراء کا حکم نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بیچنا بند ہو جائے گا اور گلیوں میں دوکانیں بند ہو جائیں گی تو خریدار کہاں سے آئیں گے، غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ بیچنے اور خریدنے دونوں کا مدار دوکان کھلی رکھنے پر ہے، جب دوکان ہی بند ہو جائے گی تو خریدار بھی نہیں آئیگا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے لفظ ’’وذروا البیع‘‘ فرمایا، جس کے ضمن میں ترک شراء کا حکم بھی ثابت ہو جاتا ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آگے پیچھے مختلف اذانوں میں کس اذان پر دوکان بند کی جائے؟ تو اس سلسلہ میں صریح جزئیہ اس لئے نہیں مل سکا کہ پہلے زمانہ میں ایک شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوا کرتا تھا، اگر شہر بہت بڑا ہے تو زیادہ سے زیادہ دو یا تین مسجدوں میں جمعہ ہوتا تھا، جن کے علاقے بھی الگ الگ ہوتے تھے، آج کے زمانہ میں چھوٹی بڑی ہر مسجد میں جمعہ ہونے لگا؛ اس لئے کس مسجد کی اذان پر دوکان بند کی جائے صریح جزئیہ تو نہیں مل سکا: البتہ

علماء سلف کی رائے دستیاب ہوئی۔

امام مسروق، امام ضحاک، امام مسلم بن یسار فرماتے ہیں کہ زوال کے بعد ہی خرید وفروخت حرام ہوجاتی ہے؛ لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگرچہ جس مسجد میں جمعہ پڑھنا ہے، اس کی اذان پر بند کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن علماء سلف کی رائے کے مطابق پہلی اذان پر دوکانیں بند کردینا چاہئے اور پھر جو لوگ جمعہ پڑھ کر پہلے آجائیں، ان کے لئے آتے ہی دوکان کھولنے کی اجازت ہے، چاہے دوسری مسجدوں میں جمعہ پڑھنا ابھی باقی ہی کیوں نہ ہو؛ اس لئے کہ آنے والوں نے حکم شرعی کی تعمیل کرلی ہے۔

قال أبو بكر: اختلف السلف في وقت النهي عن البيع. فروي عن مسروق، والضحاك، ومسلم بن يسار أن البيع يحرم بزوال الشمس. وقال مجاهد، والزهري: يحرم بالنداء، وقد قيل إن اعتبار الوقت في ذلك أولى إذ كان عليهم الحضور عند دخول الوقت، فلا يسقط ذلك عنهم تأخير النداء، ولما لم يكن للنداء قبل الزوال معنى دل ذلك على أن النداء بعد الزوال إنما هو بعد ما قد وجب إتيان الصلوة. (أحكام القرآن للجصاص الرازي، باب وجوب خطبة الجمعة، سهيل اكيڈمي، لاهور ۳/ ٤٤٨، جديد زكريا ۳/ ٥٩٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۹۵)	۱۴۲۱/۵/۲۸ھ

جمعہ کی اذان ہوتے ہی بائع پر دوکان بند کردینا لازم ہے

سوال [۳۵۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے ایضاح المسائل میں حدیث شریف کا حوالہ نہیں دیا، زحمت فرما کر حدیث

تحریر فرمادیں۔

المستفتی: قاری محمد یامین، قنوج، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث کا حوالہ نہیں دیا، مگر اس سے قبل مسئلہ ۱۵/۱ میں آیت کریمہ **فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع.** [الجمعۃ: ۰] سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بائع پر دوکان بند کردینا لازم ہے، ورنہ خریداروں کا سلسلہ باقی رہ جائے گا اور بہت سے مسلمان خریدار ترک سعی کے مرتکب ہوں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۲۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۳ھ

جمعہ کی اذان اول پر خرید وفروخت کی ممانعت

سوال [۳۶۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بروز جمعہ بعد اذان اول خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے، تو اس کی کمائی کا کیا حکم ہے اور کن دلائل سے یہ اطلاق اذان اول پر ہوتا ہے، اذان ثانی پر نہیں؟ اور اس کے خلاف کرنے والے کی اقتداء کیسی ہے اور اس کو امام بنانا کیسا ہے؟ اور بعض ائمہ بسبب وعظ وتقریر اذان جمعہ زوال کے فوراً بعد یعنی ظہر کی اذان سے بھی قبل کہلواتے ہیں، جس سے عوام کو اور زیادہ تشویش ہوتی ہے؛ جبکہ علماء کو عوام کے حق میں نرمی برتنے کی ہدایت ہے، تو کیا یہ حضرات گنہگار نہ ہوں گے؟ احقر خود اس میں مبتلا ہے؛ اس لئے برائے کرم واضح فرمائیں۔

المستفتی: ندیم احمد بجنوری، مقیم ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے جمعہ کی اذان اول پرخرید وفروخت کی ممانعت پر دلائل کا مطالبہ کیا ہے، اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید الکونین علیہ السلام کے زمانے سے حضرت عمرؓ کے آخری زمانہ تک اذان اول کا وجودنہیں تھا؛ بلکہ جمعہ کی اذان ثانی ہی تھی اور یہ اذان ثانی حضور ﷺ کے زمانہ سے حضرت عمرؓ کے آخری زمانہ تک زوال کے فوراً بعد دی جاتی تھی اورسب لوگ اذان سے پہلے ہی مسجد میں جمع ہوجایا کرتے تھے، جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیاتو انہوں نے مقام زوراء پر جو مسجد نبوی سے خارج حصہ پر تھا،اس پر اذان اول کا سلسلہ شروع فرمادیااوراذان اول زوال کے فوراًبعد دی جانے لگی، اذان ثانی جوحضور ﷺ کے زمانے سے زوال کے فوراًبعد دی جاتی تھی ،اس کو کچھ دیر بعد دی جانے لگی، دونوں اذانوں کے درمیان کچھ فاصلہ قائم کیا گیا تا کہ پہلی اذان سنتے ہی غائبین مسجد میں آنے لگیں، دوسری اذان سے پہلے پہلے سب لوگ مسجد میں جمع ہوجائیں اور اللہ تعالی نے قرآن کریم میں جمعہ کی اذان کے وقت خرید وفروخت بند کردینے کا جوحکم فرمایا ہے، اس کا مصداق حضور ﷺ کے زمانے میں اذان ثانی تھی؛ اس لئے کہ اذان ثانی زوال کے فوراً بعد ہوتی تھی اورحضرت عثمانؓ کے زمانے سے آیت کریمہ کا مصداق اذان اول بن گئی ہے؛ اس لئے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے سے زوال کے فوراًبعد جواذان دی جاتی ہے، وہ اذان اول بن گئی ہے، اسی لئے اذان اول ہی آیت کریمہ کا مصداق بن گئی اوراذان ثانی سے کچھ وقفہ دیر بعد میں قائم ہوگئی؛ اس لئے علماء جو بیان فرماتے ہیں کہ اذان اول سے خرید وفروخت ممنوع ہوجاتی ہے،وہ قرآن کریم اورآیت کریمہ کی بات ہے،وہ علماء کے من کی بات نہیں ہے۔

عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس. (بخاري، كتاب الجمعة، باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس، النسخة الهندية ١/١٢٣، رقم: ٨٩٤، ف:٩٠٤، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في وقت الجمعة، النسخة الهندية ١/١١٢، دارالسلام رقم:٥٠١)

عن السائب بن يزيدؓ قال: كان النداء يوم الجمعة، أوله إذا جلس الإمام على المنبر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر رضي الله عنهما، فلما كان عثمان رضي الله عنه وكثر الناس زاد النداء الثالث على الزوراء. (بخاري شريف، كتاب الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١٢٤، رقم:٩٠٢، ف:٩١٢)

و في عمدة القاري: فالأذان الثالث الذي زاده عثمانؓ هو الأول اليوم، فيكون الأول هو الأذان الذي كان في زمن النبي صلى الله عليه وسلم وزمن أبي بكر وعمر رضي الله عنهما عند الجلوس على المنبر، والثاني: هو الإقامة، والثالث: الأذان الذي زاده عثمانؓ، فأذن به على الزوراء. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة، زكريا ٥/ ٧١-٧٣، بيروت قديم ٦/ ٢١١)

اب رہی یہ بات کہ اذان اول اوراذان ثانی کے درمیان جو وقفہ رہتا ہے، اس وقفہ میں کچھ وعظ وتقریر اور دین کی باتیں کرنا کہاں سے ثابت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، حضرت ابو ہریرہؓ جمعہ کی اذان ثانی سے پہلے اور امام وخطیب کے ممبر پر آنے تک حدیثیں سنایا کرتے تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے بھی ثابت ہے، مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایات موجود ہیں۔

رأيت أبا هريرةؓ يخرج يوم الجمعة فيقبض على رمانتَيِ المنبر قائماً، ويقول: حدّثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلايزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس، هذا حديث صحيح الإسناد و لم يخرجاه. وقال الذهبي صحيح. (المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٦/ ٢٢٢٢، رقم:٦١٧٣، قديم ٣/ ٥١٢)

عن أبي الزهرية رضؓ**، قال: كنت جالسا مع عبد الله بن بسر يوم الجمعة، فمازال يحدثنا حتى خرج الإمام.** (المستدرك على الصحيحين، كتاب الجمعة، قديم ۲۸۸/۱، مکتبہ نزار مصطفی الباز جدید ۴۱۶/۱، رقم: ۱۰۶۱)

سائل نے جو سوال نامہ میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ جمعہ کی اذان اول کے بعد خرید وفروخت کرنا اگر ناجائز اور حرام ہے، تو اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟ اور اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں مقصد شریعت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ دور نبوت میں حضرت عثمانؓ کے زمانے تک صرف اذان ثانی جو منبر کے قریب دی جاتی تھی وہی تھی، پھر اس اذان کے بعد خطبہ شروع ہو جاتا تھا اور جمعہ کا خطبہ سننا واجب ہے اور یہ اذان ثانی زوال کے فوراً بعد دی جاتی تھی؛ لہٰذا اس اذان کے بعد بھی خرید وفروخت کو جاری رکھا جائے، تو اسے نہ جمعہ کا خطبہ مل سکتا ہے، نہ ہی جمعہ کی پوری نماز مل سکتی ہے؛ لہٰذا بالقصد اس اذان کے بعد خرید و فروخت کو جاری رکھنا گناہ کبیرہ اور موجب فسق ہے؛ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے سے زوال کے فوراً بعد ایک اذان کا اضافہ ہوا اور اس کے کچھ وقفہ کے بعد منبر کے سامنے والی اذان دی جانے لگی؛ لہٰذا حضرت عثمانؓ کے زمانے سے مسئلہ کی دو حیثیت ہو گئی۔

(۱) زوال کے فوراً بعد جو اذان دی جاتی ہے قرآن کریم میں وہی اذان مراد ہے۔ اور حضور ﷺ کے زمانے سے حضرت عثمانؓ کے زمانے تک اس اذان کا مصداق منبر کے سامنے والی اذان تھی۔ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے سے آیت کریمہ کا مصداق بن گئی؛ اس لئے کہ زوال کے فوراً بعد یہی اذان دی جاتی ہے۔

نیز منبر کے سامنے والی اذان کی آواز آج کل کے زمانے میں مسجد سے باہر بازاروں اور محلوں میں نہیں پہونچ پاتی؛ بلکہ اذان اول ہی کی آواز پہونچتی ہے، یہ تفصیل تقریباً اوپر آچکی ہے۔

(۲) دوسری حیثیت یہ ہے کہ خطبہ اور نماز دونوں کا حاصل کرنا لازم اور ضروری ہے۔ اور بالقصد خطبہ اور نماز کا ترک کر دینا موجب فسق ہے؛ لہٰذا اگر جمعہ کی اذان اول کے بعد اتنی

دیر تک خرید وفروخت جاری رکھی جائے کہ خطبہ اور نماز ترک ہو جائے ،تو یہ موجب فسق ہے۔اور بار بار بالقصد ایسا کرنے والا فاسق اور لائق امامت نہیں ہے؛ لیکن اگر اذان سننے کے بعد تیاری شروع ہو جائے اور اسی ضمن میں کچھ خرید وفروخت بھی ہو جائے تو خرید وفروخت اگر چہ مکروہ ہے؛ لیکن اس کی کمائی حرام یا مکروہ نہیں ہے؛ بلکہ حلال ہے جب کہ جمعہ کے خطبہ اور نماز میں اطمینان سے شرکت حاصل ہو جاتی ہو، اگر مسئلہ طلب اور اخلاص کے ساتھ معلوم کیا جائے تو باعث اجر وثواب ہے اور اگر کسی ذاتی رنجش کی بنا پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی نیت سے معلوم کیا جائے تو باعث معصیت ہے،اس کا ضرور خیال رکھا جائے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۰۲۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۲ھ

جمعہ کی اذانِ اول کے جواب کا شرعی حکم

سوال [۳۶۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی نماز میں خطبہ سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے، اس کا جواب دینا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمادیں۔

المستفتی: عبداللہ گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خطیب کے سامنے جب مؤذن جمعہ کے خطبہ کی اذان دے، تو اس وقت اس کا جواب سامعین کا زبان سے دینے سے متعلق کتب فقہ میں مختلف عبارتیں ملی ہے، حضرت الاستاذ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے اس مسئلہ سے متعلق متعدد جوابات لکھے ہیں، ان میں چھ جوابات فتاوی محمودیہ میں درج ہیں کچھ تفصیلی ہیں، کچھ مختصر۔

جوفتاوی محمودیہ ڈابھیل ۳۲۴/۸ سے ۳۳۳ تک اور میرٹھ ۱۲/۱۷۷-۱۸۴ تک میں موجود ہیں، اس میں حضرت مفتی صاحب نے تفصیلی فتاوی میں فقہاء کی آراء اور جزئیات بھی نقل فرمائے ہیں، امام طحاوی وغیرہ نے جوتحریر فرمایا ہے کہ زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی اذان ثانی کا جواب دینا، سامعین کے لئے جائز ہے، اسی طرح مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے نفع المفتی والسائل میں جواز کی بات کوراجح قرار دیا ہے اور امام صاحب کے قول کو اسی بات پر محمول کیا ہے کہ دنیوی کلام وغیرہ اس دوران ممنوع ہے؛ البتہ دینی کلام تسبیح، تہلیل اور اجابت اذان ممنوع نہیں ہے، پھر بعد میں امام صاحب کے نزدیک کراہت کی بات ثابت فرمائی اور صاحبینؒ کے نزدیک عدم کراہت کی بات ثابت کی گئی ہے، اس کے بعد اخیر میں استدلال کر کے یہ ثابت فرمایا کہ امام صاحب کا قول کراہت ہی پر محمول ہے یہی راجح ہونا چاہئے اور اذان ثانی کا جواب زبان سے نہ دیں؛ بلکہ دل ہی دل میں دھیان کر کے جواب دیں اور حضرت معاویہؓ کی روایت کو اس بات پر محمول کیا ہے کہ امام کے لئے اذان ثانی کا جواب زبان سے دینا مشروع ہے اور اس میں مقتدی شامل نہیں، اسی طرح حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ جدید ۲/۵۳۱ سے لے ۵۳۶ تک میں اسی موضوع سے متعلق تفصیلی فتوی تحریر فرمایا ہے، انہوں نے بھی اپنے دلائل کے ذریعہ یہی بات ثابت فرمائی ہے کہ اذان ثانی کا جواب زبان سے نہ دیا جائے اور ان بزرگوں نے زبان سے نہ جواب دے کر دل ہی دل میں جواب دینے کی بات جو کہی ہے یہ ہمیں سمجھ میں نہیں آئی؛ اس لئے کہ دل ہی دل میں جواب دینے کا مطلب یہی ہے کہ دھیان سے سنی جائے اور جواب چوں کہ بلا تلفظ ادا نہیں ہوسکتا؛ اس لئے یہی بات زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ زبان ہی سے سراً اور آہستہ جواب دیا جائے اور کتب فقہ کی عبارات سے یہی بات زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے اور ممانعت کا مدار دوران خطبہ پر ہے اور اذا خرج الإمام فلا صلوة ولا کلام کا اصل مقصد دوران خطبہ کلام اور صلوۃ سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کی رائے ہے اور امام

صاحب کا دوسرا قول جوطحطاوی علی الدروغیرہ میں منقول ہے کہ خطبہ سے پہلے دوران اذان دنیوی کلام ممنوع ہے، جواب اذان اس سے مستثنیٰ ہے، ایسی صورت میں دونوں طرح کی حدیثوں میں تطبیق ہوجاتی ہے کہ فلا صلاۃ ولا کلام سے دوران خطبہ ممانعت کا حکم ہے اور حضرت معاویہؓ کی روایت خطبہ شروع ہونے سے پہلے اور بعد سے متعلق ہے، طحطاوی علی الدر اور بحر کی عبارت اس سلسلے میں بہت واضح ہے، جو بعد میں آرہی ہے اور ایسی صورت میں حدیث بخاری پر بھی عمل ہوجائے گا، امام صاحب کے قول کا صحیح محمل بھی واضح ہوجائے گا اور صاحبینؒ کے قول کے اعتبار سے کوئی اشکال بھی نہیں رہے گا اور اس سلسلے میں ہم کو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے دو فتاوے دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱) کفایت المفتی جدید ۲۷۲/۳، جدید مطول ۲۰۵/۵ /اس میں حضرت مفتی صاحب نے بخاری شریف ۱۲۴/۱ر میں حضرت معاویہؓ، سلمان فارسیؓ کی روایت سے استدلال کر کے لکھا ہے کہ جب امام خطبے کے لئے تشریف لائے، تو خاموشی اختیار کرنے کا حکم ہے اور حضرت معاویہؓ کی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام وخطیب کے لئے اذان ثانی کا جواب دینا مشروع ہے اور غیر خطیب کے لئے انصات اور خاموشی کا حکم ہے اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ خطبہ شروع ہونے سے پہلے کلام دینی کو جائز فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ امام و خطیب کے لئے اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہے اور غیر خطیب کے لئے خاموشی بہتر ہے، مگر صاحبین کے نزدیک مقتدی کے لئے اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہے اور حضرت مفتی صاحب کا دوسرا فتوی فتاوی رحیمیہ جدید ۱۴۷/۶ر میں ازالہ الاوصام عن مسائل الاحکام از افادات سید قاضیؒ محدث راندیری ۱۹ر کے حوالے سے ذیل کے الفاظ کے ساتھ دست یاب ہوا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

تاہم متاخرین حنفیہ نے بوجہ حدیث معاویہ احادیث اذان منبری کی اجازت دی ہے؛ لیکن نماز شروع کرنے کی باتفاق ائمہ اجازت نہیں ہے اور خاکسار کے خیال میں اجابت اذان منبری کے

علاوہ دیگر اذکار سے انصات اور خاموشی اول اور اقدم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: محمد کفایت اللہ غفرلہ
مدرسہ امینیہ دہلی

مفتی صاحب کی اس تحریر سے واضح ہوا کہ اذان خطبہ کا جواب مقتدی بھی زبان سے دے سکتے ہیں، مگر اجابت اذان ثانی کے علاوہ دیگر اذکار سے خاموشی اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اکابر کی تحریرات کی اس تفصیل کے بعد اور فقہی جزئیات کے پیش نظر حضرت مفتی کفایت اللہ کا آخری فتوی زیادہ راجح اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی خطیب کے منبر پر آنے کے بعد کلام دنیاوی مکروہ ہے اور اجابت اذان مشروع ہے اور صاحبین کے نزدیک بلا شبہ جائز ہے جیسا کہ مفتی صاحب کے آخری فتوی سے واضح ہے؛ لہٰذا ہم بھی زبان سے سرًّا اذان ثانی کا جواب دینا جائز اور مشروع سمجھتے ہیں؛ اس لئے کہ ایسی صورت میں تمام روایات میں تطبیق ہوجاتی ہے اور سب روایات پر عمل بھی ہوجاتا ہے، اب ہم اس سلسلے میں پہلے بخاری شریف کی دونوں روایتیں نقل کردیتے ہیں اور اس کے بعد فقہاء کے جزئیات پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

عن سلمان الفارسي قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من اغتسل يوم الجمعة وتطهر بما استطاع من طهر، ثم ادهن، أو مس من طيب، ثم راح فلم يفرق بين اثنين فصلى ما كتب له، ثم إذا خرج الإمام أنصت غفر له ما بينه وبين الجمعة الأخرى. (بخاری شریف ۱/۱۲۴، رقم: ۹۰۰-۹۱۰)

عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف قال: سمعت معاوية بن أبي سفيانؓ، وهو جالس على المنبر أذن المؤذن، فقال الله أكبر، الله أكبر، قال معاويةؓ: الله أكبر، الله أكبر، فقال أشهد أن لا إله إلا الله، فقال معاويةؓ: وأنا، قال أشهد أن محمدا رسول الله، قال معاويةؓ: وأنا، فلما أن قضى التأذين قال يا أيها

الناس إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس حين أذن المؤذن يقول ما سمعتم مني من مقالتي...... (بخاري شريف ١/١٢٥، رقم: ٩٠٤-٩١٤، كتاب الجمعة، باب يجيب الإمام على المنبر إذا سمع النداء)

لا يرّد السلام ولايسلم ولا يقرأ؛ بل يقطعها ويجيب ولايشتغل بغير الإجابة، قال: وينبغي أن لا يجيب بلسانه اتفاقاً في الأذان بين يدى الخطيب، وأن يجيب بقدمه اتفاقًا في الأذان الأول يوم الجمعة لوجوب السعي بالنص. وتحته في حاشية الطحطاوي: قوله في الأذان بين يدي الخطيب مراعاة لقول الإمام بكراهة الكلام مطلقًا إذا صعد الخطيب المنبر؛ لكن سيأتي في الجمعة أن الأصح جواز الأذكار عنده قبل شروعه في الخطبة فلا مانع من الإجابة. (حاشية الطحطاوي على الدر كراچي ١/١٨٨)

ولأن الكلام يمتد طبعاً فيخل بالاستماع والصلاة قد تستلزمه أيضاً وبه اندفع قولهما أنه لا بأس بالكلام إذا خرج قبل أن يخطب وإذا نزل قبل أن يكبر، واجمعوا أن الخروج قاطع للصلاة. وفي العيون: المراد إجابة المؤذن أما غيره من الكلام فيكره إجماعًا. (البحر الرائق، زكريا ٢/٢٧٠، كوئٹه٢/١٥٥)

اختلف المشايخ علي قول الإمام في الكلام قبل الخطبة، فقيل: إنما يكره ما كان من جنس كلام الناس، أما التسبيح ونحوه، فلا، وقيل: ذلک مكروه، والأول أصح، ومن ثمه قال في البرهان: وخروجه قاطع للكلام أي كلام الناس عند الإمام فعلم بهذا أنه لا خلاف بينهم في جواز غير الدنيوي على الأصح. (حاشية الطحطاوي على المراقي، المكتبة الأشرفية ٥١٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ ربیع الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۲۰۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۴/۱۴۳۶ھ

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب اوراذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا

سوال [۳۶۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن خطبہ کی اذان جو دی جاتی ہے، اس کا جواب دینا اوراذان ختم ہونے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟ ضروری سمجھ کر برائے کرم مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد مسلم بردوانی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کی اذان ثانی کا جواب زبان سے جہراً دینا ممنوع اور مکروہ ہے؛ البتہ زبانی سراً جواب دینا راجح قول کے مطابق جائز اور درست ہے اوراذان ثانی کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

وإذا شرع في الدعاء لایجوز للقوم رفع الیدین ولاتأمین باللسان جهراً، فإن فعلوا ذلک أثموا. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/۳۵، کراچی ۲/۱۵۸)

أما التسبیح ونحوه فلا یکره وهو الأصح. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱۵۸، زکریا ۳/۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۳۲)

اذان ثانی کا جواب اور دوران خطبہ آپ ﷺ کے نام پر درود پڑھنا

سوال [۳۶۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کی ثانی اذان کا جواب دینا اور خطبہ کے دوران نبی ﷺ کے نام مبارک پر درود

شریف کا پڑھنا اور خطبہ کے اخیر میں دعائیہ کلمات پر آمین کہنا کیسا ہے؟

المستفتی: شفیع احمد اعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی اذان ثانی کا جواب زبان سے جہراً دینا مکروہ ہے؛ البتہ راجح قول کے مطابق زبان سے سراً جواب دینا جائز ہے، نام مبارک آجائے تو زبان سے درود شریف پڑھنا دوران خطبہ ممنوع ہے؛ بلکہ دل دل میں درود پڑھنا چاہئے۔

والصواب أنه يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم عند سماع إسمه في نفسه الخ. (در مختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۵۹، زكريا ۳/ ۳٦)

اور دوران خطبہ دعائیہ کلمات پر آمین جہراً کہنا ممنوع ہے۔

وإذا شرع في الدعاء لا يجوز للقوم رفع اليدين، ولا تأمين باللسان جهراً، فإن فعلوا ذلک أثموا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ۳/ ۳۵، كراچي ۲/ ۱۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۱٦)

جمعہ میں خطبہ کی اذان کا جواب دینا کیسا ہے؟

سوال [۳٦۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے خطبہ کی اذان کا جواب کس طرح دیا جائے، عام اذانوں کی طرح یا کوئی اور شکل ہوگی؟

المستفتی: محمد ناظم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: راجح اور صحیح قول کے مطابق جمعہ کے خطبہ کی اذان کا

جواب زبانی سراً دینابلاشبہ جائز ہے،جن فقہاء نے زبانی جواب نہ دینے کی تصریح کی ہے، ان کی مراد جہراً جواب دینا ہے یا وہ اقوال مرجوحہ ہیں جن کا اعتبار نہیں ہے۔ (مستفاد: ذخیرۃ المسائل، مولانا عبدالحی لکھنوی ص: ۱۳۶)

إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا كلام وهو قول الإمام؛ لأنه نص النبي صلى الله عليه وسلم، قوله ولا كلام: إختلف المشايخ على قول الإمام في الكلام قبل الخطبة، فقيل إنما يكره ما كان من جنس كلام الناس، أما التسبيح ونحوه فلا وقيل ذلك مكروه، والأول أصح. (حاشية الطحطاوي على المراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة ٥١٨)

ثم عند أبي حنيفة يكره الكلام حين يخرج الإمام للخطبة، وفي الينا بيع: يريد به أنه إذا صعد على المنبر، ثم اختلف المشايخ على قول أبي حنيفة، قال بعضهم: إنما يكره الكلام الذي هو من كلام الناس، أما التسبيح، وأشباهه فلا، وقال بعضهم: كل ذلك والأول أصح. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الخامس و العشرون، شرائط الجمعة، زكريا ٥٧٦/٢، رقم:٣٣٤٢، البنايه، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفية ٨٤/٣، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ٢٧٢/٢، كوئٹه ١٥٥/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۶۰/۴۰)

خطبہ کی اذان میں کلمۂ شہادت پر درود پڑھنا

سوال [۳۶۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ میں خطبہ کی اذان میں ” **اشهد أن محمد رسول الله**“ پر درود شریف

پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد اسعد قاسمی، اصالت پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک آئے تو زبان کے تلفظ کے ساتھ نہیں؛ بلکہ اتنے مخفی انداز سے درود شریف پڑھے کہ خود اپنے کو بھی سنائی نہ دے۔

أنه لا يصلى النبي صلى الله عليه وسلم عند ذكره في الخطبة، وعن أبي يوسف ينبغي أن يصلي في نفسه؛ لأن ذلك مما لايشغله عن سماع الخطبة، فكان احرازاً للفضيلتين الخ. (فتح القدير، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة العيدين، زكريا ٢/٦٦، كوئٹه ٢/٣٨، دارالفكر مصري قديم ٢/٦٩)

إذا ذكر النبي صلى الله عليه وسلم لايجوز أن يصلوا عليه بالجهر؛ بل بالقلب وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/٣٥، كراچي ٢/١٥٨)

وإذا أمر الخطيب بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم يصلي سراً إحرازاً للفضيلتين. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ص:٥١٩، الموسوعة الفقهية الكويتيه ١٩/١٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۳۱/۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۳/۱۴۱۷ھ

دور نبوت میں اذان جمعہ کہاں دی جاتی تھی؟

سوال [۳۶۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی حضور ﷺ کے زمانے میں ممبر کے سامنے ہوتی تھی

اوراس کا کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کرتا ہے؛ البتہ امر مطلوب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی یا باہر ہوتی تھی؟ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں کہاں ہوتی تھی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: مولانا محمد علی قصبہ شیر گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضور ﷺ اور حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ کے زمانہ تک جمعہ کی صرف ایک اذان ہوتی تھی اور یہ وہ اذان ہے، جو آج کے زمانہ میں مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دی جاتی ہے اور حضور ﷺ کے زمانہ سے حضرت عمرؓ کے زمانہ تک چونکہ ایک ہی اذان ہوتی تھی؛ اس لئے یہ اذان مسجد کے دروازے کے سامنے دی جاتی تھی تاکہ مسجد کے اندر کے لوگ اور باہر کے لوگ سب اذان سن سکیں؛ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں لوگوں کا مجمع زیادہ بڑھ گیا، تو تمام صحابہ کے مشورہ سے مزید ایک اذان کا اضافہ کیا گیا اور یہ اذان مسجد نبوی کے باہر مقام زوراء پر دی جانے لگی تاکہ اس اذان کو سن کر دور دراز کے لوگ مسجد میں جلد آجائیں اور یہ اذان پہلے دی جاتی ہے تاکہ غائبین حاضر ہوجائیں اور سابقہ اذان مسجد کے اندر ممبر کے سامنے دی جانے لگی تاکہ اس اذان کے ذریعہ سے مسجد کے اندر کے لوگ خطیب کی طرف متوجہ ہوکر خطبہ سنیں اور سنن ونوافل ذکر وتلاوت وغیرہ بند کردیں، یہ ہے دونوں اذانوں کی حیثیت۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن السائب بن يزيد قال: كان النداء يوم الجمعة، أوله إذا جلس الإمام على المنبر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر رضي الله عنهما، فلما كان عثمان رضي الله عنه وكثر الناس زاد النداء الثالث على الزوراء. (صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة، ١/ ١٢٤، رقم: ٩٠٢، ف:٩١٢)

عن السائب بن يزيدؓ قال: كان يؤذن بين يدي رسول الله صلى الله

علیہ وسلم إذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد، وأبي بکر، وعمر، ثم ساق نحو حدیث یونس. (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب النداء یوم الجمعۃ، النسخۃ الهندیۃ ۱/۱۵۵، دار السلام رقم: ۱۰۸۸)

إذا صعد الإمام المنبر جلس و أذن المؤذنون بین یدي المنبر، بذلک جری التوارث. (هدایۃ، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، اشرفیۃ ۱/۱۷۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۸۱۶)

خطبہ سے قبل اذان کہاں دی جائے؟

سوال [۳۶۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عرصہ تین ماہ قبل ایک امام صاحب مسجد نور خاں، حیات نگر سنبھل میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے، مسجد نور خاں میں جمعہ کے خطبہ سے پہلے کی اذان اندرون مسجد ممبر کے سامنے پہلی صف میں ہوتی چلی آرہی ہے۔ امام مذکور نے تقریباً دو ماہ آٹھ یا نو جمعوں کی نماز اسی طرح اندرون مسجد اذان کے ذریعہ پڑھائی، آٹھویں یا نویں جمعہ کو انہوں نے مؤذن کو اذان مذکور بیرون مسجد پڑھنے کا حکم دیا، اس پر وہاں موجود نمازی بھڑک گئے اور اذان کی جگہ نہ بدلنے پر اڑے رہے، بالآخر اذان اندرون مسجد میں ہوئی۔ اور امام مذکورہ نے ہی نماز پڑھائی؛ لیکن جمعہ کے بعد امام صاحب نے حدیث شریف کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ حدیث کے مطابق اذان بیرون مسجد ہونی چاہئے۔ اور حدیث کے مطابق عمل نہ کرنے والا نہ ماننے والا منافق اور کافر ہے؛ لیکن امام مذکور کے اس فیصلہ پر وہاں کے مستقل نمازیوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے پہلے آٹھ جمعوں تک اور اب بعد میں بھی حدیث کے حکم کے خلاف نماز کیوں پڑھائی اور اب بھی کیوں پڑھا رہے ہیں؛ جبکہ اذان اندرون مسجد ہو رہی ہے، آپ

کیا ہوئے کافر یا منافق؟ امام مذکور کے اس عمل سے مسجد میں لوگوں نے نماز پڑھنی بند کردی ہے، تقریباً ایک درجن مستقل نمازیوں نے جانا بند کردیا ہے اور مسجد میں تفرقہ پھیل گیا ہے، امام مذکور نے اپنی جمعہ کی تقریر میں فرمایا ڈاڑھی منڈوانا حرام ہے، خطبہ کے دوران ایک شخص پالتی مارے بیٹھا تھا، امام مذکورہ نے کہا (کیسے بیٹھا ہے جیسے مندر میں مورتی رکھی ہو)

المستفتی: نمازی مسجد جمال اختر خاں، حیات نگر سرائے ترین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب سے جمعہ کی اذان اول کا سلسلہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، وہ اذان مسجد سے باہر ہی دینے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے اور اذان اول حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں شروع ہوئی ہے، اس وقت سے خطبہ کی اذان منبر کے سامنے دینے کا سلسلہ بھی دور صحابہ سے لے کر ائمہ مجتہدین، سلف وخلف سے تواتر و توارث کے ساتھ آج تک جاری ہے؛ اس لئے اگرچہ یہ اذان حدود مسجد میں کہیں بھی دینا جائز ہے، مگر افضل اور بہتر یہی ہے کہ منبر کے سامنے یہ اذان دی جائے، جیسا کہ دور اول سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، امام مذکور سے مقتدیوں کا جوابی اعتراض اپنی جگہ درست ہے کہ جب امام نے خطبہ کی اذان مسجد سے باہر پڑھنے پر حدیث سے ثابت کر کے اس پر خود یہ استدلال کیا ہے کہ حدیث کے خلاف عمل کرنے والے کافر یا منافق ہیں، تو اس پر مقتدیوں کا جوابی اعتراض کہ آٹھ نو جمعہ تک آپ نے بلا کسی اشکال کے اندرون مسجد منبر کے سامنے خطبہ کی اذان دلوائی اور نماز پڑھائی تو مقتدیوں کی طرف سے یہ جواب دینا بالکل درست ہے؛ لیکن اصل بات یہ ہے کہ مسجد کے دروازہ پر یا صحن مسجد میں خطبہ کی اذان اس وقت دی جاتی تھی، جب تک اذان اول کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، جب حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں پہلی اذان کا سلسلہ شروع ہوا تو خطبہ کی اذان اندرون مسجد دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔

امام صاحب کا مجمع عام میں اس طرح کے بازاری اور غیر مہذب الفاظ سے یاد کرنا ایک مسلمان کی بھرے مجمع میں ہتک حرمت ہے؛ اس لئے اس نمازی سے معذرت خواہی، معافی

مانگ کر دل کی صفائی ضروری ہے، اور امام صاحب کی یہ بات درست ہے کہ داڑھی منڈانا حرام ہے۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذٰلک جرى التوارث، ولم يكن على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا هذا الأذان. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ۱/ ۱۷۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۳۸)

اذان ثانی کہاں دی جائے؟

سوال [۳۶۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اذان ثانی مسجد کے اندر ہونی چاہئے یا خارج مسجد، جو بھی صورت درست ہو جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد مشکور حسین، ملک سرسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اذان ثانی جو خطیب کے ممبر پر جانے کے بعد دی جاتی ہے، اس کو حدود مسجد میں دینا جائز ہے؛ لیکن افضل اور مستحب یہ ہے کہ خطیب اور ممبر کے سامنے یہ اذان دی جائے، یہی توارث اور تواتر سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ یہ اذان حاضرین کو متنبہ کرنے کے لئے ہوتی ہے کہ جو لوگ ذکر وتلاوت وغیرہ میں مشغول ہیں یا سنن ونوافل پڑھنے کا ارادہ کررہے ہیں، وہ حضرات سب چیزیں ترک کرکے امام کے خطبہ کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

و يؤذن ثانيًا بين يديه إذا جلس على المنبر. (شامي، كتاب الجمعة، مطلب في حكم المرقي بين يدى الخطيب، كراچي ٢/١٦١، زكريا ٣/٣٨-٣٩)

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذٰلك جرى التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/١٧١، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ١/٢٥٤، كذا في اعلاء السنن، باب التأذين عند الخطبة، دارالكتب العلمية بيروت ٨/٨٥)

الحكمة في الأذان في هذا المحل ليعرف الناس بجلوس الإمام على المنبر، فينصتون له إذا خطب. (فتح الباري، كتاب الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة ،زكريا ٢/٥٠٠، تحت رقم الحديث: ٩١٢، قديم ٢/٣٩٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۲/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۰۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۲۵ھ

اذان ثانی کا محل کیا ہے؟

سوال [۳۶۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عین الهدایہ ۱/۲۹۵/ باب الاذان اور عالمگیری ۱/۵۷/ باب الاذان میں تحریر ہے کہ سنت یہ ہے کہ اذان اونچی جگہ دے، مسجد کے اندر نہیں؛ بلکہ مئذنہ پر یا مسجد سے باہر ہونی چاہئے۔ ابن الحاج محمد مالکی نے مدخل میں لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان کا سنت طریقہ یہ ہے کہ جب امام منبر پر بیٹھے تو اذان دینے والا مینارہ پر ہو اور یہ طریقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جاری ہے، پھر ہشام بن عبد الملک جب حاکم ہوا، تو اس نے اس اذان کو جس کی ابتداء حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی تھی، اس کو مینارہ پر کردی اور اذان ثانی کو امام کے سامنے کردی۔ (حاشیہ شرح وقایہ ۱/۲۴۵)

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تعلیم الاسلام حصہ چہارم ۴۸؍ میں تحریر کرتے ہیں کہ خطیب کے سامنے ہونی چاہئے یا منبر کے پاس ہو یا ایک دو صفوں کے بعد یا ساری صفوں کے بعد، مسجد میں یا مسجد سے باہر، ہر طرح جائز ہے۔

بہر حال ہمارے علماء حق کا عمل اس کے خلاف ہے اور اذان ثانی جس مسجد میں باہر ہوتی ہے، اس کو برا سمجھتے ہیں اور علماء حق کا عمل فعلاً تو کتب فقہ کے خلاف ہے، اس کا کیا سبب ہے؟

المستفتی: عبدالرشید اناوی، معرفت عارف الصدیق، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کی اذان ثانی کو مسجد سے باہر ثابت کرنے کے لئے سائل نے تین طرح کے حوالہ جات پیش فرمائے ہیں۔

(۱) عین الہدایہ اور فتاوی عالمگیری کا حوالہ ہے، تو یہ دونوں حوالے ہر گز صحیح نہیں ہیں؛ کیونکہ سائل کی پیش کردہ عبارتیں نماز پنج گانہ کی اذان سے متعلق ہیں نہ کہ جمعہ کی اذان ثانی سے؛ کیونکہ عین الہدایہ اور فتاوی عالمگیری دونوں کتابوں میں صاف لفظوں کے ساتھ موجود ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی منبر کے سامنے دیا کریں اور اسی کے ساتھ دور صحابہ سے اب تک توارث جاری ہوتا آیا ہے، دونوں کی عبارتیں یوں ہیں: مؤذن لوگ منبر کے سامنے اذان کہیں اسی فعل کے ساتھ توارث جاری ہوتا آیا ہے۔ (عین الہدایہ باب الجمعہ ۱؍۶۵۸)

إذا جلس علی المنبر أذن بین یدیه وأقیم بعد تمام الخطبة بذلک جری التوارث. (فتاوی عالمگیري، باب الجمعة، زکریا قدیم ۱/۱۴۹، جدید زکریا ۱/۲۱۰)

اس لئے جو لوگ فتاوی عالمگیری اور عین الہدایہ کی طرف عبارتوں کو غلط منسوب کر کے جمعہ کی اذان ثانی کو مسجد سے باہر لازم کرنا چاہتے ہیں وہ قطعاً غلط ہے۔

(۲) سائل نے حاشیہ شرح وقایہ کے حوالہ سے مدخل کی عبارت کا ترجمہ نقل کیا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی حضور ﷺ کے زمانہ مبارک سے ہشام بن عبدالملک کے زمانہ تک مینارہ پر ہوتی

آئی ہے، یہ حوالہ مدخل کی طرف منسوب کرنا کسی حد تک تو صحیح ہے؛ لیکن صاحب مدخل کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے، یہ محض دعویٰ بلا دلیل ہے اور نہ ہی جمہور فقہاء متقدمین و متأخرین اس سے متفق ہیں؛ کیونکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی منارہ ہی نہیں تھا؛ بلکہ مسجد ہی کے اندر منبر کے سامنے جمعہ کی اذان ثانی دیجاتی تھی، جیسا کہ عمدۃ القاری شرح بخاری، البحر الرائق، فتاوی شامی، منحۃ الخالق وغیرہ کتب فقہ وحدیث کی عبارتوں سے صاف طریقہ سے ثابت ہوتا ہے۔

وفي فتاوى ابن يعقوب الخاصى هي الماذنة، وفيه نظر ولم يكن في زمن النبي صلى الله عليه وسلم مأذنة التي يقال لها المنارةالخ.
(عمدة القاري، باب الأذان يوم الجمعة، قديم دار إحياء التراث العربي زكريا جديد ٥/٧٤، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الأذان، قديم كوئٹه ١/٢٥٨، جديد زكريا ١/٤٥٠)

أن أول من رقي منارة مصر للأذان شرحبيل بن عامر المرادى، وبنى سلمة المنابر للأذان بأمر معاويةؓ، ولم تكن قبل ذلك. (فتاوى شامي، كتاب الصلاة، باب الأذان، كراچي ١/٣٨٧، زكريا ٢/٥٣، منحة الخالق، كوئٹه ١/٢٥٨، جديد زكريا ١/٤٥٠)

نیز محشی شرح وقایہ خود اپنی کتاب سعایہ اور نفع المفتی والسائل وغیرہ میں جمعہ کی اذان ثانی کو خطیب کے سامنے ثابت کرتے ہیں۔

أذان لا يستحب رفع الصوت فيه بل هو الأذان الثاني بين يدى الخطيب؛ لأنه كالإقامة لا علام الحاضرين صرح به جماعة من الفقهاء.
(سعاية حواله لامع الدراري ٢/٢١، هكذا في نفع المفتي والسائل ٤٢)

(۳) سائل کا علماء حق کے عمل کو تعلیم الاسلام کی عبارت کے خلاف ثابت کرنا بھی ہرگز درست نہیں ہے؛ کیونکہ علماء حق بھی اسی کے قائل ہیں کہ اندر باہر ہر طرح جائز ہے؛ البتہ سلف وخلف سے توارث کے ساتھ اندرون مسجد اذان ثانی پر عمل ثابت ہونے کی وجہ سے عدم عذر کی

حالت میں اندرون مسجد میں خطیب کے سامنے اذان ثانی کوزیادہ افضل اور بہتر کہتے ہیں اور باہر لازم ہونے اور اندر ناجائز ہونے کا انکار کرتے ہیں؛ کیونکہ جمہور فقہاء متقدمین ومتأخرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ داخل مسجد خطیب کے سامنے اذان ثانی زیادہ افضل اور بہتر ہے اور باہر لازم ہونے اور اندر ناجائز ہونے کا انکار کرتے ہیں؛ کیونکہ جمہور فقہاء متقدمین ومتأخرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ داخل مسجد خطیب ہی کے سامنے جمعہ کی اذان دی جائے اور اسی پر تمام فقہاء کا عمل چلا آرہا ہے اور صاحب مدخل کے قول کا مردود ہونا ماقبل میں ثابت ہو چکا ہے؛ اس لئے کہنا ہوگا کہ جمعہ کی اذان ثانی عدم عذر کی صورت میں اندرون مسجد خطیب کے سامنے ہی زیادہ افضل اور بہتر ہوگی۔ نیز باہر بھی جائز ہے اور نظیر کے طور پر فقہاء کی چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس و أذن المؤذن بين يدی المنبر بذلک جری التوارث. (هداية۱/ ۱۵۱، مجمع الأنهر ۱/ ۱۷۱، ملتقي الأبحر۱/ ۱۷۱)

ويؤذن ثانيا بين يديه أي الخطيب وفي الشامية: أي علی سبيل السنية كما يظهر من كلامهم. (در مختار مع الشامي، كتاب الجمعة، باب الجمعة كراچي ۲/ ۱٦۱، زكريا۳/ ۳۸)

إن التأذين عند الخطبة محله عند الإمام وبذلک جری التوارث علی ماقال صاحب الهداية قلت فبطل بذلک قول من زعم أن التأذين عند الخطبة في المسجد بدعة. (حاشية آثار السنن ۲/ ۹۵، العرف الشذي علی هامش الترمذي ۱/ ۱۱٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵؍ ۱۳۴۷)

جمعہ کی اذان ثانی کہاں پر ہو؟

سوال [۳۶۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حالات سماجی، سیاسی میں جس قدر تبدیلی آرہی ہے اور جو باعث بربادی ہے، ویسے ہی مذہبی طور پر روز نئے نئے مسئلے پیدا کئے جارہے ہیں، جس سے قوم کی بربادی ہوتی جارہی ہے۔

ادھر کچھ برسوں سے زیادہ تر قصبہ اور دیہات میں کچھ ضلع میں اذان جمعہ ثانی مسجد کے دروازے پر رائج کرادی ہے، کہاں تک درست ہے؟ جبکہ ہمارے اولین پیشوا اور اولین اکابرین مشائخ محدث اولیاء کرام نے سنت نبوی ﷺ واطوار صحابہؓ کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے، وہاں پر آج تک ایسا نہیں ہے، اللہ معاف کرے، کیا ان کو اس بات کا علم نہ تھا؟ اگر تھا تو کیوں اب تک وہاں پر اور شہر شہر و دیگر مقامات پر اذان جمعہ امام سے کچھ فاصلے پر ہوتی ہے، دوسرے ہم کو منع کرنے والے جب ان میں آکر نماز جمعہ ادا کرتے ہیں تو ہونٹ خاموش رہتے ہیں، لب کشائی تک نہیں کرتے اور نہ فتوی دیتے ہیں، نماز جمعہ ادا کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

المستفتی: نیاز احمد شمسی، ریاض خاں علوی، حکمت علی قادری، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کی اذان ثانی منبر کے سامنے، دروازے پر، اندر، باہر، ہر طرح جائز ہے؛ البتہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ امام کے سامنے منبر سے قریب کھڑے ہو کر دی جائے۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذلک جرى التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديو بند ۱/ ۱۷۱، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۵۴، مصري قديم ۱/ ۱۷۱)

جو علماء منع نہیں کرتے ہیں شاید فتنہ سے بچنے کے لئے خاموشی اختیار کرتے ہیں اور اختلاف فتنہ

سے بچ کر حکمت کا طریقہ اختیار کرنا، اس طرح کے مسائل میں بہت ضروری ہے؛ کیونکہ اذان ثانی تو ہو ہی جاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۳۹۱)

جمعہ کی اذان ثانی امام اور منبر کے سامنے دینا

سوال [۳۶۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے محلّہ میں ایک مسجد ہے، جس میں پنج گانہ اور جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور ابھی چار ہفتہ سے خطبہ کی اذان مسجد سے باہر ہوتی ہے، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ منبر کے سامنے اذان دیا کرو، تو اس کے متعلق آپ جواب تحریر فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد یحیٰ، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فقہاء کی تصریحات یہی ہیں کہ امام اور منبر کے سامنے اذان ثانی دی جائے، جو دور صحابہؓ سے اب تک تواتر وتوارث کے ساتھ تعامل بین العلماء ہے؛ اس لئے امام کے سامنے ہی افضل ہے۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدی المنبر، بذٰلک جری التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/ ١٧١)

فإذا جلس الإمام على المنبر، أذن بين يديه ثانياً. (ملتقي الأبحر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٥٤، مصري قديم ١/ ١٧١، ٧،شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٣/ ٣٨، كراچي ٢/ ١٦١، هندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٩، جديد ١/ ٢١٠، صغيري، مكتبه مجتبائي دهلي ٢٨١، كبيري، كتاب الصلاة، فصل في صلاة الجمعة، مكتبه رحيميه ديوبند

قديم ٥٢٠، اشرفية ديوبند جديد ٥٦١، احسن الفتاوى ١٢٦/٣، امداد الفتاوى ٧٠٥/١)

البتہ اگر مسجد اتنی بڑی ہے کہ اندر اذان دینے سے باہر صحن میں لوگوں کو سنائی نہیں دیتی ہے، تو امام کی روبرو ہوکر باہر بھی بلا کراہت درست ہے؛ لیکن اگر یہ عذر نہیں ہے تو خلاف اولیٰ ہے، لازم سمجھنے کی صورت میں بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۲۴۳۴۵)

جمعہ کی اذان ثانی کہاں دی جائے؟

سوال [۳۶۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے امام صاحب فرماتے ہیں کہ جمعہ کی اذان ثانی خطیب کے سامنے مسجد کے باہر دینا سنت اور مسجد کے اندر اذان دینا مکروہ تحریمی ہے اور حوالہ دیتے ہیں بخاری شریف: ۱۲۵، ابوداؤد شریف: ۱۵۵، نسائی شریف: ۶۸، مشکوۃ شریف: ۱۲۳، قاضیخاں: ۳۸/ وغیرہ کتابوں سے اگر مسجد کے باہر اذان دینا ناجائز ہے، تو دلائل کے ساتھ مفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: غلام مصطفیٰ، راڈھا رمنپور، پوسٹ: پیار بیڑا، ضلع بانکوڑا (مغربی بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کی اذان ثانی جو خطبہ کے وقت دی جاتی ہے، اس کا امام کے روبرو مسجد کے اندر امام کے سامنے اور مسجد سے باہر امام کے روبرو دینا دونوں طرح جائز اور درست ہے، باہر ہی سنت ہونے اور اندر سنت نہ ہونے کا دعوی بلا دلیل ہے اور باہر سنت ہونے اور اندر عدم سنت پر بخاری شریف ۱۲۵/۱ میں کوئی حدیث نہیں ہے اور نہ ہی ابوداؤد، نسائی ومشکوۃ میں کوئی ایسی روایت ہے کہ جس میں اندرون مسجد خطبہ کی اذان کی ممانعت موجود ہے اور قاضی خان میں خطبہ کی اذان مسجد کے اندر دینے کی ممانعت نہیں ہے،

باب الاذان میں خطبہ کی اذان کے علاوہ نماز پنج گانہ کی اذان اندرون مسجد دینے کی ممانعت آئی ہے، خطبہ کی اذان کی ممانعت ہرگز نہیں ہے؛ اس لئے ہدایہ اور فتاوی عالمگیری وغیرہ میں امام کے بالکل سامنے خطبہ کی اذان کو مسنون لکھا ہے۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذٰلک جرى التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/ ١٧١، فتاوى عالمگيري، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٩، زكريا جديد ١/ ٢١٠، البحر الرائق، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة العيدين، زكريا ٢/ ٢٧٤، كوئٹه ٢/ ١٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍ ۳۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍ ۷؍ ۱۴۱۳ھ

کیا جمعہ کی اذان ثانی منبر کے سامنے دی جائے؟

سوال [۳۶۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ جمعہ میں اذان ثانی باہر ہونی چاہئے، ثبوت میں ابوداؤد شریف کی حدیث پیش کرتا ہے، حضرت سائب بن یزید والی اور کہتا ہے ان کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری، فتاوی قاضی خاں اور بہت سی کتابیں ہیں، جس میں بعض نے اندر اذان کو مکروہ اور بعض نے منع کیا اور مسجد کے اندر اذان کی کوئی حدیث موجود ہو تو حوالہ کے ساتھ تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد ناظم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد سے باہر خطبہ کی اذان دینا حدیث سے ثابت نہیں؛

بلکہ ممبر کے سامنے اذان دینا فقہاء سے تواتر وتورث کے ساتھ ثابت ہے۔ اور جن روایات میں مسجد کے دروازے پر اذان دینا ثابت ہے، یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جمعہ کی ایک اذان ہوتی تھی، جب حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں دواذانیں ہوگئیں، تو پہلی اذان مسجد کے دروازے سے باہر دی جاتی تھی اور خطبہ والی اذان مسجد کے اندر منبر کے سامنے دی جاتی تھی، جیسا کہ فقہاء کی عبارت سے واضح ہے۔

وإذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذٰلک جرى التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/ ١٧١، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دارالكتاب ديوبند ٥١٥، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٥٤، مصري قديم ١/ ١٧١، وكذا في الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٦١، زكريا ٣/ ٣٨، فتاوى عالمگيري، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٩، جديد ١/ ٢٢٠، البحر الرائق، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة العيدين، زكريا ٢/ ٢٧٤، كوئٹه ٢/ ١٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴ ؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶ ؍۷۵۲۵)	۱۴۲۳/۲/۲۵ھ

جمعہ کی اذان ثانی کا محل

سوال [۳۶۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہمیرے محلہ میں ایک مسجد ہے، جس میں پنج گانہ اور جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور ابھی چار ہفتے سے خطبہ کی اذان مسجد سے باہر ہوتی ہے، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ منبر کے سامنے دیا کرو، اس کے متعلق جواب تحریر فرمائیں۔

(۲) بعض لوگ جمعہ کی اذان ثانی کو مسجد کے اندر امام کے سامنے دینے کو ممنوع کہتے ہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

المستفتی: حاجی ابوالقاسم، کندرکی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقہاء کرام کی تصریحات یہی ہیں کہ امام اور منبر کے سامنے اذان ثانی دی جائے، جو دور صحابہؓ سے اب تک تعامل بین العلماء ہے؛ اس لئے امام کے سامنے ہی افضل ہے۔

إذا صعد الإمام المنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يدى المنبر، بذٰلک جرى التوارث. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ديوبند ١/١٧١)

فإذا جلس الإمام على المنبر، أذن بين يديه ثانياً. (ملتقي الأبحر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتب العلمية بيروت ١/٢٥٤، قديم مصري ١/١٧١، الدر المختار مع الرد، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٦١، زكريا ٣/٣٨، هندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم١/١٤٩، جديد زكريا ١/٢١٠، صغيري، مكتبه مجتبائي دهلي ٢٨١، غنية المستملي شرح كبيري، فصل في صلاة الجمعة، اشرفية ديوبند جديد ٥٦١، مكتبه رحيمية قديم ٥٢٠، احسن الفتاوى ٣/١٢٦، امداد الفتاوى ٧٠٥)

البتہ اگر مسجد اتنی بڑی ہے کہ مسجد کے اندر اذان دینے سے باہر صحن میں لوگوں کو سنائی نہیں دیتی ہے، تو امام کے روبرو ہوکر باہر بھی بلا کراہت درست ہے؛ لیکن اگر یہ عذر نہیں ہے تو خلاف اولیٰ ہے، لازم سمجھنے کی صورت میں بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔

(۲) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فتاوی عالمگیری میں جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر دینا ممنوع ہے، وہ فتاوی عالمگیری کا مطالعہ یا تو صحیح طور سے نہیں کرتے ہیں یا فتاوی عالمگیری سمجھتے ہی نہیں ہیں؛ اس لئے کہ فتاوی عالمگیری میں بھی جمعہ کی اذان ثانی امام کے سامنے دینے کا ذکر موجود ہے۔

فتاوی عالمگیری کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وإذا جلس على المنبر أذن بين يديه، وأقيم بعد تمام الخطبة، بذلک جرى التوارث. (عالمگيري، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/١٤٩، جديد زكريا ١/٢١٠)

اور یا تو وہ لوگ عوام الناس کے ساتھ یہ خیانت کرتے ہیں کہ جمعہ کی اذان اول اور عام اذانیں اندر دینے میں؛ چونکہ غائبین کو سنائی نہیں دیں گی؛ اس لئے ان کو مسجد کے باہر دینے کا حکم ہے، اور اذان کو اندرون مسجد ممنوع قرار دیا گیا ہے، جس کو فتاوی عالمگیری میں تمام اذانوں اور جمعہ کی اذان اول کے موقع پر ذکر کیا ہے۔

وينبغي أن يؤذن على المأذنة أو خارج المسجد، ولا يؤذن في المسجد. كذا في فتاوى قاضي خان. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، زكريا قديم ١/٥٥، جديد زكريا ١/١١٥)

اس عبارت کو اذان ثانی کے موقع پر دکھانا زبردست خیانت ہے؛ اس لئے کہ اذان ثانی کی عبارت اپنی جگہ الگ سے موجود ہے، جو ہم نے اوپر ذکر کردی ہے؛ لہٰذا جمعہ کی اذان ثانی ممبر کے سامنے دینا ہی افضل ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۷۲۰/۳۵)

ایک مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے کے بعد دوسری مسجد میں جمعہ کی اذان واقامت کہنا

سوال [۳۶۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے، پھر ایک دوسری مسجد میں جا کر جمعہ کی اذان اور اقامت کہتا ہے یہ عمل مسلسل ہے، اس عمل سے اس کی یا مقتدیوں کی نماز میں کیا خلل ہوتا ہے؟

المستفتی: طارق عثمانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: نماز میں کوئی خلل نہیں ہوگا؛ البتہ دوسری مسجد میں جاکر اذان واقامت کہنا مکروہ اور ممنوع ہے، اس کا ترک لازم ہے۔

إذا صلى في المسجد الأول يكون متنفلاً بالأذان في المسجد الثاني، والتنفل بالأذان غير مشروع؛ ولأن الأذان للمكتوبة، وهو في المسجد الثاني يصلي النافلة، فلا ينبغي أن يدعو الناس إلى المكتوبة، وهو لايساعدهم الخ. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل باب شروط الصلاة، زكريا ٢/ ٧١، كراچي ١/ ٤٠٠، وهكذا في بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في صفات المؤذن، زكريا ١/ ٣٧٥، كراچي ١/ ١٥١، المبسوط، للسرخسي، باب الأذان، قبيل باب مواقيت الصلاة، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ١٤٠، البناية في شرح الهداية، كتاب الصلاة، باب الأذان، اشرفية ٢/ ٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۷۸۶)

اذان ثانی سے قبل مؤذن کا "إن الله و ملائكته" وغیرہ پڑھنا

سوال [۳۶۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بستی کی مسجد میں مسلک شافعی کے مطابق پانچوں وقت کی نماز ہوتی ہے؛ اس لئے یہاں کے سبھی لوگ مسلک شافعی سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں پر طویل عرصہ سے یہ رواج جاری ہے کہ نماز جمعہ سے پہلے یعنی خطبہ کی اذان سے پہلے مؤذن صاحب لوگوں کی طرف

مخاطب ہوتے ہیں، ہاتھ میں عصا ہوتا ہے اور پہلے یہ آیت پڑھتے ہیں:

إن الله و ملائكته يصلون على النبي يا ايها الذين اٰمنوا صلوا عليه وسلموا تسليمًا. پھر يا معشر المسلمين رحمكم الله روي في الخبر عن سيد البشر شفيع الأمة في يوم المحشر سيد الأشراف ومتمم مكارم الأخلاق، والأوصاف، سيد العرب، والعجم، محمد بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف، أنه قال: إذا صعد الخطيب على المنبر، ثم خطب خطبتين ولا يتكلم أحدكم، ومن تكلم فقد لغىٰ، ومن لغىٰ فلا ثواب بجمعة الله انصتوا رحمكم الله تعالى فاستمعوا يغفر الله لنا ولكم لوالدنا ولوالدكم لأستادنا ولأستاذكم وجميع المؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات، فاستغفروه إنه هو الغفور الرحيم.

یہ کلمہ پڑھنے کے بعد عصا امام کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور امام ممبر پر چڑھتا ہے، بعد اذان ثانی ہوتی ہے، ازراہ کرم شافعی مسلک کے تحت مذکورہ کلمات پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ شرع میں کوئی ثبوت یا دلیل ہے، جو اوپر کے کلمات خطبہ کی اذان سے پہلے پڑھے جاتے ہیں، اثبات میں یا نفی میں؟ مدلل تحریر فرمائیے، اگر ان کلمات کو پڑھیں تو کیا گناہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعظیم صدیقی، مقام: باکول، رائے گڈھ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہمارے یہاں حضرت امام شافعیؒ کی مشہور ومعروف اور معتبر کتاب کتاب الام موجود ہے، اس میں اور دیگر معتبر کتابوں میں سوال نامہ میں درج شدہ کلمات کا مذکورہ موقع میں مذکورہ طریقے سے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۶۲)

کیا اذان اول پر عورتوں کے لئے ظہر کی تیاری لازم ہے؟

سوال [۳۶۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن اذان اول کی وجہ سے جیسے مردوں کے اوپر جمعہ کی تیاری لازم ہوتی ہے، بیع وشراء حرام ہو جاتی ہے، تو کیا عورتوں پر بھی اذان اول ہوتے ہی ظہر کی تیاری میں لگنا ضروری ہے، ان کے لئے بھی بیع وشراء حرام ہو جاتی ہے؟ ہمارے یہاں کے بعض علماء جمعہ کے دن اذان اول کے بعد عورتوں پر بھی ظہر کی تیاری کو لازم کہتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟

المستفتی: محمد اکرام اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر ''**فاسعوا الی ذکر اللّٰہ و ذرو البیع**'' کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اللہ نے جمعہ کی سعی کے ساتھ ساتھ ترک بیع کا حکم فرمایا ہے، ترک شراء کا حکم نہیں فرمایا، اس کے پیچھے راز یہ ہے کہ جب بیچنے والا ہی نہیں رہے گا اور دوکان ہی بند ہو جائے گی تو خریدار کہاں سے آئے گا اور مفسرین نے اس کی تفسیر کے ذیل میں اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ جن لوگوں پر جمعہ فرض ہے، ان کے اوپر جمعہ کی اذان اول پر ہر کام چھوڑ کر جمعہ کی تیاری لازم ہے؛ لہٰذا اس سے وہ دیہات مستثنیٰ ہوں گے، جن دیہاتوں میں جمعہ جائز نہیں ہے، وہاں کے لوگوں پر جمعہ کی سعی اور تیاری کا حکم نہیں ہے، مگر ظہر کی اذان پر ظہر کی تیاری لازم ہے، تو ایسا ہی شہر اور قصبات اور جن آبادیوں میں جمعہ مشروع ہے، وہاں جمعہ کی اذان اول پر عورتوں پر ظہر کی تیاری ضروری ہے، جیسا کہ عام دنوں میں ظہر کی اذان پر مردوں کی طرح عورتوں پر بھی ظہر کی تیاری لازم ہوتی ہے؛ لہٰذا جن علماء نے یہ کہا ہے کہ جمعہ کے دن اذان اول کے بعد عورتوں پر ظہر کی تیاری لازم ہے، اس اعتبار سے صحیح ہے کہ جمعہ کی اذان کے علاوہ ظہر کے لئے کوئی

دوسری اذان نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے عام دنوں کی طرح اسی اذان سے عورتوں کوظہر کی تیاری کرنی چاہئے اوراس کواجابت اذان کے لئے اجابت بالفعل کہتے ہیں۔عورتوں کے لئے اس دن اجابت بالفعل کی یہی شکل ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. [سورة الجمعة الآية:۹]

قال العلامة الآلوسي: والظاهر أن المأمورين بترك البيع هم المأمورون بالسعي إلى الصلاة. (تفسير روح المعاني، سورة الجمعة، زكريا ۱۵/۱۵۲)

سئل ظهير الدين عمن سمع الأذان في وقت واحد من الجهات ماذا يجب عليه؟ قال: إجابة أذان مسجده بالفعل. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني، المتفرقات، زكريا ۲/۱۵٤، رقم: ۲۰۱۱، کوئٹہ ۱/۵۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹ / ۱۰۰۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۵/۲۹ھ

جمعہ کے خطبات عورتوں کو جمع کر کے سنانا

سوال [۳۶۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیانات جمعہ مرد حضرات سنتے ہیں اور ان کی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں؛ لیکن عورتیں اس سے محروم رہتی ہیں؛ جبکہ گھر کے ماحول کو درست کرنے کے لئے عورتوں کی اصلاح کی ضرورت ہے؛ اس لئے ہم نے چاہا کہ ہماری مسجد سے متصل جو مدرسہ ہے، وہاں پر عورتوں کو پردہ کی پابندی کے ساتھ جمعہ کے خطبات سنانے کا اہتمام کیا جائے؛ لیکن اس تعلق سے شریعت کیا کہتی ہے؟ کیا اس طرح عورتوں کو جمعہ کے دن جمعہ کے خطبات سنانے کا اہتمام کیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: محمد عادل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے عورتوں کی شرکت کا اہتمام کرنا چاہے الگ سے کیوں نہ ہو ایک نئے فتنہ کو دعوت دینا ہے؛ اس لئے سوال نامہ میں جو عذر لکھا گیا ہے، اس عذر کی بناء پر عورتوں کے لئے خطبہ سننے کا انتظام کرنا درست نہیں ہے اور اس کی تلافی دوسرے طریقہ سے بآسانی ہوسکتی ہے کہ عورتوں کے لئے ہفتہ میں ایک دن کسی ہال میں انتظام کیا جائے اور اس میں سخت پردہ کے اہتمام کے ساتھ علماء اور بزرگوں کے بیانات کروائے جائیں، یہ جمعہ کے خطبہ سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوگا؛ لہٰذا جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے مذکورہ طریقہ پر انتظام ہرگز نہ کیا جائے۔

عن أبي سعيد الخدري رضـ، قالت النساء للنبي صلى الله عليه وسلم: غلبنا عليک الرجال، فاجعل لنا يوماً من نفسک، فوعدهن يوماً لقيهن فيه، فوعظهن وأمرهن. (الحديث) (صحيح البخاري، كتاب العلم، باب هل يجعل للنساء يوم على حدة، العلم، النسخة الهندية ١/ ٢٠، رقم: ١٠١)

ويكره حضورهن الجماعة ولو لجمعة، وعيد، ووعظ مطلقاً، ولو عجوزاً ليلاً على المذهب المفتى به لفساد الزمان. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچي ١/ ٥٦٦، زكريا ٢/ ٣٠٧)

ولا يحضرن الجماعات. لقوله تعالىٰ: وقرن في بيوتكن الخ. قال المصنف في الكافي: والفتوىٰ اليوم على الكراهة في الصلاة كلها لظهور الفساد، ومتى كره حضور المسجد للصلوة، فلأن يكره حضور مجالس الوعظ خصوصاً عند هؤلآء الجهال الذين تحلوا بحلية العلماء أولىٰ، ذكره فخر الإسلام. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ١/ ٦٢٧-٦٢٨، كوئٹه ١/ ٣٥٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبه: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۳۰۵/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۳/۲۶ھ

کیا عورتوں پر جمعہ وعیدین کی نماز واجب ہے؟

سوال [۳۶۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا عورتوں پر جمعہ وعیدین کی نماز واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب نہیں ہے اور وہ جمعہ وعیدین کی نماز پڑھ لیتی ہیں، تو مستحق ثواب ہے یا مستحق عذاب ہے؟

المستفتی: نعیم الدین، سیتامڑھی (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں پر جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر اتفاق سے کہیں پڑھ لیں، تو نماز صحیح اور درست ہوجائے گی اور ممانعت اس لئے ہے کہ ان کے اس بہانہ سے نکلنے کے بعد آہستہ آہستہ فتنہ کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔

عن طارق بن شهاب عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة إلا أربعة: عبد مملوك، أو امرأة، أو صبي، أو مريض. (سنن أبي داؤد، باب الجمعة للمملوك، النسخة الهندية ۱/۱۵۳، دار السلام رقم: ۱۰۶۷، المستدرك، كتاب الجمعة قديم ۱/۲۸۸، مكتبه نزار مصطفیٰ جديد ۱/۴۱۷، رقم: ۱۰۶۲)

وأما النساء فهل يرخص لهن أن يخرجن في العيدين؟ أجمعوا على أنه لا يرخص للشواب منهن للخروج في الجمعة، والعيدين، وشئ من الصلاة. لقوله تعالى: وقرن في بيوتكن، والأمر بالقرار نهى عن الانتقال الخ. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في شرائط وجوب العيدين و جوازها،

زکریا ۱/ ۶۱۷، کراچي ۱/ ۲۷۵، البحر الرائق، کتاب الصلاة، باب الإمامة، زکریا ۱/ ۶۲۷، ۶۲۸، کراچي ۱/ ۳۵۸)

اوراس زمانہ میں فتنہ کی وجہ سے کسی بھی نماز کے لئے مجمع یا مسجد میں جانا عورتوں کے لئے مکروہ ہے۔

والفتویٰ الیوم علی الکراهة في الصلوة کلها؛ لظهور الفساد ومتی کره حضور المسجد للصلوة، فلأن یکره حضور مجالس الوعظ الخ. (البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب الإمامة، زکریا ۱/ ۶۲۸، کوئٹہ ۱/ ۳۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۳۵۲)

جمعہ سے قبل چار رکعت سنت مؤکدہ

سوال [۳۶۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قبل صلاۃ الجمعہ چار رکعت نماز سنت ہیں یا غیر سنت؟ اگر سنت ہیں تو کون سی سنت، شریعت کی نظر میں اس کا کیا حکم ہے؟ بالدلیل زحمت گوارہ فرمائیں۔

المستفتی: محمد شاہد کٹیہاری، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ سے قبل چار رکعت سنت مؤکدہ ہیں۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: کان النبي ﷺ یرکع قبل الجمعة أربعًا لا یفصل في شيء منهن. (سنن ابن ماجه، الصلاة، باب ماجاء في الصلاة قبل الجمعة، النسخة الهندیة ۱/ ۸۰، دارالسلام، رقم: ۱۱۲۹)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: کان رسول الله صلی الله علیه

وسلم يركع قبل الجمعة أربعًا، وبعدها أربعًا، لا يفصل بينهن. (المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ١٢/ ١٢٩، رقم: ١٢٦٧٤)

وسن مؤكدا أربع قبل الجمعة، وأربع بعدها بتسليمة. (الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في السنن والنوافل، زكريا ٢/ ١٢، كراچی ٢/١٢، كوئٹه ١/٤٢٧، الأشباه، قديم ص: ٦٤، عالمگيری، الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٢، جديد ١/١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۲/۴/۱۴۱۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۷۵۹)

نماز جمعہ کے بعد کتنی رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں؟

سوال [۳۶۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے فرض کے بعد کتنی سنت مؤکدہ ہیں؟ احناف کے مذہب کے صحیح اقوال نقل فرمائیں، اگر چھ سنت مؤکدہ ہیں، تو ان کے پڑھنے کی کیا ترتیب ہوگی؟ پہلے چار رکعت ایک سلام سے اور پھر دو رکعت ایک سلام سے، یا اس کے برعکس؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک چار رکعت ایک سلام کے ساتھ سنت مؤکدہ ہیں۔ اور حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام کے نزدیک چھ رکعت سنت ہیں، اولاً چار رکعت ایک سلام کے ساتھ اور اس کے بعد دو رکعت ایک سلام کے ساتھ، اگر وقت میں گنجائش ہو تو چھ رکعت پڑھنا افضل ہے۔ اور اگر عجلت یا کوئی عذر ہے تو چار رکعت سے سنت ادا ہو جائے گی۔

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان منكم مصليًا بعد الجمعة، فليصل أربعا. (صحيح مسلم، الجمعة، فصل في استحباب أربع ركعات أو الركعتين بعد الجمعة، النسخة الهندية ١/ ٢٨٨، بيت الأفكار، رقم: ٨٨١، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/ ٩٨٢، رقم: ١٦١٦، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٢/ ٩٠٣، رقم: ١٨٧٤)

منها أربع قبل الجمعة وأربع بعدها بتسليمة، وتحته في الطحطاوي: وقال أبو يوسف: يصلي أربعًا قبل الجمعة، وستًا بعدها وفي الكرخي محمد مع أبي يوسف، ثم عند أبي يوسف يصلي أربعًا، ثم إثنتين. (حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ٢١٣، جديد دار الكتاب ديوبند ص: ٣٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۴/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۴۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۴/۱۴۱۴ھ

جمعہ کے بعد کی چار رکعت ظہر بالشبہ نہیں ہیں

سوال [۳۶۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ بعد نماز جمعہ جو چار سنتیں اور دو سنت اور دو نفل پڑھتے ہیں، اس میں چار سنتیں بطور ظہر بالشبہ پڑھتے ہیں اور یہ اس وقت سے ہے جس وقت علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا، اب جب کہ ایسا نہیں تو پھر چار سنتیں کیوں؟ مزید کہتا ہے کہ ”فتاوی رشیدیہ وامداد الفتاوی، بہشتی زیور“ کی عبارات سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔

المستفتی: ثناء الرحمٰن ہتھورا گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا یہ کہنا کہ جمعہ کے بعد جو چار رکعتیں سنت پڑھی جاتی ہیں، وہ بطور ظہر بالشبہ پڑھتے ہیں اور اس کا ثبوت علماء کا ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے وقت سے ہے، غلط ہے؛ بلکہ یہ چار رکعت سنت مؤکدہ ہیں؛ اس لئے کہ اس کا ثبوت احادیث نبویہ اور صحابہ کرام کے عمل سے ملتا ہے، علماء کا ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے وقت سے نہیں۔ اور فتاوی رشیدیہ اور امداد الفتاوی اور بہشتی زیور وغیرہ کتابوں میں جہاں بھی جمعہ کے بعد چار رکعت ظہر بالشبہ پڑھنے کا ذکر آتا ہے، وہ ان قریہ صغیرہ کے متعلق ہیں، جہاں صحت جمعہ میں کسی وجہ سے شبہ ہو، نہ یہ کہ ظہر کے بعد کی چار رکعت سنتوں کا؛ اس لئے کہ یہ سنت مؤکدہ ہیں، جس کا تارک گنہگار ہوگا۔ (امداد الفتاوی ۱/۶۷۹، فتاوی رشیدیہ، قدیم ص: ۳۶۵، جدید زکریا ص: ۳۴۷)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان منكم مصليًا بعد الجمعة، فليصل أربعًا. هذا حديث حسن صحيح. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها، النسخة الهندية ۱/۱۱۷، دارالسلام، رقم: ۵۲۳، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ۳/ ۲۴۸، رقم: ۵۲۹)

قال في اللمعات: السنة عند أبي حنيفةؒ بعد الجمعة أربع وعند صاحبيه ست، أربع، ثم اثنتان هذا في الصلاة بعد الجمعة. (حاشية ترمذي ۱/۱۱۸، عالمگیری، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ۱/ ۱۱۲، جديد ۱/ ۱۷۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۵/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۱۵ھ

جمعہ پڑھا کر دوسری جگہ جمعہ میں بنیت نفل شرکت کرنا

سوال [۳۶۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک امام صاحب جو شہر یا قصبہ کی چھوٹی مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کر بعد میں جامع مسجد میں جمعہ کی نماز میں شریک ہوجاتے ہیں، تو ان کا یہ عمل درست ہے؟ ان کا یہ کہنا کہ فقہاء نے ظہر وعشاء کی جماعت میں نفلی نیت سے دوبارہ شریک ہونے کو جائز قرار دیا ہے، کچھ لوگ اس فقہی مسئلہ کو غلط بتاتے ہیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل ہیں، ان میں نفل کی نیت سے شرکت جائز ہے؛ البتہ مغرب میں اس لئے جائز نہیں ہے کہ تین رکعت کی نفل نہیں ہوتی ہے۔ اور جمعہ کے بعد بھی سنن ونوافل ہوتے ہیں؛ اس لئے جس نے جمعہ پڑھ لیا ہے، اس کا نفل کی نیت سے دوسری مسجد میں جمعہ کی جماعت میں شرکت کرنا جائز ہے۔

ثم بعد الإتمام اقتدى متنفلاً إن شاء، وهو أفضل لعدم الكراهة، إلا في العصر والفجر للنهي عن التنفل بعد هما، وفي المغرب للمخالفة.

(حاشية الحطحاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتاب ديو بند، جديد ص: ٤٥٠، قديم، ص: ٢٤٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۷؍محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲؍۴۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۱/۲۷ھ

جمعہ کی سنن قبلیہ اور سنن بعدیہ کل ملا کر ۱۴؍رکعت ہیں یا بارہ رکعت؟

سوال [۳۶۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور عمرو کے درمیان اس مسئلہ میں بحث ہوگئی، زید کا کہنا ہے کہ جمعہ کی ۱۴؍رکعتیں ہیں، یہی ہم سنتے آرہے ہیں اور مکتب میں یہی پڑھایا جاتا ہے اور عمرو کا یہ کہنا ہے کہ بارہ رکعتیں ہی ثابت ہیں، اخیر کی دو رکعت نفل ثابت نہیں؛ بلکہ جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت کے

بارے میں میں بھی اختلاف ہے کہ آیا چار ہیں یا چھ؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں؟ کس کی بات درست اور قابل عمل ہے؟

المستفتی: عبدالاول، احمد آباد (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جمعہ میں کل بارہ رکعتوں کا ثبوت ملتا ہے، چار رکعت جمعہ کے خطبہ سے پہلے سنت مؤکدہ، پھر خطبہ کے بعد جمعہ کی دو فرض رکعت، پھر جمعہ کے بعد ۶/ رکعت، چار رکعت ایک سلام کے ساتھ اور دو رکعت ایک سلام کے ساتھ۔ اوران چھ رکعتوں کی ادائیگی میں اختلاف ہے، بعض دو رکعت کو مقدم کرتے ہیں اور چار رکعت کو مؤخر کرتے ہیں اور بعض چار رکعت پہلے پڑھتے ہیں اور دو رکعت بعد میں، مگر ان چھ رکعتوں کے علاوہ مزید دو رکعت نوافل کا ثبوت کسی معتبر روایت سے نہیں ملتا؛ لہٰذا سوال نامہ میں عمرو کا قول زیادہ صحیح ہے۔

ملاحظہ فرمایئے جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں کی روایتیں:

عن ابن مسعودؓ، أنه كان يصلي قبل الجمعة أربعاً و بعدها أربعاً. (سنن الترمذي، كتاب الجمعة، باب ما جاء في الصلوة قبل الجمعة و بعدها، النسخة الهندية ۱/۱۱۸، دار السلام رقم:۵۲۳)

عن أبي عبيدة عن عبد اللّٰهؓ، قال: كان يصلي قبل الجمعة أربعاً—عن إبراهيم قال: كانوا يصلون قبلها أربعًا. (مصنف لابن أبي شيبة ۴/۱۱۴-۱۱۵، رقم قديم: ۵۳۶۰-۵۳۶۳، رقم جديد ۵۴۰۲-۵۴۰۵)

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من كان منكم مصليًا بعد الجمعة، فليصل أربعاً. (ترمذي، كتاب الجمعة، باب ماجاء في الصلوة قبل الجمعة وبعدها، النسخة الهندية ۱/۱۱۷، دار السلام رقم:۵۲۳)

عن أبي عبد الرحمنؓ، قال: قدم علينا ابن مسعود، فكان يأمرنا أن

نصلي بعد الجمعة أربعًا، فلما قدم علينا عليؓ: أمرنا أن نصلي ستاً، فأخذنا بقول عليؓ وتركنا قول عبد اللهؓ، قال: كان يصلي ركعتين، ثم أربعاً. (المصنف لابن أبي شيبة ۱۱۷/٤، رقم جديد ٥٤١٠، رقم قديم: ٥٣٦٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۹۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۳/ ۱۴۳۶ھ

جمعہ سے قبل چار رکعت سنت کا ثبوت

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْدُ! جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت ہے، اور حضرات حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں رکعت سنت مؤکدہ ہیں، اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم جوزیؒ نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ جمعہ سے پہلے آج کل کے زمانہ میں جو اذان اول دی جاتی ہے وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جاری ہوئی، حضور ﷺ کے زمانہ میں وہ اذان نہیں تھی؛ بلکہ منبر کے پاس خطیب کے سامنے جو اذان دی جاتی ہے وہی ایک اذان تھی، تو جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت پڑھنے کا موقع کہاں تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام جمعہ میں جلدی پہنچنے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے، اور منبر کے پاس جو اذان دی جاتی ہے اس اذان سے پہلے حضورؐ اور صحابہ کرام کا چار رکعت پڑھنے کا معمول رہا ہے، اور ان چار رکعت کا پڑھنا کسی اذان پر موقوف نہیں تھا؛ بلکہ زوال کے بعد خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑھنے کا معمول رہا ہے، پھر یہی چار رکعت حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے اذانِ اوّل کے بعد پڑھی جانے لگیں، جیسا کہ ہم آگے متعدد صحابہ کرام سے روایت پیش کریں گے، اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو تاکید سے حکم فرمایا کرتے تھے کہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھ لیا کریں؛ لہٰذا ہم اس سلسلہ میں ناظرین کے سامنے دس روایات پیش کرتے ہیں، جن میں سے متعدد صحابہ کا عمل صحیح سندوں کے ساتھ پیش کریں گے، اور چند مرفوع روایات ان کی تائید

میں پیش کریں گے اور مرفوع روایات کو تائید میں اس لئے پیش کریں گے کہ ان کی سند کے کچھ راویوں پر محدثین نے کلام کیا ہے، اور ان کو بنیاد نہیں بنائیں گے۔

جمعہ سے پہلے چار سنتوں کی روایات

(۱) عبد الرزاق عن الثوري عن عطاء بن السائب عن أبي عبدالرحمن السلمي قال: كان عبدالله يأمرنا أن نصلّي قبل الجمعةأربعاً، و بعدها أربعاً. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ٣/ ٢٤٧ برقم: ٥٥٢٥، إعلاء السنن بيروت ٧/ ١٠ برقم: ١٧١٦)

حضرت امام ابو عبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہم لوگوں کو جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھنے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔

(۲) عبد الرزاق عن معمر عن قتادة أن ابن مسعودؓ كان يصلّي قبل الجمعة أربع ركعات، وبعدها أربع ركعات. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ٣/ ٢٤٧ برقم: ٥٥٢٤)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جمعہ کے بعد بھی چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۳) عن عبد الله بن عمرؓ أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً لايفصل بينهن بسلام، ثم بعد الجمعة ركعتين، ثم أربعاً. (طحاوي شريف، باب التطوع بالليل والنهار كيف هو؟ النسخة الهندية ١/ ٢٣٣، بيروت ١/ ٤٣٥ برقم: ١٩١٩)

جبلہ بن سحیم عبداللہ بن عمرؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے اور ان چاروں رکعتوں کے درمیان سلام کے ذریعہ سے فاصلہ نہیں فرماتے تھے، اور جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے، اور پھر چار رکعت پڑھتے تھے۔

(٤) عن إبراهيم أن عبد الله بن مسعود كان يصلّي قبل الجمعة أربعا وبعدها أربعا لايفصل بينهن بتسليم. (طحاوي شريف، النسخة الهندية ١/٢٣٣، بيروت ١/٤٣٦، برقم: ١٩٢٥)

حضرت امام ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے، اور جمعہ کے بعد بھی چار رکعت پڑھتے تھے، اوران رکعتوں کے درمیان سلام کے ذریعہ سے فاصلہ نہیں فرماتے تھے۔

(٥) حدثنا ابن فضيل عن خصيف عن أبي عبيدة عن عبدالله قال: كان يصلّي قبل الجمعة أربعا. (مصنف ابن أبي شيبة جديد مؤسسة علوم القرآن بيروت٤/ ١١٤ برقم: ٥٤٠٢)

ابوعبیدہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(٦) روي عن عبدالله بن مسعود أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً وبعدها أربعاً. (ترمذي، كتاب الجمعة، باب ما جاء في الصلوة، قبل الجمعة و بعدها، النسخة الهندية ١/ ١١٧- ١١٨، دار السلام برقم: ٥٢٣)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی جاتی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے۔

اب چند مرفوع روایات تائید میں پیش کی جاتی ہیں، جن کی سند میں محدثین نے کچھ کلام کیا ہے، مگر تعدد طرق کی وجہ سے اس میں قوت پہونچ جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(٧) عن عبدالله عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً وبعدها أربعًا. (المعجم الأوسط ٤/ ٥٦٨ برقم: ٣٩٧١، المعجم الأوسط جديد ٣/ ٩١، برقم: ٣٩٥٩)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۸) عن علي قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلّي قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعاً، يجعل التسليم في آخرهنّ. (المعجم الأوسط ۱/ ٤٤٠ برقم: ۱٦۱۷، إعلاء السنن كراچی ۷/ ۱۰، بيروت ۷/ ۱٥ برقم: ۱۷٦۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور ان چاروں رکعتوں کے آخر میں سلام پھیرا کرتے تھے

(۹) عن ابن عباسؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يركع قبل الجمعة أربعاً لا يفصل في شيء منهنّ. (ابن ماجه، باب ماجاء في الصلوة قبل الجمعة، النسخة الهندية، ص ۱٥۸، دارالسلام برقم: ۱۱۲۹، المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي بيروت ۱۲/ ۱۰۱ برقم: ۱۲٦۷٤)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے، اور ان کے درمیان کوئی فصل نہیں کرتے تھے۔

(۱۰) وروى ابن النجار عن أبي هريرة مرفوعاً: من كان مصليًّا فليصل قبلها أربعاً، وبعدها أربعاً. (إعلاء السنن بيروت ۷/ ۱٤، كنز العمال بيروت ۷/ ۳۰۸، برقم: ۲۱۲۲۱)

ابن نجار حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز پڑھنا چاہے تو وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھے۔

روایات کا تحقیقی جائزہ

(۱) جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت کا ثبوت حضرات صحابۂ کرام سے صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہے، جیسا کہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ اور طحاوی شریف کی روایات صحیح سند کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا عمل اور ان حضرات کا

امت کو جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا حکم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، ورنہ حکم کیسے کر سکتے تھے؟

(۳) اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے جو مرفوع روایات اوپر پیش کی گئیں ہیں ان کی سند میں اگرچہ متکلم فیہ رواۃ بھی موجود ہیں، تب بھی ان روایات کی کوئی اصل اور حقیقت ہے، نیز تعدد طرق اور متعدد صحابہ سے نقل ہونے کی وجہ سے روایات میں قوت آجاتی ہے، اسی وجہ سے ان روایتوں کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آثار کے لئے تائید میں پیش کرنے میں کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے۔

(۴) حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مستدلات کی تمام روایات صحیح اور درست ہوا کرتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ روایات کی سند میں جو متکلم فیہ راوی داخل ہوتا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کے استدلال کے بعد ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کا ان متکلم فیہ راویوں سے روایات کا لینا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے روایات کے ضعف کا اثر امام ابوحنیفہؒ پر نہیں پڑ سکتا۔ اور امام عبد الوہاب شعرانیؒ جو اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور محقق تھے، اور شافعی المسلک کے ترجمان تھے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے میرے اوپر یہ احسان فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مسانید کا مطالعہ کر کے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کی تمام روایات ایسے خیار؟ تابعین سے مروی ہیں جو سب کے سب عدول اور ثقات ہیں، اور انہوں نے جن لوگوں سے روایت لی ہیں ان میں سے کوئی بھی ضعیف اور متکلم فیہ یا متہم بالکذب نہیں ہیں، اور ان کی لی ہوئی روایتوں کی سندوں میں جو ضعیف رواۃ آئے ہیں وہ ان کے استدلال کے بعد آئے ہیں؛ لہٰذا ضعف کا اثر ان کے مستدلات پر نہیں پڑتا۔ (اوجز المسالک، دار القلم دمشق ۱/۱۸۷، مقدمۃ التحقیق فتاوی تاتارخانیہ ۱/ ۴۴ زکریا)

ورنہ یہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ کوئی بہتی نہر ہے اس کے بیچ میں مردار پڑا ہوا ہو، اور مردار کے نیچے کی جانب سے کچھ لوگوں نے پانی پیتے ہوئے بدبو محسوس کر کے کہہ دیا کہ اس نہر کے اوپر

سے نیچے تک ہر طرف کا پانی بدبودار ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر مردار پڑا ہوا ہے صرف وہاں سے نیچے کی طرف کا پانی بدبودار ہے، اور مردار کے اوپر کی جانب بہتی نہر کے پانی میں اس کا کوئی اثر قطعاً نہیں ہے؛ لہٰذا نیچے والے کے بارے میں یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اوپر والے پانی کے بارے میں واقفیت نہیں ہے، پھر بھی بلا تحقیق ان کے اوپر بدبودار پانی پینے کا حکم لگا رہے ہیں جو شرعاً قانوناً وعرفاً کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے امام ابوحنیفہؒ پر ضعیف راویوں کے ضعف کا اثر نہیں پڑتا؛ لہٰذا جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ کی صحت کے ثبوت میں کوئی کلام نہ ہونا چاہئے؛ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ روایات کی سند میں ضعیف راویوں کے آنے سے پہلے اپنے مسائل پر استدلال کر چکے ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کو مستدل کیوں بنایا گیا؟

اس مضمون کے اندر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پانچ (۵) آثار پیش کئے گئے ہیں، خاص طور سے مصنف عبدالرزاق کی دونوں روایتیں سندِ صحیح کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، ان میں سے ایک میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مسلمانوں کو جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، اور دوسری میں اس بات کی صراحت ہے کہ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا معمول یہ رہا ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پابندی سے پڑھا کرتے تھے، اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ اور طحاوی شریف کی روایت بھی صحیح سند کے ساتھ مروی ہے جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا معمول ثابت کیا گیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول اور عمل کی تصدیق کرنے کے لئے حضرت سید الکونین علیہ السلام نے امت کو تاکیدی حکم فرمایا ہے، اور آپ ﷺ کا تاکیدی حکم مسند امام احمد بن حنبل اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

(۱) حدثنا وكيع عن سفيان عن عبدالملك بن عمير عن مولى لربعيّ عن ربعي عن حذيفة قال: كنّا عند النبي صلى الله عليه وسلم جلوساً فقال: إني لا أدرى ما قدر بقائي فيكم فاقتدوا باللذين من بعدي، وأشار إلى أبي بكر وعمر وتمسكوا بعهد عمار وما حدثكم ابن مسعود فصدقوه. (مسند إمام أحمد ابن حنبل ٥/ ٣٨٥، برقم: ٢٣٦٦٥ - ٢٣٨١٣)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو آپؐ نے فرمایا بے شک مجھے معلوم نہیں ہے کہ میری زندگی تمہارے درمیان کتنے دنوں تک باقی رہے گی؛ لہٰذا تم میرے بعد ان دونوں کی اقتدا کرتے رہنا، اور یہ کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ فرمایا، اور فرمایا کہ عمار بن یاسر کے عہد کو مضبوطی سے پکڑو، اور فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو کچھ بھی تمہارے سامنے بیان کریں اس کی ضرور تصدیق کیا کرو۔

(۲) عن حذيفة قال: كنّا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني لا أرىٰ بقائي فيكم إلا قليلاً فاقتدوا باللّذَين من بعدي، وأشار إلى أبي بكر وعمر، واهتدوا بهدى عمّار، وما حدّثكم ابن مسعودؓ فاقبلوه. (صحيح ابن حبان ٦/ ٢٥٥، برقم: ٦٩١١)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، تو آپ نے فرمایا کہ بیشک میں یہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے درمیان میرا باقی رہنا تھوڑے وقت کے لئے ہے؛ لہٰذا میرے بعد تمہیں ان دونوں کی اقتدا کرنی ہے، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرف اشارہ فرمایا، اور فرمایا کہ عمار بن یاسر سے ہدایت حاصل کرتے رہنا ہے، اور فرمایا کہ تمہارے سامنے عبداللہ بن مسعودؓ جو کچھ بھی بیان کریں اس کو ضرور قبول کرو۔

حضور ﷺ کے اس قدر تاکیدی حکم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول و عمل سے صرف نظر کیسے کی جاسکتی ہے؟ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فقہاء صحابہ میں سے ہیں کہ حضور ﷺ کے ایک ایک قول و عمل کو گہرائی تک پہونچ کر اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔

اور یہ بات بھی خوب یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اوّلین اسلام لانے والوں

میں سے ہیں، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں دنیا کے مسلمانوں میں چھٹے نمبر کا مسلمان تھا، اور پوری روئے زمین میں ہم چھ کے علاوہ کوئی مسلمان نہ تھا، صحیح سند کے ساتھ ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن القاسم بن عبدالرحمن عن أبيه قال: قال عبدالله بن مسعودؓ: لقد رأيتني سادس ستةٍ، ما على الأرض مسلمٌ غيرنا. (صحيح ابن حبان ٦/ ٣١٥، برقم: ٧٠٧١، المستدرك للحاكم جديد ٥/ ١٩٨٤، برقم: ٥٣٦٧)

حضرت قاسم ابن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یقیناً میں اپنے آپ کو چھ میں سے چھٹا آدمی دیکھ چکا ہوں، اور روئے زمین میں ہم چھ کے علاوہ کوئی اور مسلمان نہیں تھا۔

تو معلوم ہوا کہ نبوت کے پہلے سال سے لے کر حضرت سید الکونین علیہ السلام کے دنیا سے پردہ فرمانے تک ۲۳ ؍سالہ پورے دور نبوت کو حضرت ابن مسعودؓ نے دیکھا ہے، اور آپ ؐ کے خادم خاص تھے، سفر میں حضر میں ہر وقت ساتھ رہا کرتے تھے، اور صاحب النعلین سے مشہور تھے، اور اپنی جگہ فقیہ النفس تھے؛ لہٰذا اتنی خوبیوں کے مالک صحابی رسول کے قول وعمل کو صرف یہ کہہ کر چھوڑ دینا کہ ابن مسعودؓ کا اثر ہے، انتہائی جسارت یا شریعت سے ناواقفیت کی بات ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ان کے حکم اور عمل کو پیش نظر رکھ کر جمعہ سے پہلے چار رکعت کو سنت مؤکدہ کہا ہے، یہی صحیح ہے اور یہی حق ہے۔

شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

بروز اتوار ۱۳؍صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

(۴) فصل في الخطبة

منبر میں کتنی سیڑھی ہونا افضل ہے؟

سوال [۳۶۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے خطبہ کے لئے جو ممبر مسجد میں بنایا جاتا ہے، اس میں کتنی سیڑھیاں ہونی چاہئے، دو یا تین، افضل سنت کیا ہے؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق، ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبۂ جمعہ کے لئے جو ممبر ہوتا ہے، اس کے لئے تین سیڑھیاں ہونا مسنون اور یہی افضل بھی ہے۔ حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے جو ممبر بنایا گیا تھا، اس میں تین ہی سیڑھیاں تھیں۔ اور آج کل حرمین شریفین کے ممبروں میں جو زیادہ سیڑھیاں نظر آرہی ہیں، وہ بنو امیہ کے زمانہ میں مروان بن حکم نے اضافہ کیا تھا، اس کے بعد اس میں اضافہ کیساتھ سلسلہ چلتا رہا ہے، مگر خلفاء راشدین کے زمانہ میں وہی تین سیڑھیاں تھیں، جو حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں تھیں۔

وفي حديث طويل طرفه هذا: وكان منبر النبي صلى الله عليه وسلم قصيرا، إنما هو ثلاث درجات. الحديث (مسند أحمد بن حنبل ۱/۲۶۹، رقم: ۲٤۱۹)

عن الطفيل بن أبي بن كعبؓ، عن أبيه، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي إلى جذع إذ كان المسجد عريشاً وكان يخطب إلى ذلك الجذع، فقال رجل من أصحابه: يا رسول الله! هل لك أن نجعل لك شيئاً تقوم عليه يوم الجمعة؛ حتى يراك الناس و تسمعهم خطبتك؟ قال: نعم! فصنع له ثلاث درجات، فهي التي أعلى المنبر، فلما وضع المنبر، وضعوه في موضعه الذي هو فيه، فلما أراد رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يقوم إلى المنبر مر إلى الجذع الذي كان يخطب إليه، فلما جاوز الجذع، خار حتى تصدع وانشق، فنزل رسول الله صلى الله عليه وسلم لما

سمع صوت الجذع، فمسحه بيده حتى سكن، ثم رجع إلى المنبر، فكان إذا صلى صلى إليه، فلما هدم المسجد وغير أخذ ذلك الجذع أبي بن كعب، و كان عنده في بيته حتى بلي فأكلته الأرضة وعاد رفاتاً. (ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب ما جاء في بدء شان المنبر، النسخة الهندية ١٠٢، دارالسلام رقم: ١٣١٣، مسند أحمد ٥/١٣٧، رقم: ٢١٥٦٨، ٢١٥٧٢، ٢١٥٨٠)

عبد الرزاقؒ، عن رجل، من اسلم عن صالح مولى التو أمة، أن بأقوال، مولى العاص بن أمية صنع للنبي صلى الله عليه وسلم منبره من طرفاء ثلاث درجات، فلما قدم معاوية المدينة زاد فيه، فكسفت الشمس حينئذ.

(مصنف عبد الرزاق، كتاب الصلاة، باب منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم المجلس العلمي ٣/١٨٢، رقم: ٥٢٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۱۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۷؍۱۴۳۱ھ

خطبۂ جمعہ منبر کے کس زینہ سے دیا جائے؟

سوال [۳۶۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں: کہ ممبر کے اوپر جمعہ کے دن خطبہ کا طریقہ کیا ہے، خلاصہ تحریر کریں؛ کیونکہ ممبر کے تین زینہ ہوتے ہیں، جس میں سے کون سے زینہ سے خطبہ شروع کرنا چاہئے۔ اور کون سے زینہ پر بیٹھنا چاہئے؟

المستفتی: فصیح الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کا خطبہ تیسرے زینہ سے پڑھنا منقول ہے؛ البتہ پہلے اور دوسرے زینہ سے بھی پڑھنا ممنوع نہیں۔ علماء کا معمول سب طرح کا ہے، کسی خاص زینہ کی پابندی نہیں؛ لیکن اپنے اکابر کو دوسرے زینہ پر بیٹھتے ہوئے کثرت سے دیکھا گیا ہے۔ (مستفاد:

فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/ ۲۶۰، ۱۶/ ۵۲۳، جدید ڈابھیل ۸/ ۲۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد لوگوں کو سلام کرنے سے متعلق روایت کا تحقیقی جائزہ

سوال [۳۶۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کچھ غیر مقلدین زور لگا کر یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ جب خطبہ کے لئے ممبر پر تشریف لاتے تھے، تو نمازیوں کی طرف مخاطب ہوکر سلام کیا کرتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث شریف اس کی مشعر ہے۔

عن جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللہ عنہ، أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم کان إذا صعد المنبر سلم. (ابن ماجه شریف، النسخة الهندية ۷۸، الجامع الصغير ۲/ ۹۳، إعلاء السنن ۸/ ۶۶)

اس لئے غیر مقلدین ہم حنفیوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ تم خلاف سنت عمل کرتے ہو جو کہ جائز نہیں ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ممبر پر جانے کے بعد کیا امام کا نمازیوں کو سلام کرنا مسنون ہے؟ اگر مسنون ہے تو ہمارے یہاں اس کے خلاف عمل کیوں؟ اور اگر سنت نہیں ہے تو حدیث شریف کا جواب کیا ہوگا؟

المستفتی: محمد عباس ساکن سہور ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر سلام کرنے سے متعلق کتب حدیث میں جو روایات ملتی ہیں، ان سب کی سند میں کچھ نہ کچھ کلام اور خامیاں ہیں۔ اور کتب حدیث میں چار روایات ہم کو ملی ہیں، اولاً ان

حدیثوں کو مع سند کے نقل کردیتے ہیں، اس کے بعد ان روایات کی کیا حیثیت ہے، وہ بھی آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

عن محمد بن يحى حدثنا عمرو بن خالد ثنا ابن لهيعة عن محمد بن زيد بن مهاجر عن محمد بن المنكدر عن جابر بن عبد الله أن البني صلى الله عليه وسلم، كان إذا صعد المنبر سلم. (سنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الخطبة يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/٧٨، دارالسلام رقم: ١١٠٩، السنن الكبرىٰ للبيهقي ٤/٤٤٤، رقم:٥٨٣٧ نصب الرأيه، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة، مكتبه لاهور پاكستان ٢/٢٠٥، إعلاء السنن، باب سلام الخطيب على المنبر دارالكتب العلمية بيروت ٨/٨٤، كراچي٨/٨٣)

حدثنا محمد بن الحسن حدثنا محمد أبي السرى حدثنا الوليد بن مسلم حدثنا عيسىٰ بن عبد الله الأنصاري عن نافع عن ابن عمر قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل المسجد يوم الجمعة سلم على من عند منبره من الجلوس، فإذا صعد المنبر توجه إلى الناس، فسلم عليهم.
(المعجم الأوسط للطبراني قديم ٧/٣٤٩، درالفكر جديد ٥/٨٩، رقم:٦٦٧٧)

وفيه عيسى بن عبد الله الأنصاري وهو ضعيف، وذكره ابن حبان في الثقات. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٨/٨٣، ٢/١٨٤، إعلاء السنن، دارالكتب العلمية ٨/٨٣، نصب الراية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، لاهور پاكستان ٢/٢٠٥)

حدثنا أبو بكر حدثنا أبو أسامة حدثنا مجالد عن الشعبي قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا صعد المنبر يوم الجمعة استقبل الناس بوجهه، فقال: السلام عليكم، وكان أبو بكر، وعمر، وعثمان يفعلونه.
(مصنف ابن أبي شيبة، الإمام إذا جلس على المنبر يسلم قديم ٢/١١٤، مؤسسة

علوم القرآن جديد ٤ /٧٩، رقم: ٥٢٣٨، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ٣/١٩٣، رقم: ٥٢٨٢، نصب الرايه، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة لاهور پاكستان ٢/٢٠٦، إعلاء السنن، باب سلام الخطيب على المنبر، دارالكتب العلمية بيروت ٨/٨٤، كراچي ٨/٨٤)

أخبرنا ابن جريج عن عطاءؒ، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا صعد المنبر يوم الجمعة استقبل بوجهه، فقال: السلام عليكم.
(اعلاء السنن، دار الكتب العلمية ٨/٨٤، نصب الراية ٢/٢٠٦)

روایات کا جائزہ: منبر پر خطیب کے سلام سے متعلق یہ کل چار روایات آپ کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں، مگر ان روایات کی اصلیت اور حقیقت کیا ہے؟ اس پر واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

پہلی روایت جو حضرت جابر سے مروی ہے، اس روایت کی سند میں دو راویوں پر محدثین نے کلام فرمایا ہے۔

(۱) عبداللہ بن لہیعہ، ان کی کتابیں جل جانے کے بعد ان کا حافظہ متأثر ہو چکا تھا؛ اس لئے محدثین نے عبداللہ بن لہیعہ کو ضعیف اور کمزور راوی قرار دیا ہے۔

و ابن لهيعة ضعيف عند أهل الحديث، ضعفه يحیٰ بن سعيد القطان وغيره. (ترمذي شريف، النسخة الهندية ١/٨)

(۲) عمرو بن خالد بن فروخ التیمی الحرانی: ان کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے دسویں طبقہ کے محدثین میں شمار فرمایا اور ثقہ کہا ہے؛ لیکن عبداللہ بن لہیعہ اور ان کی وفات کے درمیان میں ۵۵/سال کا فاصلہ ہے؛ اس لئے اس حدیث شریف کی سند کو اگر کسی حد تک مان بھی لیا جائے تو منقطع شمار ہوگی اور منقطع حدیث شریف غیر مقلدین کے یہاں معتبر نہیں۔

نیز ابن ابی حاتم وغیرہ نے اس حدیث شریف کو موضوع قرار دیا ہے، نصب الرایہ اور ابن ماجہ کے حاشیہ میں اس کی تفصیل موجود ہے اور اگر عمرو بن خالد قرشی مراد ہے، تو اس کو امام

وکیع وغیرہ نے متہم بالکذب قرار دیا ہے؛ اس لئے یہ روایت متکلم فیہ ہے۔ اور دوسری روایت میں عیسی بن عبداللہ انصاری ہے، اس کو امام ابوبکر ہیثمی وغیرہ نے ضعیف کہا ہے، اور امام یحی بن سعید قطان نے ان کو منکر الحدیث فرمایا ہے؛ اس لئے اس حدیث شریف کو بھی ضعیف کہا گیا ہے۔ اور تیسری روایت امام عامر شعبی کی مرسل روایت ہے اور مرسل روایات غیر مقلدین کے یہاں ان کے اصول کے مطابق قابل استدلال نہیں ہوتیں، اسی طرح چوتھی روایت امام عطاء بن ابی رباح کی مرسل روایت ہے، یہ بھی ان کے یہاں معتبر نہیں، اب ثابت ہوا کہ مذکورہ چاروں روایات یا تو ضعیف ہیں یا مرسل ہیں۔ بہر حال چاروں روایات متکلم فیہ ہیں اور ایسی روایات احناف کے یہاں تو آداب اور مستحبات میں مستدل بن سکتی ہیں، اسی وجہ سے حضرت تھانوی نے بہشتی زیور ۱۱/۸۲ میں از قبیل آداب تحریر فرمایا ہے اور کتاب سراج کے اندر مستحب نقل فرمایا ہے؛ لیکن غیر مقلدین جو اپنے آپ کو بتکلف سلفی کہتے ہیں، ان کے یہاں اس قسم کی روایات مستدل نہیں بن سکتی؛ بلکہ ان کے یہاں مستدل جب ہی بن سکتی ہے کہ جب حدیث شریف مرفوع ہو، اور متصل السند بھی ہو۔ اور سند کے تمام رجال ثقہ اور معتبر ہوں اور کوئی راوی متکلم فیہ نہ ہو اور مذکورہ روایات میں سے کسی میں یہ تمام شرائط موجود نہیں ہیں، تو ہماری طرف سے سوال ہے کہ یہ احادیث ان کی شرائط کے مطابق نہ ہونے کے باوجود وہ لوگ منبر پر سلام کا التزام کیوں کرتے ہیں۔ اور حنفیہ کے اوپر اعتراض اور الزام بھی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ حالانکہ حنفیہ کے یہاں اس قسم کی روایات پر عمل کرنے میں اختیار ہے، اگر کوئی عمل کرتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے اور اگر کوئی عمل نہیں کرتا ہے تو اس پر بھی کوئی ملامت نہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں اس قسم کی روایات پر عمل کرنے اور نہ کرنے میں اختیار ہے۔ اور امر اختیاری میں کسی کو کسی پر ردوقدح کا حق نہیں ہوتا، اگر کوئی اس پر عمل کرتا ہے، تو اس کو ثواب ملنے کی امید کی جاتی ہے اور اگر کوئی عمل نہیں کرتا ہے، تو اس پر کوئی حرج بھی نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۵۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۵ھ

خطبۂ جمعہ میں عصا ہاتھ میں لینا

سوال [۳۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کا خطبہ دیتے وقت ہاتھ میں عصا لینا اور اس پر ٹیک لگا کر خطبہ دینا مسنون ہے یا نہیں؟ اگر مسنون ہے تو اس دور میں اس پر عمل کیوں متروک ہے؟ کیا اس سنت کو زندہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے؟

اگر مسنون عمل نہیں ہے، تو شرعاً اس کی حیثیت کیا ہے؟ ہمارے علاقہ ضلع سیتا پور میں کچھ لوگ عصا لے کر خطبہ دیتے ہیں، کچھ لوگ بغیر عصا کے خطبہ دیتے ہیں، شرعی حیثیت واضح فرما کر شکر گذاری کا موقع دیں۔

المستفتی: شریف احمد مظاہری، مدرس مدرسہ تعلیم القرآن چوبے ٹولہ، شہر سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات فقہاء نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ جن بلاد کو لڑائی اور قتال کے ذریعہ فتح کیا گیا ہے، ان میں عصا یا تلوار پر ٹیک لگا کر خطبہ دینا مستحب ہے۔ اور جن بلاد کو بغیر قتال کے صلح کے ذریعہ سے فتح کیا گیا ہے، اس میں بغیر عصا اور بغیر تلوار کے خطبہ دینا مستحب ہے۔ اور بعض فقہاء نے مطلقاً عصا پر ٹیک لگا کر خطبہ دینا مستحب لکھا ہے؛ اس لئے ہمارے ہندوستان میں لوگوں کو اختیار ہے کہ چاہے عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیں اور چاہے بغیر عصا کے خطبہ دیں، دونوں طرح جائز ہے اور دونوں میں سے کوئی بھی خلاف شریعت نہیں ہے؛ ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ کبھی عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا جائے اور کبھی بغیر عصا کے خطبہ دیا جائے؛ لہٰذا سیتا پور میں جو لوگ عصا ہاتھ میں لے

کر خطبہ دیتے ہیں اور جو لوگ بغیر عصا کے خطبہ دیتے ہیں دونوں جائز ہے، کسی کو کسی پر نکیر کرنے کا حق نہیں ہے اور عصا کو لازمی سمجھنا بدعت ہے اور اس کا ترک ایسے حالات میں اولیٰ اور افضل ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ص:۳۸۱)

في الدر: يخطب الإمام بسيف في بلدة فتحت به كمكة، وإلا لا كالمدينة. وفي الحاوي القدسي: إذا فرغ المؤذنون قام الإمام والسيف في يساره، وهو متكئ عليه. و في الخلاصة: يكره أن يتكئ على قوس، أو عصا. وفي الشامية: استشكله في الحلية بأن في رواية أبي داؤد أنه صلى الله عليه وسلم قام أي في الخطبة متوكئاً على عصا أو قوس الخ. ونقل القهستاني عن المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۶۳، زكريا ۳/ ۴۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۶/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
۱۴۲۹/۳/۱۶ھ	(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۵۱)

ہاتھ میں عصا لے کر خطبہ دینا

سوال [۳۶۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ کا خطبہ دیتے وقت عصا لے کر خطبہ دینا کیسا ہے؟ شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد کمال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کا خطبہ دیتے وقت ہاتھ میں لاٹھی لینے کے بارے میں دو طرح کی فقہی روایات ملتی ہیں۔ درمختار اور عالمگیری میں خلاصہ کے حوالہ سے کراہت منقول ہے۔ اور علامہ شامیؒ نے قہستانی کے حوالہ سے سنیت کا قول ذکر کیا ہے؛ لہٰذا جب

روایات دونوں طرح کی ہیں، تو کبھی لاٹھی ہاتھ میں لی جائے اور کبھی نہ لی جائے، لاٹھی لینے کا التزام نہ کیا جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۸۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۷/۲۰۷، جدید ڈابھیل ۸/۲۶۹، فتاوی سعدیہ ص: ۱۰۷، احسن الفتاوی ۴/۱۴۲)

ویکره أن یتکئ علی قوس أو عصا، قال الشامي: أنه صلی الله علیه وسلم قام أي في الخطبة متوکئاً علی عصا، أو قوس (إلی قوله) ونقل القهستاني عن عید المحیط أن أخذ العصا سنة. (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، زکریا ۳/ ٤١، کراچي ٢/ ١٦٣)

وفي الهندیة: ویکره أن یخطب متکئاً علی قوس أو عصاً، کذا في الخلاصة. (عالمگیري، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زکریا قدیم ١/ ١٤٨، جدید ١/ ٢٠٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۹۳۱)

کیا حضور ﷺ سے عصا لے کر خطبہ دینا ثابت ہے؟

سوال [۳۶۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضور ﷺ سے عصا لے کر خطبہ دینے کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو آپ ﷺ کے عصا کا حجم اور کیفیت کو بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: مفتی قمر عالم، نگینہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فتاوی تاتارخانیہ میں عصا ہاتھ میں لینے کو خلاف سنت لکھا ہے؛ لیکن یہ بات قابل غور ہے؛ اس لئے کہ متعدد احادیث شریفہ میں حضور ﷺ کا عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دینا ثابت ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ کے حاشیہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے

کہ عصا کی لمبائی آپ کے کوکھ کے برابر تھی، جس کو آپ پکڑ کر آسانی سے ٹیک لگایا کرتے تھے۔ اور عصا پر ٹیک لگانے کی روایت متعدد کتب احادیث میں مروی ہے، مگر اس کی موٹائی کتنی تھی احقر کو دستیاب نہیں ہوسکی۔

روایات ملاحظہ فرمائیے:

عن شعيب بن رزيق الطائفي حدثنا طويلاً وفيه، فأقمنابها أياماً شهدنا فيها الجمعة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقام متكئاً على عصًا أو قوس الخ. (أبو داؤد، كتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، النسخة الهندية ١/١٥٦، رقم: ١٠٩٦، صحيح ابن خزيمه، المكتب الإسلامي ١/٧٠٣، رقم: ١٤٥٢)

حدثني أبي عن أبائه أن رسول الله صلى عليه وسلم كان إذا خطب في الحرب خطب على قوس، وإذا خطب في الجمعة خطب على عصاً. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب الإمام يعتمد على عصا، أو قوس، أو ما اشبههما إذا خطب، دارالفكر ٤/٤٤٧، رقم: ٥٨٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الخطبة يوم الجمعة، النسخة الهندية، دار السلام رقم:١١٠٧، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٦/٣٩، رقم:٥٤٤٨)

عن يزيد بن البراء عن أبيه، أن النبي صلى الله عليه وسلم، خطب على قوس أو عصاً. (مسند أحمد بن حنبل ٤/٣٠٤، رقم: ١٨٩١٨، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن جديد ٤/١٧٧، رقم: ٥٦٠٨، وهكذا في مصنف عبد الرزاق، رقم: المجلس العلمي ٥٦٥٨)

وفي حديث طويل ذكره الإمام أحمد بن حنبل في مسنده قال: فتقدم فصلى ركعتين، ثم سلم، ثم استقبل الناس بوجهه وأعطىٰ قوساً أوعصاً فاتكأ عليه الخ. (مسند أحمد بن حنبل ٤/٢٨٢، رقم: ١٨٦٨٢)

عن جريرؓ، قال قلت لعطاء: أكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقوم

إذا خطب على عصا؟ قال: نعم! وكان يعتمد عليها اعتماداً. (السنن الكبرى للبيهقي، باب الإمام يعتمد على عصا أو قوس، أو ما اشبههما، دارالفكر ٤٤٧/٤، رقم: ٥٨٤٨، وهكذا في المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ٢٣٤١/٦، رقم: ٦٥٥٤، المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي ٣١٠/١١، رقم: ١٢٠٩٨، مجمع الزوائد ١٨٧/٢)

عن ابن شهاب، حدثنا طويلاً: وفيه قال ابن شهاب: وكان إذا قام أخذ عصاً، وهو قائم على المنبر، ثم كان ابو بكر الصديقؓ، وعمر بن الخطابؓ، وعثمان بن عفانؓ يفعلون ذلک. (مراسيل أبي داؤد ٧/٢، مستفاد: حاشية الفتاوى التاتارخانية ٥٦٥/٢-٥٦٦، تحت رقم المسئلة:٣٣٠٩)

وأما حديث ابن الزبير فذكره تحت عنوان: ذكر قضيبه صلى الله عليه وسلم ١٢٨/١

وفي إسناده ابن لهيعه: ولفظه: كان يخطب ومعه مخصرة أي عصاً طولها إلى حد خصر صاحبها، فهي قصيرة. (هامش المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن جديد ١٧٨/٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۰۷/۴۰)

عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دینا

سوال [۳۶۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے ریاست آسام میں ایک مولانا بوقت خطبہ عصا بکف ہوکر زبانی خطبہ سناتے ہیں اور دستۂ عصا پر ایک ایسی رحل کا انتظام کیا گیا ہے کہ وہ بظاہر دستہ ہی نظر آتی ہے؛ لیکن اگر خطبہ دیکھ کر پڑھنا چاہیں، تو اسے کھول کر وہ رحل بن جاتی ہے۔ اور اس پر کتاب رکھ کر بآسانی خطیب خطبہ دے سکتا ہے؛ چونکہ وہاں دیکھ کر خطبہ خواں کی اکثریت ہے اور عصا

سازمولانا کا اسی پر تعامل ہے؛ لیکن دیگر علماء کرام اس پر اعتراض کرنے لگے اور خاصا اختلاف کھڑا ہوگیا ہے۔اب مولانا موصوف یہ کہتے ہوئے دفاع کرنے لگے کہ اگر عصا کے ساتھ رحل بایں صورت بنائی جائے کہ وہ بند نہ کی جاسکے اور مستقل رحل کی شکل وساخت اختیار کرجائے،تو وہ قابل استعمال نہیں ہوسکتی اوراس عصا کے ساتھ جورحل ملحق ہے،وہ بظاہر بعید ازشناس ہے؛اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے،اس کو دستہ ہی قرار دے کر استعمال کیا جاسکتا ہے؛ لہٰذا مفتیان کرام اس مسئلہ کی اختلافی جہت کو سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائیں کہ خطبہ میں مطلقاً عصا کا استعمال شریعت کی نظر میں کس حیثیت کا حامل ہے اور عصا مذکور کے استعمال میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ جواب خواہ نفی کی صورت میں ہو یا اثبات کی صورت میں اسباب ووجوہات سے روشناس فرمائیں۔

المستفتی: مولوی محمد ضیاء الحق ہیلا کندی، متعلم دارالعلوم، دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت خطبہ عصا کا ہاتھ میں لینا شرعاً مسنون ومستحب ہے۔حضور ﷺ سے صراحت کے ساتھ عصا کا سہارا لے کر خطبہ دینا ثابت ہے؛ لیکن مداومت کا کہیں ثبوت نہیں ہے،اس بناء پر کبھی کبھی عصا لئے بغیر بھی خطبہ دیا جائے،تاکہ لوگ ضروری نہ سمجھنے لگیں؛ کیونکہ مستحب کو ضروری سمجھنا بھی مکروہ ہے؛ البتہ اگر خطیب ایسا ہو کہ عصاء کا سہارا لیے بغیر کھڑا نہ ہوسکتا ہو،تو اس کو مداومت کے ساتھ عصا کا سہارا لے کر خطبہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں،احادیث میں مطلقاً عصا کی بات ہے،اس کی کیفیت اور ساخت کا بیان نہیں ہے؛اس لئے اگر آپس میں اختلاف کا اندیشہ نہ ہوتو سوال نامہ میں مذکور ساخت وکیفیت کا عصا لے کر خطبہ دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱/۶۸۱، محمودیہ قدیم ۱۴/۲۴۲، ۷/۲۰۷، ڈابھیل ۸/۲۶۹، احسن الفتاویٰ ۴/۱۵۲، امداد الاحکام ۲/۳۵۰، امداد المفتیین ۵/۳۷۵، ۳۸۲، کفایت المفتی قدیم ۳/۲۱۴، جدید زکریا ۳/۲۶۰)

شعیب ابن رزیق الطائفي قال: جلست إلی رجل له

صحبة–إلى–فأقمنابها أيامًا شهدنا فيها الجمعة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقام متكئاً على عصا أو قوس. الحديث (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، النسخة الهندية ۱/۱٥٦، دارالسلام رقم: ۱۰۹٦)

ويكره أن يتكئ على قوس أو عصا. (در مختار) وفي الشامية: ونقل القهستاني عن عيد المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱٦۳، زكريا ۳/٤۱، حاشية الطحطاوي على المراقي، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ٥٤٦، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۲/ ۲٦۰، كوئٹه ۲/۱٤۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۴۵)

کیا حضور ﷺ نے عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا ہے؟

سوال [۳۶۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا ہے یا نہیں؟ اگر آپ علیہ السلام نے عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا ہے، تو اس عصا کی لمبائی کتنی تھی اور اس کو چوڑائی کتنی تھی؟

المستفتی: محمد اقبال آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا ہے اور یہ حدیث سے ثابت ہے، فقہاء نے اسے مستحب قرار دیا ہے اور اس عصا کی لمبائی کمر مبارک کی حد تک تھی۔

حدثنا وكيع عن أبي جناب عن يزيد بن البراء عن أبيه أن النبي صلى

الله علیه وسلم خطبهم یوم عیدٍ وفي یده قوسٌ أو عصا. (المصنف لابن أبي شیبه، مؤسسة علوم القرآن ٤/١٧٨، رقم: ٥٦٠٨)

وأما حدیث ابن الزبیر …… وفي إسناده ابن لهیعة، ولفظه: کان یخطب ومعه مخصرة أي عصا طولها إلی حد خصر صاحبها، فهي قصیرة.
(هامش المصنف لابن أبي شیبة٤/١٧٨، بیروت)

عن ابن جریج قال: قلت لعطاءٍ: أکان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقوم إذا خطب علی عصا؟ قال: نعم! وکان یعتمد علیها اعتماداً. (السنن الکبری، البیهقي بیروت ٣/٢٩٢)

عبد الرزاق عن معمر قال: سمعت بعض أهل المدینة یذکر أن النبي صلی الله علیه وسلم، کان إذا خطب اعتمد علی عصاه اعتماداً. (مصنف عبد الرزاق ٣/٢٨٨، بیروت) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۲۰/۴۰)

عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ دینا

سوال [۳۶۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ممبئی میں امام اپنے ہاتھ میں عصا کیوں لیتے ہیں؟ ناچیز لکھنؤ کا باشندہ ہے، اس ملک کے کافی حصوں کا دورہ کیا ہے؛ لیکن یہ طریقہ نہیں پایا، یہ طریقہ سنت ہے یا فرض یا کہ بدعت ہے؟ اگر بدعت ہے تو اسے کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ امید کہ آپ اس بارے میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔

المستفتی: امین الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: امام کے اپنے ہاتھ میں عصا لینے سے اگر سائل کی مراد

خطبہ جمعہ کے وقت ہاتھ میں لینا ہوتو اس سلسلہ میں کتب فقہ میں سنت اور کراہت دونوں طرح کی روایات منقول ہیں۔

ويكره أن يتكئ على قوس أو عصا. (در مختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۶۳، زكريا ۳/۴۱، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۲/۲۶۰، كوئٹه ۲/۱۴۸)

ونقل القهستاني عن عبد المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام. (شامي، كراچي ۲/۱۶۳، زكريا ۳/۴۱)

تو دونوں روایات کے درمیان مطابقت یوں ہے کہ عصالینا مکروہ نہیں ہے، ٹیک لگانا اوراس کا التزام مکروہ ہے۔اور بغیر عذر التزامًا ہاتھ میں عصالینا مکروہ نہیں ہے۔(مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۴۱،فتاوی واحدی ۱/۲۴۴)

لہٰذا عصاء ہاتھ میں لینے والوں کو کچھ نہ کہا جائے اور نہ ہی عصا ہاتھ میں نہ لینے والوں کو کچھ کہا جائے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍صفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۶۷۱)

خطبہ جمعہ کی مقدار

سوال [۳۶۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبہ جمعہ کی مقدار کتنی ہے اوراس حد سے تجاوز کرنے پر کیا حکم ہے؟

المستفتی: نورالحسن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مختصر خطبہ دینا مسنون ہے، جس کی مقدار قرآن پاک کی طوال مفصل سورتوں کے بقدر ہے، اس سے زیادہ خطبہ کو لمبا کرنا مکروہ ہے۔ نیز یہ کہ دونوں خطبے دونوں رکعتوں سے لمبے نہ ہوں۔(مستفاد: از فتاوی دار العلوم ۵/۱۵۴)

ویسن خطبتان خفيفتان، وتكره زيادتهما على قدر سورة من طوال المفصل. (شامي مع الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا٣/ ٢٠، كراچي ١٤٨/٢، وهكذا في البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة٢/ ١٤٨، زكريا٢/ ٢٥٨)

عن واصل بن حيان، قال: قال أبو وائل، خطبنا عمار، فأوجز و أبلغ، فلما نزل قلنا، ياأبا اليقظان لقد أبلغت و أوجزت، فلو كنت تنفست فقال: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: إن طول صلاة الرجل، وقصر خطبته، مئنة من فقهه، فأطيلوا الصلاة، واقصروا الخطبة، وإن من البيان سحراً. (صحيح مسلم، كتاب الجمعة، فصل في إيجاز الخطبة وإطالة الصلاة، النسخة الهندية ١/ ٢٨٦، بيت الأفكار رقم: ٨٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۶/ ۱۴۱۵ھ

عذر کی وجہ سے چوکی یا زمین پر خطبہ دینا

سوال [۳۶۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد کا منبر چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے امام صاحب خطبہ دینے کے لئے صحیح طور پر کھڑے نہیں ہوسکتے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ جمعہ کا خطبہ منبر پر کھڑے ہوکر ہی دینا ضروری ہے یا نیچے کھڑے ہوکر بھی خطبہ دے سکتے ہیں اور نیچے کوئی چوکی وغیرہ ڈالی جائے یا زمین پر کھڑے ہوکر خطبہ دیا جاسکتا ہے؟ جو طریقہ بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں درست ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: جلیس احمد، ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ منبر پر کھڑے ہوکر دینا مسنون ہے، مگر سوال نامہ

میں ذکر کردہ معقول عذر کی وجہ سے چوکی یا زمین پر کھڑے ہوکر خطبہ دیا جائے ،تو بلا کراہت جائز اور درست ہے ۔(مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۲۶/۵)

قال أبو رفاعة العدوي: انتهيت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهو يخطب، فقلت: يا رسول الله! رجل غريب جاء يسأل عن دينه، لايدري ما دينه؟ قال: فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم وترك خطبته، ثم أتي بكرسي خلت قوائمه حديداً فصعد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فجعل يعلمني مما علمه الله، ثم أتى خطبته فأتمها. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٥٩/٢، رقم: ١٢٨٤، صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب من دخل المسجد والإمام يخطب، النسخة الهندية ٢٨٧/١، بيت الأفكار رقم: ٨٧٦، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٧٠٦/١، رقم: ١٤٥٧، ٨٧٢/٢، رقم: ١٨٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۸۳/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۱۵ھ

جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے؟

سوال [۳۶۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا کیسا ہے اور بیٹھنے کی مقدار کیا ہے؟ اگر نہ بیٹھے تو کوئی حرج تو نہیں ہے؟ شریعت کی رو سے مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ابراہیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے اور اس کی مقدار تین چھوٹی آیتوں کے پڑھنے کے بقدر ہے، اگر کوئی شخص دو خطبوں کے درمیان نہ بیٹھے تو دو خطبے شمار نہ ہوں گے؛ بلکہ ایک خطبہ شمار ہوگا اور ایسا کرنے والا تارک سنت ہوگا۔

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم، يخطب قائماً، ثم يقعد، ثم يقوم كما تفعلون الآن. (صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الخطبة قائماً، النسخة الهندية ١/ ١٢٥، رقم: ٩١٠، ف: ٩٢٠)

(بجلسة بينهما) بقدر ثلث آيات على المذهب وتاركها مسئ على الأصح .

(در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/ ١٤٨، زكريا ٣/ ٢٠، فتاوى عالمگيري، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم١/ ١٤٧، جديد ١/ ٢٠٨، هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، اشرفي ١/ ١٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۶۷۰۰)	۱۴۲۱/۵/۲۹ھ

خطبہ کے بعد حضور ﷺ مصلے پر بیٹھتے تھے یا جماعت شروع فرماتے تھے؟

سوال [۶۳۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضور اکرم نور مجسم ﷺ نماز جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد مصلے پر تشریف فرما ہوتے تھے یا کھڑے ہوجاتے تھے، مکبر کی تکبیر کھڑے ہوکر سماعت فرماتے تھے یا بیٹھ کر؟ حدیث پاک کی روشنی میں مع حوالۂ کتب تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

المستفتی: اکبر علی، خادم مدرسہ اسلامیہ مصباح العلوم بیرداراامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ خطبہ سے فراغت کے بعد ممبر شریف سے نیچے اتر کر مصلے پر تشریف لیجا کر کھڑے رہتے اور مؤذن تکبیر کہتے تھے اور مؤذن کے تکبیر سے فارغ ہونے تک مصلے پر ہی کھڑے رہتے تھے۔

عن السائب بن يزيد قال: ما كان لرسول الله صلى الله عليه وسلم إلا مؤذن واحد إذا خرج أذن وإذا نزل أقام، و أبو بكر، وعمر، كذالك.

الحديث (ابن ماجه شريف، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الأذان يوم الجمعة، النسخة الهندية ۷۹، دارالسلام رقم:۱۱۳۵)

أقيمت بحيث يتصل أول الإقامة بأخر الخطبة، وتنتهي الإقامة بقيام الخطيب مقام الصلاة الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا۳/ ۳۹، كراچي ۲/ ۱۶۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰۸ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۷۲۹)

خطبہ میں امام کا خلفاء راشدین و دیگر صحابہ کا نام نہ لینا

سوال [۳۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری جامع مسجد میں جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل، جو خطبۂ ثانیہ دیا جاتا ہے، اس میں مقیم پیش امام وخطیب باوجود کتاب خطبہ یعنی خطبات الاحکام حضرت تھانویؒ کے ہونے کے وہ زبانی خطبہ پڑھتے ہیں، جس میں اہل بیت وخلفاء راشدین و دیگر صحابہ کے نام نامی کا تذکرہ نہیں کرتے، یہ معمول ہر جمعہ میں جاری ہے، اس سلسلہ میں امام موصوف کا یہ عمل از روئے شرعی آداب کیسا ہے؟

المستفتی: محمد مسعود کورائی اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ جمعہ میں خلفاء راشدین وغیرہ کے ناموں کو ذکر کرنا مستحب ہے، لازم یا واجب نہیں اور نہ ہی خطبہ جمعہ دیکھ کر پڑھنا لازم ہے؛ بلکہ زبانی خطبہ پڑھنے پر قادر ہے، تو زبانی پڑھنا زیادہ بہتر ہے؛ اس لئے اگر امام صاحب کوئی ایسا خطبہ پڑھیں، جس میں خلفاء راشدین وغیرہ کے ناموں کا ذکر نہ ہو، تو اس کی وجہ سے امام صاحب پر طعن وتشنیع کرنا درست نہیں ہے؛ ہاں البتہ امام صاحب کو ترغیب دی جائے، خلفائے

راشدین کا نام بھی دوران خطبہ آجائے تو بہتر ہے، نہ آنے پر کوئی الزام نہیں۔

ویندب ذکر الخلفاء الراشدین، والعمین هما حمزة، والعباس رضي الله عنهما الخ (شامي، کتاب الصلاة، باب الجمعة، کراچي ۲/۱٤۹، زکریا ۳/۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۱۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۱۱/۱۴۲۷ھ

دوران خطبہ دشمنان اسلام پر لعنت بھیجنا

سوال [۳۶۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید خطبۂ جمعہ میں یہود ونصاری اور مشرکین پر لعنت اور بددعا کے الفاظ کہتا ہے، کیا ان کا خطبہ میں مذکورہ افراد پر ان الفاظ کا کہنا درست ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں میں جواب مع دلائل تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد عثمان امروہوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: غیر قوم پر ہر زمانے میں اور ہر موقع پر لعنت کرنے کی بات ثابت نہیں ہے، ہاں البتہ جب غیر کی طرف سے مسلمانوں پر مظالم ہونے لگیں، تو فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی جائے، اس میں دشمنان اسلام پر لعنت اور بددعا کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح خطبۂ جمعہ میں بھی ایسے مظالم کے زمانے میں لعنت کی اجازت ہے، حضور ﷺ نے مسلسل ایک مہینہ ایسے مظالم کے موقع پر لعنت کے ساتھ بددعاء فرمائی ہے، مگر مسلسل ہر زمانے میں نہیں؛ اس لئے اگر زید ایسے مظالم کے زمانے میں خطبہ جمعہ میں لعنت کی بددعا کرتے ہیں تو گنجائش ہے، مگر مسلسل ہر زمانے میں نہیں کرنی چاہئے۔ (

مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۷۴/۷)

عن أنس رضـ قال: قنت النبي صلى الله عليه وسلم بعد الركوع شهراً يدعو على رعل و ذكوان، ويقول: عصية عصت الله ورسوله. (بخاري شريف، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع ورعل وذكوان، النسخة الهندية ۲/ ۵۸۷، رقم: ۳۹٤۷، ف: ٤٠٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۶۵۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۹ھ

دوران خطبہ ''السلطان ظل الله'' کے الفاظ کہنا

سوال [۳۶۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ کے خطبہ میں بعض خطیب درمیان خطبہ یہ جملے بھی کہتے ہیں کہ "**السلطان ظل الله في الأرض من أكرمه أكرمه الله و من أهانه أهانه الله**" کیا اس وقت ہندوستان میں بوقت خطبہ ان جملوں کا کہنا صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو کون شخص مراد ہوگا؟ اور اگر کوئی اس کا مصداق نہیں ہے، تو کیا ان الفاظ کا کہنا ترک کردیا جائے؟

المستفتی: قاری احمد علی، استاذ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں بھی ان الفاظ کا کہنا مستحب نہیں ہے اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں ان الفاظ کا کہنا درست نہیں اور ہندوستان میں بھی غیر اسلامی حکومت ہے؛ لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ، مکتبہ تفسیر القرآن ۱۰۹/۴)

و أما الدعاء للسلطان في الخطبة، فلا يستحب لما روي أن عطاء سئل عن ذلك، فقال: أنه محدث وإنما كانت الخطبة تذكيرًا، في الخلاصة

وغيرها: الدنو من الإمام أفضل من التباعد على الصحيح، ومنهم من احتار التباعد حتى لا يسمع مدح الظلمة في الخطبة. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٢/٢٦٠، كوئٹه ٢/١٤٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۶۴۲/۳۲)

خطبہ میں ” والسلطان ظل اللہ الخ“ پڑھنا

سوال [۳۶۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبہ میں یہ الفاظ ”والسلطان ظل الله في الأرض، من أهان سلطان الله في الأرض اهانه الله أو من اكرمه اكرمه الله“ ذکر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ دار الاسلام ہو یا دار الحرب ہو؟

المستفتی: محمد علاء الدین، منی پوری، متعلم مدرسہ عبداللہ ابن مسعود، ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ روایت کے اکثر الفاظ صحیح حدیث شریف سے ثابت ہیں اور بعض الفاظ صحیح حدیث شریف میں موجود نہیں ہیں اور حدیث شریف سے ثابت شدہ روایات خطبہ میں ذکر کرنا جائز اور درست ہے، چاہے دار الاسلام ہو یا دار الحرب؛ اس لئے کہ خطبہ میں تذکیر اور نصیحت ہوتی ہے اور یہ بھی ایک نصیحت کی بات ہے، اس میں دار الاسلام یا دار الحرب کا کوئی امتیاز نہیں۔

من أهان سلطان الله في الأرض أهانه الله. (ترمذي شريف، ابواب الفتن، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/٤٦، دارالسلام رقم:٢٢٢٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۰۲۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۲ھ

خطبہ میں "السلطان ظل اللہ" پڑھنے کے عدم جواز کے فتوی سے رجوع

سوال [۳۶۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ کے دو فتوے میرے سامنے ہیں اور دونوں میں سائل نے یہ سوال پوچھا ہے کہ خطبہ میں "**السلطان ظل الله في الأرض من أهان سلطان الله في الأرض أهانه الله**" کا پڑھنا مشروع ہے یا نہیں؟ لہٰذا پانچ صفر ۱۴۱۷ھ کے جواب میں جواہر الفقہ اور بحر کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ ان الفاظ کا کہنا اسلامی حکومت میں مستحب نہیں ہے اور غیر اسلامی حکومت میں درست نہیں ہے اور ہندوستان میں بھی غیر اسلامی حکومت ہے؛ جبکہ ۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ء میں دس سال کے بعد کے جواب میں یہ لکھا گیا ہے کہ چوں کہ یہ الفاظ حدیث میں مذکور ہیں اور صحیح حدیث شریف سے ثابت ہیں؛ اس لئے حدیث شریف سے ثابت شدہ الفاظ کا خطبہ میں ذکر کرنا بلاشبہ جائز اور درست ہے؛ کیونکہ خطبہ میں تذکیر ونصیحت ہوتی ہے اور یہ بھی ایک نصیحت کی بات ہے، چنانچہ حضرت والا سے گذارش ہے کہ دونوں کے درمیان بظاہر جو تعارض نظر آرہا ہے، اس کو رفع فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پہلے فتوی میں بحر کی عبارت کے پیش نظر جواب لکھا گیا تھا اور بحر کی عبارت میں سلطان اور بادشاہ کی تعریف اور اس کے لئے دعا کرنے کو خلاف استحباب لکھا ہے اور مسئلہ دار الاسلام کا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دار الاسلام میں اگر عادل بادشاہ نہیں ہے، تو اس کے لئے خواہ مخواہ دعا کرنا مستحب نہیں ہے؛ ہاں البتہ اس کی اصلاح

کی غرض سے دعا کرنا جائز ہے اور غیر اسلامی ممالک میں جو حکام ہوتے ہیں، ان کے لئے عدل وانصاف کی دعا کرنا جائز ہے اور ظالم کی ہدایت کی دعا کرنا بھی جائز ہے، اس سے ہٹ کر جب ظلم کررہا ہو، تو اس ظالم کے لئے یونہی دعا کرنا درست نہیں ہے۔

نیز بحر کی عبارت کا مقصد حاکم کا نام لے کر اس کے لئے دعا کرنا مشروع اور مستحب نہیں ہے، جواہر الفقہ میں یہی جواب لکھا ہے کہ پاکستان میں بعض لوگ محمد علی جناح کا نام لے کر دعا کر رہے تھے، اس کے جواب میں جواہر الفقہ میں عدم جواز کی بات لکھی ہے؛ اس لئے کہ وہ متشرع اور متبع شریعت حاکم نہیں تھا، اسی کے پیش نظر ہم نے بھی ۱۴۱۷ھ میں اسی طرح کا جواب لکھا تھا، پھر ۱۴۲۷ھ میں حدیث شریف کے پیش نظر خطبہ میں ان الفاظ کے پڑھنے کو جائز لکھا تھا؛ اس لئے کہ خطبہ تذکیر ونصیحت ہے اور اس حدیث شریف میں جو مضمون ہے اس میں بھی ایک طرح کی نصیحت ہے کہ جو حاکم کا اعزاز کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا اعزاز کرے گا اور جو حاکم کی اہانت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی اہانت کریں گے؛ لہٰذا بطور نصیحت کے حدیث کے ان الفاظ کو خطبہ میں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے چاہے حکومت اسلامی ہو یا غیر مسلم کی ہو، اس میں کوئی فرق نہیں اور حضرت ابوبکرہؓ نے یہ حدیث شریف اسی موقع پر بیان فرمائی تھی کہ ایک شخص امیر کی اہانت کے جملے استعمال کررہا تھا کہ ہمارے امیر کو دیکھو کتنا باریک کپڑا اور فساق کا لباس پہن کر خطبہ دے رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امیر متبع شریعت نہیں تھا اور یہ بنوامیہ کے دور کا واقعہ ہے اور اسی موقع پر حضرت ابوبکرہؓ نے یہ حدیث شریف سنائی تھی؛ لہٰذا بطور نصیحت کے خطبہ میں یہ الفاظ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں؛ چنانچہ پہلے فتویٰ سے ہم رجوع کرتے ہیں اور دوسرا فتویٰ زیادہ صحیح ہے۔

اس سلسلے میں مزید چند روایات ملاحظہ فرمائیے:

عن زياد بن كسيب العدوي، قال: كنت مع أبي بكرة تحت منبر ابن عامر وهو يخطب وعليه ثياب رقاق، فقال أبو بلال: أنظروا إلى أميرنا يلبس ثياب الفساق، فقال أبو بكرة: أسكت، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم

یقول: من أهان سلطان الله في الأرض أهانه الله. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ٢/٤٦، دارالسلام رقم: ٢٢٢٤، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ٩/١٢١، رقم: ٣٦٧٠)

عن أبي بكرة، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من أكرم سلطان الله في الدنيا، أكرمه الله يوم القيامة، ومن أهان سلطان الله في الدنيا، أهانه الله يوم القيامة. (مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢، رقم: ٢٠٧٠٥، ٥/٤٩، رقم: ٢٠٧٦٩)

عن أبي بكرة قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: السلطان ظل الله في الأرض، فمن أكرمه أكرمه الله، ومن أهانه أهانه الله. (شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٦/١٧، رقم: ٧٣٧٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۰۱/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۱۳ھ

محراب کے اندر منبر پر خطبہ دینا

سوال [۳۶۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر منبر بالکل محراب کے اندر رہے اور منبر کی آخری سیڑھی دیوار کی برابر میں ہے، دیوار سے باہر نکلی ہوئی نہیں ہے، تو اس پر خطبہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عباس بردوانی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسی جگہ منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ دینا مسنون ہے، جہاں سے سب لوگ امام کو اچھی طرح دیکھ سکیں؛ لہٰذا جب محراب کے اندر ہونے کی وجہ سے امام

سب لوگوں کو نظر نہ آئے اور دائیں اور بائیں طرف کے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو تو مکروہ ہے۔

عن الطفيل بن أبي بن كعب، عن أبيه، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: يصلي إلى جذع ويخطب إليه فقال له رجل من اصحابه: ألا نجعل لک عريشا تقوم عليه يراک الناس يوم الجمعة وتسمع من خطبتک؟ قال: نعم. الحديث (مسند الدارمي، دارالمغني ١/ ١٨٠، رقم: ٣٦)

منها أن يستقبل القوم بوجهه ويستدبر القبلة؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم، هكذا كان يخطب، وكذا السنة في حق القوم أن يستقبلوه بوجوههم؛ لأن الإسماع والاستماع واجب للخطبة وذا لايتكامل إلا بالمقابلة الخ (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في سنن الخطبة، قديم ١/ ٥٩٢، زكريا ١/ ٢٦٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۲۴ھ

خطبہ ہاتھ باندھ کر دے یا کھول کر؟

سوال [۳۶۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبہ زبانی پڑھنے کی صورت میں ہاتھ باندھ کر پڑھنا چاہئے یا ہاتھ کھول کر؟ اگر ہاتھ کھول کر پڑھنا چاہئے تو ہاتھ باندھ کر پڑھنے میں کوئی کراہت تو نہیں؟ اور اگر دونوں شقیں صحیح ہیں تو اصح کیا ہے؟ بینوا توجروا.

المستفتی: محمد حنیف، رام نگری، مینگا والا، بادلی ٹانڈہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر کو اس سلسلے میں کتب حدیث وفقہ میں کوئی صراحت

نہیں ملی۔

بعثت أنا والساعة كهاتين. الحديث (مسلم شريف، كتاب الجمعة ٢٨٤/١، بيت الأفكار رقم:٨٦٧)

وأشار بيده. الحديث (بخاري شريف، باب الجمعة ١٢٨/١، مؤطا إمام مالك ٣٨/١)

فقام متوكئًا على عصا أو قوس فحمد الله. الحديث (ابوداؤد شريف، كتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، النسخة الهندية ١٥٦/١، دارالسلام رقم:١٠٩٦)

وغیرہ کے الفاظ سے اشارۃً ودلالۃً بغیر ہاتھ باندھے مسنون معلوم ہوتا ہے اور ہاتھ باندھ کر خلاف سنت معلوم ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۹۶۹)

خطبۂ اولیٰ میں سامعین کا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا

سوال [۳۶۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سامعین جمعہ کے خطبہ کے دوران خطبۂ اول میں تشہد والی بیٹھک بیٹھتے ہیں اور دونوں ہاتھ ناف کے نیچے اس طرح باندھتے ہیں، جس طرح قیام میں ہاتھ باندھے جاتے ہیں اور خطبۂ ثانیہ میں بالکل تشہد والی بیٹھک بیٹھتے ہیں، زانو پر ہاتھ دراز کردیتے ہیں، کیا مذکورہ بیٹھک شریعت سے ثابت ہے؟ نیز یہ بھی بتلائیں کہ دوران خطبہ کس طرح بیٹھنا چاہئے؟

المستفتی: مولانا عبدالناصر، مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے خطبہ کے دوران خطبۂ اولی میں ناف کے نیچے

ہاتھ باندھنا اور خطبۂ ثانی میں تشہد والی بیٹھک بیٹھ کر زانوں پر ہاتھ رکھنا کتاب وسنت وفقہ سے ثابت نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۱/ ۱۴۲۰ھ

خطبۂ جمعہ میں لقمہ دینا

سوال [۳۶۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر خطیب جمعہ کے خطبہ میں قرآن یا حدیث غلط پڑھ دے، تو غلطی بتائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد راشد، قاضی پورہ، ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بوقت خطبہ اگر آیت قرآنی یا حدیث شریف غلط پڑھی جارہی ہے یا خطیب پڑھتا پڑھتا اٹک کر رک گیا ہے، تو نماز میں لقمہ دینے کی طرح تجربہ کار عالم یا حافظ کے لئے خطیب کو لقمہ دینے کی گنجائش ہے، ہر شخص کو نہیں۔

بخلاف فتحه علی إمامه، فإنه لا يفسد مطلقاً. (در مختار علی الشامي، كتاب الصلاة، باب ما يفيد الصلاة و ما يكره فيها، كراچي ۱/ ۶۲۲، زكريا ۲/ ۳۸۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۱۳۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۴/ ۱۴۲۲ھ

خطبہ دینے میں موروثی دعوی کی شرعی حیثیت

سوال[۳۶۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صوبۂ آندھرا پردیش کے ضلع پرکاشم کے ''یدلی'' منڈل میں عیدگاہ میں رمضان، بقر عید کے موقع پر خطبہ دینے کا مسئلہ ہے، بستی کی نوعیت یہ ہے کہ یہاں پر ایک خاندان جو ملا خاندان سے مشہور ہے، برسوں سے اسی خاندان کے عام فرد کے (غیر حافظ، غیر عالم) خطبہ دینے کا سلسلہ چلا آرہا ہے، آخر میں چھ سات سال سے (کم وبیش) اسی خاندان کے ایک فرد جو صرف ناظرہ خواں ہے (نہ حافظ ہیں، نہ عالم ہیں) خطبہ دے رہے ہیں اور خطبہ کے دوران کچھ خرافات ہوتی ہیں، جیسے خطبہ کے دوران مصلیوں میں سے کوئی خطیب صاحب پر تولیہ یا کپڑے وغیرہ اڑھاتے ہیں اور خطیب صاحب خطبہ کے ختم پر منبر پر ہی بیٹھے رہتے ہیں اور امام صاحب دعا کرتے ہیں۔

نیز خطبے کے بعد غلط مسائل بتاتے ہیں، نیز ان کے پڑھنے میں لحن جلی بھی پیش آتی ہے، جس سے آیات قرآنیہ احادیث شریفہ کے معانی بدل جاتے ہیں، شہر کے علماء نے انہیں سمجھایا کہ آپ اپنا خطبہ صحیح کرلو، تو انہوں نے الٹا جواب دیا کہ آپ ہی لوگ مجھ سے صحیح کرالو اور شہر کے اکثر لوگ ان کے خطبے سے مطمئن نہیں ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ اتنے برسوں سے شہر میں حفاظ علماء بھی موجود نہیں تھے۔ اب الحمدللہ تقریباً آٹھ حفاظ علماء، مفتیان موجود ہیں اور لوگوں میں آواز اٹھ رہی ہے کہ اہل علم سے خطبہ دلوایا جائے، تو اسی صورت میں شہر کے ایک طبقہ نے ان ناظرہ خواں خطیب سے کہا کہ آپ کے خطبے میں غلطیاں ہیں، آپ ہٹ جائیں اور اہل علم کو آگے بڑھائیں تو انہوں نے انکار کرکے کہا کہ خطبہ دینا صرف ہمارے خاندان کا حق ہے، ہم ہی خطبہ دیں گے۔

سوال: یہ ہے کہ ناظرہ خواں کی یہ ضد صحیح ہے؟ کیا خطبہ دینا کسی خاندان کا حق ہے؟ یا یہ کہ شریعت میں امامت اور خطبہ دینے کے لئے کوئی ترتیب یا ترجیح ثابت ہے؟ اگر ہے براہ کرام اس کی وضاحت فرمائیں۔ نیز یہ کہ ان ناظرہ خواں کو ہم کس طرح سمجھا سکتے ہیں؟ اگر

مان جائے تو الحمدللہ ورنہ شریعت کے مطابق ترتیب قائم کرنے کے لئے ہم کہاں تک جاسکتے ہیں؟ ہم پر کتنی ذمہ داری ہے؟ اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے مشورہ کیا تو رائے یہ آئی کہ ضلع پرکاشم کے صف اول کے علماء کرام (جو ناظرہ خواں کے استاذ بھی ہیں) سے رابطہ کر کے اس فکر کی تصدیق کرائیں اوران کے خاندان والوں کو سمجھائیں کیا یہ اقدام صحیح ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ فرد بعض مرتبہ حکومت کا سہارا لیتے ہیں اور شریعت کے خلاف ان سے تعاون لیتے ہیں، اس سلسلہ میں مکمل رہبری فرمائیں۔

المستفتی: محمد رفیع قاسمی، ید لی، ضلع: پرکاشم (آندھرا پردیش)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ نماز پڑھانے والا امام الگ سے مستقل ہے اور خطبہ دینے والا امام سے ہٹ کر کوئی دوسرا شخص ہے، جو اپنے خاندان اور موروثی حق کا دعویٰ کرتا ہے، شریعت میں خطبہ دینے کا حق اسی کو ہے جو لائق امامت ہو اور صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور ضروری مسائل سے واقف ہو، صرف ناظرہ خواں کا عید و بقرعید کا خطبہ پڑھنا جو صحیح طور پر خطبہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں ہے، ایسے شخص کو خطبہ دینے کا حق نہیں ہے، جو امام نماز پڑھاتا ہے، اسی کو خطبہ دینے کا حق ہے اور مسائل شرعیہ میں موروثی حق نہیں چلتا۔ (مستفاد: کتاب النوازل ۲۵۲/۴)

عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ، قال: قال لنا علیه السلام: یؤم القوم أقرأهم لکتاب اللّٰہ وأقدمهم قراءةً. (مسلم، کتاب المساجد، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندیة ۱/۲۳۶، بیت الأفکار الدولیة رقم:۶۷۳، ترمذي شریف، کتاب الصلاة، باب ما أحق بالإمامة، النسخة الهندیة، ۱/۵۵، دار السلام رقم: ۲۳۵)

الأحق بالإمامة الأعلم بأحکام الصلاة، ثم الأحسن تجویداً وتلاوةً للقرآن، ثم الأورع، ثم الأسن، ثم الأحسن خلقًا، ثم الأحسن وجهًا، ثم الأشرف نسبًا. (شامي، باب الإمامة، مطلب في تکرار الجماعة في المسجد، زکریا

۲/ ۲۹۴-۲۹۵، کراچي ۱/ ۵۷۷، المحیط البرهاني، المجلس العلمي ۲/ ۱۷۷)

ولو أم قومًا وهم له كارهون، إن الكراهة لفساد فيه أولأنهم أحق بالإمامة منه كره له ذلك تحريماً لحديث أبي داؤد "لايقبل الله صلاة من تقدم قومًا وهم له كارهون" وإن هو أحق لا والكراهة عليهم. (شامي، زکریا ۲/ ۲۹۷، کراچي ۱/ ۵۵۹،أبو داؤد شريف، کتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، النسخة الهندية ۱/ ۸۸، دارالسلام رقم:۵۹۳)

لاينبغي أن يصلي غير الخطيب؛ لأن الجمعة مع الخطبة كشئ واحدٍ، فلاينبغي أن يقيمها اثنان وإن فعل جاز وهذا يكون باستخلاف الخطيب. (شامي، کراچي ۲/ ۱۶۲، زکریا ۳/ ۱۱، فتاوی محمودیه ڈابھیل ۸/ ۲۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۳۰/ جمادی الثانیہ ۱۴ھ
۱۴۳۶/۶/۳۰ھ	(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۰۲۳/۴۱)

خطبۂ جمعہ اور نماز الگ الگ شخصوں کا پڑھانا

سوال [۳۶۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض جگہوں پر خطبہ جمعہ کوئی اور پڑھاتے ہیں اور نماز جمعہ کوئی اور پڑھاتے ہیں، کیا اس طرح تقسیم درست ہے؟

المستفتی: محمد عبد السبحان، کیلفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کا خطبہ کوئی اور پڑھے اور نماز جمعہ کوئی اور پڑھائے تو بھی نماز جمعہ بلا شبہ درست ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/ ۴۶۶)

وقد علم من تفاريعهم، أنه لا يشترط في الإمام أن يكون هو

الخطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٤٧، زكريا ٣/١٩، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٢/٥٠٨، كوئٹه ٢/١٤٧)

وفي القنية: واتحاد الخطيب والإمام ليس بشرط على المختار، وفي الذخيرة: لو خطب صبي عاقل وصلى بالغ جاز. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند ٥٠٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۲۸۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۷ھ

ایک شخص نماز جمعہ پڑھائے اور دوسرا خطبہ دے

سوال [۳۶۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امام صاحب نے جمعہ کا خطبہ پڑھا اور دوسرے آدمی نے نماز جمعہ پڑھائی، تو جمعہ کی نماز ہوگی یا نہیں؟ اس میں خطبہ اور نماز کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں خطبہ اور نماز الگ الگ لوگوں کا پڑھانا کیسا ہے؟

المستفتی: جمیل احمد، باغ بہادر گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کی نماز اور خطبہ میں افضل اور بہتر صورت یہ ہے کہ جس نے خطبہ پڑھا ہو وہی نماز پڑھائے؛ لیکن اگر ایسا نہیں کیا گیا؛ بلکہ ایک نے خطبہ دیا اور دوسرے نے نماز پڑھائی، تو ایسی صورت میں بلا تردد نماز صحیح ہوگئی ہے، بس صرف افضلیت کے خلاف عمل ہوا ہے اور نماز وخطبہ بلا کراہت درست ہے۔

لاينبغي أن يصلي غير الخطيب؛ لأنهما كشيءٍ واحد، فإن فعل بأن

خطب صبي بإذن السلطان، وصلى بالغ جاز هو المختار. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ٢/١٦٢، زكريا ٣/٣٩)

وفي القنية: واتحاد الخطيب والإمام ليس بشرط على المختار نهر. وفي الذخيرة: لو خطب صبي عاقل وصلى بالغ جاز؛ لكن الأولى الاتحاد كما في شرح الآثار. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، دارالكتاب ديوبند جديد ٥٠٨)

ولاينبغي أن يصلي غير الخطيب؛ لأن الجمعة مع الخطبة كشئ واحد، فإن فعل بأن خطب صبي بإذن السلطان، وصلى بالغ جاز. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، قبيل باب صلاة العيدين قديم مصري ١/١٧٢، دارالكتب العلميه بيروت جديد ١/٢٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۳۰ھ

خطبۂ جمعہ زبانی دینا بہتر ہے یا کتاب کو دیکھ کر؟

سوال [۳۶۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبۂ جمعہ جو کتابوں میں شائع ہوچکے ہیں، ان کو دیکھ کر پڑھنے یا ان خطبوں کو زبانی یاد کرکے یا اپنی طرف سے بنا کر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان خطبوں کو دیکھ کر دینا زیادہ بہتر ہے، جو شائع ہوچکے ہیں بالمقابل ان خطبوں کو زبانی یاد کرکے یا اپنی طرف سے بنا کر دینے کے شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد الطاف، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خطبۂ جمعہ زبانی اور دیکھ کر پڑھنا دونوں طرح جائز ہے؛ لیکن زبانی یاد کرکے یا اپنی طرف سے بنا کر کے زبانی یاد کرکے دینا زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ خطبہ جمعہ وعظ ہے؛ اس لئے زبانی یاد کرکے ہی خطبہ دینا زیادہ بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/۹، ڈابھیل ۲۱۲/۸، ۲۱۳)

والخطبة في الاصطلاح هي الكلام المؤلف، الذي يتضمن وعظاً وابلاغاً على صفة مخصوصة. (المؤسوعة الفقهية ١٧٦/١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۱۴۱/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۷/۱۷ھ

دوران خطبہ متولی کا امام صاحب کو پگڑی باندھنا

سوال [۳۶۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں جب امام صاحب نماز سے فارغ ہوتے تھے اور خطبہ کے لئے ممبر پر جاتے تھے، تو خطبہ کے درمیان متولی جامع مسجد اپنی طرف سے ان کے سر پر پگڑی باندھتے تھے، یہ تقریباً پچاس سال سے سلسلہ پگڑی جاری تھا، کسی نے گذشتہ سال منع کر دیا، تو اب کی مرتبہ ایسا کیا کہ جب امام صاحب خطبہ کے لئے ممبر پر بیٹھے تو خطبہ پڑھنے سے پہلے متولی جامع مسجد نے پگڑی باندھی، ایک صاحب نے پھر ٹوک دیا کہ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس میں ریاکاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان متولی صاحب کی شہرت ہو اور لوگ جانیں کہ جامع مسجد کے متولی ہیں، تو کیا پگڑی باندھنا ممبر پر امام صاحب کے صحیح ہے؟ ان حضرات نے کہا امام صاحب سے ہمیں محبت ہے؛ اس لئے پگڑی باندھتے ہیں، تو جواب دیا گیا کہ اگر محبت ہے تو گھر ہی سے امام صاحب کے پگڑی باندھ کر کیوں نہیں لاتے، تو کیا متولی مسجد کا یہ فعل درست ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد تسلیم راعینی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دوران خطبہ یا خطبہ کے وقت امام صاحب کے سر پر دستار باندھنا سلف وخلف سے ثابت نہیں؛ اس لئے اس کا ترک لازم ہے، متولی سے معلوم کیا جائے کہ یہ دستار فضیلت ہے یا دستار خلافت؟ کہ متولی صاحب سے حدیث پڑھ کر امام دستار فضیلت حاصل کر رہا ہے یا متولی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو کر دستار خلافت حاصل کر رہا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍شوال المکرم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۵۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹؍۱۰؍۱۴۱۷ھ

ناپاک پانی سے غسل کرکے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھادی

سوال [۳۶۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک امام نے ناپاک پانی سے غسل کرکے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ پانی ناپاک تھا، تو کیا نماز اور خطبہ دونوں ہی چیزیں دوبارہ ادا کی جائیں گی یا صرف نماز؟

نیز اگر خطبہ ناپاک پانی سے غسل کرکے پڑھ دیا، اس کے بعد معلوم ہوا کہ پانی ناپاک تھا، تو پھر غسل کرکے نماز ادا کی تو کیا خطبہ پھر سے پڑھنا پڑے گا؟

المستفتی: محمد شعیب فتح پوری، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: طہارت شروط صلاۃ میں سے ہے اور ماء نجس سے غسل عدم غسل کے حکم میں ہے؛ اس لئے نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔ اور طہارت شرط خطبہ میں سے

نہیں ہے؛ اس لئے خطبہ کا اعادہ واجب نہیں ہوگا، ہاں اس کا اعادہ مستحب ہوگا۔

ولو خطب محدثاً أو جنباً، ثم توضأ أو اغتسل وصلى جاز الخ

(البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ٢/٢٥٨، كراچي ٢/١٤٧)

خطبہ لوٹانا واجب و لازم نہیں؛ البتہ مستحب ضرور ہوگا۔

لو خطب محدثا أو جنباً، جاز و يأثم ثم إقامة الخطيب في المسجد، وبه ظهر معنى السنية مقابل الشرط من حيث صحة الخطبة. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ٣/٣٤، كراچي ٢/١٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۹۰/۲۵)

مقامی زبان میں منظوم خطبہ دینا

سوال [۳۶۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبۂ جمعہ کے وقت ہندوستان میں عموماً سامعین؛ چونکہ عربی زبان نہیں سمجھتے، اس لئے کیا خطبہ مقامی زبان میں پڑھا جاسکتا ہے؟ اور نثر کی بہ نسبت نظم زیادہ مؤثر ہوتی ہے، تو کیا خطبۂ جمعہ اردو منظوم پڑھا جاسکتا ہے؟

(۲) زاہد خطبۂ جمعہ اول عربی میں پڑھتا ہے اور پھر فوراً نماز سے قبل ہی اس کا اردو منظوم ترجمہ پڑھتا ہے، کیا یہ عمل درست ہے؟ اگر نہیں تو کیا ترک سنت لازم آتا ہے؟

المستفتی: تسلیم احمد، تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) خطبہ کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے، اگر غیر عربی میں جائز ہوتا تو بہت سے صحابہ کرامؓ جو دور دور بلاد عجمیہ میں گئے، وہ بھی غیر عربی میں

خطبہ دے سکتے تھے؛ لیکن عربی کو چھوڑ کر کسی دوسری زبان میں خطبہ نہ دیا؛ کیونکہ آپ ﷺ کا طریقہ اور سنت متوارثہ یہی ہے کہ خطبہ عربی زبان میں ہو، اس کے برخلاف عربی زبان کو چھوڑ کر اردو میں خطبہ پڑھنا یا عربی کے ساتھ اردو کو ملانا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے، اسی طرح خطبۂ جمعہ میں اردو منظوم پڑھنا بدعت اور ناجائز ہے؛ کیونکہ قرون مشہود لہا بالخیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ (مستفاد: امداد المفتیین ص:۳۸۵)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية على خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم والصحابة، فيكون مكروهًا تحريماً، وكذا قراءة الأشعار الفارسية، والهندية فيها. (عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية، باب احكام صلاة الجمعة، اشرفی دیوبند ۱/ ۲۰۰)

(۲) زید کا یہ طریقہ بالکل خلاف سنت ہے، حضور ﷺ کا طریقہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ خطبہ ختم فرماتے، تو فوراً اقامت کہی جاتی۔ اور نماز اور خطبہ کے درمیان فصل نہیں کرتے؛ اس لئے خطبہ اور اقامت کے درمیان فصل کرنا مکروہ ہوگا اور اس کا اردو منظوم پڑھنا بھی مکروہ ہوگا۔

قوله: فإذا أتم أي الإمام الخطبة أقيمت بحيث يتصل أول الإقامة بآخر الخطبة. (شامي كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۶۱، زكريا ۳/ ۳۹)

وفي الدر: ويكره الفصل بأمر الدنيا، ذكره العيني. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/ ۱۶۱، زكريا ۳/ ۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

خطبہ کے درمیان اردو تقریر کرنا

سوال [۳۶۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ امام صاحب نے جمعہ کی نماز کے لئے خطبہ شروع فرمایا اور خطبۂ اول ختم ہونے سے پہلے اردو میں یہاں کی وہاں کی نہ جانے کون کون سے موضوع کی تقریر کرتے ہیں پھر پڑھتے ہیں ''**بارک اللہ لنا ولکم في القرآن العظیم**'' یہاں پر پہلا خطبہ ختم کرتے ہیں، پھر خطبہ ثانیہ ٹھیک پڑھتے ہیں، کیا امام صاحب کا یہ عمل از روئے شرع کسی کے نزدیک درست ہے یا نہیں؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد رئیس، محلّہ ڈیریہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تمام خطبہ کا خالص عربی زبان میں ہونا لازم اور ضروری ہے، اردو میں خطبہ دینا یا اردو، عربی دونوں کو ملا کر خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت سیئہ ہے؛ لہٰذا امام صاجب کو چاہئے کہ اردو میں جو بھی بیان کرنا ہو، وہ اذان خطبہ سے پہلے یا نماز کے سلام کے بعد کرے، دوران خطبہ اردو میں وعظ کرنے سے احتراز کرے۔

(مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/۲۷۶)

وکل ماحرم في الصلاۃ حرم فیہا، أي في الخطبۃ. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، کراچي ۲/ ۵۹، زکریا ۳/ ۳۵)

الخطبۃ یوم الجمعۃ، وفي العید بغیر اللسان العربي، أو ترجمتہا بالعجمي أحد ثوا ذلک بعد قرون الخیر بلا إثارۃ من علم. (مجموعۃ الفتاوی ۲/ ۲۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۷۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۳ھ

دوران خطبہ آیات واحادیث کا ترجمہ کرنا

سوال [۳۶۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبۂ جمعہ میں خطیب کبھی کبھار تہدید والی آیت یا حدیث کا ترجمہ اردو میں اپنی واقفیت کی بناء پر کر دیتا ہے، صرف لوگوں میں خوف خدا پیدا کرنے کے لئے، تو کیا یہ امر بنظر شرع خطیب کا صحیح ہے؟

المستفتی: محمد احمد مدرسہ اسلامیہ بشیریہ سکر ہٹہ کلاں، بھوج پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ کے درمیان آیات یا احادیث کا ترجمہ اردو وغیرہ میں کرنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ یہ عمل صحابہ اور ائمہ مجتہدین، سلف صالحین کے توارث کے خلاف ہے۔ (مستفاد: فتاوی نظامیہ ۱/ ۵۶، امداد الاحکام ۲/ ۳۳۸)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلی اللّٰه علیه وسلم والصحابة، فیکون مکروهًا تحریماً. (عمدة الرعایه علی هامش شرح الوقایه، باب أحکام صلاة الجمعة، اشرفی ۱/ ۲۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۲۳ھ

اردو زبان میں جمعہ کا خطبہ

سوال [۳۶۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ناظرہ خواں ہیں اور اردو کی چند کتابیں پڑھے ہوئے ہیں، محلّہ میں مولوی صاحب کے نام سے پکارے جاتے ہیں، نیز یہ صاحب مسجد کے امام بھی ہیں، ان کا معمول یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ ہمیشہ اردو زبان میں دیتے ہیں، اشعار پڑھتے ہیں اور ان کی توضیح کرتے ہیں، کبھی کبھی درمیان خطبہ عربی عبارت بھی پڑھتے ہیں۔

جب ان سے اردو زبان میں خطبہ کے جواز کے بارے میں دلیل مانگی گئی، تو انہوں نے مولانا حمیداللہ صاحب میرٹھی کی کتاب توحید استشہاد میں پیش کی، جس میں جمعہ کے خطبہ کے اردو زبان میں ہونے کے جواز پر مسلم شریف، ترمذی شریف اور بخاری شریف وغیرہ کا حوالہ تھا۔ نیز اس میں اس کے جواز پر بطور استدلال کے قرآن کی آیت بھی پیش کی تھی جو مرقوم ہے۔

وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه الخ [سوره ابراهيم، پاره:۱۳]

میں نے ان سے اس آیت کا ترجمہ معلوم کیا، تو انہوں نے کہا کہ مجھکو ترجمہ نہیں آتا اور جب میں نے ترجمہ کرنا چاہا، تو فرمایا کہ میں یہ قرآن نہیں مانتا اور نہ تمہارا ترجمہ؛ بلکہ مترجم قرآن پاک لاؤ، ہم اس کو مانیں گےاور یا ان اردو کتابوں کو مانیں گے۔

نیز وہ جمعہ کے خطبہ کے اردو زبان میں جائز ہونے پر اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ ہم لوگ عربی زبان سمجھ نہیں پاتے؛ اس لئے اردو ہی میں پڑھتے ہیں۔ اور مزید انہوں نے فرمایا کہ دیکھئے ہم ان ہی اردو کتابوں کو مانیں گے، آپ جو کہیں گے اس کو نہیں مانیں گے، اگر آپ کہیں گے کہ میت کو اگر مرد ہے تو تین کپڑے میں دفن کرنا چاہئے، تو ہم نہیں مانیں گے؛ بلکہ اس کو پانچ کپڑے میں دفن کریں گے چاہے ہو چاہے نہ ہو۔

اب سوال طلب امر یہ ہے کہ آیا اردو زبان میں خطبہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز توحید نامی کتاب جو حمیداللہ میرٹھی کی ہے معتبر ہے یا نہیں؟ جو امام اس کو استشہاد میں پیش کر کے اردو زبان میں خطبہ دیتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالقیوم، گرام و پوسٹ: امان اللہ پٹی، جانب ٹولہ، وایا: میری گنج ضلع پورنیہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اردو زبان میں خطبہ دینا نہ بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف وغیرہ اور نہ مذکورہ آیت کریمہ میں اس کا ثبوت ہے؛ بلکہ آیت کریمہ کے اندر تبلیغ وتذکیر کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ اور خطبہ تبلیغ وتذکیر نہیں ہے؛ بلکہ ذکر ہے اگرچہ لغت میں خطبہ بمعنی وعظ وتذکیر کے آیا ہے؛ لیکن حدیث وفقہ میں واضح طور پر خطبہ بمعنی ذکر کے آیا ہے

اور ذکرعبادت ہوتا ہے، اس میں زبان فہمی مقصود نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ نماز میں قراءت قرآن عربی زبان میں ہوتی ہے، اس میں فہم مقصود نہیں ہوتا، ایسے ہی خطبہ بھی عبادت وذکر اللہ ہے، اس میں فہم مقصود نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ آیت کریمہ کے ذریعہ استدلال کرکے اردو زبان میں خطبہ کو ثابت کرنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔

ولنا أن الخطبة ذکر الخ. (مبسوط سرخسي، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، دارالکتب العلمیة بیروت ۲/۲۶)

ولاینبغي للإمام أن یتکلم في خطبته بشيء من حدیث الناس؛ لأنه ذکر منظوم. (مبسوط سرخسي، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، دار الکتب العلمیة ۲/۲۷)

عن أبي هریرة رضي الله عنه،قال: قال النبي صلی الله علیه وسلم: إذا کان یوم الجمعة وقفت الملائکة علی باب المسجد......فإذا خرج الإمام طووا صحفهم ویستمعون الذکر. (صحیح البخاري، باب الإستماع إلی الخطبة، النسخة الهندیة ۱/۱۲۷، رقم: ۹۱۹، ف:۹۲۹)

نیز شریعت اسلامی میں سامعین کا وہی حکم ہے، جو نماز میں مقتدیوں کا ہے، مثلاً نماز میں جب امام قراءت شروع کرتا ہے، تو مقتدیوں پر خاموشی کا حکم ہے، ایسا ہی جب امام خطبہ دینا شروع کرے تو سامعین پر خاموش رہنے کا حکم ہے اور جیسا کہ نماز میں قراءت تذکیر وتبلیغ نہیں ہے؛ بلکہ ذکر اللہ ہے ایسا ہی خطبہ بھی ذکر ہی ہے، اس میں زبان فہمی مقصود نہیں ہے۔

لایجب الإنصات للقرآن إلا في موضعین في الصلاۃ، والخطبة، ثم نقل عن أکثر العلماء أن الإنصات واجب علی من سمعها، ومن لم یسمعها. (عمدۃ القاري شرح بخاری، باب الاستماع إلی الخطبة، تحت رقم الحدیث: ۹۲۹، زکریا قدیم ۶/۲۲۹-۲۳۰، جدید زکریا ۵/۹۸، احسن الفتاوی ۴/۱۵۰)

نیز حمید اللہ میرٹھی کی کتاب بنام توحید کا مذکورہ مضمون قابل اعتبار نہیں، اس میں کتاب وسنت اور اجماع امت کو چھوڑ کر عقلی گھوڑے دوڑانے کی کوشش کی گئی ہے اور حدیث کی کتابوں

کا منگھڑت حوالہ پیش کر دیا گیا ہے اور اردو زبان میں خطبہ دینا مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۲۳۹/۸)

لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوراثة من النبي الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله عنهم، فيكون مكروهاً تحريماً الخ

(عمدة الرعاية حاشية شرح وقايه ۱/ ۲۰۰)

البتہ اس امام کے پیچھے نماز درست ہے؛ اس لئے کہ مسئلہ اختلافی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۵۶۷/۲۵)

اردو میں خطبہ دینا یا اردو میں ترجمہ کرنا

سوال [۳۶۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کا خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرنا یا خطبہ کے دوران اردو میں تقریر کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد کامل، اوجھاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کا خطبہ عربی میں دینا مسنون ہے اور یہی خلفاء راشدین اور دور صحابہؓ، تابعین، سلف وخلف سے تواتر اور توارث سے ثابت ہے، خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد اس کا اردو میں ترجمہ کرنا، اسی طرح خطبہ کے درمیان اردو میں تقریر کرنا، سنن متوارثہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۲۵۹/۸، میرٹھ ۳۶۰/۱۲، جواہر الفقہ زکریا ۵۰۶/۲)

لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوراثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله عنهم، فيكون مكروهاً تحريماً الخ

(عمدة الرعاية على هامش شرح الوقايه، باب احكام صلاة الجمعة، رقم الحاشية ۲، مكتبه بلال ۱/ ۲۰۰)

الكراهة إنما هي لمخالفة السنة؛ لأن النبي ﷺ، وأصحابه قد خطبوا دائماً بالعربية. (مجموعة رسائل اللكنوى، رسالة أكام النفائس ٤/ ٤٤، بحواله محموديه ڈابهيل ٨/ ٢٦٢)

الخطبة الفارسية التي أحدثوها واعتقدوا أحسنها ليس الباعث إليها إلا عدم فهم العجم اللغة العربية، وهذا الباعث قد كان موجوداً في عصر خير البرية مع ذلك لم يخطب أحد منهم بغير العربية، ولما ثبت وجود الباعث في تلك الأزمنة، وفقدان المانع والتكاسل و نحوه معلوم بالقواعد المبرهنة لم يبق إلا الكراهة التي هي أدنىٰ درجات الضلالة.

(رسالة أكام النفائس ٤/ ٤٧، بحواله محموديه ڈابهيل ٨/ ٢٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۳۱/۴۰)

اردو زبان میں جمعہ کا خطبہ

سوال [۳۶۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اردو میں خطبہ دینا کیسا ہے، ہم جاہل لوگ عربی میں خطبہ نہیں سمجھ پاتے ہیں اور امام صاحب کے دوران خطبہ اشعار پڑھنے سے ساری باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں؛ لہٰذا ہمیں شریعت کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالستار، پورنیہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اردو زبان میں خطبہ دینا خلاف سنت اور مکروہ ہے اور خطبۂ جمعہ نماز کی قرأت کے مشابہ ہے؛ اس لئے قراءت کی طرح خطبہ کے مفہوم کو سمجھنا لازم نہیں؛ بلکہ صرف توجہ اور دھیان دینا لازم ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۷۴۳، فتاوی دار العلوم ۵/۵۲، فتاوی عبدالحی ۲/۲۶۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۲۹۲، جدید ڈابھیل ۸/۲۹۵، کفایت المفتی قدیم ۳/۲۱۴، جدید زکریا ۳/۲۶۰، جدید زکریا مطول ۵/۲۰۲)

اور اردو اشعار بھی مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: فتاوی عبدالحی ۲/۲۶۲)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله عنهم، فيكون مكروهاً تحريماً.

(عمدة الرعاية على هامش شرح الوقايه، باب احكام صلاة الجمعة، اشرفی دیو بند ۱/ ۲۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۱۹۳۹)

مخلوط خطبہ دینا

سوال [۳۶۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ میں ممبر پر مخلوط خطبہ دینا کیسا ہے؟

المستفتی: خالد احمد، وانمباڑی (تمل ناڈو)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے دن منبر پر مخلوط خطبہ دینا مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے کہ نبی کریم اور دور صحابہؓ سے ضرورت ہونے کے باوجود عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ دینا ثابت نہیں ہے۔

لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله عنهم، فيكون مكروهاً تحريماً.

(عمدة الرعاية علی هامش شرح الوقایه، باب احکام صلاة الجمعة، اشرفی دیو بند ۱/ ۲۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳ر ۲۸۳)

جمعہ وعیدین کے دونوں خطبوں کے درمیان اردو میں تقریر کرنا

سوال [۳۶۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے گاؤں میں کتب فقہیہ کی روشنی میں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں ہے؛ لیکن عرصۂ دراز سے جمعہ وعیدین کی نماز ہر سال پابندی کے ساتھ ادا کی جاتی ہے؛ بلکہ عیدین میں تقریباً ساڑھے چار سو افراد سے زائد جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ جو امام صاحب عیدین کی نماز پڑھاتے ہیں، ان کا ہمیشہ کا معمول ہے کہ وہ ہر سال مداومت کے ساتھ عیدین کے خطبۂ اولیٰ کے پڑھنے کے بعد متصلاً اسی قیام میں تقریباً آدھ پون گھنٹہ اردو زبان میں تقریر کرتے ہیں، جس میں پڑھے گئے عربی خطبہ کے ترجمہ ومفہوم کے علاوہ بھی دنیا بھر کی باتیں بیان کرتے ہیں، اس کے بعد پھر تین تسبیح پڑھنے کے بقدر بیٹھتے ہیں اور پھر کھڑے ہوکر کے خطبۂ ثانیہ عربی زبان میں پڑھتے ہیں؛ لہٰذا ان مذکورہ صورتوں میں امام صاحب کا اس قدر اردو زبان میں تقریر کرنا شرعاً کیسا ہے، ایسے امام کی اقتداء کسی بھی نماز میں درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: تلمیذ حسن ارریاوی، دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین اور جمعہ کا خطبہ عربی زبان میں ہونا ضروری اور

لازم ہے، غیر عربی زبان میں خطبہ کو حضرات فقہاء نے مکروہ لکھا ہے؛ اس لئے کہ دور صحابہؓ سے لے کر آج تک ائمۂ مجتہدین اور سلف وخلف صالحین سے توارث اور تواتر کے ساتھ عربی زبان ہی میں خطبہ دینے کا حکم ثابت ہے اور غیر عربی میں خطبہ کا جواز کسی بھی فقیہ اور امام سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا خطبہ کے دوران یا دونوں خطبوں کے درمیان اردو میں تقریر کرنا مکروہ تحریمی اور ممنوع ہوگا، جس کا ترک کرنا لازم ہے، ورنہ تارک سنت ہوگا اور اگر اردو میں تقریر کرنی ہے تو خطبہ کی اذان سے قبل یا نماز کے بعد ہی کیا کریں۔

عن أبي الزاهرية قال: كنت جالساً مع عبد الله بن بسر يوم الجمعة، فما زال يحدثنا حتى خرج الإمام. الحديث (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٨٧٦/٢، رقم: ١٨١١، المستدرك للحاكم، كتاب الجمعة قديم ٢٨٨/١، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ٤١٦/١، رقم: ١٠٦١)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم والصحابة، فيكون مكروهًا تحريماً. (عمدة الرعايه على هامش شرح الوقايه، باب أحكام صلاة الجمعة، اشرفى ٢٠٠/١)

اردو میں خطبہ دینے کی وجہ سے اس کی امامت میں کوئی فرق نہیں آئے گا؛ البتہ امام کو یہ عمل ترک کر دینا چاہئے۔ نیز مذکورہ گاؤں میں جمعہ وعیدین کی نماز صحیح نہ ہوگی، بجائے جمعہ کے ظہر کی نماز پڑھنا واجب ہوگا۔

لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض (إلى قوله) لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، زكريا ٧/٣، كراچي ١٣٨/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۴۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۵۱۱)

جمعہ کے دن مسجد میں مائک کے ذریعہ سے تقریر کرنا

سوال [۳۶۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد اتنی بڑی ہے کہ اس میں نماز جمعہ میں اتنے نمازی ہوتے ہیں کہ اگر بغیر مائک کے وعظ وتقریر کی جائے تو خطیب کی آواز تمام مصلیان کو پہونچ سکتی ہے؛ لیکن اس مسجد میں مائک کے ذریعے تقریر اس غرض سے کی جاتی ہے تاکہ بستی کے بقیہ مصلیان بھی مسجد میں حاضر ہوکر نماز جمعہ ادا کرلیں۔

حضرت مفتی صاحب سے ہمارا سوال صرف اتنا ہے کہ سوال میں مذکورہ مسجد میں مائک کے ذریعہ سے وعظ وتقریر کرنا یہ عمل جائز ہے یا بدعت؟ تسلی بخش جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد توحید مدناپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوال نامہ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مذکورہ مسجد میں مائک کے ذریعہ وعظ وتقریر کرنا یہ عمل جائز ہے یا بدعت؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جائز اور درست ہے۔ اور وعظ وتقریر کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دینی اور اصلاحی فائدہ پہنچے؛ لہٰذا اس مسجد میں مائک کے ذریعہ تقریر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عن عاصم بن محمدؓ، عن أبيه قال: رأيت أبا هريرة رضي الله عنه، يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.

(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۳/ ۵۱۲، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۶/ ۲۲۲۲، رقم: ۶۱۷۳)

ویجوز الدرس بسراج المسجد، وإن كان موضوعاً فيه للصلاة إلى ثلث الليل. (البحر الرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، كوئٹه ۲/ ۲۵۰، زكريا۵/ ۴۲۰، خلاصة الفتاوى، كتاب الوقف، الفصل الرابع في المسجد وأوقافه، المكتبة الأشرفية ۴/ ۴۲۲)

لو وقف على دهن السراج للمسجد لايجوز وضعه جميع الليل؛ بل بقدر حاجة المصلين، ويجوز إلى ثلث الليل، أو نصفه إن احتيج إليه للصلاة فيه. (هندية، كتاب الوقف، مطلب فيما إذا أراد أن يقرأ الكتاب بسراج المسجد، زكريا قديم ۲/ ۴۵۹، جديد ۲/ ۴۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۸۷۱)	۱۴۳۶/۲/۶ھ

جمعہ کی دونوں اذانوں کے درمیان وعظ ونصیحت

سوال [۳۶۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اذان اول کے بعد اذان ثانی سے قبل کچھ لمحہ ضروری مسائل اور دینی باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن ایک شخص کا اعتراض ہوتا ہے کہ اس وقت بیان کرنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ذکر وتلاوت کرنے کا وقت ہے؛ لہٰذا مدلل اور مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عتیق احمد مدراسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اذان اول کے بعد اذان ثانی سے قبل جمعہ میں دینی مسائل اور وعظ ونصیحت کرنا جائز اور درست ہے؛ لیکن اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ لوگوں میں اعلان ہوجائے کہ خطبہ سے قبل ۵ر منٹ سنتوں کے لئے وقت دیا جائے گا؛ لہٰذا جو آتا جائے دینی گفتگو میں شریک ہوتا جائے اور ذکر وتلاوت کے مقابلہ میں شریعت میں دینی مسائل زیادہ اہم اور افضل ہیں۔

عن أبي ذر رضي الله عنه، قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا أبا ذر! لأن تغدو فتعلم آية من كتاب الله، خير لك من أن تصلي مائة ركعة؛ ولأن تغدو فتعلم باباً من العلم، عمل به أو لم يعمل، خير من أن تصلي ألف ركعة. (ابن ماجه شريف، كتاب العلم، باب فضل من تعلم القرآن و علمه، النسخة الهندية ص: ۲۰، دارالسلام رقم: ۲۱۹)

هذا الحديث يدل على أن تعلم العلم خير من كثرة الأعمال.

(حاشية ابن ماجه ۲۰)

عن أبي الزاهرية قال: كنت جالساً مع عبد الله بن بسر يوم الجمعة، فما زال يحدثنا حتى خرج الإمام. الحديث (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۸۷٦/۲، رقم: ۱۸۱۱، المستدرك للحاكم، كتاب الجمعة قديم ۲۸۸/۱، مكتبه نزار مصطفیٰ الباز جديد ۴۱٦/۱، رقم: ۱۰٦۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۵۹۹/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱/۱۴۱۹ھ

خطبۂ جمعہ سے قبل یا نماز جمعہ کے بعد وعظ ونصیحت کرنا

سوال [۳٦٦۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اکثر مساجد میں نماز جمعہ سے پہلے مسنون خطبہ کے علاوہ کوئی خطاب حالت حاضرہ پرلوگوں کی زبان میں نہیں ہوتا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز تو ہو جاتی ہے، مگر مقصد جمعہ ادا نہیں ہوتا، جمعہ ہفتہ بھر کے احتساب کا دن ہے، جس میں خطیب جمعہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں ملت کی کوتاہیوں گمراہیوں کی نشاندہی کر کے قرآن وسنت کی روشنی میں ہدایات دے۔

المستفتی: ماسٹر عبدالحق، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جمعہ سے قبل وعظ وتقریر کرنا مقصد جمعہ میں داخل نہیں ہے اور بیان نہ ہونے سے ادائیگی جمعہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے؛ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ خطبہ کے اندر دینی مسائل، امر بالمعروف نہی عن المنکر سے متعلق دینی مضامین کا ہونا مسنون ہے اور غیر عربی لوگ عربی خطبہ سمجھنے پر قادر نہیں ہوتے؛ اس لئے خطبہ سے پہلے یا نماز کے بعد مادری زبان میں دینی مسائل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق کچھ دینی اصلاحی بیان کرتے رہنا مسلمانوں کی افادیت کے لئے بہتر اور مناسب ہے، اور حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، مگر یہ خطبہ اور نماز کا جز نہیں ہوگا۔

عاصم بن محمد، عن أبيه، قال: رأيت أبا هريرة –رضي الله عنه– يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.

(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۳/۵۱۲، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۶/۲۲۲۲، رقم: ۶۱۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ
۱۴۳۰/۱۲/۲۸ھ	(فتویٰ نمبر: الف ر)

جمعہ سے قبل منبر پر بیٹھ کر تقریر کرنا

سوال [۳۶۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دہلی کی اکثر مساجد میں ائمہ حضرات جمعہ سے پہلے ممبر پر بیٹھ کر تقریر کرتے ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ ممبر پر بیٹھ کر تقریر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ضیاء الرحمٰن، کیروف مطلوب احمد، چوہان بانگر، نیوسیلم پور (دہلی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جمعہ سے پہلے لوگوں کی تذکیر کے لئے احکامات اسلامیہ اور ضروری مسائل کا بیان کرنا نہ صرف درست ہے بلکہ مستحب ہے، حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں جمعہ کے روز احادیث شریفہ بیان فرماتے، اس کے بعد سیدنا حضرت عمرؓ خطبۂ جمعہ دیتے۔

عن عاصم بن محمدؓ، عن أبيه قال: رأيت أبا هريرة رضي الله عنه، يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.

(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۳/۵۱۲، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۶/۲۲۲۲، رقم: ۶۱۷۳)

اس کے علاوہ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اس طرح کا عمل ثابت ہے، جیسے حضرت تمیم داریؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں خطبہ سے پہلے بیان فرماتے تھے۔

عن السائب بن يزيد، أنه لم يكن يقص على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا أبي بكر، وكان أول من قص تميم الداريؓ، استأذن عمر بن الخطاب أن يقص على الناس قائماً، فأذن له عمر. (مسند أحمد بن حنبل ۳/۴۴۹، رقم: ۱۵۸۰۶، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۷/۱۴۹، رقم: ۶۶۵۶، مصنف عبد الرزاق، باب ذكر القصاص، المجلس العلمي ۳/۲۱۹، رقم: ۵۴۰۰)

لیکن اس میں یہ احتیاط رہے کہ اذان خطبہ سے تقریباً ۵/۱۰ منٹ پہلے بیان کو ختم کردیا جائے، تاکہ تمام لوگ بآسانی سنت ادا کرسکیں۔ (مستفاد: فتاوی محمود یہ ڈابھیل ۴/۳۲۰)

اور منبر پر بیٹھ کر تقریر وعظ کرنا حضور ﷺ سے ثابت ہے؛ لہٰذا منبر پر بیٹھ کر تقریر وعظ کرنے میں

کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ یہ عمل بلا کراہت درست ہے۔

عن عطاء بن يسار أنه سمع أبا سعيد الخدريؓ، أن النبي صلى الله ليه وسلم جلس ذات يوم على المنبر و جلسنا حوله. (بخاري شريف ۱/۱۲۵، حديث:۹۱۱، ۱/۱۹۷، حديث: ۱۴۴۴)

حميد بن هلال قال: قال أبورفاعة: إنتهيت إلى النبيﷺ، وهو يخطب قال: فقلت يا رسول الله! رجل غريب جاء يسأل عن دينه، لايدري ما دينه قال: فأقبل على رسول الله صلى الله عليه وسلم وترك خطبتة حتى انتهى إلى يسأل، فأتى بكرسى حسبت قوائمه حديداً، قال: فصعد عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم: وجعل يعلمني مما علمه الله، ثم أتى فأتم آخرها .

(صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب من دخل المسجد والإمام يخطب، النسخة الهندية ۱/۲۸۷، بيت الأفكار رقم:۸۷۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۹ ۶۵)	۱۴۲۱/۴/۶ھ

خطبۂ جمعہ سے قبل وعظ کرنا

سوال [۳۶۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا جمعہ کی نماز سے قبل جبکہ لوگ سنن میں مشغول ہوں مسجد میں تقریر کرنا درست ہے؟ نیز پہلے خطبہ کے بعد اس کا مفہوم اردو میں بتلا کر وقفہ کرلیں اور پھر دوسرا خطبہ دیدیں یہ شکل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: فخر الاسلام، امام موتی مسجد سرائے ترین، سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خطبۂ جمعہ سے قبل وعظ کہنا فی نفسہ ممنوع نہیں ہے، اگر کوئی

مانع خارجی پیش آئے تو شرعی طریقہ پر اس کا انسداد کیا جائے؛ لہٰذا خطبۂ جمعہ کے مقرر وقت کے شروع ہونے سے قبل وعظ ختم کر دیا جائے، عام نمازیوں سے کسی جمعہ میں وعظ کہنے کی اجازت لی جائے، اگر سب یا اکثر راضی ہوں، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۱/۶۴۹، احسن الفتاوی زکریا ۴/۱۲۸)

نیز دو خطبوں کے درمیان پہلے خطبہ کا مفہوم اردو میں بتانا درست نہیں۔ (مستفاد: علم الفقہ ۲/۱۴۸)

عاصم بن محمد بن زيد، عن أبيه، قال: كان أبوهريرة رضؓ يقوم يوم الجمعة إلى جانب المنبر، فيطرح أعقاب نعليه في ذراعيه، ثم يقبض على رمانة المنبر، يقول: قال أبو القاسم صلى الله عليه سلم: قال محمد صلى الله عليه وسلم، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، ثم يقول في بعض ذلک: ويل للعرب من شر قد اقترب، فإذا سمع حركة باب المقصورة بخروج الإمام جلس. (المستدرك للحاكم، كتاب العلم، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ١٥٨/٦، قديم ١٠٨/١، رقم: ٣٦٧)

عن السائب بن يزيد قال: لم يقص على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا أبي بكر، وعمر، وكان أول من قص تميم الداري رضؓ واستأذن عمر رضي الله عنه،، فأذن له فقص قائماً. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٤٩/٧، رقم: ٦٦٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۹۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۳/۱۴۱۹ھ

خطبۂ جمعہ سے قبل اردو زبان میں منبر پر وعظ کہنا

سوال[۳۶۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن جمعہ کا عربی خطبہ منبر پر پڑھنا سنت ہے؟ اگر کوئی شخص اردو زبان میں وعظ وتقریر عربی خطبہ سے پہلے منبر پر ہی کرنا چاہے، تو کیا اس طرح اردو زبان میں عربی خطبہ سے پہلے منبر پر اردو میں تقریر کرنا سنت کے خلاف ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: شمیم اختر بنوروئل کرنا ٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمعہ کے دن اذان اول کے بعد اذان ثانی سے پہلے اردو میں وعظ ونصیحت کرنا شرعاً جائز ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ وعظ ونصیحت منبر پر بیٹھنے کے بجائے الگ کرسی وغیرہ پر ہو، تاکہ خطبہ کی مشابہت لازم نہ آئے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۴۹)

عن عاصم بن محمدؓ، عن أبيه قال: رأيت أبا هريرة رضي الله عنه، يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبوالقاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.

(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۳/۵۱۲، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۶/۲۲۲۲، رقم: ۶۱۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۰۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۲۴ھ

جمعہ کی اذان اول وثانی کے درمیان وعظ کا شرعی حکم

سوال[۳۶۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے دیار صوبہ کرناٹک میں نماز جمعہ کا طریقہ یہ ہے کہ ساڑھے بارہ بجے اذان

ہوتی ہے اور ایک بجے خطیب صاحب منبر پر آتے ہیں اور اس کے بعد اذان ثانی ہوتی ہے، اذان ثانی کے فوراً بعد خطیب صاحب ایک رکن کے بقدر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کھڑے ہوکر خطبہ ثانی عربی میں دیتے ہیں اور پھر نماز کھڑی ہوجاتی ہے۔ اب ہم ذمہ داران حضرات یہ چاہتے ہیں کہ اذان اول ہو اور اس کے بعد خطیب صاحب منبر سے علیحدہ ہوکر ایک بجے اردو میں بیان کریں اور اس کے بعد پانچ منٹ سنتیں پڑھنے کے لئے دیں اور اس کے بعد امام صاحب منبر پر آئیں اور اذان ثانی دی جائے اور پھر عربی میں دو خطبے ہوں، آیا ہم کمیٹی والوں کا دوسرا طریقہ سنت کے موافق ہوگا یا طریقہ اول سنت کے موافق ہے؟ مندرجہ بالا مسئلہ کا جواب دیں۔

المستفتی: کمیٹی مسجد اعظم کرنا ٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات علماء وفقہاء نے خطبۂ جمعہ اردو میں دینے کو مکروہ لکھا ہے؛ اس لئے ذمہ داران مسجد کی جو رائے ہے، وہ زیادہ مناسب ہے کہ اذان اول اور اذان ثانی کے درمیان اردو میں بیان کیا جائے، پھر اذان ثانی کے بعد دونوں خطبے عربی میں دئے جائیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۶۴۲/۱، فتاوی دار العلوم ۶۶/۵، امداد الاحکام ۷۷/۲، امداد الفتاوی ۶۴۲/۱، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۲۳۹/۸)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية على خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم والصحابة، فيكون مكروهًا تحريمًا.

(عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية، باب احكام صلاة الجمعة، اشرفی دیوبند ۲۰۰/۱)

عن معمر، عن الزهري، قال: أول من قص تميم الداري رضـ على عهد عمر، استأذنه في كل جمعة قائماً، فأذن له، فكان يقوم قال: ثم استزاده مقاماً آخر فزاده، فلما كان عثمان استزاده مقاماً آخر، فكان يقص في الجمعة ثلاث مرات. (مصنف عبد الرزاق، باب ذكر القصاص، المجلس العلمي

۲۱۹/۳، رقم: ۵٤۰۰)

عن عاصم بن محمدؓ، عن أبيه قال: رأيت أبا هريرة رضي الله عنه، يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبوالقاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.

(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۵۱۲/۳، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۲۲۲۲/٦، رقم: ٦١٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۸۳۶/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۱۹ھ

درمیان خطبہ مقتدیوں کو ضروری ہدایت کرنا

سوال [۳٦٦۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امام منبر پر کھڑے ہونے کے بعد کوئی ضروری ہدایات از قبل خطبہ یا درمیان خطبہ مقتدیوں کو کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کرے تو نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد ادریس جامعہ ملیہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ شروع کرنے سے پہلے اپنی مادری زبان میں ضروری ہدایات اور وعظ ونصیحت وغیرہ بلاکراہت جائز اور درست ہے؛ البتہ دوران خطبہ غیر عربی میں ممنوع اور مکروہ ہے؛ ہاں البتہ عربی زبان میں جائز ہے؛ اس لئے کہ عربی میں ہونے کی صورت میں یہ بھی خطبہ کا جز ہو جاتا ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱۲۸/۴، علم الفقہ ۱۴۹/۲)

عن السائب بن يزيد، أنه لم يكن يقص على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا أبي بكرؓ، وكان أول من قص تميم الداري، استأذن عمر بن

الخطاب أن يقص على الناس قائماً، فأذن له عمر. (مسند أحمد بن حنبل ۴۴۹/۳، رقم: ۱۵۸۰۷)

عن عاصم بن محمدؓ، عن أبيه قال: رأيت أبا هريرة رضي الله عنه، يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رمانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الإمام للصلاة جلس.
(المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۵۱۲/۳، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۲۲۲۲/۶، رقم: ۶۱۷۳)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية على خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم والصحابة، فيكون مكروها تحريماً، وكذا قراء ة الأشعار الفارسية، والهندية فيها. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية، باب احكام صلاة الجمعة، اشرفی دیوبند ۲۰۰/۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/ ۱۴۲۳ھ

خطبہ کی اذان کے بعد خطبہ کے مسائل وآداب بتانا

سوال [۳۶۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جمعہ کے دن خطیب کا خطبہ کی اذان کے بعد اور عربی خطبہ سے پہلے اردو اور مقامی زبان میں خطبہ کے آداب ومسائل بتانا اور یہ کہنا کہ اگر کوئی تکلیف نہ ہو، تو دوزانو قعدہ کی حالت میں بیٹھ جائیں، کیا یہ طریقہ درست ہے؟ اس طرح سے مسائل وآداب بتاسکتے ہیں؟

المستفتی: محمد ضیاء الرحمٰن، میسور، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ میں خطبہ کی اذان سے پہلے مسائل وغیرہ اردو زبان میں بتا سکتے ہیں اور اذان کے بعد صرف عربی زبان میں خطبہ دینا ضروری ہے اور اردو زبان میں مسئلہ بتانا مشروع نہیں ہے؛ البتہ اگر مسئلہ بتانا ہے، تو نماز کے بعد ایک منٹ، دو منٹ میں مسئلہ بتا کر دعا کرلے۔

الشامن: يكره الكلام مطلقاً دينيًا كان أو دنيويًا من حين شروع الإمام في الخطبه اتفاقاً. (حاشية هداية، باب صلاة الجمعة، اشرفی ديوبند، ۱/۱۷۱)

عن السائب بن يزيد، أنه لم يكن يقص على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا أبي بكر، وكان أول من قص تميم الداري رضـ، استأذن عمر بن الخطاب أن يقص على الناس قائماً، فأذن له عمر. (مسند أحمد بن حنبل ٤٤٩/٣، رقم: ١٥٨٠٧)

فإنه لاشک في أن الخطبة بغير العربية على خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم والصحابة، فيكون مكروها تحريماً، وكذا قراء ة الأشعار الفارسية، والهندية فيها. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية، باب أحكام صلاة الجمعة، اشرفی ديوبند ۱/ ۲۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۳۵/۳۷)

تقریر اور خطبہ کے دوران سنت پڑھنے کا متعین شدہ وقت نہ دینے کا حکم

سوال [۳۶۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مسجد کا امام ہے، وہ ہر جمعہ کو خطبہ سے پہلے آدھا گھنٹے تقریر کرتے ہیں، تقریر

کے ختم ہونے کے بعد نمازی حضرات سنت پڑھتے ہیں، مگر ابھی نمازی حضرات دو رکعت یا تین رکعتیں ہی پڑھ پاتے ہیں کہ مؤذن صاحب اذان دے دیتے ہیں، اس پر امام صاحب بھی کچھ نہیں کہتے ہیں، تو ایسی صورت میں جو نمازی حضرات دو رکعت یا ایک رکعت اذان کے دوران پڑھتے ہیں، تو ان نمازیوں کا اذان کے دوران نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ نیز امام صاحب کے لئے اس وقت خاموش رہنا درست ہے یا نہیں؟ یا امام کو کم از کم اتنا وقت دینا چاہئے جتنے وقت میں نمازی حضرات چار رکعات سنتیں سنت کے مطابق پڑھ سکیں جو بھی حکم شرعی ہو دلائل سے واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبدالغفور، جلپائی گوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پہلے سے یہ طے شدہ نظام ہے کہ امام کی تقریر کے بعد اذان ثانی اور خطبہ سے پہلے لوگ سنتیں پڑھا کریں گے اور اس کے لئے مثلاً پانچ منٹ کا وقفہ دینے کی بات طے ہوئی ہے اور اس طے شدہ نظام کے باوجود چار رکعت پڑھنے کے بقدر وقت نہیں دیا جاتا ہے، تو یہ غیر مناسب بات ہے، امام و مؤذن کو خود اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ نظام کے مطابق چار رکعت سنت پڑھنے کے بقدر جو وقت متعین ہوا ہے، وہ لوگوں کو دے تا کہ لوگ اس وقت میں اپنی سنتیں پوری کرلیں؛ لیکن پھر بھی اگر مؤذن نے اذان شروع کردی اور اذان کے بعد امام نے خطبہ شروع کر دیا ہے اور سنت پڑھنے والوں کی نماز ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے، ان کے لئے چار رکعت سنت اسی وقت پوری کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، یہی قول زیادہ راجح اور مفتی بہ ہے: اس لئے کہ جمعہ کی چار سنن قبلیہ کو صلاۃ واحدہ قرار دیا گیا ہے، جو ایک ہی سلام کے ساتھ پوری کی جاتی ہیں، اس کو بیچ میں انقطاع کئے بغیر خطبہ کے دوران پوری کرنے کی اجازت ہے۔

وإذا خرج الإمام فلا صلاة ولا كلام، وأفاد أنه لا يكره الشروع قبل الخروج فيتم ما شرع فيه- إلى قوله- واختلف في سنة الجمعة، فقيل:

يقطع على رأس الركعتين كالنفل المطلق، والصحيح أنه يتمها؛ لأنه كصلاة واحدة واجبة؛ ولكن يخفف القراءة بقدر الواجب بإدراك الواجب.

(حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، دار الكتاب ديوبند ۵۱۸)

إذا شرع في الأربع قبل الجمعة، ثم افتتح الخطبة والأربع قبل الظهر، ثم أقيمت هل يقطع على رأس الركعتين؟ تكلموا فيه، والصحيح أنه يتم، ولا يقطع لأنها بمنزلة صلاة واحدة واجبة. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، کوئٹہ ۲/ ۱۵۵، زکریا ۲/ ۲۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۴۵/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۳/۵ھ

نماز جمعہ کے بعد دعا سے قبل چندہ کی گولک پھرانا

سوال [۳۶۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں جامع مسجد میں نماز کا سلام پھیر کر جمعہ کی نماز کے بعد جلدی سے چندہ کرلیتے ہے، جمعہ کی نماز سے پہلے اگر چندہ کرتے ہیں، تو لوگ سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، چندہ بھی نہیں ہو پاتا اور سنتوں میں بھی خلل ہوتا ہے، زید کفایت المفتی کے حوالہ سے جائز کہتا ہے، ہماری بستی والے تسلی کے طور پر آپ سے رجوع کر رہے ہیں، اگر یہ طریقہ صحیح ہوں تو جاری رکھیں؟ مسجد کی اچھی خاصی ضرورت اس چندہ سے پوری ہوجاتی ہے۔ کیا اس طرح کی ضرورت کے پیش نظر فرض اور سنتوں کے درمیان اتنے فصل کی شرعاً اجازت ہے؟

المستفتی: باشندگان سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا سلام پھیرنے کے بعد دعا

سے پہلے ایک دو آدمی خاموشی کے ساتھ مسجد کے فراہمی چندہ کے لئے گولک گھمادیں یارومال وغیرہ کپڑا لے کر صفوں میں خاموشی سے گھوم لیں، جس سے مسجد کے اخراجات و ضروریات پوری کرنے میں مدد ملے، ایسا کرنا بلا شبہ جائز اور درست ہے اور اتنی دیر کے لئے سنتوں کو موقوف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، پانچ سات منٹ میں یہ کام پورا ہوجاتا ہے اور پانچ، سات منٹ سنتوں کو فرضوں سے مؤخر کرنے میں کوئی قباحت نہیں؛ اس لئے اس طریقہ سے مسجد کی فراہمی چندہ کر لینے کی گنجائش ہے، حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ مسجد میں فرضوں سے فراغت کے بعد چل کر اپنے گھروں اور رہائش گاہوں میں جا کر سنتیں پڑھا کرتے تھے، کسی کا گھر قریب ہوتا تھا اور کسی کا گھر دور ہوتا تھا۔ نیز فرض کے سلام پھیرنے کے بعد سنتوں سے پہلے بسا اوقات ذکر و وظائف میں مشغول ہوجاتے تھے، اس کے بعد سنتیں پڑھ لیا کرتے تھے؛ لہٰذا سنتوں کا فرضوں سے اس قدر فاصلہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ اس لئے زید کا کفایت المفتی کے حوالہ سے جائز کہنا صحیح اور درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، جدید زکریا مطول ۱۷۲)

عن الأزرق بن قيسؓ، قال: صلى بنا إمام لنا يكنى أبا رمثه، فقال: صليت هذه الصلاة، أو مثل هذه الصلاة مع النبي صلى الله عليه وسلم، وكان أبو بكرؓ، وعمرؓ يقومان في الصف المقدم......فقام الرجل الذي أدرك معه التكبيرة الأولىٰ من الصلاة يشفع، فوثب إليه عمر، فأخذ بمنكبه فهزه، ثم قال: إجلس، فإنه لم يهلك أهل الكتاب إلا أنهم لم يكن بين صلوتهم فصل فرفع النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: أصاب الله بك يا ابن الخطاب. (ابوداؤد شريف، كتاب الصلاة، باب في الرجل يتطوع في مكانه الذي يصلي فيه المكتوبة، النسخة الهندية ١/ ١٤٤، دارالسلام رقم:١٠٠٧، المعجم الكبير للطبراني دار أحياء التراث العربي ٢٢/ ٢٨٤، رقم: ٧٢٨، المستدرك للحاكم، كتاب الصلاة قديم ١/ ٢٧٠، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ١/ ٣٩٥، رقم: ٩٩٦)

والأصل في الرواتب أن يأتي بها في بيته والسر في ذلک كله أن يقع الفصل بين الفرض والنوافل بما ليس من جنسها، و أن يكون فصلا معتداًبه يدرک به بادي الرأي، وهو قول عمر لمن أراد أن يشفع معه المكتوبة: إجلس، فإنه لم يهلک أهل الكتاب إلا أنه لم يكن بين صلاتهم فصل، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أصاب الله بک يا ابن الخطاب، وقوله صلى الله عليه وسلم اجعلوها في بيوتكم. (حجة الله البالغة ۲/ ۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر ربیع الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۱۷ھ

خطبہ سے قبل چندہ کرنا

سوال [۱۷۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری مسجدوں میں عموماً یہ رواج ہے کہ لوگ ڈبہ کے ذریعہ مسجد کے فنڈ کے لئے خطبہ سے پہلے، اسی طرح امام کے سلام پھیرنے کے بعد دعا سے پہلے چندہ کرتے ہیں، بسا اوقات سلام پھیرنے کے بعد ڈبہ کے بجائے کوئی شخص کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور رومال وغیرہ لے کر چندہ کے لئے تمام نمازیوں کے سامنے گھومتا ہے۔ اور بعض مساجد میں یہ بھی رواج ہے کہ اذان جمعہ کے بعد مسجد کے گیٹ کے سامنے اندرونی حصہ میں دو چار شخص کوئی کپڑا بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں، چندہ دینے والے لوگ وہیں جمع کردیتے ہیں۔ کیا یہ شکلیں چندہ کرنے کی جائز ہیں؟ اور اگر یہ شکلیں جائز نہیں، تو اس کی متبادل شکلیں پیش فرمائیں۔

المستفتی: محمد مسعود ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جمعہ کے بعد مسجد کی ضروریات یا کسی مذہبی کام کے

لئے دعا کو چند منٹ روک کر سوال میں مذکور دونوں طرح چندہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، اسی طرح اگر اذان جمعہ کے بعد چند لوگ رومال وغیرہ بچھا کر چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جائیں۔ اور جن لوگوں کو معلوم ہے وہ چندہ دیتے جائیں اور اس عمل سے کوئی شور وغل نہ ہو، جس سے کسی نمازی کی نماز میں خلل ہو، تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن خطبہ سے کچھ دیر قبل لوگوں کا گھوم کر چندہ کرنا، جس میں نمازیوں کی گردنوں کو پھلانگنا پڑے یا کسی نمازی کے سامنے گذرنے کی ضرورت پیش آئے، تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

المختار أن السائل إن كان لايمر بين يدى المصلي، ولا يتخطى الرقاب، ولايسأل الناس الحافاً؛ بل لأمر لا بد منه، فلابأس بالسؤال والإعطاء. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ١٦٤/٢، زكريا ٤٢/٣، هكذا في الهندية، كتاب الصلاة، الباب السادس في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١٤٨/١، جديد ٢٠٩/١، وهكذا في الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤١/٢٦، وهكذا في البناية، كتاب الصلاة، باب الجمعة اشرفية ٩٤/٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۱۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۱۹ھ

دوران خطبہ مسجد کا چندہ کرنا

سوال [۳۶۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خطبہ کے دوران مسجد کے چندہ کا بکسا صف کے درمیان سے آگے بڑھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اویس، جامعہ ملیہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ کے خطبہ کے درمیان چندہ کے ڈبہ سے چندہ کرنا

یاسنت پڑھنے والوں کے سامنے سے ڈبہ گھمانا سخت ممنوع اورنا جائز ہے؛ کیونکہ دوران خطبہ نماز اورذکر سے بھی شریعت نے منع کیا ہے، ہاں البتہ اس کے لئے متبادل شکل یہ ہوسکتی ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد دعاء سے پہلے جس وقت کوئی آدمی نماز کی حالت میں نہیں ہوتا ہے، اس وقت چند منٹ کے لئے ڈبہ گھما دیا جائے، اس سے مسجد کا کام بھی ہوجائے گا اور کسی نمازی کی نماز میں کسی قسم کا خلل بھی نہ ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۶۵، فتاوی دارالعلوم ۵/۱۲۱)

إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا كلام. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، قبل مطلب في حكم المرقي بين يدى المصلي، زكريا ۳/۳۴، كراچي ۲/۱۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/ ۱۴۲۳ھ

خطبہ کے دوران چندہ کرنا

سوال [۳۶۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جمعہ میں خطبہ کے درمیان مسجد کے لئے چندہ کرنا کیسا ہے؟ اسی طرح اگر کسی کے پاس کھلے ہوئے روپئے نہیں ہیں، تو وہ بڑا نوٹ دے کر حسب منشاء واپس لیتا ہے، مثلاً کسی کو پانچ روپیہ مسجد میں دینے ہیں اوراس کے پاس کھلے ہوئے پانچ روپیہ نہیں ہے، تو اس نے دس کا نوٹ دیا اور پانچ روپیہ واپس لیے ایسا کرنا کیسا ہے؟ مذکورہ بالا مسائل میں شریعت کی رہنمائی مطلوب ہے، ضرورت پڑنے پر ان کو طبع بھی کرایا جاسکتا ہے؛ اس لئے گذارش ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عقیل احمد، ٹانڈہ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ کے دوران مسجد کے لئے چندہ کرنا جائز نہیں ہے، نیز نماز یا ذکر بھی اس وقت جائز نہیں ہے؛ بلکہ سب لوگوں پر لازم ہے کہ سب خطبہ کی طرف متوجہ ہو جائیں؛ ہاں البتہ سلام پھیرنے کے بعد دعاء سے قبل جلدی سے یہ کام کرلیا جائے تو جائز ہے۔ نیز پانچ روپئے چندہ دینے میں دس کا نوٹ دے کر پانچ روپیہ واپس لینا جائز ہے، اسی طرح سو کا نوٹ دے کر اس کا ٹوٹا ہوا فٹکر لینے کی بھی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ یہ از قبیل دیون ہے اعیان نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱۲۶/۳، جدید زکریا ۱۶۹/۳، جدید زکریا مطول ۲۱۹/۵)

أن الدين هو ما يثبت في الذمة من غير أن يكون معيناً مشخصاً سواء كان نقدًا أم غيره، أما العين فهي الشيئ المعين المشخص كبيت.

والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي، ولا يتخطى الرقاب، ولايسأل الناس إلحافاً؛ بل لأمر لا بدمنه، فلابأس بالسؤال والإعطاء. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ٢/ ١٦٤، زكريا ٣/ ٤٢، هكذا في الهندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٨، جديد ١/ ٢٠٩، هكذا في الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٣٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۰۶۱/۳۲)

جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے یا سلام پھیرتے ہی چندہ کرنا

سوال [۳۶۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ مسجد میں نماز جمعہ سے قبل چندہ ہوتا ہے، اس وقت جو چند لوگ موجود ہوتے ہیں، وہ بھی نماز میں مشغول ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ چندہ خطبہ سے قبل ناجائز ہے؟

(۲) نماز جمعہ کا سلام پھیرتے ہی دعاء سے قبل چندہ کرنا کیسا ہے اور اگر دعاء کے بعد چندہ کرتے ہیں تو چندہ نہیں ہوتا؛ کیونکہ کچھ لوگ سنن ونوافل پڑھے بغیر ہی مسجد سے نکل جاتے ہیں اور بقیہ لوگ نماز میں مشغول ہوجاتے ہیں؛ اس لئے چندہ نہیں ہوتا، اس وجہ سے مسجد کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، تو کیا نماز جمعہ کا سلام پھیرتے ہی دعاء سے قبل مسجد کا چندہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: مسعود حسن، سہس پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مسجد کی ضروت کی خاطر جمعہ سے قبل چندہ کی گنجائش ہے، مگر شرط یہ ہے کہ سنت پڑھنے والوں کو خلل نہ ہو اور نمازی کے آگے سے نہ گذرے اور گردنوں کو نہ پھلانگے؛ لہٰذا اگر سنت پڑھنے والوں کو خلل ہوگا یا نمازی کے آگے سے گذرنا پڑتا ہو یا گردنیں پھلانگنا پڑتا ہو تو جائز نہ ہوگا۔

(۲) اگر سب لوگ دعاء سے قبل تھوڑی دیر کے لئے انتظار پر متفق ہیں تو دعاء سے قبل چندہ کرنے کی گنجائش ہے، مگر ہمیشہ کے لئے معمول نہ بنایا جائے۔

والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدى المصلي، ولا يتحظى الرقاب، ولايسأل الناس الحافاً؛ بل لأمر لا بدمنه، فلابأس بالسؤال والإعطاء.

(شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، كراچي ۲/۱۶۴، زكريا ۳/۴۲، وهكذا في الهندية، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ۱/۱۴۸، جديد ۱/۲۰۹، وهكذا في الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۶/۳۴۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۶۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۲/۱۴۱۷ھ

خطبۂ الوداع

سوال [۳۶۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ، جس کو عوام الناس ''الوداع'' کے نام سے جانتے ہیں، تو کیا اس جمعہ میں وہی خطبہ پڑھنا، جو اس دن کے لئے تیار کیا گیا ہے ضروری ہے یا نہیں؟ نیز شریعت کی رو سے کیا اس جمعہ کی کوئی خصوصیت ہے، جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں؟

المستفتی: محمد اطہر سیتاپوری، موضع: جیوتی شاہ عالم پور، پوسٹ: کملاپور، سیتاپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوداع کی شریعت میں کوئی اصل نہیں؛ بلکہ بدعت ہے؛ کیونکہ خطبۃ الوداع پڑھنا قرون مشہود لہا بالخیر سے ثابت نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۱۸۴، جدید ڈابھیل ۸/۲۹۶، احسن الفتاوی، زکریا ۱/۱۷/۳، فتاوی رشیدیہ قدیم ۱۴۹، جدید زکریا ۱۲۳)

ومن الأمور المحدثة ما ذاع في أكثر بلاد الهند، والدكن وغيرهما من تسمية خطبة الجمعة الأخيرة بخطبة الوداع. (مجموعة رسائل اللكنؤي ردع الإخوان عن محدثات آخر جمعة رمضان، كراچي ۲/۲۴، بحواله محموديه ڈابهيل ۸/۲۹۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۴۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ

خطبۃ الوداع کا ثبوت، اور نہ پڑھنے پر امام کو ذلیل کرنا

سوال [۳۶۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ ایک عالم صاحب ہیں جو کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہیں، انہوں نے ایک مسجد میں ماہ رمضان کے آخری جمعہ کی نماز جس کو لوگ الوداعی جمعہ کہتے ہیں پڑھائی اور نماز جمعہ سے پہلے جب خطبہ پڑھا تو اس کے اندر الوداع کے الفاظ نہیں کہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ رمضان کے آخری جمعہ کے نماز کے خطبہ میں الوداع کے الفاظ کہنا کیا ضروری ہے؟ اگر یہ لفظ خطبہ میں ادا نہ کرسکا تو کیا اس پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق ہے؟ محلّہ کے ایک آدمی ان مولانا صاحب کو اس بات پر ذلیل کررہے ہیں اور پورے محلّہ میں انتشار کررہے ہیں، ان کے لئے ہنگامہ کرنا اور مولانا کو ذلیل ورسوا کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد مقصود، مقبرہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبۃ الوداع قرون مشہود لہا بالخیر، نیز سلف وخلف وصلحاء سے ثابت نہیں، نیز قرآن وحدیث وکتب فقہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے؛ لہٰذا امام صاحب نے جمعۃ الوداع کو اگر خطبہ الوداع نہیں پڑھا، تو شرعاً امام صاحب پر کوئی الزام نہیں ہے، جو لوگ نہ پڑھنے پر امام صاحب کو ذلیل ورسوا اور ملامت کررہے ہیں اور بے دین بات پر انتشار کررہے ہیں وہ غلطی پر ہیں، ان کو اپنے اس عمل سے باز آکر امام صاحب سے اپنی غلطی کی معافی کی درخواست کرنی چاہئے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۸۵، فتاوی دارالعلوم ۵/۵۳، محمودیہ ۱۲/۱۸۴، ۱۴/۲۶۹، جدید ڈابھیل ۸/۲۹۵، ۲۹۶)

ومن الأمور المحدثة ما ذاع في أكثر بلاد الهند، والدكن وغيرهما من تسمية خطبة الجمعة الأخيرة، بخطبة الوداع و تضمينها جملا دالةً على التحسر بذهاب ذلک الشهر، فيدرجون فيها جملاً دالةً على فضائل ذلک الشهر، ويقولون بعد جملة أو جملتين، الوداع والوداع أوالفراق، والفراق، لشهر رمضان أو الوداع ياشهر رمضان، و نحو ذلک من الألفاظ الدالة على ذلک. (مجموعة رسائل اللكنوي، بحواله حاشية

فتاوی محمودیه ڈابھیل ۸/ ۲۹٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰٦۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۳۰ھ

جمعة الوداع اور اس کے مخصوص خطبہ کا حکم

سوال [۳٦۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ جو کہ الوداع کے نام سے مشہور ہے، ہر سال اس جمعہ کو الوداع والا خطبہ ضروری سمجھ کر پڑھا جاتا ہے، کیا ایسی صورت میں اس خطبہ کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرمائیں اور اگر اس خطبہ کو ہر سال، ہر رمضان کے آخری جمعہ میں غیر ضروری سمجھ کر پڑھا جاتا ہو، تو کیا ایسی صورت میں جبکہ اس خطبہ کو ضروری سمجھ کر تو نہ پڑھا جاتا ہو؛ لیکن ہر الوداع کو پڑھا جاتا ہو، اس کا پڑھنا صحیح ہوسکتا ہے؟ بہر دو صورت جو مسئلہ ہو اس کو وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد اقبال احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خطیب چاہے ضروری سمجھ کر پڑھتا ہو یا غیر ضروری سمجھ کر دونوں صورتوں میں مکروہ اور بدعت ہے؛ اس لئے کہ اکثر عوام اس میں امتیازی فضیلت سمجھ کر اہتمام سے ان مساجد میں خطبہ سننے کے لئے جاتے ہیں، جہاں خطبۃ الوداع ہوتا ہو، جس کی شریعت میں کوئی خاص فضیلت نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ٦۴۲، احسن الفتاوی، زکریا ۱/ ۳۷۱، فتاوی دار العلوم ۵/ ۵۳)

و من الأمور المحدثة، ماذاع في أكثر بلاد الهند، والدكن وغيرهما من تسمية خطبة الجمعة الأخيرة بخطبة الوداع. (مجموعه

رسائل اللكنؤي ردع الإخوان عن محدثات آخر جمعة رمضان، كراچي ٢/ ٢٤، بحواله محموديه ڈابھیل ٨/ ٢٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۱۹۸۲)

رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوداع پڑھنا

سوال [۳۶۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رمضان کے آخری جمعہ کو خطبہ الوداع الفراق، الوداع الفراق یا شہر رمضان وغیرہ کے الفاظ سے پڑھنا کسی حدیث سے ثابت ہو تو تحریر فرمادیں؟ بہت سے لوگ خطبۃ الوداع سننے کے لئے دور دراز سے آتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے، اگر یہ مستحب یا مسنون ہو تو روایات تحریر فرمادیجئے۔

المستفتی: عبید اللہ، بھاگل پوری، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو ”الوداع والفراق والسلام یا شہر رمضان“ وغیرہ کے الفاظ سے خطبۃ الوداع پڑھنا حضرت سید الکونین علیہ السلام، خلفاء راشدین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہیں ہے، اس کو اکابر اہل فتاوی نے مکروہ اور بدعت لکھا ہے، ابوالحسنات حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے مجموعۃ الفتاوی اور خلاصۃ الفتاوی ۴/ ۳۲۹ کے حاشیہ میں اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ ۱۲۳ میں، اور حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی ۱/ ۶۸۵ میں، اور حضرت مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے فتاوی دارالعلوم ۵/ ۹۶ میں اور فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے فتاوی محمودیہ مطبع ڈابھیل ۸/ ۲۹۶، مطبع میرٹھ ۱۲/ ۱۶۱ میں، اور مفتی شفیعؒ نے امداد المفتیین ۴۰۴ میں بدعت اور مکروہ لکھا ہے:

اس لئے رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو ''الوداع والفراق و السلام یاشہر رمضان'' وغیرہ کے الفاظ سے خطبہ پڑھنا ترک کردینا چاہئے۔اورمسنون خطبہ پڑھنا چاہئے،ہاں البتہ ماہ شعبان کے آخری جمعہ کے بیان میں رمضان المبارک کے مہینہ کی فضیلت سے متعلق بیان کرنا بہتر اور افضل ہے،جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے۔ شعب الایمان للبیہقی ۳۰۵/۳،رقم:۳۶۰۸ ملاحظہ فرمائیے:

عن سلمان الفارسي، قال: خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر يوم من شعبان فقال: أيها الناس! قد أظلكم شهر عظيم، شهر مبارك شهر فيه ليلة خير من ألف شهر، جعل الله صيامه فريضة، وقيام ليله تطوعاً، من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كمن أدى فريضة فيما سواه، و أدى فريضة فيه كان كمن أدى سبعين فريضة فيما سواه، وهو شهر الصبر، فالصبر ثوابه الجنة، وشهر المواساة، وشهر يزاد فيه رزق المؤمن، ومن فطر فيه صائماً، كان له مغفرة لذنوبه، و عتق رقبته من النار، وكان له مثل أجره من غير أن ينقص من أجره شئ، قلنا يا رسول الله! ليس كلنا يجد مايفطر الصائم؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يعطي الله هذا الثواب من فطر صائماً على مذقة لبن، أو تمرة، أو شربة من ماء، ومن أشبع صائماً سقاه الله من حوضي شربة لا يظمأ حتى يدخل الجنة، وهو شهر أوله رحمة، و أوسطه مغفرة، وآخره عتق من النار زاد همام في روايته فاستكثروا فيه من أربع خصال، خصلتان ترضون بها ربكم، وخصلتان لا غنى لكم عنهما، فأما الخصلتان اللتان ترضون بها ربكم، فشهادة أن لا إله إلا الله، و تستغفرونه، وأما اللتان لا غنى لكم عنهما، فتسألون الله الجنة، و تعوذون به من النار. لفظ حديث همام وهو أتم (شعب الإيمان للبيهقي، باب الصيام، فضائل شهر رمضان دارالكتب العلمية ٣٠٥/٣، رقم: ٣٦٠٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۹۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۲۱ھ

جمعۃ الوداع کو بطور عید منانے کی شرعی حیثیت

سوال [۳۶۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ (جمعۃ الوداع) کو مسلمان بطور تیوہار مناتے ہیں اور اس کے لئے باقاعدہ گھر کے سبھی افراد کے لئے نئے کپڑوں کا اور اچھے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، تو یہ کہاں تک جائز اور درست ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

المستفتی: محمد عمران جامعی، مسجد انصاران، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذہب اسلام میں عید اور بقرعید کے دن کو خصوصیت کے ساتھ منانا ثابت ہے، اور ان کے علاوہ ایام تشریق کے تین دن بھی زیادہ خوشی اور اہمیت کے ایام ہیں، یہ پانچ دن اسلام کے ایسے تیوہار اور ایسے خوشی کے ایام میں جن میں روزہ رکھنا بھی جائز نہیں، اس کے بعد ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ کا دن اہمیت کا حامل ہے، ہر جمعہ کو نیا کپڑا یا دھلا ہوا کپڑا پہننا، اسی طرح عطر لگانا اور غسل کرنا مستحب ومسنون ہے؛ لیکن رمضان کے آخری جمعہ جس کو عام لوگ جمعۃ الوداع کہتے ہیں، اس کو پورے سال کے دوسرے جمعات کے مقابلہ میں الگ سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں؛ اس لئے اس کو الگ سے اہمیت دینا شریعت اسلام کے اصول وقوانین اور شعائر سے ناواقفیت کی بات ہے۔

عن أبي هريرة رضـ، عن البني صلى الله عليه وسلم، قال: خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة فيه خلق آدم وفيه أدخل الجنة وفيه أخرج منها ولاتقوم الساعة إلا في يوم الجمعة. (ترمذي شريف، كتاب الجمعة، باب ماجاء في فضل يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۱۰۱، دار السلام رقم: ۴۸۸)

عن أوس ابن أوسؓ، قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: من اغتسل يوم الجمعة، وغسل وبكر وابتكر دودنا واستمع، وأنصت كان له بكل خطوة يخطوها أجر سنة صيامها وقيامها. (ترمذي شريف، كتاب الجمعة، باب في فضل الغسل يوم الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١١١، دار السلام رقم: ٤٩٦)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أربع من سنن المرسلين والحياء، والتعطر، والسواک، والنكاح. (ترمذي شريف، أبو اب النكاح، باب ماجاء في فضل التزويج، النسخة الهندية ١/ ٢٠٦، دار السلام رقم: ١٠٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۵۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۲۷ھ

(۲۹) باب العیدین

(۱) فصل في الإمامة والقضاء وغیرها

عیدین کی امامت کا مستحق کون ہے؟

سوال [۳۶۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بستی قصبہ باشٹہ کے شہر قاضی جناب مولانا حبیب اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، بستی میں علماء کرام اور طالب علم بھی موجود ہیں، عیدین کی امامت کے لئے افضل اور حقدار کون ہے؟

المستفتی: محمد عرفان انصاری، قصبہ باشٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر بستی میں متعدد علماء کرام موجود ہیں، تو ان میں تقوی و طہارت اور علم وفضل اور مسائل میں جو زیادہ فائق ہے، اسی کو شہر قاضی اور امام عیدگاہ بنانا چاہئے۔ اور ساری قوم کو ایسے عالم پر متفق ہوجانا چاہئے اور اگر سارے علماء تقوی وطہارت اور علم وفضل میں برابر درجہ کے ہیں، تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کرکے قرعہ میں جس کا نام نکلے اس پر سب کو متفق ہوجانا چاہئے۔ اور اس منصب کے لئے آپس میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔

فائدة: لا یقدم أحد في التزاحم إلا بمرجح..... فإن استووا یقرع بین المستویین، أو الخیار إلی القوم، فإن اختلفوا اعتبر أکثرهم. (شامي، کتاب الصلاة،

باب الإمامة، کراچي ۱/۵۵۸، ۵۵۹، زکریا ۲/۲۹۶، ۲۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۸۶۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۲۷ھ

کیا عید کے دن فجر نماز چھوڑنے والا عید کی امامت کرسکتا ہے؟

سوال [۳۶۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو امام عید کے دن فجر کی نماز نہیں پڑھتے، کیا ان کے پیچھے عید کی نماز اور خطبہ سننا جائز ہے؟ عوام ان کے پیچھے نماز پڑھنا نہیں چاہتی۔

المستفتی: محمد عرفان انصاری، قصبہ: باشٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا شخص فاسق ہے؛ جبکہ بغیر عذر ترک کرتا ہو۔

عن الحسن رضـ قال: سمعت أنس بن مالک قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ثلاثة رجل أم قوماً وهم له کارهون. (سنن الترمذي، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء من أم قوما و هم له کارهون، النسخة الهندیة ۱/۸۲، دارالسلام رقم: ۳۵۸)

وتارکها عمداً أي تکاسلاً فاسق. (شامي، کتاب الصلاۃ، کراچي ۱/۳۵۲، زکریا ۲/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۵۱)

عیدین میں دو شخصوں کا مل کر امامت کرنا

سوال [۳۶۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ عیدین میں خطبہ کوئی اور، امامت کوئی اور کرتے ہیں۔ نیز ایک خطیب متعدد جگہ خطبہ و نماز پڑھاتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

المستفتی: محمد عبدالسبحان، کیلی فورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کا خطبہ کوئی اور شخص اور نماز کوئی دوسرا پڑھادے، تو یہ بلاشبہ درست ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/۴۶۶)

وقد علم من تفاريعهم، أنه لا يشترط في الإمام أن يكون هو الخطيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچي ۲/۱۴۷، زكريا ۳/۱۹)

البتہ عید کی نماز واجب ہے، جب ایک خطیب نے عید کی نماز پڑھ لی ہے، تو اس کا دوسری جگہ جا کر دوبارہ عید کی نماز پڑھنا نفل ہے؛ لہٰذا اس کے پیچھے عید کی واجب نماز پڑھنے والوں میں سے کسی کی نماز درست نہیں ہے۔

وشروط صحة الاقتداء أربعة عشر شيئاً-إلى قوله-وأن لا يكون الإمام أدنى حالاً من المأموم كافتراضه، وتنفل الإمام. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، دارالكتاب ديوبند ص: ۲۹۰، ۲۹۱)

ومن شروط الإمام أن لا يكون الإمام أدنى حالاً من المأموم، فلا يصح اقتداء مفترض بمتنفل. (الفقه على المذاهب الأربعة، مباحث الإمام في الصلاة، اقتداء المتفرض بالمتنفل، دارالفكر ۱/۴۱۸، مكمل ۲۳۵)

ولامفترض بمتنفل و بمفترض فرضاً آخر؛ لأن اتحاد الصلاة شرط عندنا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ۲/۳۲۴، ۳۲۵، كراچي ۱/۵۷۹)

ولا (يصح) اقتداء المفترض بالمتنفل. (هندية، قديم الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماماً لغيره، زكريا ۱/۸۶، جديد ۱/۱۴۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۸۸)	۱۴۳۴/۱۱/۷ھ

حنفی امام کا بارہ تکبیریں کہنے اور عورتوں کی امامت کا حکم

سوال [۴۶۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ اگر کوئی شخص امام اعظمؒ کی اقتداء کرتا ہے اور وہ پھر ایسی جگہ پہونچ گیا، جہاں کے لوگ امام شافعیؒ کی اقتداء کرتے ہیں اور لوگوں نے اسے عید کی نماز پڑھانے کو کہا، تو امام اعظمؒ کی اقتداء کرنے والا شخص کیا ان لوگوں کو نماز عید پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک عیدین میں بارہ تکبیریں زائد کہنی پڑتی ہیں اور اپنے امام صاحب کے نزدیک چھ زائد تکبیریں ہیں، تو ان کو بارہ زائد تکبیروں کے ساتھ پڑھانا کیسا ہے؟

(۲) سوال یہ ہے کہ ان کے یہاں عورتیں بھی نماز پڑھنے جاتی ہیں؛ لیکن پردہ کا معقول انتظام رہتا ہے، وہ اس طرح کہ سب مرد عیدگاہ چلے جاتے ہیں اور عورتیں مسجد میں جاتی ہیں؛ جبکہ امام کے علاوہ کوئی بھی بستی میں نہیں رہتا ہے اور امام بھی باقاعدہ پردہ کے اندر ہو کر نماز پڑھاتا ہے، تو کیا امام اعظمؒ کی تقلید کرنے والا نماز عید عورتوں کو پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ پردہ کے نظم کے ساتھ بغیر خوف فتنہ کے، اس کا جواب بالتفصیل مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: نظر الدین، مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہاں پڑھا سکتا ہے، مگر وہ اپنے امام کے مذہب کے مطابق پڑھائے؛ لہٰذا وہ اس میں صرف چھ تکبیریں میں زائد کہے نہ کہ بارہ اور شافعیؒ لوگوں کی نماز اس کے پیچھے بلا کراہت جائز ہوگی۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳۵۹/۶، جدید زکریا ۸۸۰/۶، عزیز الفتاوی ۲۲۳/۱)

(۲) عورتوں پر نہ عید کی نماز فرض ہے، نہ واجب ہے اور نہ سنت ہے؛ لہٰذا یہ عورتوں کے حق میں ضرورت کی چیز نہیں ہے؛ اس لئے نہ عورتوں کا اس طریقہ سے الگ سے ایک جگہ عید کی نماز کے لئے جمع ہونا مشروع ہے نہ کسی مرد کے لئے ان کی امامت کرنا مشروع ہے؛ کیونکہ

مرد پر تو مجمع میں شریک ہوکر عید کی نماز ادا کرنا واجب ہے؛ لہٰذا کسی مرد کے لئے اس غیر ضروری امر کے لئے ترک واجب مشروع نہ ہوگا۔

وتجب صلاة العيد على من تجب عليه الجمعة. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، اشرفي ۱/ ۱۷۲)

عن طارق بن شهاب عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة إلا أربعة: عبد مملوك، أو امرأة (الحديث). (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الجمعة للمملوك، والمرأة، النسخة الهندية ۱/ ۱۵۳، دار السلام رقم: ۱۰۶۷، المستدرك للحاكم، كتاب الجمعة، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۱/ ۴۱۷، رقم: ۱۰۶۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

نمازِ عید میں مقتدی کے لقمہ دینے پر تکبیرات زوائد کہنے کا حکم

سوال [۳۶۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امامِ عیدگاہ نے نماز ادا کرنے کے لئے نیت کر کے ثناء پڑھی اور بغیر تکبیر کہے قرأت شروع کی، پیچھے سے کسی نے اللہ اکبر کہا تینوں زائد تکبیرات پوری ہوگئیں، اب متقدی کہتے ہیں کہ نماز ادا ہوئی کہ نہیں؟

المستفتی: اظہار الحق، قاضی نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں اگر سورۂ فاتحہ مکمل کرنے سے قبل لقمہ دیا گیا ہے اور امام صاحب نے تکبیر کہہ کر از سر نو سورۂ فاتحہ اور ضم سورۃ کیا ہے تو نماز ہوگئی۔

نسي التكبير في الأولىٰ حتى قرأ بعض الفاتحة أو كلها، ثم تذكر يكبر ويعيد الفاتحة......لأنها تمت وصحت بالكتاب و السنة. (حلبي كبير، باب صلاة العيد، فروع خروج إلى المصلي،اشرفية ديوبند ص: ٥٧٢، شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ٢/ ١٧٣، زكريا ٣/ ٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۱۶)	۱۴۳۴/۱۱/۲۴ھ

جن لوگوں کی نماز فاسد ہوگئی امام کا ان کو نماز پڑھانا

سوال [۳۶۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک سہ منزلہ مسجد میں امام صاحب نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھائی، جب امام صاحب نماز عید سے فارغ ہوگئے، تو تیسری منزل کے مقتدیوں نے جو امام کے ساتھ نماز میں شریک تھے، یہ شکایت کی کہ مائک کی آواز ہمارے کانوں میں نہ پڑنے کی وجہ سے ہم میں سے بعض سے پہلی رکعت کے سجدے یا رکوع یا تکبیر زوائد فوت ہوئیں اور بعض سے دوسری رکعت کے، امام صاحب کا یہ سن کر ان لوگوں کو دوبارہ عید کی نماز پڑھانا کیا درست ہے؟ یا اس موقع پر صحیح مسئلہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی، سورت گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: راجح اور صحیح قول کے مطابق عید کی نماز واجب ہے؛ لہٰذا امام صاحب نے جب پہلی مرتبہ عید کی نماز پڑھائی، جس میں کچھ لوگوں کی نماز فاسد ہوگئی تو جن کی نماز فاسد ہوگئی تھی، ان پر لازم تھا کہ آپس میں سے ہی کسی کو امام بناتے یا کسی ایسے کو امام بناتے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی، مگر چونکہ ان لوگوں کی امامت اسی امام نے کرائی ہے، جس

نے ایک مرتبہ صحیح طریقہ پر عید کی نماز ادا کرلی ہے اور عید کی نماز ایک ہی دفعہ ہوتی ہے، تو دوبارہ یہ عید کی نماز نہیں ہوئی؛ اس لئے اس امام کے پیچھے دوبارہ نماز پڑھنے والے مقتدیوں میں سے کسی کی بھی عید کی نماز نہیں ہوئی؛ بلکہ سب کی نماز بکراہت نفل ہوگئی۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۴۳۴/۸، فتاوی دارالعلوم ۲۲۴/۵، فتاوی عثمانی ۵۵۱/۱، آپ کے مسائل اوران کاحل مدلل جدید ۱۵۹/۴)

ان الاقتداء شركة وموافقة، فلا بد من الاتحاد. (هداية، باب الإمامة، مكتبه البشرىٰ، كراچي پاكستان ۲٤٦/١، اشرفي ديوبند ١٢٧/١)

واتحاد الصلاتين شرط لصحة الاقتداء. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس ما يمنع صحة الإقتداء ومالا يمنع، زكريا ٢٦٨/٢ رقم: ٢٣٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۰/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۱۶ھ

عید کی نماز میں سجدہ کرنے میں تاخیر ہونا

سوال [۳۶۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب جو عیدگاہ میں عرصۂ دراز سے امامت کررہے تھے، انہوں نے نماز عید الفطر ادا کرائی، پہلی رکعت مع تین زوائد تکبیرات درست پڑھائی، دوسری رکعت مع قرأت وتین تکبیرات درست پڑھائی، مگر چوتھی تکبیر کے بعد رکوع میں جانے سے قبل تاخیر ہوگئی، پیچھے سے کسی مقتدی نے اللہ اکبر کہا امام صاحب رکوع میں چلے گئے اور سجدہ وغیرہ درست ادا کیے، مگر بعد میں مقتدی لڑنے لگے کہ نماز نہیں ہوئی، نماز دہرائی جائے، کچھ کہنے لگے درست ہوگئی، بہر حال نماز کسی دوسرے امام کے ذریعہ دوبارہ ادا کی گئی، کیا یہ نماز اول درست ہوئی

یانہیں؟ دوسری نماز کا جو اعادہ ہوا وہ درست تھی یا نہیں؟

المستفتی: قاری رفیق احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عام نمازوں میں کسی رکن میں تین تسبیح کے بقدر تاخیر موجب سجدۂ سہو ہوتی ہے؛ لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ عید وغیرہ مجامع میں ایسی غلطی سے سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں رہتی؛ بلکہ اس کے بغیر بھی نماز درست ہوجاتی ہے؛ تاکہ کثیر مجمع کی وجہ سے نمازیوں میں انتشار نہ ہو، بریں بناء مسئولہ صورت میں اگر بالفرض نماز عید میں ایسی کوئی غلطی ہوگئی تھی، تو اس نماز کو بعد میں دہرانے کی ضرورت نہیں تھی، جن لوگوں نے نماز کا اعادہ کرایا، انہیں غالباً مسئلہ کا صحیح علم نہ ہوگا۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/۵۷۴، امداد المفتیین ۴۰۶)

والسهو في صلاة العيد، والجمعة، والمكتوبة، والتطوع سواء، والمختار عند المتأخرين عدمه في الأوليين؛ لدفع الفتنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، كراچي ۲/۲۹، زكريا ۲/۵۶۰)

قال في الأصل: والسهو في العيدين، والجمعة، والمكتوبة، والتطوع سواء، إلا أن مشايخنا قالوا: لا يسجدون للسهو في الجمعة، والعيدين. في الغياثية: وهو المختار. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون، صلاة العيدين، زكريا ۲/ ۶۳۱، رقم: ۳۴۶۶، المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون، صلاة العيدين، المجلس العلمي ۲/ ۵۰۱، رقم: ۲۲۷۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۲۴ھ

نماز عید سے قبل سنن ومستحبات

سوال [۳۶۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ عید الفطر کی نماز سے قبل کون کون سے اعمال وافعال حضور پاک ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں؟ چند مخصوص سنن ومستحبات تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: کلیم اللہ، مقام وپوسٹ: کملاپور، ضلع: سیتاپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید الفطر کی نماز سے قبل جو اعمال مسنون ومستحب ہیں، ان میں سے چند چیزیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) کوئی میٹھی چیز کھانا (۲) مسواک کرنا (۳) غسل کرنا (۴) خوشبو لگانا (۵) اپنے کپڑوں میں سے عمدہ کپڑے پہننا (۶) صدقۂ فطر ادا کرنا (۷) پیدل عیدگاہ جانا وغیرہ۔

و ندب یوم الفطر أکله حلواً وتراً و لو قرویًا قبل خروجه إلی صلاتها ، و استیاکه و اغتساله وتطییبه......ولبسه أحسن ثیابه......و أداء فطرته، ثم خروجه ما شیًا إلی الجبانة الخ (الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب العیدین، زکریا ۳/ ۴۷ تا ۴۹، کراچي ۲/ ۱۶۸، هدایة، کتاب الصلاۃ، باب العیدین، اشرفي دیوبند ۱/ ۱۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۳۷۰)

ایک صوبہ میں عید کی نماز پڑھنے کے بعد دوسرے صوبہ میں پڑھنا

سوال [۳۶۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ابوبکر ریاست کرناٹک ضلع ہاسن گاؤں ارے ہلی کا رہنے والا ہے، مگر وہ اپنے کاروبار کی وجہ سے ریاست کیرالا ضلع کاسرگوڈ میں رہتا ہے اور کیرالا میں ایک دن پہلے ہی عید الفطر کی نماز ہوگئی، اب ابوبکر کیرالا سے عید الفطر کی نماز پڑھ کر اپنے ضلع ہاسن گاؤں ارے ہلی آیا، تو

یہاں دوسرے دن عید کی نماز پڑھی جارہی تھی، تو کیا ابوبکر اپنے گاؤں ارے ہلی میں دوبارہ عیدالفطر کی نماز پڑھ سکتا ہے؟

المستفتی: ابوبکر، کیرالا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت میں ابوبکر جب ریاست کرناٹک آگیا اور وہاں پر دوسرے دن عید ہورہی ہے، تو وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ عید کی نماز ادا کرے گا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۳۸، احسن الفتاوی، زکریا ۴/۱۳۴)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: صومكم يوم تصومون، وفطركم يوم تفطرون. (سنن الدارقطني، كتاب الصيام، قبيل باب في وقت السحر، دارالكتب العلمية بيروت ۲/۱٤٤، رقم: ۲۱٦۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۲۶/۳۸)

عذر کی وجہ سے بھی دوسرے دن نماز عید قضا ہی ہوتی ہے

سوال [۳۶۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عذر کی بناء پر نماز عید دوسرے دن پڑھی گئی، یہ ادا ہوئی یا قضا؟

المستفتی: محمد فاضل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوسرے دن نماز عید قضا ہوگی نہ کہ ادا؛ اس لئے کہ نماز عید کا وقت پہلے دن کے زوال آفتاب تک رہتا ہے، اس سے پہلے پہلے پڑھی جانے والی نماز ادا ہوگی اور اس کے بعد قضا کا وقت ہے ادا کا نہیں؛ لہٰذا اس کے بعد جو پڑھی جائے گی، وہ قضا ہی ہوتی ہے چاہے عذر کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔

فإن اشتغل الإمام فلم يصل، أوترک عمداً حتى زالت فقد حل الذبح بغير صلاة؛ لأنه بالزوال فات وقت الصلاة، وإنما يخرج الإمام في اليوم الثاني والثالث على وجه القضاء. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦١، كراچي ٦/٣١٨)

وتؤخر بعذر كمطر إلى الزوال من الغد فقط، فوقتها من الثاني، كالأول وتكون قضاءً لا أداءً. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، زكريا ٣/٥٩، كراچي ٢/١٧٦، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب العيدين، كوئٹه ٢/١٦٢، زكريا ٢/٢٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰؍۱۱۴۷۷)

نمازِ عید دوسرے دن قضا ہوتی ہے ادا نہیں

سوال [۳۶۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بارش کی وجہ سے عید الفطر کی نماز پہلے دن عید گاہ میں پڑھنا مشکل ہے، تو ایسی صورت میں مساجد میں نماز عید پڑھیں یا اگلے دن کے لئے موقوف رکھنی چاہئے؟

المستفتی: محمد ابراہیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی صورت میں مساجد میں نماز عید پڑھ لینی چاہئے، اگلے دن کے لئے موقوف نہ رکھی جائے؛ کیونکہ نماز عید دوسرے دن قضا ہو جاتی ہے اور پہلے دن کی نماز ادا ہوتی ہے۔

وتؤخر بعذر كمطر إلى الزوال من الغد فقط فوقتها من الثاني كالأول وتكون قضاءً لا أداءً. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، زكريا٣/٥٩، كراچي ٢/١٧٦)

عن أبي هريرةؓ أنه أصابهم مطر في يوم عيد، فصلى بهم النبي صلى الله عليه وسلم صلاة العيد في المسجد. (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب يصلي بالناس في المسجد إذا كان يوم مطر، النسخة الهندية ١/١٦٤، دارالسلام رقم: ١١٦٠، مستدرك حاكم، كتاب الصلاة، باب العيدين قديم ١/٢٩٥، مكتبه نزار مصطفي الباز ٢/٤٢٧، رقم: ١٠٩٤)

قال ابن الملك: كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي صلاة العيد في الصحراء، إلا إذا اصابهم مطر، فيصلي في المسجد. (بذل المجهود، كتاب الصلاة، باب يصلي بالناس في المسجد إذا كان يوم مطر، قديم ٢/٢١٢، جديد دارالبشائر الإسلامية ٥/٢٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۳/۴۰)

عید کی نماز کے بعد قبرستان جانا کیسا ہے؟

سوال [۳۶۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کی نماز کے بعد قبرستان جانا اور عزیز مرحومین کو ایصال ثواب کرنا کیسا ہے؟ بہت سے لوگوں میں اس کا اہتمام دیکھنے میں آتا ہے، کیا یہ بدعت تو نہیں ہے؟

المستفتی: محمد ذاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کی نماز کے بعد قبرستان جاکر مرحومین کو ایصال ثواب کرنا جائز اور درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی یہ عمل بدعت ہے؛ بلکہ بعض روایات اس کی مؤید ہیں (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۱۲/۵۵۶، محمودیہ ڈابھیل ۹/۲۰۱)

لابأس بزيارة القبور وهو قول أبي حنيفة--وأفضل أيام الزيارة أربعة يوم الإثنين، والخميس، والجمعة والسبت–وكذلك في الأزمنة المتبركة كعشر ذى الحجة، والعيدين، وعاشوراء، وسائر المواسم. (هندية، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيارة القبور و قرأة القرآن في المقابر، زكريا اقديم٥/ ٣٥٠، جديد٥/ ٤٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۰/۴۰)

عید کی نماز کے وقت جنازہ آجائے تو پہلے کون سی نماز پڑھیں؟

سوال [۳۶۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر عید کی نماز کے وقت جنازہ آجائے، تو پہلے نماز جنازہ پڑھی جائے یا عید کی نماز پڑھی جائے؟ نیز اگر بعد میں پڑھی جائے تو خطبۂ عید سے قبل یا بعد میں پڑھی جائے؟

المستفتی: محمد قاسم محمد پور، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز جنازہ بہر حال نماز عید کے بعد ہی پڑھنی چاہئے، اب رہی بات کہ خطبہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں پڑھی جائے، تو اس میں دونوں طرح گنجائش ہے؛ لہٰذا موقع ومحل کے اعتبار سے اگر خطبہ سے پہلے نماز جنازہ پڑھنے میں تشویش نہیں ہے اور دفن میں اکثر لوگ شرکت کے لئے نہیں جائیں گے، تو خطبہ سے پہلے پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر دفن میں اکثر لوگ شرکت کے لئے جانے والے ہیں، تو ایسی شکل میں خطبہ کے بعد نماز جنازہ پڑھنی چاہئے؛ تا کہ سب لوگوں کو خطبہ سننے کا بھی موقع مل سکے اور پھر خطبہ کے بعد دفن میں بھی شرکت کا موقع مل سکے۔

وتقدم صلاة العيد على صلاة الجنازة، إذا اجتمعتا. (هندية، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، زكريا قديم ١/١٥٢، جديد ١/٢١٣، درمختار، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ٢/١٦٧، زكريا٣/٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۷۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

عید کے موقع پر گھروں سے چندہ کرکے گلیوں کو کاغذات اور لائٹ سے مزین کرنا

سوال [۳۶۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر وشارم میں عید کے موقع پر ہر گلی میں لڑکے تمام گھروں سے چندہ وصول کرکے گلیوں میں رنگین کاغذات اور لائٹ لگاتے ہیں اور کوئی چندہ نہ دے، تو ان سے جبراً لیا جاتا ہے اور لائٹ عید کے تین دن لگائے رکھتے ہیں۔ اور رنگین کاغذ ایسے ہی پڑا رہتا ہے اور چندہ میں بچا ہوا پیسہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور رنگین کاغذ چپکانے میں رمضان کا قیمتی وقت ضائع کردیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح رنگین کاغذ اور لائٹ سے گلیوں کو مزین کرنا، گھروں سے چندہ وصول کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد آصف، کنو ینر تنظیم العلماء، وشارم، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کے موقع پر گلی کوچوں کو رنگین کاغذات اور لائٹوں کے ذریعہ سے چمکانے کے واسطے چندہ کرنا قطعاً جائز نہیں، یہ فضول خرچی ہے، اس کام کے لئے چندہ دینے والے بھی گنہگار ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے اس طرح فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْن. [سورة بنی اسرائیل:۲۷]

کے ذریعہ سے سخت وعید نازل فرمائی ہے؛ اس لئے اس سے مسلمانوں کو دور رہنا لازم ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۲۴۶/۴۰)

۱۴۰۸ھ کو دس ذی الحجہ کس دن تھی؟

سوال [۳۶۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قواعد شرعیہ کی رو سے ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کب کی تسلیم کی گئی ہے؟ اور عید الاضحیٰ اگست کی کون سی تاریخ میں ہوگی؟ یعنی ۱؍ ذی الحجہ کب ہے؟

المستفتی: محمد سفیان عالم، سہسپور ضلع: بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہاں ثبوت شرعی نہ ملنے کی بناء پر قواعد شرعیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اور مفتیان مرادآباد نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ عید الاضحیٰ بروز جمعرات ہوگی۔

نوٹ: بعد میں دیوبند، سہارنپور سے شرعی ثبوت آنے کی وجہ سے اس فیصلہ سے رجوع کر کے بدھ کا اعلان کیا گیا۔

طريق موجب كأن يتحمل اثنان الشهادة، أو يشهدا على حكم القاضي، أو يستفيض الخبر. (شامي، كراچي ۲/ ۳۹۴، زكريا ۳/ ۳۶٤، كتاب الصوم، مطلب في اختلاف المطالع) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹۱/۲۳)

عیدگاہ کومزین کرنا اور راستوں میں جھنڈے لگانا

سوال [۳۶۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں عیدین کے موقع پر عیدگاہ کومزین کرتے ہیں، ساتھ ساتھ چاروں طرف سرخ جھنڈے اور بیچ میں ایک مخصوص سرخ جھنڈ الگاتے ہیں اور گیٹ کرایہ پر لے کر لگاتے ہیں۔ کیا یہ شریعت میں درست ہے؟

المستفتی: خیر الاسلام آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید، بقرعید کے لئے عیدگاہ اور اس کے راستوں میں جھنڈیاں لگانا شریعت سے ثابت نہیں ہے؛ البتہ شوکت اسلام کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کا عید کے لئے جمع ہوجانا ثابت ہے۔ اور عیدگاہ کومزین کرنے کے لئے چندہ کرنا بھی مشروع نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۵/۵۸۴، میرٹھ ۱۲/۵۴۷)

عن أم عطيةؓ أمرنا أن نخرج، فنخرج الحيض، والعواتق، وذوات الخدور. (بخاری شريف، كتاب العيدين، باب اعتزال الحيض المصلي، النسخة الهندية ١/ ١٣٤، رقم: ٩٧١، ف: ٩٨١)

عن جابرؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: إذا كان يوم العيد خالف الطريق. (بخاري، كتاب العيدين، باب من قال: خالف الطريق إذا رجع يوم العيد، النسخة الهندية، رقم: ٩٧٦، ف: ٩٨٦)

قال الحافظؒ: وقيل لإظهار شعار الإسلام فيهما......وقيل ليغيظ المنافقين أو اليهود، وقيل ليرهبهم بكثرة من معه، ورجحه ابن بطال.

(فتح الباري اشرفی ٢/ ٦٠٠، بیروت ٢/ ٥٤٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۵۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۲۳ھ

عیدگاہ ایک راستہ سے جانا اور دوسرے سے آنا

سوال [۳۶۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید وبقرعید کے دن ایک راستہ سے جانا اور دوسرے راستہ سے واپس آنا اس کا کیا ثبوت ہے؟ مزید برآں لوگ قبرستان ہوکر آنا ضروری سمجھتے ہیں، تو اس کی کیا اصل ہے؟

المستفتی: معراج الدین، سپولوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کے لئے ایک راستہ سے جانا اور دوسرے راستہ سے آنا مسنون اور حدیث سے ثابت ہے؛ البتہ قبرستان جانا صحیح حدیث میں مذکور نہیں؛ لیکن بعض فقہ کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے؛ لہٰذا قبرستان کی زیارت بہتر اور مستحب اور مستحسن عمل ہے، لازم اور ضروری نہیں ہے۔

عن جابرؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: إذا كان يوم عيد خالف الطريق. الحديث (بخاري شريف، كتاب العيدين، باب من خالف الطريق إذا رجع يوم العيد،النسخة الهندية ١/ ١٣٤، رقم:٩٧٦، ف:٩٨٦)

والزيارة يوم الجمعة بعد الصلوة حسن– إلى قوله–وكذلك في الأزمنة المتبركة كعشر ذي الحجة والعيدين. (هندية، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيادة القبور وقراءة القرآن في المقابر، زكريا قديم ٥/ ٣٥٠، جديد ٥/ ٤٠٥، هكذا في هامش البخاري ١/ ١٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۹ھ

(۲) فصل في صلاة العيدين

عیدین کی نماز کا مسنون طریقہ

سوال [۳۶۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز کا مسنون طریقہ فقہ حنفی اور حدیث کی روشنی میں تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عید کی نماز کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اس میں چھ تکبیریں زائد ہوتی ہیں، ان تکبیروں کے علاوہ باقی نماز عام نمازوں کی طرح ہے۔ اوران چھ تکبیروں میں سے تین تکبیریں پہلی رکعت میں ہوتی ہیں اور تین تکبیریں دوسری رکعت میں ہوتی ہیں اور دونوں رکعتوں میں تکبیرات زوائد کا مقام الگ الگ ہے، پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء پڑھی جائے گی اور ثناء کے بعد تین زائد تکبیریں کہی جائیں گی، ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھا کر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں گے اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ کر امام **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** اور **بسم اللہ الرحمن الرحیم** پڑھ کر قراءت شروع کرے گا، سورۂ فاتحہ اور ضم سورت کے بعد رکوع کرکے کھڑا ہو جائے گا، اس کے بعد دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے تین تکبیرات زوائد کہے گا، ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھائے جائیں گے، اس کے بعد بغیر ہاتھ اٹھائے چوتھی تکبیر کہہ کر امام رکوع میں چلا جائے گا، بقیہ نماز عام نمازوں کی طرح بدستور ادا کرے گا، یہ عیدین کی نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ ہے۔

نیز یہ بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ پہلی رکعت کی تکبیر تحریمہ بھی واجب ہے اور دوسری رکعت کی تکبیر رکوع بھی واجب ہے؛ اس لئے نتیجۃً دونوں رکعتوں میں آٹھ تکبیرات واجب ہیں۔

دلائل ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

عن كردوس قال: قدم سعيد بن العاص في ذي الحجة، فأرسل إلى عبد الله، وحذيفة، وأبي مسعو الأنصاري، وأبي موسىٰ الأشعري، فسألهم عن التكبير في العيد؟ فأسندوا أمرهم إلى عبد الله، فقال عبد الله: يقوم فيكبر، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر، فيقرأ، ثم يكبر، و يركع ويقوم فيقرأ، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر الرابعة، ثم يركع. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، في التكبير في العيدين و اختلافهم فيه، تحقيق الشيخ عوامة، موسسة علوم القرآن ٤/٢١٦، رقم:٥٧٥٥، ٥٧٥٤، شرح معاني الآثار للطحاوي، الزيادات، باب صلاة العيدين، كيف التكبير فيها، عباس أحمد الباز ٤/١٧٦، رقم:٧١٤٠، كتاب الآثار للإمام محمد، كراچي٢٠٥، رقم:٢٠٢)

عن الأسود بن يزيد عن ابن مسعود: في الأولى خمس تكبيرات بتكبيرة الركعة وبتكبيرة الاستفتاح، وفي الركعة الأخرى أربعة تكبيرة الركعة. (مصنف عبد الرزاق، كتاب الصلاة، باب التكبير في العيدين، المجلس العلمي ٣/٢٩٣، رقم:٥٦٨٥)

عن أنس بن مالك رضـ، أنه قال: تسع تكبيرات، خمس في الأولى و أربع في الأخيرة مع تكبيرة الصلاة. (شرح معاني الآثار للطحاوي، الزيادات، باب صلاة العيدين، كيف التكبير فيها، عباس أحمد الباز ٤/١٧٦، رقم: ٧١٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۲۵/۴۱)	۱۴۳۶/۲/۲۰ھ

نماز عید میں تکبیرات زوائد چھ ہیں یا بارہ؟

سوال [۳۶۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کی نماز میں زائد تکبیروں کی مقدار چھ ہے یا بارہ، ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ یہ

کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نماز عید بارہ زائد تکبیروں کے ساتھ ادا فرماتے تھے، نہ کہ چھ تکبیروں کے ساتھ؛ لہٰذا تم لوگ جو چھ تکبیروں کے ساتھ نماز عید پڑھتے ہو وہ درست نہیں ہے، حضور والا سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمائیں کہ حضور ﷺ سے کتنی تکبیروں کے ساتھ نماز عید ادا کرنا ثابت ہے اور ہمارے پاس اسی چھ زائد تکبیرات کے ساتھ نماز عید ادا کرنے کے دلائل کیا ہیں؟ اور اس سلسلے میں احادیث مبارکہ اور فقہی جزئیات سے مسئلہ کو مدلل فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: نسیم احمد مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین کی نمازوں میں تکبیرات زوائد کا مسئلہ کچھ مختلف فیہ ہے؛ چنانچہ اس سلسلہ میں روایات کے مختلف انداز سے وارد ہونے کی وجہ سے فقہاء اور مجتہدین کے اقوال بھی مختلف ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے اس بارے میں ائمہ کے دس اقوال وارد ہوچکے ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود میں شوکانی کی نیل الاوطار کے حوالہ سے ان سارے اقوال کو نقل فرمایا ہے اور ان دس اقوال میں چھ تکبیروں کا قول بھی موجود ہے اور بارہ تکبیروں کا قول بھی مذکور ہے اور سب نے اپنے اپنے طور پر احادیث شریفہ سے استدلال کیا ہے اور ہمیں چھ تکبیرات والے اور بارہ تکبیرات والے قول پر غور کرنا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ نے چھ تکبیرات زوائد والی روایات کو اختیار فرمایا ہے اور دوسرے ائمہ نے بارہ تکبیرات والی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔

اب دونوں قسم کی روایات کو سامنے رکھ کر تحقیقی جائزہ لینا ہے کہ کس قسم کی روایات کو قوت وترجیح حاصل ہے، اب ہم دونوں قسم کی روایات کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ بارہ تکبیرات والی روایات سب متکلم فیہا ہیں، یہ روایات ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد وغیرہ میں وارد ہوئی ہیں، ترمذی کی روایات میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ آیا ہے، اس راوی کے اوپر محدثین نے مختلف انداز سے کلام کیا ہے:

امام شافعیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے ''رکن من أرکان الکذب'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اور ابن ماجہ کی روایت کی سند میں عبدالرحمٰن بن سعد بن عمار بن سعد کے نام سے ایک راوی آیا ہے وہ متکلم فیہ اور ضعیف راوی ہے۔

علامہ ذہبی، امام یحییٰ بن معین اور حافظ ابن حجر عسقلانی ان سارے محدثین نے اس کو ضعیف اور متکلم فیہ قرار دیا ہے، اور ابوداؤد کی روایت میں ایک راوی عبداللہ بن لہیعہ آیا ہے، یہ بھی متکلم فیہ راوی ہے، ان کی کتابیں جل جانے کے بعد ان کا حافظہ کمزور ہوگیا تھا؛ اس لئے محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، یہ بارہ تکبیرات والی روایات کا حال ہے۔ یہ تفصیل بذل المجہود قدیم ہندی نسخہ ۲/۲۰۶، جدید دارالبشائر الاسلامیہ ۵/۲۲۹ میں موجود ہے اور فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۸/۴۴۰، میں بھی اس کو نقل کیا گیا ہے اور چھ تکبیرات زوائد والی روایات اعلی درجہ کی سند سے مروی ہیں اور یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ عیدین کی دونوں رکعتوں میں سے ہر رکعت میں چار چار تکبیرات لازمہ ہیں، کل آٹھ تکبیرات واجب ہیں، پہلی رکعت میں ثناء کے بعد قراءت سے پہلے تین تکبیرات زوائد ہیں اور ایک تکبیر تحریمہ اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد رکوع سے پہلے تین تکبیرات زوائد ہیں، ایک تکبیر رکوع، یہ کل آٹھ تکبیرات واجب ہیں، جن میں سے چھ زوائد اور ان تکبیرات کی روایات صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں، امام عبدالرزاق نے سند صحیح کے ساتھ، امام طبرانی نے سند جید کے ساتھ، امام ابوبکر بن أبی شیبہ نے مصنف بن ابی شیبہ میں صحیح اور عالی سند کے ساتھ، امام طحاوی نے اور امام ابوداؤد نے سند حسن کے ساتھ ان روایات کو نقل فرمایا ہے۔

روایات ملاحظہ فرمائیے:

عبد الرزاق عن معمر عن أبي اسحاق عن علقمة، والأسود بن يزيد قال: كان ابن مسعود جالساً وعنده حذيفة وأبو موسىٰ الأشعري، فسألهما سعيد بن العاص عن التكبير في الصلاة يوم الفطر والأضحى، فجعل هذا يقول: سل هذا، وهذا يقول: سل هذا، فقال له حذيفة: سل

هذا –لعبد الله بن مسعود– فسأله، فقال ابن مسعود يكبر أربعًا، ثم يقرأ، ثم يكبر، فيركع، ثم يقوم في الثاية فيقرأ، ثم يكبر أربعاً بعد القراءة. (منصف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ۳/۲۹۳، ۵۶۸۷، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ۹/۳۰۳-۹۵۱۶)

مصنف بن ابی شیبہ میں اعلیٰ درجہ کی سند کے ساتھ کچھ الفاظ کے فرق کے ساتھ ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن معبد بن خالد عن كردوس قال: قدم سعيد بن العاص في ذى الحجة، فارسل إلى عبد الله، وحذيفة، وأبي مسعود الأنصاري، وأبي موسىٰ الأشعري، فسألهم عن التكبير في العيد؟ فأسندوا أمرهم إلى عبد الله، فقال عبد الله: يقوم فيكبر، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر فيقرأ، ثم يكبر و يركع، ويقوم فيقرأ، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر، ثم يكبر الرابعة، ثم يركع. (مصنف ابن ابي شيبة تحقيق شيخ عوامة ۴/۲۱۶، رقم: ۵۷۵۵)

طحاوی شریف کی روایت کا حاصل بھی تقریباً اسی طرح ہے۔ ملاحظہ ہو:

طحاوی شریف جدید دار الکتب العلمیۃ ۴/۷۵، رقم: ۱۷۴۰، ابو داؤد شریف، سنن کبریٰ بیہقی میں بھی حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت حذیفہ بن الیمان ؓ سے روایت تقریباً اسی طرح ثابت ہے اور یہ سند سند حسن کے درجہ میں ہے، سنن کبری بیہقی جدید، النسخۃ الہندیۃ، دار الفکر ۵/۶۹، رقم: ۶۲۷۵، ابوداؤد، النسخۃ الہندیۃ ۱/۱۶۳، دار السلام رقم: ۱۱۵۲)

اب ان تمام روایات کا تحقیقی جائزہ سامنے آجانے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ چھ تکبیرات زوائد والی روایات کو زیادہ قوت اور ترجیح حاصل ہے؛ اس لئے حنفیہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۲۱/۴۱)

عید کی نماز میں تکبیرات زوائد بھول جائے تو؟

سوال [۳۶۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز میں امام تکبیرات زوائد بھول گیا، آخر میں سجدہ سہو بھی نہیں کیا، تو ایسی صورت میں عید کی نماز بلا کراہت درست ہوگئی یا اعادہ لازم ہے؟

المستفتی: انعام اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین کی نماز میں چھ تکبیرات زوائد ہیں پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ اور ثناء کے بعد تین تکبیریں ہیں اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد رکوع سے پہلے تین تکبیریں ہیں اور دوسری رکعت کے رکوع کی تکبیر بھی واجب ہے، اگر بھول سے یہ تکبیریں چھوٹ جائیں تو ساری کتب فقہ میں یہ حکم مذکور ہے کہ سجدۂ سہو واجب ہو جائے گا؛ لیکن ساتھ میں متاخرین فقہاء نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ جمعہ اور عیدین میں مجمع کثیر ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کرنے میں لوگوں کی نماز خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور لوگوں میں اختلاف وانتشار کے ذریعہ فتنہ کھڑا ہونے کا خطرہ ہے؛ اس لئے سجدہ سہو کے بغیر عیدین اور جمعہ کی نماز درست ہو جائے گی اور سجدہ سہو نہ کرنے کو اولیٰ اور بہتر بھی لکھا ہے؛ اس لئے سوال میں ذکر کردہ صورت میں نماز عید درست ہوگئی ہے، مگر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر مجمع کثیر نہ ہو تو امام کو سجدہ سہو کر لینا چاہئے۔

ترک قراءة الفاتحة، أو القنوت، أو التشهد، أو تكبيرات العيدين؛ لأنها واجبات فإنه عليه السلام، واظب عليها من غير تركها مرة، وهي أمارة الوجوب؛ ولأنها تضاف إلى جميع الصلاة، فدل أنها من خصائصها، وذلك بالوجوب ......وكل ذلك واجب وفيها سجدة السهو هو الصحيح.

(هداية، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، مكتبه اشرفية ۱/۱۵۷-۱۵۸)

العاشر تكبيرات العيدين. قال في البدائع: إذا تركها أو نقص منها أوزاد عليها أو أتى بها في غير موضعها، فإنه يجب عليه السجود. (البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب سجود السهو، کوئٹه ۲/۹۶، زکریا ۲/۱۷۰)

أما السهو في تكبيرات العيد، فهو يتحصيلها في غير محلها، أوبالزيادة فيها، أو بالنقصان عنها، أو بتركها، ففي كل ذلك يجب سجود السهو. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر: سجود السهو، المجلس العلمي ۲/۳۱۳، رقم:۱۸٦٦، ومثله في التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر سجود السهو، زكريا ۲/۳۹۹، رقم:۲۷۸۷، الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، مکتبه اشرفية ۱/۹۲، امدادية ملتان ۱/۹۲)

والسهو في صلاة العيد، والجمعة، والمكتوبة، والتطوع سواء، والمختار عند المتأخرين عدمه في الأولين؛لدفع الفتنة كما في جمعة البحر، وتحته في الشامية: الظاهر أن الجمع الكثير فيما سواهما، كذلك كما بحثه بعضهم، وكذا بحثه الرحمتي. وقال: خصوصاً في زماننا، وفي جمعة حاشية أبي السعود عن العزمية، أنه ليس المراد عدم جوازه؛ بل الأولى تركه لئلا يقع الناس في فتنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، كراچي ۲/۹۲، زكريا ۲/۵٦۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۳٦ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۲۳/۴۱)

عید کی نماز کی پہلی رکعت کی تکبیرات زوائد بھول جائے تو؟

سوال [۷۰۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین میں امام تکبیرات زوائد پہلی رکعت میں بھول گیا، دوسری رکعت میں یاد آیا تو ایسی

صورت میں پہلی رکعت کی چھوٹی ہوئی تکبیریں دوسری رکعت میں لوٹا سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر لوٹا سکتے ہیں تو دوسری رکعت میں کس وقت یہ تکبیریں کہیں گے؟

المستفتی: علاء الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر امام پہلی رکعت میں تکبیرات زوائد کہنا بھول جائے تو رکوع سے پہلے پہلے تکبیرات کہنے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا اگر پہلی رکعت کا رکوع کرلیا ہے، تو رکوع کے بعد قومہ کی حالت میں تکبیرات کہنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر پہلی رکعت کا سجدہ کرلیا ہے، تو پہلی رکعت کی فوت شدہ تکبیرات زوائد کا کوئی اعادہ نہیں، اسی طرح دوسری رکعت میں یاد آجائے تو اعادہ کی کوئی گنجائش نہیں؛ اس لئے کہ وہ تکبیرات کے اعادہ کا مقام نہیں ہے؛ لہٰذا وہ چھوٹی ہوئی تکبیروں کا اعادہ نہیں کرے گا؛ بلکہ سجدۂ سہو کرنا لازم ہوگا؛ لہٰذا اگر مجمع کثیر نہیں ہے، تو سجدۂ سہو کرلے اور اگر مجمع کثیر ہے، تو سجدۂ سہو بھی معاف ہوجائے گا اور بغیر سجدہ سہو کے عید کی نماز درست ہوجائے گی، جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے واضح ہوتا ہے۔

العاشر تكبيرات العيدين قال في البدائع: إذا تركها أو نقص منها أوزاد عليها أو أتى بها غير موضعها، فإنه يجب السجود، وذكر في كشف الأسرار، أن الإمام إذا سها عن التكبيرات حتى ركع، فإنه يعود إلى القيام؛ لأنه قادر على حقيقة الأداء فلا يعمل بشبهه. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ۲/ ۹٦،زكريا ۲/ ۱۷۰)

أما السهو في تكبيرات العيدين: و هي بتحصيلها في غير محلها، أو بالزيادة فيها أو بالنقصان عنها أو بتركها، ففي كل ذلك يجب سجود السهو. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر سجود السهو، المجلس العلمي ۲/ ۳۱۳، رقم: ۱۸٦٦، مثله في التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر سجود السهو، زكريا ۲/ ۳۹۹، رقم: ۲۷۸۷)

السهو في صلاة العيد، والجمعة، والمكتوبة، والتطوع سواء، والمختار عند المتأخرين عدمه في الأوليين؛ لدفع الفتنة كما في جمعة البحر. وتحته في الشامية: الظاهر أن الجمع الكثير فيما سواهما، كذلك كما بحثه بعضهم، وكذا بحثه الرحمتي. وقال: خصوصاً في زماننا، وفي جمعة حاشية أبي السعود عن العزمة، أنه ليس المراد عدم جوازه؛ بل الأولى تركه لئلا يقع الناس في فتنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، كراچي ۲/۹۲، زكريا ۲/۵۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۹۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۲۰ھ

عیدین میں خطبوں کی مسنون مقدار اور تعداد

سوال [۴۷۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید میں دو خطبے ضروری ہیں یا ایک سے بھی کام چل سکتا ہے اور خطبہ کی مقدار کیا ہو؟ مسالک اربعہ مع دلائل اور مفتی بہ قول نقل فرمائیں؟

المستفتی: محمد عبد السبحان، کیلفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عید کی نماز میں بھی جمعہ کی طرح دو خطبہ مسنون ہیں، بس اتنا فرق ہے کہ جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے ہوتا ہے اور عیدین کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے اور خطبہ کی کم سے کم مقدار تین آیتوں کے برابر ہے اور زیادہ کی مقدار میں سامعین کی رعایت کا لحاظ کرتے ہوئے جتنا چاہے لمبا کر سکتا ہے۔

عن جابرؓ، قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم: يوم فطر،

وأضحىٰ، فخطب قائماً، ثم قعد قعدة، ثم قام. (ابن ماجه، باب ماجاء في الخطبة في العيدين، النسخة الهندية ۱۹۱، دارالسلام، رقم: ۱۲۸۹)

عن عبد الله بن عتبة رضـ، قال: السنة أن يخطب الإمام في العيدين خطبتين يفصل بينهما بجلوس. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب صلاة العيدين، باب جلوس الإمام حين يطلع على المنبر...... قديم ۲/۱۵۸، دارالفكر ۵/۸۲، رقم: ٦۳۰۵)

عن عبد الله بن السائب رضـ، قال: شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم: العيد، فلما قضى الصلاة، قال: إنما نخطب فمن أحب أن يجلس للخطبة فليجلس، ومن أحب أن يذهب فليذهب. (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الجلوس للخطبة، النسخة الهندية ۱/۱٦۳، دارالسلام رقم: ۱۱۵۵، المستدرك للحاكم، كتاب صلاة العيدين قديم ۱/۲۹۵، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ۲/٤۲٦، رقم: ۱۰۹۳، سنن الدارقطني، كتاب العيدين، دارلكتب العلمية بيروت ۲/۳۸، رقم: ۱۷۲۲)

خطبتا العيدين سنة باتفاق. (الفقه على على المذاهب الأربعة، مباحث صلاة العيدين، حكم خطبة العيدين مكمل ۱۹۹، دارالفكر ۱/۳۵۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۹/۱۸٦)

وقالا: لابد من ذكر طويل يسمى خطبة، وهو مقدار ثلاث آيات عند الكرخي. (العناية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، زكريا ۲/۵۷، دارالفكر مصري قديم ۲/۵۹، وهكذا في البنايه اشرفية ديو بند ۳/۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۳۲۵)

کیا نماز عیدین کے خطبہ میں تکبیرات تشریق والا خطبہ ضروری ہے؟

سوال [۳٦۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ ایک مسجد میں امام صاحب کی عدم موجودگی میں زید کو عید الفطر کے موقعہ پر نماز عید پڑھانے کے لئے کہا گیا، زید ایک مستند عالم وحافظ ہیں، تقریباً ۳۵ رسال قبل مظاہر العلوم سہارنپور سے فراغت حاصل کر چکے ہیں، مختلف جگہ کافی عرصہ تک امامت کے فرائض انجام دے چکے ہیں، اور اکابرین کے خاندان سے ہیں، نماز عید الفطر کے ادا کرنے کے بعد زید نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے خطبات میں سے دو خطبہ حسب قاعدہ پڑھے، مگر تکبیر تشریق والا خطبہ نہیں پڑھا، مسجد کے چند نمازیوں نے اعتراض کیا کہ تکبیر تشریق والا خطبہ نہیں پڑھا وہ بھی پڑھا جائے، زید کا کہنا تھا کہ میں دو خطبہ پڑھ چکا ہوں؛ اس لئے تیسرے خطبہ کی ضرورت نہیں، دو خطبہ ادا ہو چکے ہیں، مگر نمازیوں کے اصرار پر ایک دوسرے صاحب نے جو کسی بھی مدرسہ سے فارغ نہیں ہیں، انہوں نے خطبہ پڑھ دیا بعد میں اس پر بحث ہوئی، زید کا کہنا ہے کہ میں نے سہارنپور میں اور دیوبند، گنگوہ کے قیام کے دوران اور زمانہ طالب علمی کے اندر متعدد باران تمام جگہوں کے اکابرین حضرات کو نماز عید کے موقعہ پر مختلف خطبات پڑھتے ہوئے سنا اور دیکھا ہے اور علماء حضرات الگ الگ خطبات پڑھتے ہیں، اس بنا پر زید کا کہنا یہ ہے کہ تکبیر تشریق والا خطبہ بھی پڑھ سکتے ہیں؛ لیکن ضروری نہیں ہے؛ اس لئے وضاحت درکار ہے۔

(۱) نماز عید کے خطبہ میں تکبیر تشریق والا خطبہ ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) چند نمازیوں کا اعتراض کیا اپنی جگہ پر درست ہے؟

(۳) کیا زید کا کہنا اپنی جگہ پر درست ہے؟

(۴) کیا زید نے جو دو خطبہ پڑھے وہ شرعی لحاظ سے کافی تھے یا نہیں؟

برائے کرم جواب سے جلد از جلد مطلع کریں۔

المستفتی: سلیم احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین میں پہلے خطبہ کے شروع میں ۹ رمرتبہ، دوسرے

خطبہ میں ۷؍مرتبہ، بالکل آخر میں ۱۴؍مرتبہ مسلسل تکبیر تشریق کہنا مستحب ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۴۵۲/۸)

کما في تنوير الأبصار مع الدر المختار: و يبدأ بالتكبير في خطبة العيدين، ويستحب أن يستفتح الأولىٰ بتسع تكبيرات، والثانية بسبع و أن يكبر قبل نزوله من المنبر أربع عشرة الخ. (تنوير الأبصار مع الرد، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين نعمانيه ۱/ ۵٦۱، كراچي ۲/ ۱۷۵، زكريا۳/ ۵۸، هندية، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، زكريا قديم ۱/ ۱۵۰، زكريا جديد ۱/ ۲۱۲)

لیکن واجب اور ضروری نہیں؛ اس لئے جب زید نے دو خطبہ دیدیئے تو دوبارہ تکبیرات کے ساتھ خطبہ نہیں دینا چاہئے تھا؛ بلکہ اگر لازم سمجھ کر ایسا کیا ہے تو وہ مکروہ تحریمی اور بدعت سیئہ کا مرتکب ہوا ہے۔

الجهلة يعتقدونها سنة أو واجبة، وكل مباح يؤدي إليه فمكروه. تحته في الشاميه: الظاهر أنها تحريمية؛ لأنه يدخل في الدين ماليس منه.

(شامي، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۹۸، كراچي ۲/ ۱۲۰)

(۱) ضروری نہیں (۲) درست نہیں (۳) درست تھا (۴) کافی تھا۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شوال المکرّم ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۲۸۲)

عیدین کے خطبہ میں تکبیر تشریق کی تعداد اور طریقہ

سوال [۳۷۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کے پہلے خطبہ میں عموماً مشہور ہے کہ نو بار تکبیر تشریق پڑھی جائے، مگر

کسی کتاب میں مل نہیں رہا ہے؛ لہٰذا حوالہ درکار ہے؛ البتہ درمختار کراچی ۱/۱۶۱، پر یہ عبارت ہے۔

ویستحب أن یستفتح الأولیٰ بتسع تکبیرات تتری أي المتتابعات، والثاني بسبع هو السنة الخ.

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شروع ہی میں لگاتار پڑھے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا شروع میں بھی لگاتار نو بار پڑھے اور درمیان میں بھی نو بار پڑھے؟

نیز تکبیرات سے مراد صرف **الله اکبر الله اکبر لا إله إلا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد** ہے، اگر صرف اللہ اکبر ہے، تو خطیب گویا اذان جیسی کہے گا، جس سے عام لوگ بھڑکیں گے؛ چونکہ اس پر عمل آج کل متروک ہے اور اگر تکبیر تشریق مراد ہے، تب بھی لوگ بھڑکیں گے یا یہ کہ آہستہ پڑھے تاکہ لوگ نہ بھڑکیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن، افضل گڑھ، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: کتب فقہ میں مسلسل شروع میں نو تکبیرات اور دوسرے خطبہ کے شروع میں سات تکبیرات اور دونوں کے اخیر میں چودہ تکبیرات مسلسل کہنے کو مستحب لکھا ہے۔ اور ان تکبیرات سے مراد پوری تکبیر تشریق ہے، لوگوں کے بھڑکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جو لوگ مسائل سے واقف ہیں، وہ ان تکبیرات کو پڑھتے ہیں۔

ویستحب أن یستفتح الأولیٰ بتسع تکبیرات تتری أي المتتابعات، والثانیة بسبع هو السنة، وأن یکبر قبل نزوله من المنبر أربع عشرة.

(الدر المختار مع الرد، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین، زکریا ۳/۵۸، کراچی ۲/۱۷۵، البحر الرائق، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین، زکریا ۲/۲۸۳، کوئٹه ۲/۱۶۲، حاشیة الطحطاوي علی مراقي الفلاح، باب أحکام العیدین، دارالکتاب دیوبند ص:۵۳۵، مجمع الأنهر، باب صلاة العیدین، مصري قدیم ۱/۲۷۴،

دارالكتب العلمية بيروت ۲۵۷/۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۵۶۱)

اردو میں عیدین کا خطبہ مکروہ

سوال [۳۷۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کا پہلا خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد دوسرا خطبہ پڑھنے سے پہلے اردو میں تقریر کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد عادل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین کا پہلا خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد دوسرا خطبہ شروع کرنے سے پہلے اردو میں تقریر کرنا مکروہ ہے؛ اس لئے کہ عربی میں خطبہ پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے توارث کے ساتھ عربی میں خطبہ پڑھنا ثابت ہے؛ لہٰذا اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۴۵۵/۸، محمودیہ میرٹھ ۵۳۲/۱۲)

لأن النبي الله عليه وسلم، وأصحابه قد خطبوا دائما بالعربية، و لم ينقل عن أحد منهم أنهم خطبوا خطبة، و لو خطبة غير الجمعة بغير العربية.

(رسالة أكام النفائس اللكنوي ٤/٤٤، بحواله محمود يه ڈابهيل ٤٥٥/٨)

لاشک في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله عنهم، فيكون مكروهًا تحريماً. (عمدة الرعاية، حاشية شرح الوقايه، باب أحكام صلاة الجمعة، اشرفى

دیوبند ۱/ ۲۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۲۹)

عیدین کی نماز کے بعد خطبہ سے قبل اردو زبان میں بیان کرنا

سوال [۵-۳۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کی نماز کے بعد خطبہ سے پہلے اردو زبان میں بیان کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: مولوی عبد الماجد، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز کے بعد خطبہ سے پہلے وعظ ونصیحت کا ثبوت نہیں ہے؛ بلکہ نماز کے بعد اگر دعا کرنی ہے تو دعا کے بعد متصلاً خطبہ شروع ہو جانا چاہئے اور خطبہ کے بعد اپنی مادری زبان میں اگر کوئی وعظ ونصیحت کرتا ہے اور لوگ بھی اس کے لئے رک جاتے ہیں، تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ لیکن عید کے دن خطبہ کے بعد وعظ ونصیحت سننے کے لئے لوگوں میں رک جانے کی عادت نہیں ہے، ہاں البتہ نماز شروع ہونے سے پہلے اگر وعظ ونصیحت کی جائے اور نماز شروع ہونے تک لوگ سکون واطمینان کے ساتھ سنیں تو کوئی حرج نہیں؛ البتہ جائز دونوں طرح ہے چاہے نماز سے پہلے ہو یا خطبہ کے بعد مگر نماز اور خطبہ کے درمیان مشروع نہیں ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ ۱/ ۳۶۹)

عن جابر بن عبد اللہ ؓ قال: سمعته يقول: إن النبي صلى الله عليه وسلم قام يوم الفطر فصلى فبدأ بالصلوة قبل الخطبة، ثم خطب الناس، فلما فرغ نبي الله صلى الله عليه وسلم نزل، فأتى النساء، فذكرهن. الحديث (مسلم شريف، كتاب صلاة العيدين، النسخة الهندية ۱/ ۲۸۹، بيت الأفكار رقم: ۸۸۵، مسند الدارمي، باب الحث على

الصدقة يوم العيدين، دار المغني بيروت ۲/ ۹۹۷، رقم: ۱۶۴۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۲/ ۱۴۲۳ھ

عیدین کے خطبوں کے درمیان تقریر کرنا

سوال [۳۷۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مولانا صاحب عیدین کی نماز میں پہلا خطبہ پڑھ کر بیٹھتے ہیں، پھر کھڑے ہوکر تقریر کرتے ہیں، پھر دوسرا خطبہ پڑھتے ہیں، یعنی دونوں خطبوں کے درمیان تقریر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور بعض مرتبہ مولانا جمعہ کی نماز میں اس طرح کر کے خطبہ دیتے ہیں۔

المستفتی: محمد فضیل، الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ وعیدین کے دو خطبوں کے درمیان تقریر کرنے کے جواز وعدم جواز میں تفصیل یہ ہے کہ اگر خطبہ اردو میں ہو، تو چونکہ یہ رسول ﷺ اور آپ کے صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، مجتہدین ومحدثین اور فقہاء متقدمین ومتأخرین کے طریقہ اور عمل کے خلاف ہے؛ اس لئے مکروہ تحریمی ہے؛ چنانچہ عمدۃ الرعایہ شرح وقایہ میں ہے۔

فإنه لا شک في أن الخطبة بغير العربية على خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة، فيكون مكروهًا تحريماً. (عمدة الرعاية، على هامش شرح الوقاية، باب أحكام صلاة الجمعة، اشرفی دیوبند ۱/ ۲۰۰)

اور اگر عربی میں ہو تو وہ خطبہ کا جزء ہے؛ اس لئے کہ درحقیقت عربی میں تقریر کرنے کا نام ہی خطبہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۹۴۶)

عیدین کے خطبہ میں امام کے سر پر چھتری پکڑنے کا حکم

سوال [۳۷۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صوبہ بنگال کے ضلع جلپائی گوڑی اور کوچ بہار میں یہ رواج ہے کہ عیدین کی نماز کے بعد جب امام صاحب خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، تو ان پر چھتری پکڑی جاتی ہے چاہے دھوپ ہو یا نہ ہو، چاہے بارش ہو یا نہ ہو، بہر صورت چھتری پکڑی جاتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ براہ کرم مع حوالہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد جہانگیر، جلپائی گوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین کے خطبہ کے دوران اگر دھوپ ہورہی ہے، یا بارش ہورہی ہے، تو چھتری لگا کر کھڑا ہوجانا بہتر اور مستحسن ہے اور اگر دھوپ بھی نہیں ہے اور بارش بھی نہیں ہورہی ہے، تو بلاضرورت خطیب کے اوپر چھتری لگا کر کھڑا ہوجانا بے ثبوت ہے اور اس کا التزام بدعت ہے اور اس کا ترک کرنا لازم ہے۔

قال الشمني: البدعة ما أحدث على خلاف الحق المتلقي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من علم أو عمل لو حال بنوع شبهة، واستحسان، وجعل ديناً قويمًا وصراطًا مستقيما. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب البدعة خمسة أقسام، زكريا ديوبند۲/ ۲۹۹، كراچي ۱/ ۵۶۰)

قال ابن المنير: إن المندوبات قد تنقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها.

(فتح الباري، كتاب الاذان، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، رقم:۸۵۲، دارالفكر ۲/ ۳۳۶، اشرفي ۲/ ۴۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۰۳۶/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۵/۲۲ھ

(۳) فصل في صلاۃ العید في المسجد وغیرہ

مسنون عیدگاہ

سوال [۴۷۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدگاہ کہاں بنائی جائے اور عیدگاہ کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کیا کیا مندوب ومسنون؟

(۲) ایسے خیمہ جو بیاہ شادی کے پروگراموں میں لگائے جاتے ہیں، اسی طرح کے خیمہ عیدگاہ میں بوقت نماز وتقریر لگانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عمر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) عید کی نماز ان علاقوں میں جائز ہے، جہاں پر جمعہ کی نماز جائز ہوتی ہے، یعنی شہر، قصبات اور ایسے بڑے گاؤں میں عید اور جمعہ کی نماز جائز ہوتی ہے، جو گاؤں قصبہ نما ہوتا ہے، جس کی آبادی ۳۰۰۰/ ہزار سے متجاوز ہو اور عیدگاہ کا آبادی سے باہر صحراء اور جنگلوں میں ہونا افضل اور مسنون ہے۔ (مستفاد: محمود یہ ڈابھیل ۸/۴۰۹)

تصح صلاۃ العیدین بما تصح به الجمعة إشارة إلی المصر والسلطان. (الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الصلاۃ، الفصل السادس العشرون في صلوۃ العیدین، زکریا ۲/۶۰۸، رقم: ۳۴۱۹)

عن عطاء بن السائب رضؓ، قال: صلیت الفجر في هذا المسجد في یوم فطر، فإذا عبد الرحمن، وعبد اللّٰہ بن معقل، فلما قضیا الصلاۃ خرجا وخرجت معهما إلی الجبانة. (مصنف لابن أبي شیبة، مؤسسة علوم القرآن بیروت ۴/۱۹۱، رقم: ۵۶۵۸)

عن أبي سعید الخدري رضؓ، قال: کان النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم یخرج

یوم الفطر، والأضحی إلی المصلیٰ. (بخاري شریف، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی ۱/۱۳۱، رقم:۹۴۶، ف:۹۵٦)

عن عليؓ: الخروج إلی الجبانة في العیدین من السنة، ثم خروجه ماشیًا إلی الجبانة، وهي المصلی العام. وتحته في الشامیة: أي في الصحراء. (المعجم الأوسط، دار الکتب العلمیة ۳/۱۱٦، رقم:۴۰۴۰، شامي، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین، مطلب یطلق المستحب علی السنة، کراچي ۲/۱٦۸، زکریا ۳/۴۸)

الخروج إلی الجبانة في صلوة العید سنة، وإن کان یسعهم المسجد الجامع، علی هذا عامة المشائخ، وهو الصحیح. (هندیة، الباب السابع عشر في صلاة العید، زکریا قدیم ۱/۱۵۰، جدید ۱/۲۱۱، تاتارخانیة ۲/٦۱۱، رقم:۳۴۲۳)

فالأفضل أداؤها في الصحراء في سائر البلدان. (مرقات المفاتیح شرح مشکوة المصابیح، کتاب الصلاة، باب صلوة العیدین، الفصل الثاني، الأولیٰ أن یصلی العید في الصحراء...... إمدادیه ملتان پاکستان ۳/۲۹۸)

(۲) جن ایام میں صبح سے ہی سورج کی دھوپ تیز ہوجاتی ہے، ان ایام میں دھوپ سے حفاظت کے لئے عیدگاہ میں خیمہ لگادیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ زیب وزینت مقصود نہ ہو۔

مأ ابیح للضرورة یتقدر بقدرها. (الأشباہ والنظائر قدیم ص: ۱۴۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۵۵۵)

نماز عید کون سی عیدگاہ میں ادا کی جائے؟

سوال [۴۷۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے عید کی نماز کے لئے اپنی زمین دی؛ حالانکہ کافی عرصہ سے اس زمین پر

عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں اور زید نے اس زمین کی رجسٹری نہیں کی ہے؛ جبکہ لوگوں نے عید گاہ کے نام سے رجسٹری کرنے کو کہا تو زید نے رجسٹری کرنے سے انکار کردیا، پھر بھی اس میں نماز ہوتی ہے، تو عمر نے دوسری زمین کی عیدگاہ کے نام سے رجسٹری کردی ہے اور دونوں عیدگاہ میں نمازیں ہوتی ہیں، دونوں عیدگاہ کے درمیان چالیس یا پچاس میٹر کا فاصلہ ہے، دونوں عیدگاہ میں سے کون سی عیدگاہ میں نماز جائز ہے؟

المستفتی: علی مرتضی، قاسمی دارالشفاء، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دوسری زمین چونکہ باضابطہ عیدگاہ کے لئے رجسٹری کردی گئی ہے؛ اس لئے اس پر نماز عید بلاشبہ جائز ہے اور پہلی زمین؛ چونکہ مالک کی ملکیت ہے تو اس پر اس شرط کے ساتھ نماز جائز ہے کہ مالک زمین نے عید کے موقع پر اپنی خوشی سے اس میں نماز کی اجازت دے دی ہو، بشرطیکہ الگ الگ دو جماعتیں نہ ہوں۔

تؤدي بمصر واحد بمواضع كثيرة اتفاقاً. (در مختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة العيد، زكريا ۳/۵۹، كراچي ۲/۱۷۶)

رجل له ساحة لابناء فيها أمر قومًا أن يصلوا فيها بجماعة، فهذا على ثلاثة أوجه: أحدها: إما أن أمرهم بالصلاة فيها أبداً نصاً، بأن قال صلوا فيها ابدًا، أو أمرهم بالصلاة مطلقاً ونوىٰ الأبد، ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجداً لو مات لا يورث عنه، وأما إن وقت الأمر باليوم، أو الشهر، أو السنة، ففي هذا الوجه لا تصير الساحة مسجداً لو مات يورث عنه. (هندية، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد و مايتعلق به، الفصل الأول فيما يصيربه مسجداً، زكريا قديم ۲/۴۵۵، جديد ۲/۴۰۹، الفتاوى التاتار خانية، كتاب الوقف، الفصل الحادى والعشرون في المساجد، زكريا۸/۱۵۷، رقم:۱۱۴۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۶۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۱۷ھ

عید کی نماز مساجد میں ادا کی جائے یا عید گاہ میں؟

سوال [۴۷۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں ہر محلّہ کی الگ الگ مسجد ہے، جس میں اسی محلّہ کے آدمی نماز پڑھتے ہیں اور ہر محلّہ کے لوگ اپنی اپنی مسجد میں عید کی نماز بھی ادا کرتے ہیں، ہمارے محلّہ کے لوگوں کی ایک عید گاہ کی زمین، دوسرے محلّہ کے بیچ میں ہے، جس میں ہم عید کی نماز ادا کرتے ہیں اور ہم مسجد میں عید کی نماز ادا نہیں کرتے، ہر مسجد کی الگ الگ کمیٹی بھی ہے، ہر کمیٹی اپنا امام مؤذن اور عید کے امور طے کرنے میں مستقل ہیں، اب چند سال پہلے ہمارے علاقہ میں ایک بڑی مسجد مرکز کے نام سے بنی ہے، جو گاؤں کی آبادی سے باہر ہے، اگر چہ وہاں بھی اب نئی آبادی دھیرے دھیرے بس رہی ہے اور اس مرکز کی مسجد کافی بڑی ہے اور اس کا احاطہ تقریباً ۳۰-۳۵ بیگھہ زمین کو لیے ہوئے ہے، جس میں ہمارے تمام محلّہ کے لوگ اگر اپنی اپنی مسجد میں عید کی نماز چھوڑ کر ایک جگہ اکٹھا نماز ادا کریں تو بھی وہ جگہ نہیں بھرے گی، مرکز کی طرف سے تمام مساجد میں یہ بات چلائی جاتی ہے کہ وہاں نماز ادا کی جائے، جس سے محلّہ کے متولیوں کو ناگواری ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ......

(۱) کیا ان مساجد کی متفرق عید کی نماز کو ختم کر کے اس ایک بڑی مرکز مسجد میں اکٹھا عید کی نماز کا نظم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ہر محلّہ کی کمیٹی سے اس سلسلہ میں بات طے کر لیں؟

(۲) یا جس طرح نماز ہو رہی ہے ہونے دیں اور مرکز میں جو چاہے اپنی مرضی سے آئے اور اپنی نماز عید ادا کرے؟

(۳) کیا ہر محلّہ کے لوگ اپنی اپنی مسجدوں کو چھوڑ کر نماز عید کے لئے مرکز میں شرکت کریں یہ بہتر ہوگا، یا اپنی اپنی مساجد میں جیسے پڑھتے آئے ہیں یہ بہتر ہے؟

المستفتی: حاجی شاہ عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کی نماز آبادی سے باہر عیدگاہ میں ادا کرنا مسنون ہے اور اگر عیدگاہ پہلے سے تیار شدہ نہیں ہے، تو آبادی سے باہر کہیں بھی کھلی فضا میں عید کی نماز ادا کی جائے، تو سنت ادا ہو جائے گی اور محلّہ کی مسجدوں میں عید کی نماز پڑھنے کے بجائے آبادی سے باہر عیدگاہ میں پڑھنا زیادہ افضل اور مسنون ہے۔ اور جس مرکزی مسجد کا ذکر کیا گیا ہے، اگر اس میں ہر محلّہ کے مسلمان آسانی سے اکٹھے ہو سکتے ہیں، جیسا کہ سوال نامہ میں ذکر ہے تو محلّہ کی مسجدوں کے مقابلہ میں سب لوگوں کا وہاں اکٹھا ہو کر نماز عید ادا کرنا بہتر ہوگا؛ اس لئے کہ عید کی نماز میں مسلمانوں کا اجتماع اور شوکت اسلام بھی مقصود ہوتا ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضـ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يخرج يوم الفطر، والأضحى إلى المصلیٰ. (بخاري شريف، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر ١/ ١٣١، رقم:٩٤٦، ف:٩٥٦)

عن علي رضـ قال: الخروج إلى الجبانة في العيدين من السنة. (المعجم الأوسط للطبراني، دار الفكر بيروت ٣/ ١١٦، رقم:٤٠٤٠)

والخروج إليها أي الجبانة لصلوة العيد سنة، وإن وسعهم المسجد الجامع، هو الصحيح. (تنوير مع الدر، كتاب الصلاة، باب صلوة العيدين، مطلب يطلق المستحب على السنة، كراچي ٢/ ١٦٨، زكريا ٣/ ٤٩، تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس و العشرون في شرائط صلوة العيد، زكريا ٢/ ٦١١، قديم ٢/ ٨٩، رقم:٣٤٢٣)

ذلک أي الخروج إلى الصحراء لصلوة العيد أفضل من صلاتها في المسجد لمواظبة النبي صلى الله عليه وسلم على ذلک مع فضل مسجده. (فتح الباري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى الخ جديد اشرفيه ديو بند ٢/ ٥٧٢، قديم دار الريان للتراث العربى ٢/ ٥٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۹۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۶ھ

بلا عذر عیدگاہ چھوڑ کر مسجد میں نماز عید

سوال [۳۷۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے محلّہ کے قریب میں ہی عیدگاہ ہے، مگر عید وبقرعید کی نماز محلّہ کی مسجد میں منتظمین مسجد اس غرض سے کراتے ہیں کہ مسجد کے لئے چندہ آجائے گا، برائے کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا عید الفطر وعید الاضحیٰ کی نماز محلّہ کی مسجد میں پڑھی جاسکتی ہے؟ جبکہ عیدگاہ قریب بھی ہو اور عیدگاہ تک جانے میں نہ بیماری کا خطرہ ہو، نہ مال کا اور نہ جان کا۔

المستفتی: مصلیان مسجد محلّہ یوسف نگر جیون گڈھ، علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدگاہ کا آبادی سے باہر ہونا سنت مؤکدہ ہے اور بغیر عذر آبادی سے باہر عیدگاہ میں نماز عید نہ پڑھ کر آبادی کے اندر مسجد یا میدان میں پڑھنا خلاف سنت ہے اور ترک سنت مؤکدہ کا گناہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۰۹، احسن الفتاوی ۴/۱۱۹)

عن أبي سعید الخدريؓ، قال: کان النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یخرج یوم الفطر، والأضحی إلی المصلیٰ. (بخاري شریف، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر ۱/ ۱۳۱، رقم: ۹۴۶، ف:۹۵۶)

والخروج إلیها أي الجبانة لصلوة العید سنة، وإن وسعهم المسجد الجامع، هو الصحیح الخ (الدر المختار، کتاب الصلاة، باب صلوة العیدین، مطلب یطلق المستحب علی السنة وبالعکس، زکریا ۳/ ۴۹، کراچي ۲/ ۱۶۹،تاتار خانیة، کتاب الصلاة، الفصل السادس و العشرون في شرائط صلوة العید، زکریا ۲/ ۶۱۱، قدیم ۲/ ۸۹، رقم:۳۴۲۳)

الخروج إلی الجبانة في صلوة العید سنة، وإن کان یسعهم المسجد الجامع،

علی هذا عامة المشایخ، وهو الصحیح. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العید، زکریا قدیم ۱/ ۱۵۰، جدید ۱/ ۲۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۷۹)

عیدگاہ میں نہ جاکر مسجد میں بلا عذر نماز عید ادا کرنا

سوال [۳۷۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گاؤں جس کی مسلم غیر مسلم کل آبادی تقریباً تین ہزار ہے، اس بستی میں ہی کفن دفن وغیرہ کی ضروریات بھی پوری ہوجاتی ہیں، پانچ مسجدیں ہیں، ہر مسجد میں مسجد کی ابتداء سے جمعہ کی نماز ہوتی ہے، اس گاؤں اور قرب وجوار میں جتنے گاؤں ہیں، ان سب کی ایک بہت بڑی عیدگاہ ہے، جو باہر کھلے میدان میں ہے، سبھی قرب وجوار والے لوگ عید کی نماز کے لئے عیدگاہ آتے ہیں، مگر اس بستی کے چند لوگ مل کر عید کی نماز مسجد میں پڑھتے ہیں اور مسجد میں عید کی نماز سے قبل فجر کے بعد فوراً قربانی کا جانور ذبح کردیتے ہیں، تو کیا ان حضرات کے لئے عیدگاہ ترک کرکے محلّہ کی مسجد میں عید کی نماز پڑھنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رفیق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسے گاؤں میں عید کی نماز واجب ہے جس کی آبادی تقریباً تین ہزار یا اس سے زائد ہو اور جب گاؤں کے لئے آبادی سے باہر باضابطہ عیدگاہ موجود ہے، تو عیدگاہ کو چھوڑ کر بلا عذر گاؤں کی مسجد میں عید کی نماز پڑھنا خلاف سنت ہے؛ اس لئے کہ عید کی نماز آبادی سے باہر جو عیدگاہ متعین کی گئی ہے وہیں پڑھنا مسنون ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۹/ ۱۱۷، جدید ڈابھیل ۸/ ۴۰۴، فتاوی دار العلوم ۵/ ۱۸۵، امداد الاحکام ۲/ ۳۴۶)

عن أبي سعيد الخدريؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يخرج يوم الفطر، والأضحى إلى المصلىٰ. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر ۱/۱۳۱، رقم:۹٤٦، ف:۹٥٦)

عن عليؓ قال: الخروج إلى الجبانة في العيدين من السنة. (المعجم الأوسط للطبراني، دار الفكر ۳/۱۱٦، رقم: ٤٠٤٠)

والخروج إليها أي الجبانة لصلوة العيد سنة، وإن وسعهم المسجد الجامع، هو الصحيح. (الدرالمختار على هامش رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صلوة العيدين، كراچي ۲/۱٦۸، زكريا ۳/٤۹، فتاوى عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في العيدين، زكريا قديم۱/۱٥٠، جديد۱/۲۱۱)

والخروج إلى الجبانة لصلوة العيد سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشايخ. (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون في شرائط صلوة العيد ۲/٦۱۱، رقم:۳٤۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۴۲۱)

شہر کی جامع مسجد میں عیدین کی نماز ادا کرنا

سوال [۳۷۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا قصبہ بہت سے مواضعات پر مشتمل ہے، جہاں چیرمین کا انتخاب ہوتا ہے، تقریباً چار سال سے شہر کی جامع مسجد میں بھی لوگ نماز عیدین ادا کرتے ہیں، اب ایک عالم نے کہا ہے کہ جامع مسجد میں نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں آں محترم سے درخواست ہے کہ اس عالم کا قول کہاں تک درست ہے؟ امید ہے کہ جلد جواب مرحمت فرمائیں گے۔

(۲) واضح رہے کہ اس عالم کو آپ کی اس تحریر پر بھی ''اگر عیدگاہ آبادی کے اندر آگئی ہے، تو ایسی عیدگاہ سے سنت مؤکدہ کا حکم ختم ہوجاتا ہے'' جو ترجمان دیوبند شوال المکرّم کے شمارہ میں موجود ہے، اس پر بھی اعتراض ہے۔

المستفتی: ظفر الاسلام، دارالعلوم، مؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) آبادی سے باہر عیدگاہ میں جا کر نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے، بلاعذر ایسی عیدگاہ کو ترک کر کے شہر میں نمازِ عید پڑھنا مکروہ اور خلاف سنت ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۳۵، فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۹۸/۵، کفایت المفتی قدیم ۲۴۵/۳، جدید زکریا ۲۹۳/۳، جدید زکریا مطول ۲۹۱/۵، امداد الفتاوی ۶۱۰/۱)

عن أبي سعید الخدري رضي الله عنه قال: کان النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم یخرج یوم الفطر، والأضحی إلی المصلیٰ. (صحیح البخاري، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر ۱/۱۳۱، رقم: ۹۴٦، ف: ۹۵٦)

چنانچہ جناب نبی کریم ﷺ اسی مقصد کے پیش نظر مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کی فضیلت کے باوجود باہر جنگل وصحراء میں جا کر عید کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۱٦/۷، ڈابھیل ۴۰۵/۸)

ذلک أفضل من صلاتها في المسجد لمواظبة النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم علی ذلک مع فضل مسجده. (فتح الباري، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی، قدیم بیروت ۵۲۲/۲، جدید اشرفیه دیوبند ۵۷۲/۲)

ہاں البتہ اگر کوئی عذر ہو مثلاً بارش یا سخت سردی یا ضعفا ومعذورین ہوں، تو ایسی صورت میں شہر کی مساجد میں نمازِ عید ادا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۴۵/۳، جدید زکریا ۲۹۳/۳، جدید زکریا مطول ۲۹۱/۵، ایضاح المسائل ص: ۳۳)

ولا یصلی في المسجد إلا عن ضرورة...... وقال الشافعي في الأم:

بلغنا أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يخرج في العيدين إلى المصلى بالمدينة، وكذا من بعده إلا من عذر مطر ونحوه. (عمدة القاري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى، دار إحياء التراث العربي ٢٨١/٦، زكريا ١٧١/٥)

ويستخلف غيره ليصلى في المصر بالضعفاء بناء على أن صلاة العيدين في موضعين جائزة بالاتفاق. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ١٦٨/٢، زكريا ٤٩/٣، مصرى ٧٧٧/١)

(۲) اگرعیدگاہ آبادی کے اندر آگئی ہے، تو ایسی عیدگاہ سے سنت مؤکدہ کا حکم ختم ہوجاتا ہے؛ اس لئے کہ آبادی سے باہر میدان اور صحراء میں نماز عید پڑھنے کا اصل مقصد شوکت اسلام کا مظاہرہ ہے۔ اور جب عیدگاہ آبادی کے اندر آجائے تو مقصد فوت ہوجانے کی وجہ سے اصل عیدگاہ کا حکم باقی نہیں رہے گا؛ لہٰذا وہاں نماز پڑھنا اور شہر کی مسجدوں میں نماز پڑھنا برابری کا حکم رکھتا ہے، کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۳۴، فتاوی دارالعلوم ۲۰۸/۵، امدادالفتاوی ۶۴۳/۱)

تؤدي بمصر واحد بمواضع كثيرة اتفاقاً. (الدر المختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة العيدين، مطلب أمر الخليفة لايبقي بعد موته زكريا ٥٩/٣، كراچي ١٧٦/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۱۹۷/۳۵)

عیدین کی نماز مسجد میں ادا کرنے سے عیدگاہ کا ثواب

سوال [۳۷۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک جگہ پر تین مسجدیں ہیں، عیدگاہ نہ ہونے کی بنا پر گاؤں والے عیدین کی نماز بھی

شہر کی بڑی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مالی حالت قوی اور مضبوط ہونے کے باوجود عیدگاہ نہ ہونے کی بناء پر بار بار مسجد ہی میں عیدین کی نماز ادا کرنے سے عیدگاہ میں نماز ادا کرنے کے برابر ثواب ملے گا یا نہیں؟ اور عیدگاہ کا انتظام نہ کرنے کی وجہ سے شہر والے عنداللہ مجرم ہوں گے؟

المستفتی: انس فاروق، گودھر، اپنچ محل، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی عیدگاہ جو آبادی سے بالکل باہر صحراء میں ہوتی ہے، اس میں عیدگاہ کی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور اس میں عید کی نماز پڑھنے کا مقصد اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہے اور جن شہروں میں عیدگاہ آبادی کے اندر آگئی ہے، ان کا حکم اور شہر کی جامع مسجد اور بڑی مسجدوں کا حکم تقریباً یکساں ہے، جن میں آبادی سے باہر صحراء میں عید کی نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل نہیں ہوتی ہے۔

عن أبي سعید الخدريؓ، قال: کان النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یخرج یوم الفطر، والأضحی إلی المصلیٰ. (صحیح البخاري، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر ۱/ ۱۳۱، رقم: ۹۴۶، ف: ۹۵۶)

حتی لو صلی العید في الجامع و لم یتوجہ إلی المصلیٰ، فقد ترک السنۃ الخ (البحرالرائق، کتاب الصلاۃ، باب العیدین، زکریا ۲/ ۲۷۸، کوئٹہ ۲/ ۱۵۹)

اور عیدگاہ کی باقاعدہ تعمیر کرنا لازم نہیں ہے؛ بلکہ شہر اور آبادی سے باہر جنگلوں میں کسی بھی میدان میں عید کی نماز ادا کرنے سے عیدگاہ کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے اور جس میدان میں عید کی نماز پڑھی جائے، اس میں کھیتی باڑی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

عن عليؓ: الخروج إلی الجبانۃ في العیدین من السنۃ. (المعجم الأوسط ۳/ ۱۱۶، رقم: ۴۰۴۰)

والخروج إلیھا، أي الجبانۃ لصلوۃ العید سنۃ. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب

صلوة العيدين، مطلب يطلق المستحب على السنة وبا لعكس، كراچي ۲/ ۱۶۹، زكريا ۳/ ۴۹)

والخروج إليها، أي الجبانة لصلوة العيد سنة. وفي الحاشية: قوله سنة: فلو لم يتوجه إليها فقد ترك السنة. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صلوة العيدين، كوئٹه ۱/ ۳۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رصفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۲۲/ ۱۱۰۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۲/ ۱۴۳۴ھ

فتنہ سے بچنے کے لئے کچھ لوگوں کا محلّہ کی مسجد میں نماز عید ادا کرنا

سوال [۳۷۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا قصبہ بارہ چودہ محلات پر مشتمل ہے، زمانہ قدیم سے ایک عیدگاہ قائم ہے، جس میں قصبہ کے پانچ سات محلے اور بیسیوں دیہات کے دیوبندی مسلک کے مسلمان نماز عید ادا کرتے ہیں، ادھر چند سالوں سے کچھ لوگوں نے اس میں ایک فتنے کی شکل پیدا کی، اس میں ناکامی کے بعد ایک محلّہ کی جامع مسجد میں نماز عید پڑھنی چاہی؛ لیکن مسجد کی کمیٹی نے مخالفت کی اور پڑھ نہیں سکے، تو ایک غیر جامع مسجد میں نماز عید تیس پینتیس آدمیوں نے ادا کرلی، پھر ہنگامہ کر کے ایک جدید انتخاب کیا اور جامع مسجد پر مسلط ہو گئے اور عیدین کی نماز پڑھنے لگے، ادھر ایک دوسری عیدگاہ کے ایک مصلی قاری صاحب اپنی عیدگاہ کے امام سے عناد کی وجہ سے الگ ہو کر اسی جامع مسجد میں آکر امامت کرنے لگے، اس سال ہماری عیدگاہ کے خطیب نے کہا کہ عیدگاہ کی موجودگی میں بلا عذر شرعی کے مسجد میں نماز عید پڑھنا مکروہ ہے، پانچ چھ ماہ کے بعد قاری صاحب نے اپنی جامع مسجد سے خطبۂ جمعہ میں متواتر دو تین جمعہ تک تقریر کرتے ہوئے بہت اشتعالی انداز میں فرمایا کہ جامع مسجد میں نماز عید پڑھنا بغیر کسی عذر کے مطلقاً درست ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں۔

نیز عیدگاہ تو اب آبادی میں آ گئی ہے تو مسجد کے حکم میں ہوگئی، عربی، فارسی، اردو کی ڈیڑھ سو کتابوں کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ سمجھا ہے کہ عیدگاہ کو بلا عذر چھوڑ کر مسجد میں نماز عید ادا کرنا مکروہ نہیں ہے۔ اور کتابوں کی فہرست بھی پڑھ کر سنائی۔ فتاوی شامی، شرح وقایہ، بدائع الصنائع، امداد الفتاوی، فتاوی دارالعلوم، فتاوی محمودیہ وغیرہ وغیرہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ صرف معذورین، ضعفاء، مرضیٰ یا تنگیٔ عیدگاہ کی صورت میں مسجد میں نماز عید پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ نیز انہوں نے عیدگاہ پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ تو مسجد کے حکم میں ہے اور مفتی شبیر احمد صاحب مرادآبادی کا حوالہ بھی دیا اور کوئی تحریر ان کی نہیں دکھائی، پتہ چلا ہے کہ کوئی استفتاء بھی آپ کے نام ارسال کیا تھا، جس کا جواب یہاں پہونچ گیا ہے، اس کی فوٹو کاپی ساتھ میں منسلک ہے۔

(۱) نماز عید سے متعلق جو آپ نے لکھا ہے، نہ اس سے اختلاف ہے اور نہ عیدگاہ کی آبادی میں آجانے کے مسئلہ سے اختلاف ہے؛ البتہ سوال یہ ہے کہ ہماری عیدگاہ جس نوعیت کی ہے کیا وہ آبادی کی تعریف میں آتی ہے؟

(۲) نیز اگر آبادی کی تعریف میں آتی ہے، تو اس سے اختلاف کر کے کسی مسجد میں صرف پچاس ساٹھ آدمی کو لے کر نماز عید پڑھنا اور عیدگاہ کو چھوڑ دینا، جس میں کئی ہزار مسلمان نماز عید ادا کرتے ہیں اور اتنے آدمی کی مزید گنجائش موجود ہے، کیا حکم ہے؟

عیدگاہ کی نوعیت یہ ہے کہ اس کے مصلی پانچ سات قصبہ کے محلّہ جو ایک کلومیٹر اور نصف کلو میٹر پر پڑتے ہیں اور بیسیوں دیہات جو پانچ سے سات کیلومیٹر پر پڑتے ہیں ادھر چند سالوں سے کچھ لوگ آ کر عیدگاہ کے قریب آباد ہوگئے ہیں جو عید تو اسی عیدگاہ میں پڑھتے ہیں؛ لیکن نماز جمعہ دوسرے محلّہ میں جا کر پڑھتے ہیں؛ البتہ پنجوقتہ نماز کے لئے ایک چھوٹی سی مسجد حال ہی میں تعمیر کر لی ہے۔ جواب لکھتے وقت آپ کے ذہن میں یہ بات رہے کہ اس مسلک کے تمام ہی مسلمان اسی عیدگاہ میں نماز عید پڑھتے رہے ہیں، کبھی کسی نے اختلاف کر کے نہ

دوسری جگہ نماز عید پڑھی اور نہ ہی عید گاہ میں تنگی ہوئی اور عید گاہ جاتے وقت مختلف راستوں پگڈنڈیوں اور شاہراہوں پر شوکت اسلام کا منظر قابل دید رہتا ہے اور جو لوگ جامع مسجد میں پڑھتے ہیں، ان کی تعداد پچاس ساٹھ سے متجاوز نہیں ہے۔ اور کفار بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی پھوٹ کی بنیاد پر یہ لوگ یہاں پر نماز عید پڑھتے ہیں، ان دونوں باتوں کا جواب شریعت مطہرہ کی روشنی میں تحریر فرمائیں تاکہ اس قصبہ میں ایک مسلک کے لوگوں کے مابین واقع نزاع کو ارباب حل وعقد بیٹھ کر ختم کرسکیں۔

نوٹ: عید گاہ سال بھر بند رہتی ہے، نہ اذان ونماز پنج گانہ ہوتی ہے نہ کوئی پروگرام، صرف نماز عیدین کے لئے کھولی جاتی ہے۔

المستفتی: حاجی سفیان قاسمی، گھوسی، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے یہاں کی عید گاہ ہم نے نہیں دیکھی ہے، اگر وہ آبادی میں آگئی ہے تو مسجد اور اس میں نماز پڑھنا برابر ہے، چاہے وہاں پر دوسرے گاؤں دیہات کے لوگ بھی آکر نماز پڑھتے ہوں۔ آقائے نامدار ﷺ آبادی سے باہر نماز عید کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور اس عید گاہ سے کافی دور دور کے لوگ دوسرے محلوں سے آپ کے ساتھ نماز عید کے لئے آیا کرتے تھے، جیسا کہ بنو سلمہ، بنو حارثہ، بنو عبد الأشہل، بنو عمرو بن عوف، یہ سب لوگ گاؤں، دیہات سے الٹے شہر کی طرف آتے تھے؛ لہٰذا آپ کی جو عید گاہ آبادی کے اندر آگئی ہے، اس کو مسجد یا مدرسہ یا قبرستان کے لئے لے کر اس کے عوض میں آبادی سے باہر شرعی عید گاہ بنائی جائے، جس میں مختلف محلات کے لوگ نماز کے لئے آئیں گے، تو اس کی مخالفت قطعاً جائز نہ ہوگی۔ اور اب جو صورت حال بتائی جارہی ہے، اس میں نماز نہ پڑھ کر اگر کچھ لوگ مسجد میں نماز پڑھ لیں تو ان پر کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ یہ نماز اختلاف اور فتنہ برپا کرنے کے لئے نہ ہو، سہارنپور میں حضرت شیخؒ کی معیت میں سب سے پہلے مسجد میں عید کی نماز ہوئی تھی؛ جبکہ وہاں بھی عید گاہ آبادی میں آگئی تھی، مگر اس میں کسی کی مخالفت

مقصود نہیں تھی۔ بہرحال آبادی میں آئی ہوئی عیدگاہ میں نماز پڑھنا اور مسجد میں نماز پڑھنا دونوں برابر ہے، مگر فتنہ وفساد بھی قطعاً جائز نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۷۲۲۵)

مساجد میں عید کی نماز پڑھنا

سوال [۴۷۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر کی بہت سی مسجدوں میں عیدین کی نماز پڑھی جاتی ہے، جامع مسجد میں بھی ہوتی ہے اور محلّہ کی چار پانچ مسجدوں میں بھی عیدین کی نماز پڑھی جاتی ہے؛ جبکہ عیدگاہ جانے میں کوئی پریشانی بھی نہیں ہے، اس صورت میں کیا حکم ہے؟ اگر کراہت ہے تو کون سی؟

المستفتی: اسرار احمد، نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آبادی کے باہر صحراء میں شرعی عیدگاہ ہے اور وہاں عید کی نماز پڑھنے میں کوئی عذر بھی نہیں ہے، تو ایسی عیدگاہ کو چھوڑ کر تمام لوگوں کا آبادی کی مساجد میں عید کی نماز ادا کرنا خلاف سنت ہے، ہاں البتہ عیدگاہ میں نماز ہوتی ہے اور بعض مساجد میں بھی نماز ہوتی ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ نیز اگر عیدگاہ آبادی کے اندر آگئی ہے، تو وہ مسنون عیدگاہ کے دائرہ سے خارج ہوگئی ہے، اس میں نماز پڑھنا اور مسجدوں میں نماز پڑھنا برابر کا حکم رکھتا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۳۵، امداد الفتاوی ۱؍۶۴۳، کفایت المفتی قدیم ۳؍۲۴۶، جدید زکریا ۳؍۲۹۳، مطول ۵؍۲۹۰)

وفیہ: البروز إلی المصلی والخروج إلیہ، ولایصلي في المسجد إلا عن ضرورۃ، وروي ابن زیاد عن مالک قال: السنۃ الخروج إلی الجبانۃ.

(عمدة القاری، کتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی قدیم ۲۸۱/٦، جدید زکریا دیو بند ۱۷۱/۵، فتاوی محمودیه قدیم ۲۱٦/۷، جدید ڈابھیل ٤۰۵/۸)

عن أبي سعيد الخدري رضـ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يخرج يوم الفطر، والأضحى إلى المصلىٰ. (صحیح البخاري، کتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر ۱۳۱/۱، رقم: ۹٤٦، ف: ۹۵٦)

عن علي رضـ: الخروج إلى الجبانة في العيدين من السنة. (المعجم الأوسط، دار الفكر بيروت ۱۱٦/۳، رقم: ٤۰٤۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍شوال المکرّم ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۹۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۱۰/۳۰ھ

عیدگاہ سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مساجد میں عید کی نماز ادا کرنا

سوال [۴۷۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں عید کی نماز عیدگاہ میں تاخیر سے ہوتی ہے؛ جبکہ محلّہ کی مسجد میں عیدگاہ سے ڈیڑھ، دو گھنٹہ پہلے ہوتی ہے، تو کیا اس طرح سے محلّہ کی مسجد میں نماز درست ہوجائے گی اور اس مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، کسی قسم کی کوئی کراہت تو نہیں ہے؟

المستفتی: محمد شمس الہدیٰ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کے دن عیدگاہ کی نماز سے پہلے مساجد میں عید کی نماز پڑھنا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔

ووقت الصلوة من الارتفاع إلى الزوال. (شامي، کتاب الأضحية، کراچي ۳۱۸/٦، زکریا ٤٦۱/۹)

ولو ضحىٰ بعد ما صلى أهل المسجد، ولم يصل أهل الجبانة أجزأه استحساناً؛ لأنه صلاة معتبرة، حتى لو اكتفوا بها أجزأتهم. وقال العلامة ابن الهمام رحـ:

لأن کون صلاة أهل المسجد صلاة معتبرة لاینافي کون صلاة أهل الجبانة أیضاً صلاة معتبرة. (هدایه مع فتح القدیر، کتاب الأضحیه، کوئٹه ۸/ ۴۳۱، زکریا ۹/ ۵۲۷، شامي، کتاب الأضحیه، زکریا ۹/ ۴۶۰، کراچي ۶/ ۳۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۶۰۵)

عیدگاہ سے پہلے مساجد میں نماز عید

سوال [۴۷۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک عیدگاہ میں عید کی نماز نہ ہوجائے تب تک گاؤں کی مسجد میں عید کی نماز صحیح نہیں ہوتی، پہلے عیدگاہ میں نماز ہوجائے، پھر مسجدوں میں عید کی نماز صحیح ہوگی، کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے؟

المستفتي: محمد ظاہر، محلّہ: کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شہر کی مسجدوں میں عیدین کی نماز عیدگاہ سے پہلے ادا کرنا بلاکراہت درست ہے۔

ولو ضحیٰ بعد ما صلی أهل المسجد، ولم یصل أهل الجبانة أجزأه استحساناً؛ لأنها صلوة معتبرة الخ (شامي، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۶۰، کراچي ۶/ ۳۱۸)

ولو ضحیٰ بعد ما صلی أهل المسجد، ولم یصل أهل الجبانة أجزأه استحساناً؛ لأنه صلاة معتبرة، حتی لو اکتفوا بها أجزأتهم. وقال العلامة ابن الهمام: لأن کون صلاة أهل المسجد صلاة معتبرة لاینافي کون صلاة أهل الجبانة أیضاً صلاة معتبرة. (هدایه مع فتح القدیر، کتاب الأضحیه، کوئٹه ۸/ ۴۳۱، زکریا

۵۲۶/۹، شامي، کتاب الأضحیه، زکریا ۴۶۰/۹، کراچي ۳۱۸/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۵/صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۰۷۲/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۲/۲۳ھ

قبلہ رخ قبریں ہوتو عیدگاہ میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

سوال [۳۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بہت بڑا پرانا قبرستان ہے اور آج سے تقریباً دس سال پہلے اس قبرستان کے متصل مشرقی جانب عیدگاہ کی زمین خریدی گئی؛ لیکن ابھی تک عیدگاہ نہیں بنائی گئی ہے اور امسال ۱۹۹۸ء میں بقرعید کی نماز پڑھی گئی، عیدگاہ کے مغربی جانب قبرستان اور مشرقی جانب کاشتکاری کی زمین اور شمالی جانب بھی کاشتکاری کی زمین اور جنوب میں تالاب ہے، اس عیدگاہ میں نماز ہوگی یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے اور دوسال میں عیدگاہ بنانے کا اراداہ ہے۔ انشاء اللہ۔

المستفتی: سمیع الدین، مہراج گنجی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب قبریں عیدگاہ کے احاطۂ زمین سے باہر ہیں تو وہاں عیدین کی نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، چاہے قبرستان قبلہ کی جانب کیوں نہ ہو، وہاں بلاتردد نماز عید جائز ہے۔

لاتکره الصلوة في جهة قبر إلا إذا کان بین یدیه بحیث لو صلی صلوة الخاشعین وقع بصره علیه. (شامي، کتاب الصلاة، باب مایفسد الصلوة وما یکره فیها، مطلب: في بیان السنة، والمستحب، کراچي ۶۵۴/۱، زکریا ۴۲۵/۲، هندیة، کتاب الصلاة، الباب السابع فیما یفسد الصلاة، الفصل الثاني فیما یکره في الصلوة وما لا

یکره، زکریا قدیم ۱/ ۱۰۷، جدید ۱/ ۱۶٦، تاتار خانیة، کتاب الصلاة، الفصل الرابع في ما یکره للمصلي و ما لا یکره، زکریا ۲/ ۲۱۳، رقم: ۲۱۹۸، قدیم ۱/ ۵۷۰)

ولا بأس بالصلوة فیها إذا کان فیها موضع أعد للصلاة و لیس فیه قبر ولا نجاسة، کما في الخانیة. (شامي، کتاب الصلاة، قبیل مطلب تکره الصلاة في الکنیسة، زکریا ۲/ ۴۲، کراچي ۱/ ۳۸۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۷۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۱ھ

جولوگ عید کی نماز میں پیچھے رہ گئے وہ کیا کریں؟

سوال [۴۷۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں عید کی نماز میں کچھ لوگ پیچھے رہ گئے تھے، بعد میں ان لوگوں نے دوبارہ عید کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو ایک حنفی عالم نے کہا کہ دوبارہ عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، اس جملہ کو سن کر ایک غیر مقلد عالم نے کہا کہ اگر نماز نہ ہوگی تو ہم تم کو قربان کردیں گے، ورنہ اس کا ثبوت کسی حدیث سے دو؛ لہٰذا آن محترم سے درخواست ہے کہ مذکورہ مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل فرما کر ذہنی خلجان کو رفع فرمائیں۔

المستفتی: ابو الکلام سدھارتھ نگری، دار الطلبہ لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زوال سے پہلے پہلے وقت کے اندر اندر دوسری جگہ عید کی نماز وہ لوگ جماعت سے ادا کریں، جن کو عیدگاہ میں عید کی نماز نہیں ملی ہے تو بلاتردد جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ جس طرح جمعہ کی نماز متعدد مقامات پر ایک شہر میں جائز ہے اور آگے پیچھے بھی جائز ہے، اسی طرح عیدین کی نماز بھی دوبارہ دوسری جگہ پر درست ہے۔

إن صلاة العيدين في موضعين جائزة بالإتفاق. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين،مطلب يطلق المستحب على السنة و بالعكس، كراچي ۱۶۹/۲، زكريا ۴۹/۳)

وتجوز إقامة صلاة العيدين في موضعين، وأما إقامتها في ثلاثة مواضع، فعند محمدؒ تجوز. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلوة العيدين، زكريا قديم ۱/۱۵۰، جديد ۱/۲۱۱، الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون: شرائط صلاة العيد، زكريا ۶۱۲/۲، رقم:۳۴۲۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۸۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۷/۴ھ

ہر جگہ نماز عید ہونے کے بعد جو لوگ باقی رہ جائیں ان کا الگ سے نماز عید پڑھنا

سوال [۳۷۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر کے مختلف مقامات پر نماز عید ہوتی ہے، ان میں سے آخری جگہ بھی نماز ہوچکی؛ لیکن کچھ لوگ نماز نہ پڑھ سکے، تو کیا یہ لوگ کسی جگہ جماعت کرکے نماز عید ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: فضل اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں، یہ لوگ بھی زوال سے پہلے پہلے اپنے میں سے کسی کو امام بنا کر نماز عید ادا کر سکتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۴۵، باقیات فتاوی رشیدیہ ص:۲۲۰)

ولم تقض إن فاتت مع الإمام؛ لأن الصلوة بهذه الصفة لم تعرف قربة إلا بشرائط لاتتم بالمنفرد، فمراده: نفي الصلاة وحده، وإلا فإذا فاتت مع إمام وأمكنه أن يذهب إلى إمام أخر، فإنه يذهب إليه؛ لأنه يجوز تعددها في مصر واحد في موضعين وأكثر اتفاقاً. (بحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة

العيدين، كوئٹه ۲/ ۱۶۲، زكريا ۲/ ۲۸۳، كذا في الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ۲/ ۱۶۹، زكريا ۳/ ۴۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۷۸)

ایک عیدگاہ میں دوبار عید کی نماز پڑھنا

سوال [۴۷۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں عیدگاہ ہے، جس میں باہری لوگ عیدین کی نماز پڑھنے آتے ہیں، جب عیدین کا وقت آتا ہے، تو گاؤں کی جامع مسجد میں جمعہ کے روز تمام متقدیوں کے مشورہ سے جس میں باہر کے لوگ بھی ہوتے ہیں عید کی نماز کا وقت طے ہوتا ہے، وقت مقررہ پر گاؤں کے سبھی لوگ اور باہر کے لوگ بھی سب اکٹھا ہوجاتے ہیں، تب نماز پڑھی جاتی ہے، ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے، مگر اب چند دنوں سے کچھ لوگ آپس میں دنیاوی رنجش کی وجہ سے چند لوگوں کو جو ان کے موافق خیال کے ہیں ان کو ساتھ لے کر وقت مقررہ سے پہلے ہی عید کی نماز پڑھ لیتے ہیں، لوگوں نے ہر چند سمجھایا مگر نہیں مانے، ان کے پڑھ لینے کے بعد وقت مقررہ پر گاؤں والے اور باہری لوگ جمع ہوجاتے ہیں، جن کی تعداد پہلی جماعت کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، مقررہ وقت پر امام سابق کے پیچھے نماز پڑھی جاتی ہے، مگر فکر اس کی ہے کہ عیدگاہ میں دو جماعتیں ہوتیں ہیں، تو کون سی جماعت صحیح ہوگی، پہلی جماعت یا دوسری جماعت؟

المستفتی: محمد عادل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو لوگ اعلان شدہ وقت سے قبل باجماعت عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھتے ہیں، ان کی نماز مکروہ ہوگی اور جو لوگ اعلان کے بعد وقت مقررہ پر عیدگاہ

میں نماز پڑھتے ہیں، ان کی نماز سنت کے مطابق بلا کراہت درست ہوجائے گی؛ لہٰذا پہلی جماعت مکروہ اور دوسری جماعت مسنون ہوگی۔

ولو صلی بعض أهل المسجد بإقامة و جماعة، ثم دخل المؤذن والإمام و بقية الجماعة فالجماعة المستحبة لهم والكراهة للأولیٰ الخ

(عالمگیري، کتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفته وأحوال المؤذن، زکریا قدیم ۱/ ۵٤، جدید ۱/ ۱۱۱، تاتار خانیة، کتاب الصلاة، الفصل الثاني في الأذان، نوع آخر في المتفرقات، زکریا ۲/ ۱۵٦، رقم:۲۰۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۱۵ھ

ایک ہی عیدگاہ میں دوسری جماعت قائم کرنا

سوال [۳۷۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید الاضحیٰ کی نماز عیدگاہ کے اندر اکثر لوگوں نے ادا کی اور کچھ لوگوں کی نماز چھوٹ گئی تھی، تو ان لوگوں نے اسی عیدگاہ میں دوبارہ نماز عید الاضحیٰ ادا کرلی، تو ان کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ نیز کیا اسی عیدگاہ میں دوبارہ نماز ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر اس کی کوئی صورت ہو تو اس کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ثاقب ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز عید کی دوسری جماعت بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں عربی کی معتبر کتب فقہ میں صریح جزئیہ احقر کی نظر سے نہیں گذرا، ہاں البتہ نماز کے حق میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح قرار دیا گیا ہے، اس پر قیاس کر کے مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری وغیرہ نے دوسری جماعت کو بلا عذر مکروہ لکھا ہے؛ اس لئے بلا عذر دوسری جماعت کی

اجازت نہیں؛ البتہ اگر عیدگاہ چھوٹی پڑ گئی ہے اور مجمع اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ ایک ساتھ سب لوگوں کا یکبارگی نماز پڑھنا عیدگاہ میں ممکن نہیں ہے، تو ایسی صورت میں دوسری جماعت کی گنجائش ہے؛ لیکن اس جماعت کا امام بھی دوسرا ہونا چاہئے، پہلے امام کے پیچھے نماز نہ ہوگی۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳۵/۵، جدید زکریا ۱۵۳/۶)

يكره تكرار الجماعة في مسجد. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، كراچي ۱/ ۵۵۲، زكريا ۲/ ۲۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۰۰۵/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۶ھ

بارش کی وجہ سے ایک ہی مسجد میں دو مرتبہ نماز عید ادا کرنا

سوال [۴۷۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کی نماز گاؤں کی ایک مسجد میں ہوئی اور بہت لوگ نماز پڑھنے سے رہ گئے اور بارش بہت زیادہ ہو رہی ہے اور گاؤں میں ایک ہی مسجد ہے اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں پر عید کی نماز پڑھائی جا سکے اور ان سب لوگوں نے بھی اسی مسجد میں نماز ادا کر لی، آیا ان لوگوں کی نماز جو بعد میں ادا کر لی ہے، وہ نماز ہوگی یا نہیں؟ یا اس نماز کو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے؟

المستفتی: عبدالحکیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر وہ بڑا گاؤں جس کی آبادی تین ساڑھے تین ہزار یا اس سے زائد کی مردم شماری ہے اور نماز عید ادا کرنے کے لئے کوئی بڑا ہال وغیرہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں ان لوگوں کی نماز بھی بلا کراہت ادا ہوگئی ہے، جنہوں نے بعد میں نماز پڑھی ہے۔ اور اگر چھوٹا گاؤں ہے، جس کی آبادی تین ہزار سے کم ہے اور اس میں کوئی بازار وغیرہ بھی نہیں

ہے، تو ایسے گاؤں میں عید کی نماز چونکہ صحیح نہیں ہوئی ہے؛ اس لئے دونوں قسم کے لوگوں کی نماز عید صحیح نہیں ہوئی اور سب کی نماز نفل ہو جائے گی اور نفل باجماعت مکروہ ہے۔

صلوة العيد في القرىٰ تكره تحريماً، أي لأنه اشتغال بما لايصح؛ لأن المصر شرط الصحة الخ. وفي الشامية: فهو نفل مكروه لأدائه بالجماعة الخ (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب في الفال والطيرة، زكريا ۳/۴۶، كراچي ۲/۱۶۷، حاشية الطحطاوي على الدر، باب العيدين، كوئٹه ۱/۳۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۹۳۰)

عذر کی وجہ سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نماز عید ادا کرنا

سوال [۳۷۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسی مسجد جس میں صلوۃ پنج گانہ اور جمعہ کے علاوہ قلت جگہ اور عیدگاہ نہ ہونے کی وجہ سے عیدین کی نماز ادا کی جاتی ہے؛ لیکن کبھی بارش، کیچڑ وغیرہ کی زیادتی کی وجہ سے صرف اندرون مسجد ہی نماز ہوتی ہے اور کثرت تعداد کی وجہ سے ایک مرتبہ میں بھی لوگ مسجد میں سما نہیں پاتے، اس پریشانی کے باعث دوبارہ جماعت کرنی پڑتی ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے عذر کی وجہ سے دوسری نماز عید اسی مسجد میں ادا ہو جائے گی، کوئی کراہت تو نہیں آئے گی؟

المستفتی: محمد اکرم مدھے پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر واقعی بارش یا کیچڑ کی وجہ سے کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو سکے اور وہاں کوئی دوسرا ہال وغیرہ بھی موجود نہ ہو۔ نیز نماز عید فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو ایسی

صورت میں دوبارہ نماز مسجد مذکورہ میں بلا کراہت درست ہو جائے گی۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۳۶/۵، جدید زکریا ۱۵۳/۶)

یکرہ تکرار الجماعة في مسجد محلة بأذان و إقامة الخ (شامي، کتاب الصلاۃ، باب الإمامة، مطلب في تکرار الجماعة في المسجد، زکریا ۲۸۸/۲، کراچي ۵۵۲/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱۴۰/۳۱)

جہاں جمعہ جائز نہیں وہاں عید کی نماز کا حکم

سوال [۳۷۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ اسلامیہ میں قرآن کریم کی تعلیم ہوتی ہے اور فرض نماز بھی ادا کی جاتی ہے، علاوہ جمعہ کے اور رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن شریف بھی مستقل طریقے سے پڑھا جاتا ہے، جب سے مدرسہ قائم ہوا ہے۔ کیا اس مدرسہ اسلامیہ میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز بھی پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب ارسال فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: حافظ خوشنود احمد، ڈھکیہ جمعہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آبادی سے باہر جا کر عید گاہ میں نماز عید ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے؛ لہٰذا ایسے قصبہ کے مدرسہ میں جہاں جمعہ کی نماز نہ ہوتی ہو وہاں عیدین کی نماز کو قائم نہ کیا جائے؛ کیونکہ بلا عذر کے آبادی سے باہر جا کر عیدگاہ میں نماز نہ پڑھنا خلاف سنت ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۳۵)

عن أبي سعيد الخدريؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يخرج يوم الفطر، والأضحى إلى المصلى. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر ۱/ ۱۳۱، رقم:۹٤٦، ف:۹٥٦)

عن عليؓ: الخروج إلى الجبانة في العيدين من السنة. (المعجم الأوسط ۱۱٦/۳، رقم: ٤٠٤٠)

ثم خروجه ماشيًا إلى الجبانة و هي المصلى العام، و تحته في الشامية: أي الصحراء (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة العيدين، مطلب يطلق المستحب على السنة و بالعكس، زكريا ۳/ ٤٨، كراچي ۲/ ١٦٨)

الخروج إلى الجبانة في صلوة العيد سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشائخ، وهو الصحيح. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السابعة عشر في صلاة العيد، زكريا قديم۱/ ۱٥٠، جديد الفتاوى التاتارخانية ۲/ ٦۱۱، رقم:۳٤۲۳)

الخروج إلى المصلى وهى الجبانة سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشايخ، لما ثبت أنه عليه الصلوة والسلام كان يخرج يوم الفطر، ويوم الأضحىٰ إلى المصلى. (حلبي كبير، صلاة العيد، فروع خروج إلى المصلى اشرفية ديوبند ص: ٥٧۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۱/ ۱۴۲۳ھ

جہاں جمعہ جائز نہیں وہاں مفتی کا نماز عید پڑھنا

سوال [۳۷۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ اگرکوئی مفتی جمعہ کی نماز ادا نہ کرے، جہاں جمعہ شریعت کے لحاظ سے نہیں ہوتا، تو پھر وہی امام مفتی اس گاؤں میں عیدین کی نماز ادا کریں تو کیا جہاں جمعہ نہیں ہے، وہاں عیدین کی نماز پڑھنا مفتی صاحب کے لئے جائز ہے؟

المستفتی: محمد اکرام علی، بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہاں جمعہ کی نماز شرعی طور پر صحیح نہیں ہوتی ہے، وہاں عیدین کی نماز بھی شرعی طور پر صحیح نہیں ہے، چاہے نماز پڑھنے والے عالم ہوں یا غیر عالم، سب کے لئے ایک ہی حکم ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۲۲۶، جدید ڈابھیل ۸/۳۸۵)

عن علي رضی، قال: لاجمعة، ولاتشريق، ولاصلوة فطر، ولا أضحى إلا في مصر جامع، أو مدينة عظيمة. (مصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من قال: لا جمعة، ولاتشريق إلا في مصر جامع، مؤسسه علوم القرآن بيروت ٤/٤٦، رقم: ٥٠٩٩)

تجب صلاتهما في الأصح على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوى الخطبة، فإنها سنة بعدها. وفي القنية: صلاة العيد في القرى تكره تحريماً. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب في الفال والطيرة، كراچي ٢/١٦٦، زكريا ٣/٤٥)

اعلم أن صلوة العيد واجبة على من تجب عليه الجمعة، هذا هو الصحيح من المذهب. (حلبي كبير، فصل في صلوة العيد اشرفية ديوبند ص: ٥٦٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱۸۱/۳۱)

جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی وہاں اشراق کا حکم

سوال [۴۲۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اشراق کی نماز عید کے روز ایسے دیہات میں جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی ہے، پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا دیہات میں شہر کی عید کی نماز ہونے سے پہلے پڑھ سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد قاسم گودھروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جن دیہاتوں میں عید کی نماز جائز نہ ہو اور وہاں کے لوگ عید کی نماز نہ پڑھتے ہوں، ایسے دیہاتوں میں نماز عید سے پہلے نماز اشراق پڑھنا مشروع ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں صریح جزئیہ نہیں ملا؛ البتہ اوجز المسالک کی عبارت سے جواز کی بات مترشح ہوتی ہے۔ اوجز المسالک کی عبارت میں نماز عید سے پہلے اشراق کی نماز کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ''اگر نوافل میں مشغول ہو جائیں گے تو عید کی نماز میں تاخیر ہوسکتی ہے'' اس علت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دیہات کے لوگوں کے لئے عید کے دن اشراق کی نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔

وعن ابن مسعود و حذيفة: أنهما كانا ينهيان الناس عن الصلاة قبل العيد- ولأن المبادرة إلى صلاة العيد مسنونة. وفي الإشتغال: بالتطوع تأخيرها. (أوجز المسالك، كتاب العيدين، باب الرخصة في الصلوة قبل العيدين وبعدهما، جديد دار القلم دمشق ۳/٦٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۱۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۲۳ھ

(۴) فصل في تكبيرات التشريق

ایام تشریق میں تکبیر تشریق کا وجوب

سوال[۳۷۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بقرعید کے موقع پر ۹؍ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر تک تکبیر تشریق پڑھنا کیا حکم رکھتا ہے اور یہ تکبیر تشریق کن لوگوں پر لازم ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بقرعید کے موقع پر ۹؍ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳؍کی عصر تک تکبیر تشریق پڑھنا اصح قول کے مطابق واجب ہے۔

عن علي بن حسين عن جابر بن عبدالله، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكبر في صلاة الفجر يوم عرفة إلى صلاة العصر من آخر أيام التشريق، حين يسلم من المكتوبات. (سنن الدار قطني، كتاب العيدين، دارالكتب العلمية بيروت ۲/۳۷، رقم:۱۷۱۹)

ويجب تكبير التشريق في الأصح. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ۲/۱۷۷، زكريا ۳/۶٤)

تكبير التشريق: واجب، يبدأ بالتكبير من صلاة الغداة يوم عرفة...... يكبر إلى صلاة العصر من آخر أيام التشريق......يجب على كل من تجب عليه المكتوبة في أيام التشريق. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع والعشرون، تكبيرات أيام التشريق، زكريا ۲/٦۳٤-٦٤٠، رقم: ۳٤۷۰-۳٤۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۳۲۵)

عید کی نماز کے بعد تکبیر تشریق ہے یا نہیں؟

سوال [۳۷۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قصبہ گولا ضلع لکھیم پورکھیری کے امام جامع مسجد نے عیدگاہ میں بقرعید کی نماز پڑھائی سلام کے بعد امام نے بلند آواز سے تکبیر تشریق پڑھی اور نمازوں کی طرح، جس پر پیچھے سے ایک عالم صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا کہ عید کی نماز واجب ہے اور واجب نماز کے بعد تکبیر تشریق نہیں پڑھی جاتی ہے، جس کی وجہ سے لوگوں میں کافی افواہیں ادھر اُدھر کی اڑیں؛ لہٰذا وضاحت فرمائیں کہ عیدین کی نماز کے بعد تکبیر تشریق کی کیا حیثیت ہے؟ کس طرح پڑھیں؟ بلند آواز سے پڑھیں یا آہستہ پڑھیں؟

المستفتی: اراکین کمیٹی انجمن ضلع لکھیم پورکھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ بقرعید کی نماز کے بعد بھی تکبیر تشریق بآواز بلند پڑھنا مستحب ہے؛ لہٰذا امام صاحب نے بآواز بلند جو تکبیر تشریق پڑھی ہے، وہ صحیح اور درست ہے اور جس عالم صاحب نے اس پر اعتراض کیا ہے وہ قول راجح اور مفتی بہ کے خلاف ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۴۴۵/۸)

عن علي بن أبي طالب، وعمار بن یاسرؓ، أنهما سمعا رسول الله صلی الله علیه وسلم ...... یکبر في دبر الصلات المکتوبات من قبل صلاة الفجر، غداة عرفة إلی صلاة العصر، آخر أیام التشریق یوم دفعة الناس العظمی. (سنن الدارقطني، کتاب العیدین، دار الکتب العلمیة بیروت ۳۷/۲، رقم:۱۷۱۷)

وعند البلخیین یکبرون عقب صلاة العید لأدائها بجماعة کالجمعة وعلیه توارث المسلمین، فوجب إتباعه. (شامي، کتاب الصلاة، باب العیدین، کراچي ۱۷۹/۲، زکریا ۶۳/۳)

وعليه الاعتماد والعلم والفتوى في عامة الأمصار وكافة الأعصار، ولابأس به عقب العيد؛ لأن المسلمين توارثوه فوجب اتباعهم. (إعلاء السنن، كتاب العيدين، باب تكبيرات التشريق، وإنما لا تجب إلا على أهل المصر، بيروت ۸/ ۱۵۱، ۱۲٤۸)

وشرط إقامة، ومصر، ومكتوبة..... قيد بالمكتوبة احترازاً عن الواجب كصلوة الوتر، والعيدين..... والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد الخ (البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب العيدين، زكريا ۲/ ۲۸۹، کوئٹہ ۲/ ۱٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۶۱/ ۱۱۳۳)

عیدین کی نماز میں تکبیرِ تشریق مشروع ہے یا نہیں؟

سوال [۳۷۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایامِ تشریق میں ہر فرض نمازوں کے بعد تکبیر تشریق زور سے پڑھنے کا حکم ہے؟، سوال یہ ہے کہ عید کی نماز فرض نہیں ہے، بلکہ واجب ہے، جو باجماعت پڑھی جاتی ہے، تو کیا عید کی نماز کے بعد تکبیر تشریق زور سے پڑھنا مسنون ہوگا؟ اس میں فقہاء کا کیا اختلاف ہے اور قولِ راجح کیا ہے؟

المستفتی: محمد کامل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تکبیرِ تشریق کے ہر فرض نماز کے بعد پڑھنے پر علماء کا اتفاق ہے؛ البتہ عید کی نماز کے بعد پڑھے جانے میں اختلاف ہے، بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ نماز عید کے واجب ہونے کی وجہ سے تکبیر تشریق نہیں پڑھی جائیگی، تاہم مشائخ کے عمل

اورتوارث مسلمین کی وجہ سے تکبیر تشریق پڑھنا مناسب معلوم ہوتا ہےاور یہی قول راجح ہے۔
(مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۸/۴۴۵ محمودیہ میرٹھ ۱۲/۵۲۴)

عقب كل فرض، شمل الجمعة وخرج به الواجب كالوتر، والعيدين، والنفل وعند البلخيين يكبرون عقب صلوة العيد؛ لأدائها بجماعة كالجمعة، وعليه توارث المسلمين، فوجب اتباعه. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، كراچي ٢/١٧٩، زكريا٣/٦٣)

ولو كبر على إثر صلاة العيد لابأس به؛ لأن المسلمين توارثوا هكذا، فوجب أن يتبع توارث المسلمين. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب العيدين، كوئٹه ٢/١٦٥، زكريا ٢/٢٨٩)

ولابأس بالتكبير عقب صلاة العيدين. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي قديم ص:٢٩٦، دار الكتاب جديد ص:٥٤١، إعلاء السنن، كتاب العيدين، باب تكبيرات التشريق، وانما لاتجب الا على أهل المصر، كراچي ٨/١٢٤، بيروت ٨/١٥١)

وقال أبو يوسف و محمدؒ التكبير يتبع الفريضة، فكل من أدىٰ فريضة فعليه التكبير، والفتوى على قولهما. (الجوهر النيرة، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، دارالكتاب ديوبند ١/١١٤، امدادية ملتان ١/١١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۵۰)

تین مرتبہ تکبیر تشریق پڑھنا کیسا ہے؟

سوال [۳۷۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تکبیر تشریق تین تین مرتبہ پڑھنا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مرتبہ تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے اور ایک سے زائد پڑھنے کے سلسلے میں دو طرح کے جزئیہ ملتے ہیں، بعض جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا کراہت جائز ہے اور بعض جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلاف سنت ہے؛ اس لئے اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس پر نکیر نہ کی جائے اور جو نہیں پڑھتے ہیں ان کو پڑھنے کی ترغیب نہ دیں۔

ویجب تکبیر التشریق في الأصح للأمر به مرةً، وإن زاد علیها یکون فضلاً. (در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب العیدین، مطلب في تکبیر التشریق، زکریا ۳/۶۲، کراچي ۲/۱۷۷)

ذکر أبو السعود أن الحموي نقل: عن القراحصاري أن الإتیان به مرتین خلاف السنة، قلت: وفي الأحکام عن البر جندي: ثم المشهور من قول علمائنا أنه یکبر مرة، و قیل ثلاث مرات. (شامي، کتاب الصلاة، باب العیدین، قبیل مطلب المختار أن الذبیح اسماعیل، زکریا ۳/۶۲، کراچي ۲/۱۷۸)

وصفته أن یقول مرة واحدة، وإن زاد علیها یکون نفلاً. (الدر المنتقي في شرح الملتقي علی هامش مجمع الأنهر، کتاب الصلاة، باب صلوة العیدین، دارالکتب العلمیة بیروت ۱/۲۶۰)

قوله مرة إشارة إلی رد ما نقل عن الشافعي: أنه یکرر التکبیر ثلاثاً. (البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب صلاة العید، کوئٹه ۲/۱۶۵، زکریا ۲/۲۸۸)

وصفته أي صفة التکبیر أن یقول مرة، حتی لو زاد فقد خالف السنة. وعند الشافعي یقول: اللّٰہ اکبر ثلاثا، أو خمساً، أو سبعاً، أوتسعاً متصلاً. (مجمع الأنهر، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین، دارالکتب العلمیة، بیروت ۱/۲۶۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۹؍شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۲۵۹)

تکبیرات تشریق تین مرتبہ پڑھنا افضل ہے یا ایک مرتبہ؟

سوال [۴۲۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماہ ذی الحجہ میں ایام تشریق کے پانچ دن کی تکبیرات تشریق کیا تین مرتبہ پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت ہے یا ایک مرتبہ؟ نیز فقہ حنفی میں کہیں بھی تین مرتبہ کا ثبوت ہے یا ایک ہی مرتبہ ہے؟ ہمارے شہر رائچور صوبہ کرناٹک میں بریلوی حضرات تین مرتبہ کو سنت اور افضل قرار دیتے ہیں۔

المستفتی: محمد عاکف

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تکبیر تشریق ایک مرتبہ پڑھنا ہر نماز کے بعد نویں ذی الحجہ کی نماز فجر سے تیرہویں کی نماز عصر تک واجب ہے۔ اوراس سے زائد دو یا تین مرتبہ پڑھنا بعض فقہاء نے خلاف سنت اور بعض فقہاء نے مستحب لکھا ہے اور خلاف سنت کے قول کو بعد کے فقہاء نے راجح اور مفتی بہ قرار دیا ہے؛ لہٰذا اس مسئلہ کو موضوع بحث بنانا نہیں چاہئے؛ کیونکہ تین مرتبہ کہنا بھی بعض فقہاء سے ثابت ہے؛ اس لئے ان پر نکیر کی ضرورت نہیں، اگر آپ ایک مرتبہ پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں تو صرف اپنے خاص لوگوں کو دیا کریں۔

ويجب تكبير التشريق في الأصح مرة، وإن زاد عليها يكون فضلاً الخ . وتحته في الشامية: إن الإتيان به مرتين خلاف السنة الخ.

(درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب في تكبير التشريق، كراچي ۱۷۷/۲، زكريا ديوبند ۶۲/۳)

وما زاد فهو مستحب، وفي مجمع الأنهر: إن زاد فقد خالف السنة.

(حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، دار الكتاب ديوبند، جديد ۲/۵۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۸۹۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۱۱/۱۴۲۶ھ

تکبیر تشریق کن لوگوں پر واجب ہے

سوال [۴۷۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جامعہ فاطمہ شاہجہاں پور کی طرف سے مسائل عیدالاضحیٰ جو شائع ہوئے، جس کی فوٹو کاپی منسلک ہے، برائے تشریح مفتی جامعہ فاطمہ کو روانہ کیے گئے، مفتی صاحب نے جو جوابات دیئے ہیں، وہ سمجھ میں نہیں آئے؛ اس لئے آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔

سوالات درج ذیل ہیں:

الف: تکبیر تشریق کے سلسلہ دریافت یہ کرنا ہے کہ جماعت مستحبہ کی تشریح کس طرح نماز باجماعت ہو، جس کو مستحب کہا جائے گا؟

ب: اگر کسی کو امام کے ساتھ پوری رکعتیں نہ ملی ہوں، تو وہ اپنے کو مستحب جماعت میں شامل تصور کرتے ہوئے بعد سلام تکبیر تشریق کہے یا تکبیر تشریق چھوڑ دے؟

ج: مندرجہ بالا تحریر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تکبیر تشریق صرف اور صرف نماز باجماعت پڑھنے والوں پر واجب ہے، اگر کسی کی جماعت کسی مجبوری سے فوت ہوگئی ہے یا وہ مسافر ہے، تو اس پر تکبیر تشریق واجب نہیں ہے؟

د: گھر کے اندر جو خواتین بغیر جماعت نماز پنج گانہ ادا کر رہی ہیں، وہ بھی میری ناقص عقل کے مطابق مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں تکبیر تشریق سے مستثنیٰ تصور ہوں گی؛ کیونکہ اس واجب کو ادا کرنے کے لئے جماعت مستحبہ کی ضرورت ہے۔

المستفتی: خادم مطلوب احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تکبیر تشریق کن لوگوں پر واجب ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کے دو قول ہیں:

(۱) وہی ہے کہ جو جامعہ فاطمہ کے اشتہار میں درج ہے کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں گے، ان کے اوپر تکبیر تشریق واجب ہے۔

(۲) یہ ہے کہ تکبیر تشریق نویں ذی الحجہ کی صبح سے تیرہویں کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد مرد پر بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے اور عورت پر آہستہ آواز سے، چاہے جماعت سے پڑھی جائے یا تنہا، چاہے مسبوق ہو یا عورت، ہر عاقل بالغ مرد وعورت مسافر مقیم سب پر تکبیر تشریق واجب ہے، یہی دوسرا قول راجح ہے اور یہی معمول بہا ہے، اس میں سائل کے سوال نامہ کی چاروں شقوں کا جواب آ گیا، فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

ووجوبه على إمام مقيم بمصر و على مقتد مسافر، أو قروي، أو امرأة بالتبعية؛ لكن المرأة تخافت، ويجب على مقيم اقتدىٰ بمسافر، و قالا بوجوبه فور كل فرض مطلقاً ولو منفرداً، أو مسافراً، أوامرأة؛ لأنه تبع للمكتوبة، وعليه الاعتماد والعمل، والفتوى في عامة الأمصار. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب: المختار أن الذبيح إسماعيل، كراچي ٢/ ١٧٩، زكريا ٣/ ٦٤)

يجب على كل من تجب عليه المكتوبة في أيام التشريق، والرستاقي، والبلدي، والمسافر، والمقيم، والذي يصلى وحده، أوبجماعة سواء. (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع والعشرون في تكبيرات أيام التشريق، زكريا ٢/ ٦٤٠، رقم: ٣٤٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۹۳/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۶ھ

تکبیرات تشریق سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال[الف: ۳۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایام تشریق میں تکبیر تشریق کتنی مرتبہ کہنا مسنون ہے، اور تین مرتبہ لازم کہنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) تکبیرات تشریق امام ومقتدی کا ایک ساتھ کہنا مسنون ہے یا پہلے امام کہہ لے پھر مقتدی کہے، کون سا طریقہ افضل ومسنون ہے؟

(۳) اگر تکبیر تشریق امام ومقتدی کا ایک ساتھ کہنا مسنون ہے، تو طحطاوی علی المراقی کی عبارت ”**ولو نسي الإمام التكبير أتى به المؤتم وجوباً الخ ٥٤٠**“ کا مطلب کیا ہے؟ نیز اس مسئلہ کی تائید میں صاحب طحطاویؒ نے امام ابو یوسفؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام پہلے تکبیر کہے گا، پھر مقتدی کہیں گے، بہر حال جو طریقہ مسنون وافضل ہو، اس کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد زبیر، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہر فرض نماز کے بعد تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے اور تین مرتبہ پڑھنے کو بعض فقہاء نے خلاف سنت لکھا ہے اور بعض فقہاء نے بغیر التزام کے مستحب بھی لکھا ہے؛ اس لئے تین مرتبہ پڑھنے نہ پڑھنے میں اختیار رہے گا۔ اور تین مرتبہ نہ پڑھنے والے پر نکیر نہ کی جائے اور تین مرتبہ پڑھنے والے پر بھی نکیر نہ کی جائے۔

وفي حاشية الطحطاوي: ويأتي به مرة، ومازاد فهو مستحب.

(حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب أحكام العيدين، دارالكتاب ديوبند ٥٣٩)

(۲) افضل یہی ہے کہ تکبیر کی ابتداء امام کرے پھر مقتدی بھی تکبیر کہیں؛ لیکن اگر امام تکبیر کہنا بھول جائے تو مقتدی زور سے تکبیر کہیں تاکہ امام کو تنبیہ ہو جائے۔

وفي التاتار خانية: ويبدأ الإمام به، ثم القوم، فإن نسي الإمام يبدأ واحد من القوم حتى يكبر الإمام. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع والعشرون كيفية تكبير التشريق، زكريا ۲/ ۶۳۹، رقم:۳۴۷۶، كوئٹه ۲/ ۱۰۳)

(۳) جواب نمبر۲ر میں سوال نمبر۳ر کی وضاحت بھی آگئی ہے کہ پہلے امام ہی تکبیر تشریق شروع کرے گا، اس کے بعد ہی مقتدی کہیں گے، یہی افضل طریقہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۴/ ۱۴۲۹ھ

شہر کی ایک مسجد میں نماز عید کے بعد دیگر محلوں کے لوگوں کے لئے قربانی کا حکم کیا ہے؟

سوال [ب: ۳۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نجیب آباد اور جلال آباد کسی زمانہ میں الگ الگ آبادی تھی اور آج کے زمانہ میں بلا کسی فصل کے دونوں کی آبادی متصل ہوکر ایک ہی قصبہ اور ایک ہی شہر جیسی ہوچکی ہے کوئی بھی اجنبی آدمی اس کی حیثیت کو دیکھ کر دونوں کو الگ الگ نہیں سمجھ سکتا، ایسی صورت میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ بقرعید کی نماز نجیب آباد میں پہلے ہوجاتی ہے اور جلال آباد میں تاخیر سے ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ نجیب آباد میں بقرعید کی نماز ہوجانے کے بعد جلال آباد والوں کے لئے اپنی نماز عید پڑھنے سے پہلے قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اسی طرح کسی بھی شہر میں کسی ایک محلّہ کی مسجد میں نماز عید ہوجائے تو دوسرے محلّہ کے ان لوگوں کے لئے قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جنھوں نے نماز عید نہیں پڑھی ہے اور قربانی کرنے کے بعد جہاں نماز عید تاخیر سے ہوتی ہے یہ لوگ وہاں جاکر نماز عید الاضحیٰ ادا کریں گے؟

المستفتی: مفتی اسرار احمد، امام مسجد ریلوے اسٹیشن، نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب نجیب آباد اور جلال آباد دونوں آبادی مل کر ایک قصبہ بن چکا ہے، تو دونوں ایک قصبہ کے الگ الگ دو محلوں کے حکم میں ہوچکے ہیں اور دونوں مل کر

ایک ہی قصبہ شمار ہوگا اورشہر وقصبہ کی کسی ایک مسجد میں نماز عید الاضحیٰ ہوجانے کے بعد دوسرے محلّہ والوں کے لئے قربانی جائز ہوجاتی ہے یانہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی دورائیں ہمارے سامنے ہیں:

(۱) پہلی رائے یہ ہے کہ شہر کی مختلف مسجدوں اورعید گاہ میں سے کسی ایک جگہ نماز عید ہوجانے کے بعد پورے شہر میں ہر جگہ قربانی جائز ہوجاتی ہے؛ لہٰذا اس قول کے مطابق نجیب آباد میں نماز عید ہوجانے کے بعد جلال آباد میں بھی قربانی جائز ہوجائیگی اسی شہر کے ایک محلّہ کی مسجد میں نماز عید ہوجانے کے بعد ان محلوں میں بھی قربانی جائز ہوجائیگی جن محلوں میں ابھی نماز عید نہیں ہوئی ہے اور بعد میں ہونے والی ہے اور اس قول کے مطابق دوسرے محلّہ کے لوگ اپنی قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بعد عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں اور یہی قول اکثر اردو فتاوی میں دیکھنے کو ملے گا؛ لیکن یہ قول حدیث رسول کی عبارۃ النص کے خلاف ہے؛ اس رائے کے مطابق عبارت ملاحظہ فرمائیے:

ولو ضحیٰ بعد ما صلی أهل المسجد ولم يصل أهل الجبانة أجزأه استحسانًا؛ لأنها صلاة معتبرة حتى لو اكتفوا بها أجزأتهم. (شامي، زكريا ٩/ ٤٦٠، هداية اشرفي ٤/ ٤٤٦، البحرالرائق زكريا ٨/ ٣٢٢)

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ شہر کے مختلف محلوں میں سے اگر کسی ایک محلّہ میں پہلے نماز عید ہوجائے تو صرف اسی محلّہ کے لوگوں کے لئے اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کرنا جائز ہوجاتا ہے اور دوسرے محلّہ کے لوگوں کے لئے اس وقت تک اپنی قربانی جائز نہ ہوگی جب تک ان محلوں میں نماز عید نہ ہوجائے، اسی قول کو فقہاء نے حدیث رسول کے زیادہ موافق قرار دیا ہے اور اسی قول پر عمل کرنے میں احتیاط ہے؛ لہٰذا اس قول کے مطابق شہر کے اندر جن لوگوں نے اپنی نماز عید نہیں پڑھی ہے، ان کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ دوسرے محلّہ میں نماز عید ہوجانے کی وجہ سے اپنی قربانی کردیں، پھر عید کی نماز پڑھنے کے لئے جائیں اور حدیث رسول کے مطابق احتیاط کا پہلو غالب ہونے کی وجہ سے اسی پر عمل کرنا زیادہ احوط اور زیادہ بہتر ہے۔ عبارات ملاحظہ فرمائیے:

وإن كان يصلى في المصر في موضعين بأن كان الإمام قد خلف من يصلى بضعفة الناس في الجامع وخرج هو بالآخرين إلى المصلى، وهو الجبانة، ذكر الكرخيؒ: أنه إذا صلى أهل أحد المسجدين أيهما كان جاز ذبح الأضاحي وذكر في الأصل: إذا صلى أهل المسجد فالقياس أن لا يجوز ذبح الأضحية وفي الاستحسان يجوز، وجه القياس أن صلاة العيد لما كانت شرطاً لجواز الأضحية في حق أهل المصر فاعتبار صلاة أهل أحد الموضعين يقتضي أن يجوز واعتبار صلاة أهل الموضع الآخر يقتضي أن لا يجوز، فلا يحكم بالجواز بالشک؛ بل يحكم بعدم الجواز احتياطًا. (بدائع الصنائع زكريا ٤/٢١١)

قوله: أجزأه استحسانا يشير إلى أنه لا يجزيه قياسًا، وذلک لأن اعتبار جانب أهل الجبانة يمنع الجواز واعتبار جانب أهل المسجد يجوز ذلک؛ فإنه قبل الصلاة من وجه وبعد الصلاة من وجه، فوقع الشک، وفي العبادات يؤخذ بالاحتياط. (فتح القدير زكريا ٩/٥٢٦)

قال شمس الأئمه الحلواني: هذا إذا ضحى رجل من الفريق الذي صلى فأما إذا ضحىٰ رجل من الفريق الذي لم يصل فلم تجز أضحيته قياسًا و استحسانًا.

(الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٧/٤١٩، رقم:٢٧٩٩٦، وهكذا في البناية شرح الهداية ١٢/٢٥)

اورحدیث شریف اس مسئلہ سے متعلق یہ ہے:

عن أنس بن مالک قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من ذبح قبل الصلاة فإنما يذبح لنفسه، ومن ذبح بعد الصلاة فقدتم نسكه وأصاب سنة المسلمين. (بخارى شريف، أضاحي ٢/٨٣٢، رقم:٥٣٣١، مسلم شريف أضاحي ٢/١٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۳۰۲)

سات شرکاء میں سے ایک نے پہلے عید کی نماز پڑھ کر قربانی کردی باقی شرکاء نے ابھی نماز نہیں پڑھی

سوال [۴۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شہر کے مختلف محلوں کے سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لئے خرید لیا، اور شہر میں نماز عید الاضحیٰ مختلف مسجدوں میں ہوتی ہے اور عید گاہ میں بھی ہوتی ہے، مگر ان نمازوں کے اوقات مختلف ہیں:

ایک مسجد میں سورج طلوع ہونے کے بیس منٹ کے بعد نماز عید الاضحیٰ ہوجاتی ہے، دوسری مسجد میں طلوع شمس کے آدھا گھنٹہ کے بعد ہوتی ہے، تیسری مسجد میں ایک گھنٹہ کے بعد ہوتی ہے، چوتھی مسجد میں سوا گھنٹہ کے بعد ہوتی ہے، پانچویں مسجد میں ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہوتی ہے اور عید گاہ میں تقریباً دو گھنٹے بعد ہوتی ہے، ان ساتوں شرکاء میں سے ایک اس مسجد میں نماز پڑھتا ہے، جس میں سب سے پہلے نماز عید ہوتی ہے، دوسرا اس کے بعد والی میں، تیسرا اس کے بعد والی میں، چوتھا اس کے بعد والی میں، پانچواں اس کے بعد والی میں، چھٹا عید گاہ میں نماز پڑھے گا اور ساتواں شریک نماز ہی نہیں پڑھتا ہے، وہ فرض، نماز جمعہ، عیدین کچھ نہیں پڑھتا ہے، بس وہ صرف ایک نام کا مسلمان ہے، مگر اس کی کمائی حلال ہے اور یہ سب لوگ الگ الگ محلوں کے ہیں، ایسے حالات میں سب سے پہلے جس نے نماز عید پڑھ لی، وہ اپنی نماز کے بعد قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہتا ہے؛ جبکہ اس کے شرکاء میں سے کسی نے نماز عید نہیں پڑھی ہے، یہ سب بعد میں پڑھیں گے، تو اس کے لئے تمام شرکاء کی طرف سے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی ہے، جانور کو ذبح کردینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: اسرار احمد، امام مسجد اسٹیشن والی، نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: شامی وغیرہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جب شہر میں کسی ایک مسجد میں نماز عید ہوجائے، تو پورے شہر میں ہر جگہ قربانی کرنا جائز ہوجاتا ہے اور اسی مسئلہ کو اردو فتاوی کی اکثر کتابوں میں بھی صراحت سے لکھا گیا ہے؛ لہٰذا مذکورہ شرکاء میں سے جس نے پہلے نماز پڑھ لی ہے، اس کے لئے دیگر شرکاء کے نماز پڑھنے سے پہلے مشترک جانور کو سب کی طرف سے ذبح کردینا جائز ہوگا، اور سب کی قربانی درست ہوجائیگی اور جو بے نمازی ہے، اس کی وجہ ہے کسی کی قربانی میں کوئی فرق نہیں آئے گا؛ اس لئے کہ قربانی میں مسلمان ہونا اور حلال مال ہونا شرط ہے اور وہ دونوں شرطیں یہاں موجود ہیں، مگر بہتر یہی ہے کہ سب کی نماز ہوجانے کے بعد ذبح کیا جائے، تا کہ حدیث شریف پر بھی مکمل عمل ہوجائے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۱۵/۵۰۹، فتاوی رحیمیہ ۱۰/۳۹)

ولو ضحیٰ بعد ما صلی أهل المسجد ولم يصل أهل الجبانة أجزاه استحسانًا؛ لأنها صلاة معتبرة حتى لو اكتفوا بها أجزأتهم. (شامي، زكريا ٩/ ٤٦٠، هداية اشرفي ٤/٤٤٦، مجمع الأنهر، مكة المكرمة ٤/ ١٧٠، البحرالرائق زكريا ٨/ ٣٢٢، تبيين الحقائق زكريا ٦/٤٧٧)

اور حدیث شریف اس مسئلے سے متعلق یہ ہے:

عن أنس بن مالک قال: قال النبی صلى الله عليه وسلم: من ذبح قبل الصلاة فإنما يذبح لنفسه، ومن ذبح بعد الصلاة فقدتم نسكه وأصاب سنة المسلمين. (بخاری شريف، أضاحي ٢/ ٨٣٢، رقم: ٥٣٣١، صحيح مسلم، أضاحي ٢/ ١٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۳۰۳)

(۵) فصل في من يجب عليه صلاة العيد و من لايجب

کیا عورتوں پر عید کی نماز واجب ہے؟

سوال[۳۷۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز جس طرح مردوں پر واجب ہے، کیا عورتوں پر بھی واجب ہے؟ عہد نبوی ﷺ میں تو عورتیں نماز عید میں شریک ہوا کرتی تھیں؛ لیکن حضرات صحابہؓ کے زمانہ میں فتنہ کے اندیشہ سے جماعت کی حاضری سے روک دی گئیں، تو کیا اب عورتیں نماز عید گھر میں ادا کرسکتی ہیں یا نہیں؟ تفصیلی جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: جلیس احمد ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نماز عید کے لئے نماز جمعہ کی طرح جماعت شرط ہے اور تنہا عورتوں کی جماعت جائز نہیں ہے؛ اس لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورتوں کے لئے گھر میں نماز عید ادا کرنا درست نہیں ہوگا۔

ومن شرائطها الجماعة؛ لأن الجمعة مشتقة منها الخ (هداية، كتاب الصلاة، باب صلوة الجمعة اشريفى ديوبند ۱/ ۱۶۹)

تجب صلواتهما في الأصح على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوىٰ الخطبة الخ (الدر المختار مع الشامي، باب العيدين، مطلب في الفال والطيرة، زكريا ۳/ ۴۵، كراچي ۲/ ۱۶۶)

اعلم أن صلوة العيد واجبة على من تجب عليه الجمعة، هذا هو الصحيح من المذهب. (حلبي كبير، فصل في صلوة العيد، اشرفية ديوبند ص:۵۶۵)

ویکره إمامة المرأة للنساء في الصلوات کلها من الفرائض، و النوافل الخ (هندية، کتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماماً لغيره، زکريا قديم ١/ ٨٥، جديد ١/ ١٤٣)

ويکره تحريماً جماعة النساء. (در مختار، کتاب الإمامة، کراچي ١/ ٥٦٥، زکريا ٢/ ٣٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ شوال المکرّم ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۴۲۱)

کیا عورتوں پر نمازِ عید الفطر وعید الاضحیٰ واجب ہے؟

سوال [۳۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا عورتوں پر عید الفطر وعید الاضحیٰ کی نماز پڑھنا بھی واجب ہے؟

المستفتی: حافظ مقصود احمد انصاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں پر عید الفطر وعید الاضحیٰ کی نماز پڑھنا نہ واجب ہے، نہ سنت اور نہ مستحب؛ بلکہ ممنوع اور مکروہ تحریمی ہے؛ کیونکہ تنہا عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے اور جمعہ وعیدین میں حاضر ہونا بھی ممنوع اور مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/ ۲۳۲)

عن أم سلمةؓ، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: خير مساجد النساء قعر بيوتهن. (مسند أحمد بن حنبل ٦/ ٢٩٧، رقم: ٢٧٠٧٧، ٣٠١، رقم: ٢٧١٠٥)

ويکره حضورهن الجماعة ولو لجمعة، وعيد، و وعظ مطلقاً، ولو عجوزاً ليلاً على المذهب المفتى به لفساد الزمان الخ . (الدر المختار مع المحتار،

كتاب الصلاة باب الإمامة، مطلب إذا صلى الشافعی قبل الحنفي، كراچي ١/٥٦٦، زكريا٢/٣٠٧، كوئٹه ١/٤١٨)

قوله ولايحضرن الجماعات؛ لقوله تعالىٰ: ”وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ“ [سورۃ الاحزاب:۳۳]

وقال صلى الله عليه وسلم: صلاتها في قعر بيتها أفضل من صلاتها في صحن دارها، وصلاتها في صحن دارها أفضل من صلاتها في مسجدها، وبيوتهن خير لهن؛ ولأنه لا يؤمن الفتنة من خروجهن. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ١/٦٢٧، كوئٹه ١/٣٥٨)

ويكره تحريماً جماعة النساء؛ لأن الإمام إن تقدمت لزم زيادة الكشف، وإن وقفت وسط الصف لزم ترك الإمام مقامه، وكل منهما مكروه. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كوئٹه ١/٢٤٥)

ويكره تحريماً جماعة النساء. (در مختار، باب الإمامة، كراچي ١/٥٦٥، زكريا ٢/٣٠٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۹۳)

عورتوں کا عیدین کی نماز پڑھنا

سوال [۳۷۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض عورتیں عیدین کے دن عیدین کی نماز اپنے اپنے گھروں میں ادا کرتی ہیں، پھر ان میں سے بعض تو آپس میں باجماعت ادا کرتی ہیں اور بعض تنہا ادا کرتی ہیں، تو کیا ان دونوں صورتوں میں ان کی نماز ہو جاتی ہے یا پھر گناہ کی مستحق بنتی ہیں؟

المستفتی: اسرار الحق، محمد پور، اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عورتوں پر عیدین کی نماز واجب نہیں ہے۔
نیز عیدین کی نماز عورتوں کے لئے بلا جماعت اور مع جماعت پڑھنا بھی درست نہیں؛ البتہ عیدگاہ یامساجد میں عید کی نماز ہو جانے کے بعد عورتیں اپنے گھروں میں تنہا تنہا بطور شکریہ نفل نماز پڑھ سکتی ہیں، مگر وہ عید کی نماز نہ ہوگی اور نماز عید سے پہلے نفل پڑھنا عورتوں کے لئے بھی ممنوع ومکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳۲/۵، جدید زکریا ۱۵۱/۶، محمودیہ قدیم ۲۳۹/۱، ۲۳۷، جدید ڈابھیل ۳۹۳/۸، ۴۳۵)

وتجب صلاة العيدين على كل من تجب عليه صلوة الجمعة و من لا فلا.
(تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون في صلوة العيدين، نوع آخر في بيان من يجب عليه الخروج في العيدين، زكريا ۶۱۳/۲، رقم: ۳۴۲۸، قديم ۹۰/۲)

تجب صلاتهما في الأصح على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوى الخطبة. (الدر المختار مع الشامي، باب العيدين، مطلب في الفال والطيرة، كراچي ۱۶۶/۲، زكريا ۴۵/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۲۲۷/۳۵)

عورتوں کا تنہا عیدین کی نماز باجماعت ادا کرنا

سوال [۳۷۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محلّہ کی تمام عورتیں عیدین اور جمعہ کے دن کسی مقام پر جمع ہو کر کسی پڑھی لکھی عورت کو امام بنا کر تمام عورتیں اسی کے پیچھے نماز ادا کرتی ہیں، جب ان عورتوں سے کہا جاتا ہے کہ تم ایسا مت کرو، تو وہ عورتیں جواب دیتی ہیں کہ ہم لوگ جاہل ہیں خود سے نماز تنہا ادا نہیں کر سکتے، تعلیم

کے طور پر ایسا کرتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا شریعت مطہرہ میں درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد مرتضیٰ، مدھوبنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کا تنہا الگ سے عورت کو امام بنا کر عیدین کی نماز ادا کرنا ممنوع اور مکروہ تحریمی ہے اور شرعی طور پر عورتوں پر عیدین کی نماز لازم نہیں ہے۔

ویکرہ تحریماً جماعة النساء. (در مختار، کتاب الصلوٰة، باب الإمامة، کراچي ۱/۵٦٥، زکریا ۲/۳۰٦)

ویکرہ إمامة المرأة للنساء في الصلوة کلها من الفرائض، والنوافل. (عالمگیری، کتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الثالث في بیان من یصلح إماماً لغیرہ، زکریا ۱/۸۵)

ویکرہ تحریماً جماعة النساء؛ لأن الإمام إن تقدمت لزم زیادة الکشف، وإن وقفت وسط الصف لزم ترک الإمام مقامه، وکل منهما مکروہ. (حاشیة الطحطاوي علی الدر المختار، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کوئٹہ ۱/۲۴۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲۳۴/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۷/۱۴۱۳ھ

عورتیں عیدین کے دن کون سی نماز پڑھیں؟

سوال [۴۷۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کے لئے عید کی نماز ہے یا نہیں؟ ہے تو مستحب ہے یا نفل ہے یا کچھ اور؟

المستفتی: عبد المتین، قصبہ: بھنگا، شراوستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں پر عیدین کی نماز واجب نہیں، ان کو صرف اس کی

اجازت ہے کہ عیدگاہ یا مساجد میں عید کی نماز ہونے کے بعد اپنے گھروں میں تنہا بطور شکرانہ نفل نماز پڑھ لیں۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳۲/۵، جدید زکریا ۶/ ۱۵۱، مالا بد منہ ۶۲-۶۵، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند)

تجب صلاتهما في الأصح على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوىٰ الخطبة. (الدر المختار مع الشامي، باب العيدين، مطلب في الفال والطيرة، زكريا ٣/ ٤٥، كراچي ٢/ ١٦٦)

اعلم أن صلاة العيد واجبة على من تجب عليه الجمعة، هذا هو الصحيح من المذهب. (حلبي كبير، فصل في صلوة العيد، اشرفية ديو بند ص:٥٦٥)

ويكره إمامة المرأة للنساء في الصلوات كلها من الفرائض، والنوافل. (هندية، كتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماماً لغيره، زكريا قديم١/ ٨٥، جديد ١/ ١٤٣)

وتجب صلاة العيدين على كل من تجب عليه صلاة الجمعة ومن لا فلا. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون في صلوة العيدين، نوع آخر في بيان من يجب عليه الخروج في العيدين، زكريا ٢/ ٦١٣، رقم: ٣٤٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۷ھ

عورتوں کا گھروں میں عید کی نماز جماعت سے پڑھنا

سوال [۳۷۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں ایک پرانی رسم چلی آرہی ہے کہ مرد حضرات نماز عید گاہ میں پڑھتے ہیں اور عورتیں گاؤں کی مسجد میں عیدین کی نماز ادا کرتی ہیں، کبھی ان کی نماز کوئی پڑھا لکھا لڑکا پڑھاتا ہے اور کبھی انہیں عورتوں میں سے ایک پڑھی لکھی عورت ان کی نماز پڑھاتی

ہے اور خطبہ بھی دیتی ہے؛ لیکن ابھی تک اس بات کا نہ میں نے مشاہدہ کیا ہے اور نہ ہی کسی سے معلوم کیا ہے کہ آیا وہ ممبر پر چڑھ کر خطبہ دیتی ہے یا نیچے ہی اکتفا کرتی ہے، تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کیا عورت منبر پر چڑھ کر خطبہ دے سکتی ہے؟ اور کیا کوئی لڑکا بالغ یا نابالغ ان کی امامت کرسکتا ہے، بغیر پردہ کے حائل ہوتے ہوئے؟ اور کیا اس کے علاوہ اس دور میں عورتوں کی عیدین کی نماز کی ادائیگی کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا عیدین کے علاوہ کسی اور نماز کو وہ باجماعت ادا کرسکتی ہیں اور کیا مسجد میں عورتیں کسی بھی قسم کی کوئی نماز ادا کرسکتی ہیں؟ کیا شریعت کی رو سے اس کی اجازت ہے؟ نیز کیا کوئی عورت مسجد کی صفائی کرسکتی ہے؟

المستفتی: ابوالکلام سدھارتھ نگری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین اور جمعہ کی نماز عورتوں پر فرض نہیں ہے؛ لہٰذا عورتوں کا عیدگاہ جانا یا محلّہ کی مسجد میں جمع ہوکر عیدین کی نماز ادا کرنا درست نہیں ہے۔ اور جب عیدین کی نماز ہی درست نہیں ہے تو خطبہ بھی دینا درست نہیں ہے۔ نیز اس پرفتن دور میں عورتوں کا مسجد میں جانا اور اکٹھا ہوکر نماز ادا کرنا فتنہ سے خالی نہیں ہے؛ لہٰذا عورتوں کے لئے اس دور میں یہی حکم ہے کہ وہ اپنی نمازیں اپنے اپنے گھروں میں تنہا ہی ادا کریں، اسی طرح عورتوں کا عیدین کی جماعت کرنا کہ اس میں عورت ہی امام ہو اور خطبہ دے یہ بھی شرعاً ممنوع ہے، نیز صفائی کے لئے ایسی عورت مسجد میں جاسکتی ہے، جس پر فتنہ کا خوف نہ ہو؛ لیکن اگر فتنہ کا خوف واندیشہ ہو تو درست نہیں ہے۔

إعلم أن صلوة العيد واجبة على من تجب عليه الجمعة، هذا هو الصحيح من المذهب. (حلبي كبير، فصل في صلوة العيد اشرفية ديوبند ص: ٥٦٥، در مختار، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب في الفال و الطيرة، زكريا ٣/ ٤٥، كراچي ٢/ ١٦٦، الفتاوى التاتارخانية، فصل في صلوة اليدين، نوع آخر في بيان من يجب عليه الخروج في العيدين، زكريا ٢/ ٦١٣، رقم: ٣٤٢٨)

ویکره تحریماً جماعة النساء؛ لأن الإمام إن تقدمت لزم زیادة الکشف، وإن وقفت وسط الصف لزم ترک الإمام مقامه، وکل منهما مکروه. (حاشیة الطحطاوي علی الدر المختار، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کوئٹه ۱/ ۲٤٥، هندیة، کتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الثالث في بیان من یصلح أماماً لغیره، زکریا قدیم ۱/ ۸٥، جدید ۱/ ۱٤۳، در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کراچي ۱/ ٥٦٥، زکریا ۲/ ۳۰٦)

أجمعوا علی أنه لا یرخص للشواب منهن الخروج في الجمعة، والعیدین، وشئ من الصلوة لقوله تعالیٰ: وقرن في بیوتکن. (بدائع الصنائع، کتاب الصلاة، فصل في صلوة العیدین، شرائط وجوبها وجوازها، زکریا ۱/ ٦۱۷)

ولا یباح للشواب منهن الخروج إلی الجماعات بدلیل ما روي عن عمر رضؓ أنه نهي الشواب عن الخروج؛ ولأن خروجهن إلی الجماعات سبب الفتنة، والفتنة حرام، وما أدیٰ إلی الحرام فهو حرام. (بدائع الصنائع، صلاة الجماعة، فصل في بیان من یصلح للإمامة علی التفصیل، زکریا ۱/ ۳۸۸)

عن أم حمید قالت: قلت یا رسول الله! یمنعنا أزواجنا أن نصلي معک، ونحب الصلوة معک؟ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: صلاتکن في بیوتکن أفضل من صلاتکن في حجرکن، وصلا تکن في حجرکن أفضل من صلاتکن في الجماعة. الحدیث (مصنف ابن أبي شیبة، مؤسسة علوم القرآن بیروت ٥/ ۲۰۳، رقم: ۷۷۰۲)

عن أبي الأحوص رضؓ، قال: قال عبد الله: المرأة عورة وأقرب ماتکون من ربها إذا کانت في قعربیتها، فإذا خرجت استشرفها الشیطان. (مصنف لا بن أبي شیبة، مؤسسة علوم القرآن، بیروت ٥/ ۲۰۲، رقم: ۷٦۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۱۲۱/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۷/۸ھ

(٦) فصل في الدعاء، والمصافحة، والمعانقة بعد العيدين

عیدین کے بعد دعا کب مانگی جائے؟

سوال [۴۲۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کے خطبہ کے بعد متصلاً دعاء ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا دلیل ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کو باعث ثواب قرار دے کر دعا کرنے پر اصرار کرنا شریعت میں کیسا ہے؟
بعض فقہاء کی کتابوں میں لکھا ہے کہ دعا ثابت نہیں ہے اور بعض مفتیان کرام نے لکھا ہے کہ یہ ثابت ہے پس اگر کوئی نماز کے بعد بھی دعاء کرلے اور خطبہ کے بعد بھی دعاء کرلے تو اس کے کرنے پر کیا گناہ کبیرہ ہوگا یا صغیرہ؟ اور اگر کوئی عالم اس دعاء کے کرنے پر اصرار کرے اور نہ کرنے پر ملامت کرے تو اس عالم پر شریعت کا کیا حکم ہوگا؟
برائے کرام مدلل بحوالہ فیصلہ فرمائیں گے۔

المستفتی: مولانا شمس الحق آسام، خادم مدرسہ مرکز العلوم ڈبکا (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین میں اجتماعی دعا کرنا حدیث صحیح سے ثابت ہے؛ چنانچہ بخاری شریف، مسلم اور ترمذی شریف میں یہ روایت موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شوکت اسلام کی غرض سے عورتوں کو بھی عیدگاہ پہونچنے کا حکم ہوتا تھا اور اس میں حائضہ اور پردہ نشیں عورتوں کو بھی لے جایا جاتا تھا اور حائضہ عورتیں عیدگاہ میں عید کی نماز میں شریک نہیں ہوتی تھیں؛ بلکہ الگ بیٹھ جاتی تھیں اور جب عید کی نماز کے بعد دعاء ہوتی تھی تو دعاؤں میں شریک ہوجاتی تھیں، تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں اجتماعی دعاء ہوتی تھی؛ لیکن اس کی صراحت نہیں کہ نماز کے بعد ہوتی تھی یا خطبہ کے بعد۔

اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ نمازوں کے بعد دعاء قبول ہوتی ہے؛ اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیدگاہ میں جو دعاء ہوتی تھی وہ نماز کے بعد ہوتی تھی، اسی وجہ سے اکابرو مشائخ نماز عید کے بعد دعاء کو مستحب کہتے ہیں اور خطبہ کے بعد دعاء کے استحباب کا انکار کرتے ہیں۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن حفصة بنت سيرينؒ، قالت: كنا نمنع جوارينا أن يخرجن يوم العيد، فجاء ت امرأة فنزلت قصر بني خلف فأتيتها، فحدثت أن زوج أختها غزى مع النبي صلى الله عليه وسلم ثنتى عشرة غزوة، فكانت أختها معه في ست غزوات، قالت: كنا نقوم على المرضى، ونداوي الكلمىٰ، فقالت يا رسول الله! أعلى أحدانا بأس إذا لم يكن لها جلباب أن لاتخرج، فقال: لتلبسها صاحبتها من جلبابها، فليشهدن الخير و دعوة المؤمنين. (بخاري، كتاب العيدين، باب إذا لم يكن لها جلباب في العيد ١/ ١٣٤، رقم: ٩٧٠، ف: ٩٨٠، مسلم، كتاب العيدين فصل في إخراج العواتق و ذوات الخدور، النسخة الهندية ١/ ٢٩٠، بيت الأفكا رقم: ٨٩٠، ترمذي، كتاب العيدين، باب في خروج النساء في العيدين، النسخة الهندية ١/ ١٢٠، دارالسلام رقم: ٥٣٩)

عن أبي أمامة رضي الله عنه، قال: قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم: أي الدعاء أسمع؟ قال جوف الليل و دبر الصلوات المكتوبات.

(سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٧، دار السلام رقم: ٣٤٩٩)

عن أنس بن مالكؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: مامن عبد بسط كفيه في دبر كل صلاة، ثم يقول: اللّٰهم الٰهي وإله إبراهيم، واسحاق، ويعقوب، واله جبريل، وميكائيل، واسرافيل عليهم السلام، أسئلك أن تستجيب دعوتي، فإني مضطر وتعصمني في ديني، فإنى مبتلى وتنالني برحمتك، فإني مذنب وتنفي عني الفقر، فاني متمسكن إلاكان حقاً على الله عزوجل أن لا يرد يديه خائبتين. (عمل اليوم الليلة ١٢١، رقم: ١٣٨)

جب نماز کے بعد دعاء ہوگئی ہے، تو خطبہ کے بعد دعاء کی ضرورت نہیں اور سوال میں پوچھا گیا ہے کہ خطبہ کے بعد دعاء کرنے پر گناہ صغیرہ ہوگا یا کبیرہ تو زیر بحث مسئلہ گناہ کبیرہ سے متعلق ہے ہی نہیں؛ بلکہ استحباب اور عدم استحباب سے متعلق ہے اور استحباب کے خلاف مسئلہ پر اگر گناہ ہوتا ہے تو صغیرہ ہوتا ہے، جو نیک اعمال کے ذریعہ معاف ہو جاتا ہے؛ لہٰذا خطبہ کے بعد دعا نہ کرنے والوں پر ملامت کرنا غلط ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱ر ۱۱۸۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱/۱۴۳۶ھ

کیا عید کی نماز کے بعد دعاء کرنا حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے؟

سوال [۳۷۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز عیدین کے بعد قبلِ خطبہ دعا مانگنا، حضور ﷺ یا صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد اللطیف وعبد الملک، نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عیدین کی نماز میں دعا کرنا تو ثابت ہے؛ لیکن وہ دعاء نماز کے بعد کی جائے یا خطبہ کے بعد اس کی تعیین حدیث میں نہیں ہے اور احادیث شریفہ میں فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنے کا ورود ہوا ہے۔ نیز ہمارے تمام اکابر اہل فتاوی نے نماز کے بعد خطبہ سے پہلے دعا مانگنے کو بہتر کہا ہے؛ اس لئے دیگر نمازوں کی طرح عیدین کی نماز کے بعد دعا مانگنا مستحب ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/ ۱۲۵، عزیز الفتاوی ۳۰۲، امداد المفتیین ۴۰۸، فتاوی محمودیہ قدیم ۲/ ۲۹۵، جدید ڈابھیل ۸/ ۴۶۵، احسن الفتاوی ۴/ ۱۲۵، فتاوی دار العلوم ۵/ ۲۲۵)

عن أم عطية رضـ قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم،

ویدعون بدعائهم یرجون برکة ذلک الیوم وطهرته. (صحیح البخاري، کتاب العیدین، باب التکبیر أیام منی ۱/۱۳۲، رقم: ۹٦۱، ف:۹۷۱)

عن أبي أمامة رضؓ قال: قیل یا رسول الله ! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف اللیل الأخر ودبر الصلوات المکتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلاترجمة، النسخة الهندیة ۲/۱۸۷، دارالسلام رقم:۳٤۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۶۱)

عیدین کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال [۳۷۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا کہیں سے ثبوت ہے یا نہیں؟

المستفتی: مقصود عالم، چمپارن، متعلم مدرسہ جامع مسجد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدین کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا ثابت اور مشروع ہے، مگر خطبہ کے بعد ثابت نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۰۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۲۹۵، جدید ڈابھیل ۸/۴۶۵)

عن أم عطیة رضؓ قالت: کنا نؤمر أن نخرج یوم العید حتی نخرج البکر من خدرها حتی نخرج الحیض، فیکن خلف الناس، فیکبرن بتکبیرهم، ویدعون بدعائهم یرجون برکة ذلک الیوم وطهرته. (صحیح البخاري، کتاب العیدین، باب التکبیر أیام منی ۱/۱۳۲، رقم: ۹٦۱، ف:۹۷۱)

عن أبي أمامة رضؓ قال: قیل یا رسول الله ! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف اللیل الأخر ودبر الصلوات المکتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلاترجمة،

النسخة الهندية ۲/ ۱۸۷، دار السلام رقم: ۳۴۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۳۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۷/ ۱۴۱۸ھ

نماز عید اور خطبہ دونوں کے بعد دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال [۴۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ہمارے یہاں جمعہ وعیدین کا امام ہے، امام مذکور عیدین میں نماز عیدین کے بعد دعا مانگتا ہے اور خطبہ سے فارغ ہو کر پھر دوبارہ اجتماعی جہری دعا کرتا ہے۔ زید امام کے اس عمل پر عمرو نے زید کو دو دعا مانگنے سے منع کیا اور کہا کہ نماز عیدین کے بعد دعا مانگ لیں اور خطبہ کے بعد دعا نہ کریں اور عمرو نے اپنی دلیل میں امداد الفتاوی، فتاوی رحیمیہ وغیرہ کا حوالہ پیش کیا، مگر زید امام دو دعا مانگنے پر مصر ہے۔ اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ زید وعمرو میں کس کا موقف صحیح اور جمہور کے موافق ہے؟ پھر اگر ایک ہی دعا کرنا ثابت ہے، تو یہ دعا کس وقت کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، آیا نماز عیدین کے بعد یا بجائے بعد نماز عیدین کے خطبہ کے بعد دعا کرنا بہتر ہے؟ مفصل باحوالہ تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: سفیان احمد القاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عیدین کی نماز کے بعد دعاء مشروع ہے؛ لیکن خطبہ کے بعد دعاء کا کوئی ثبوت نہیں ملتا؛ لہٰذا عمرو کا دو دعا پر نکیر کرنا صحیح اور درست ہے اور عمرو نے دلیل میں جن فتاوی کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، وہ بھی درست ہے۔ اور زید امام کا دو دعاء مانگنے پر مصر ہونا ہٹ دھرمی اور ضد پر محمول ہوگا، اس کو اپنی ضد سے باز آجانا چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/ ۲۹۵، ۲/ ۳۰۷، جدید ڈابھیل ۸/ ۴۶۵، ۴۶۱، امداد الفتاوی ۱/ ۶۰۲، ایضاح المسائل ۳۳)

عن أم عطيةؓ قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ١٣٢/١، رقم: ٩٦١، ف:٩٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۷۳۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۷ھ

عیدین کے خطبہ کے بعد دعاء کرنا کیسا ہے؟

سوال [۴۶ ۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں کے اندر کافی دن سے یہ اختلاف ہے کہ عیدین کی نماز کے بعد دعاء مانگنی چاہئے یا خطبہ کے بعد؟ ہمارے یہاں چند عالم ہیں اور حفاظ بھی ہیں؛ لیکن معلوم ہونے کے باوجود کبھی عیدین کے خطبہ سے پہلے دعا کر لیتے ہیں اور کبھی بعد میں کوئی امام مقرر نہیں، جو نماز پڑھاتا ہے اس کا طریقہ علیحدہ ہوتا ہے۔ صحیح مسئلہ بیان فرمائیں۔

المستفتی: محمد عمران رامپوری، گرام ملک منڈی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خطبہ کے بعد دعاء کا ثبوت نہیں اور نمازوں کے بعد ثابت ہے؛ اس لئے عیدین میں نماز کے بعد ہی دعاء کرنا صحیح طریقہ ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۶۰۲/۱)

عن أبي أمامةؓ، قال: قيل يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ١٨٧/٢، دار السلام رقم: ٣٤٩٩)

عن أم عطيةؓ، قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ١/١٣٢، رقم: ٩٦١، ف: ٩٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

نماز عید کے بعد دعا

سوال [۴۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعد نماز عیدین کے دعا مانگنے کے بارے میں ہمارے ضلع کے علماء کرام میں تین فریق ہوگئے۔

(۱) فریق اول فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد عموماً وخصوصاً دعا مانگنا احادیث سے ثابت ہے، پس نماز عیدین بھی اس حکم میں داخل ہے۔ اور خطبہ تکمیل صلوۃ ہونے کی وجہ سے خطبہ کے بعد دعاء کرنا مستحب ہے؛ کیونکہ نماز اور خطبہ کے درمیان کوئی فصل منقول نہیں۔

(۲) فریق دوم فرماتے ہیں کہ بعد نماز عیدین کے دعا کرنا مستحب ہے اور خطبہ کے بعد نہیں؛ کیونکہ خطبہ لیکچر کو کہتے ہیں اور لیکچر کے بعد دعا منقول نہیں۔

(۳) فریق سوم کہتے ہیں کہ بعد نماز عیدین کے دعا کرنا مسنون ہے اور خطبہ کے بعد بھی، یہ فریق بعد نماز عیدین کے دو مرتبہ دعا کرتے ہیں، ان تینوں فریقوں کی صورتوں میں سے کون سی صورت اچھی ہے، جن کا اتباع ہم پر لازم ہے؟

المستفتی: محمد اجمل حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز عید کے بعد دعا اجتماعی طور پر مانگنا احادیث شریفہ

سے ثابت ہے؛ لہٰذا نماز کے بعد خطبہ سے قبل یا خطبہ کے بعد لاعلی التعیین اجتماعی دعاء مانگنا جائز ہے؛ لیکن اکابر اہل فتاوی نے نماز کے بعد خطبہ سے قبل کو مستحب لکھا ہے؛ اس لئے صرف ایک دعا مانگنا اور وہ بھی خطبہ سے قبل نماز کے بعد مستحب ہے اور دو دعاء مانگنا کہیں سے ثابت نہیں۔ اور حضور ﷺ عیدین میں حائضہ اور نفساء عورتوں کو لے جاتے تھے اور یہ خواتین نماز کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی دعا میں شامل ہو جاتی تھیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۰۳، ایضاح المسائل ص: ۳۳)

عن أم عطيةؓ، قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ١/١٣٢، رقم: ٩٦١، ف: ٩٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۲۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۲۷ھ

عید کی نماز کے بعد دعاء

سوال [۴۷۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز میں دعا ہے یا نہیں؟ اجتماعی طور پر دعا مانگیں یا نہیں؟ مانگیں تو کب مانگیں نماز کے بعد یا خطبہ کے بعد؟ ہمارے شہر میں خطبہ کے بعد دعا مانگنے کا مقامی علماء نے رواج روا رکھا ہے اور اس کو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب کفایت المفتی میں لکھا ہے کہ دعا نماز کے بعد جائز ہے، مگر خطبہ کے بعد دعا افضل ہے، بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے یہاں خطبہ کے بعد ہی دعا مانگنے کا رواج ہے، مگر کچھ لوگ اس کو منع کرتے ہوئے نماز کے بعد ہی دعا مانگتے ہیں اور اسی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور عوام میں ایک نیا بھونچال پیدا کرتے ہیں، جس

سے اختلاف ابھر کر قوم میں توڑ پھوڑ کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔

المستفتی: انجمن اتحاد المعلمین، کھرگون (ایم پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ وارد ہے کہ عیدین کی نماز میں حائضہ اور نفساء عورتیں دعاء میں شرکت کے لئے جاتی تھیں۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أم عطيةؓ، قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ۱/۱۳۲، رقم: ۹۶۱، مشكوة شريف ۱۲۵)

حدیث شریف سے ایک دعا کرنا ثابت ہے؛ لیکن وہ دعا نماز کے بعد کی جائے یا خطبہ کے بعد اس کی تعیین حدیث میں نہیں ہے۔ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے اس سلسلہ میں دو فتوے ہیں، ایک میں یہی بات ہے کہ دونوں موقعوں میں سے کسی ایک موقعہ پر دعا مانگی جائے تو مضائقہ نہیں۔ اور دوسرے میں خطبہ کے بعد کو اچھا کہا ہے؛ لیکن حضرت مفتی صاحب کے علاوہ باقی تمام اکابر اہل فتاوی نے بجائے خطبہ کے بعد کے نماز کے بعد دعا مانگنے کو بہتر کہا ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ، حضرت مفتی محمود صاحبؒ اور حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ لدھیانویؒ وغیرہم، ان کے فتاوی کے حوالے ذیل میں درج ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۰۷، عزیز الفتاوی ۳۰۲، امداد المفتیین ۴۰۸، فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۲۹۵، ۲/۳۰۷، جدید ڈابھیل ۸/۴۶۱، ۴۶۵، احسن الفتاوی ۴/۱۲۵، فتاوی دار العلوم ۵/۲۲۵)

عن عائشةؓ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: في دبر

كل صلوة: اللّٰهم رب جبرئيل، وميكائيل، واسرافيل، أعذني من حر النار، وعذاب القبر. (مجمع الزوائد، كتاب الأذكار، الدعاء في الصلاة و بعدها، دارالكتب العلمية بيروت ١١٠/١٠)

عن أبي أمامةؓ، قال: قيل يا رسول اللّٰه! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الاٰخر ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ١٨٧/٢، دارالسلام رقم: ٣٤٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۶۳۳/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۵ھ

دعا عید کی نماز کے بعد ہو یا خطبہ کے بعد؟

سوال [۴۷۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بستی میں عید کی نماز کے بعد دعاء مانگنے کے سلسلہ میں زید اور بکر کا اختلاف ہے، زید ایک طویل عرصہ تک امام کے ساتھ نماز کے بعد دعاء مانگتا رہا، مگر چند دنوں سے زید اور امام نے نماز کے بعد دعاء مانگنا ترک کر دیا ہے، ان کے اس عمل پر بکر نے سختی سے اصرار کرنا شروع کیا ہے کہ نماز کے بعد خطبہ سے پہلے دعاء مانگنی چاہیے، اس بات کو زید اور امام ماننے کے لئے تیار نہیں اور راپنے اس عمل (ترک دعا) پر بطور استدلال ام عطیہؓ کی روایت جو بخاری شریف ۱۳۲/۱ پر موجود ہے، اس کو پیش کرتا ہے۔ زید اور امام دلیل دیتا ہے کہ صلوۃ عید کے بعد دعاء منصوص نہیں۔ اب قابل لحاظ چند امور ہیں۔

الف: نماز عید کے بعد فوراً دعاء مانگنا ثابت ہے یا نہیں؟

ب: اگر ثابت ہے تو تارک دعاء قابل ملامت ہے یا نہیں؟

ج: زید اور امام اور اس کے رفقاء حق پر ہیں یا بکر اور اس کے ہمنوا راہ راست پر ہیں؟

نیز ایسی صورت حال پیش آنے پر دونوں فریقوں کا کیا موقف ہونا چاہئے؟ بینوا توجروا.

المستفتی: عبدالحسیب اشہد، سنسار پوری، متعلم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کی نماز کے بعد دعاء صراحت کے ساتھ تو ثابت نہیں؛ لیکن ام عطیہؓ کی روایت جو بخاری شریف میں منقول ہے، اس سے اشارہ اور دلالت کے طور پر ثابت ہوتی ہے؛ لہٰذا اگر دعا مانگی جائے تب بھی قابل اشکال نہیں۔ اور اگر نہ مانگی جائے تب بھی قابل اعتراض نہیں۔ یہ ایک اختیاری امر ہے، اس پر اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں، مگر اکابر ومشائخ نے دعاء مانگنے کو مستحب لکھا ہے؛ اس لئے نماز کے بعد خطبہ سے قبل دعاء مانگنا مستحب ہوگا لازم نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۶۰۳)

دونوں فریقوں میں سے کسی پر بھی ملامت یا اعتراض مناسب نہیں۔

عن أم عطيةؓ، قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ۱/۱۳۲، رقم: ۹۶۱، ف: ۹۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۵۰۵)

نماز عید کے بعد دعا کے سلسلے میں اکابر دیوبند کا معمول

سوال [۴۷۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین میں دعا نماز کے بعد کرنی چاہئے یا خطبہ کے بعد اکابر فقہاء کا کیا معمول رہا ہے؟

المستفتی: حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد، بقلم: کلیم اللہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نمازِ عید کے بعد دعاء جائز اور مشروع ہے، مگر خطبے کے بعد دعا کا ثبوت نہیں ہے۔ نیز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی (شیخ الہند) تمام اکابر کا یہی معمول رہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/۱۹، فتاوی محمودیہ قدیم ۷/۲۱۸، جدید ڈابھیل ۸/۴۶۲)

عن عائشةؓ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في دبر كل صلوة: اللّٰهم رب جبرئيل، وميكائيل، واسرافيل، أعذني من حر النار، وعذاب القبر. (مجمع الزوائد، كتاب الأذكار، الدعاء في الصلاة و بعدها، دارالكتب العلمية بيروت ١٠/ ١١٠)

عن أم عطيةؓ، قالت: كنا نؤمر أن نخرج يوم العيد حتى نخرج البكر من خدرها حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس، فيكبرن بتكبيرهم، ويدعون بدعائهم يرجون بركة ذلك اليوم وطهرته. (صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منى ١/ ١٣٢، رقم: ٩٦١، ف: ٩٧١)

عن أبي أمامةؓ، قال: قيل يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٧، دارالسلام رقم: ٣٤٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۶۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۵/۴ھ

عیدین کی نماز میں دعاء کب کی جائے خطبہ سے پہلے یا بعد میں؟

سوال [۳۷۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ عیدین کی نماز میں اگر خطبہ کے بعد دعاء کی جائے تو اس میں شرعاً کیا مضائقہ ہے؛ چونکہ محلّہ کے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ عیدین کے خطبہ کے بعد دعاء کی جائے۔ اور دوسری مساجد میں بھی خطبہ کے بعد دعاء ہوتی ہے؛ لیکن محلّہ کے چند لوگ کہتے ہیں کہ عیدین میں خطبہ کے بعد شریعت میں کہیں بھی کسی بھی حدیث سے دعا ثابت نہیں ہے؛ اس لئے محلّہ میں اس مسئلہ کو لے کر کافی انتشار ہے، درخواست ہے کہ حدیث وفقہ کی روشنی میں مدلل اور مفصل جواب دیں؟

المستفتی: محمد یوسف خان گوجر ٹولہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مطلقاً نمازوں کے بعد دعا کا ثبوت تو بہت سی احادیث سے ہے؛ اس لئے عیدین کے سلام کے بعد خطبہ سے پہلے اجتماعی طور پر دعا مانگنا شرعاً جائز اور درست ہے اور پھر خطبہ کے بعد دوبارہ دعا مانگنا حدیث وفقہ اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہیں ہے۔ (مستفاد: مجموعۃ الفتاوی قدیم ۱/۱۲۰، امداد الفتاوی ۱/۶۰۳، عزیز الفتاوی ۱/۳۰۷، محمودیہ قدیم ۲/۲۹۵، ۲/۲۰۸، جدید ڈابھیل ۸/۴۶۱، ۴۶۵)

عن أبي أمامة رضـ قال: قيل يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۲/۱۸۷، دارالسلام رقم: ۳۴۹۹)

عن عائشة رضـ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في دبر كل صلوة: اللّٰهم رب جبرئيل، وميكائيل، واسرافيل، أعذني من حر النار، وعذاب القبر. (مجمع الزوائد، كتاب الأذكار، الدعاء في الصلاة و بعدها، دارالكتب العلمية بيروت ۱۰/۱۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰۱۶)

نمازعیدین کے بعد مصافحہ سے متعلق جامع فتوی

سوال [۴۷۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز کے بعد لوگوں میں مصافحہ کا معمول ہے، خاص طور پر عید کی نماز پڑھانے والے امام صاحب سے مصافحہ کے لئے لوگوں کی بھیڑ لگتی ہے؛ اس لئے مفتی صاحب سے صحیح مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے کہ عیدین کی نمازوں کے بعد عید گاہ میں یا عیدگاہ سے نکل کر باہر لوگوں کا آپس میں مصافحہ کرنا کیسا ہے؟ اور مصافحہ کے ساتھ عید کی مبارک بادبھی پیش کرتے ہیں، اسی طرح اگر عید کی نماز مسجدوں میں ہوتی ہے، تو وہاں بھی یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے، اس کا شرعی حکم واضح فرمائیں۔

المستفتی: عبیداللہ، بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کی نماز کے بعد مصافحہ سے متعلق تفصیلی بات دلائل کے ساتھ ضروری معلوم ہوتی ہے، اس مسئلہ میں احقر نے بعض بڑوں اور بعض اہل فتاوی کی تحریروں کو دیکھ کر نمازوں کے بعد کے مصافحہ کو کہیں مکروہ اور کہیں بدعت لکھا ہے، اسی طرح عید کی نمازوں کے بعد کے مصافحہ کو بھی مطلقاً مکروہ لکھ دیا اور اردو کے فتاوی کے حوالہ کو بھی پیش کردیا اور شامی کا حسب ذیل جزئیہ بھی دلیل کے طور پر لکھدیا۔

ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط: أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوة بكل حالٍ؛ لأن الصحابة رضي الله عنهم ماصافحوا بعد أداء الصلوة؛ ولأنها من سنن الروافض، ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة لا أصل لها في الشرع، وإنه ينبه فاعلها أولا ويعزر ثانياً، ثم قال وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: إنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه، لا في أدبار

الصلوات، فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك، ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچي ٦/٣٨١، زكريا ديوبند ٩/٥٤٧)

مگراس موضوع سے متعلق مختلف کتب فقہ، کتب حدیث کی مراجعت اور شیعوں اور روافض کے عمل اورمحل مصافحہ کو دیکھنے کے بعدضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ سے متعلق ہر گوشہ کو پیش نظر رکھ کرمسئلہ کوسمجھنے کی ضرورت ہے، یہاں یہ بات یادرکھیں کہ جومسئلہ اب لکھا جارہا ہے احقر نے جتنے بھی فتاوی اس موضوع سے متعلق اس سے قبل لکھے ہیں، ان میں سے جوبھی فتوی اس تحریر کے خلاف ہوگا اس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ یہی تحریر صحیح ہے اوراس کے خلاف دیئے گئے فتووں سے اس تحریر کے ذریعہ رجوع کیا جارہا ہے؛ لہٰذا مختلف کتابوں کی مراجعت کے بعد جوکچھ بھی اس نااہل نے سمجھا ہے وہ پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) نماز کا سلام پھیرتے ہی فوراً دائیں بائیں جانب کے لوگوں سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا جائے، جیسا کہ حرمین شریفین میں ایران سے آئے ہوئے شیعہ ورافضی اوراسی طرح انڈونیشیا اورملیشیا سے آئے ہوئے بعض لوگ اس طرح سلام کے معاًبعد مصافحہ کرتے ہوئے کثرت کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں، یہی شیعوں اور رافضیوں کا شعار ہے اوراسی کو علماء نے من سنن الروافض کہہ کر بدعت اورمکروہ قرار دیا ہے، جیسا کہ شامی کی مذکورہ عبارت میں موجود ہے؛ لہٰذا شیعوں اور رافضیوں کا شعار صرف یہی ایک شکل قرار دی جاسکتی ہے، دیگر شکلوں کوان کا شعارنہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

وذكر أن منهم من كرهها؛ لأنها من سنن الروافض. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/٣٦٣)

(۲) چند افراد نماز کے لئے مسجد جارہے ہوں اور انہوں نے آپس میں ملاقات کے وقت مصافحہ نہیں کیا اوراسی طرح گفتگو کرتے ہوئے مسجد پہونچ جائیں، پھر نماز سے فراغت کے بعد آپس میں مصافحہ کرنے لگیں، تو اس کو بھی علماء نے مکروہ اور بدعت مذمومہ قرار دیا ہے؛ اس

لئے کہ اس صورت میں یہ بات لازم آتی ہے کہ ان لوگوں نے نمازوں کے بعد ہی مصافحہ کو لازم اور مسنون سمجھا ہے؛ اس لئے علماء نے اس طرح کے مصافحہ کو مکروہ اور بدعت قرار دیا ہے۔

جو ذیل کی عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة، ثم إذا صلوا يتصافحون، فأين هذا من السنة المشروعة ولذا صرح بعض علمائنا بأنها مكروهة حينئذٍ وأنها من البدع المذمومة. (مرقاة المفاتيح، كتاب الآداب، باب المصافحة والمعانقة، مكتبة امداديه ملتان ۹/ ۷٤، عون المعبود، باب المصافحة، دارالكتاب العربي ٤/ ۲۱ ٥، رقم: ۵۲۱۱، حاشية سنن أبي داؤد هندي ۲/ ۷۰۸)

(۳) نمازوں کے سلام کے بعد متصلاً بیٹھے بیٹھے دائیں بائیں کے لوگوں سے مصافحہ نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی نمازوں کے بعد اسے مسنون سمجھا جاتا ہے، اسی طرح نماز سے قبل ملاقات پر مصافحہ نہیں ہوا اور گفتگو کرتے ہوئے مسجد پہنچ کر نماز ادا کرنے کے بعد مصافحہ نہیں ہوا اور نہ ہی نمازوں کے بعد مصافحہ کی مواظبت اور پابندی کا اہتمام ہے؛ بلکہ کبھی کبھار نماز کے بعد امام صاحب سے مصافحہ کا اہتمام ہے جیسا کہ ہماری مغربی یوپی کی عام مساجد کا یہی حال ہے، تو ایسی صورت میں کبھی کبھار کسی سے محبت میں مصافحہ کرلیا جائے یا کسی سے چند دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے، اس سے نماز کے بعد مصافحہ کرلیا جائے، چاہے عصر یا فجر کی نماز کے بعد ہی کیوں نہ ہو، تو اس طرح کا مصافحہ شرعاً مسنون اور مستحب ہے۔ صاحب درمختار نے اپنی عبارت کے ذریعہ سے اسی شکل کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

درمختار کی عبارت ملاحظہ ہو۔

تجوز المصافحة؛ لأنها سنة قديمة متواترة، بقوله عليه الصلاة والسلام: من صافح أخاه المسلم وحرك يده......تناثرت ذنوبه، وإطلاق المصنف تبعاً للدرر والكنز والوقاية والنقاية والمجمع والملتقى وغيرها

يفيد جوازها مطلقاً ولو بعد العصر. (در مختار مع رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، كراچي٦/٣٨١، زكريا ٩/٥٤٧)

اور یہ حکم مرقاۃ کی اس عبارت سے بھی مستفاد ہوتا ہے۔

نعم لو دخل أحد في المسجد والناس في الصلاة، أو على إرادة الشروع فيها، فبعد الفراغ لو صافحهم؛ لكن بشرط سبق الكلام على المصافحة، فهذا من جملة المصافحة المسنونة بلاشبهة. (مرقاة المفاتيح، كتاب الأدب، باب المصافحة والمعانقة، مكتبة امداديه ملتان ٩/٧٤)

اور بلامواظبت نماز عصر کے بعد بھی مصافحہ کا ثبوت اس حدیث شریف سے ہوتا ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن الحكم قال سمعت أباجحيفة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم بالهاجرة إلى البطحاء، فتوضأ، ثم صلى الظهر ركعتين والعصر ركعتين، وبين يديه عنزة، قال شعبة: وزاد فيه عون عن أبيه عن أبي جحيفة قال: كان تمر من ورائها المرأة وقام الناس فجعلوا يأخذون يديه فيمسحون بهما وجوههم، قال: فأخذت بيده فوضعتها على وجهي، فإذا هي أبرد من الثلج، وأطيب رائحة من المسك. (صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ١/٥٠٢، رقم:٣٤٢٨، ف:٣٥٥٣، مسند أحمد بن حنبل ٤/٣٠٩، رقم:١٨٩٧٤، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٢٢/١١٥، رقم:٢٩٤)

(۴) عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ کے بارے میں غور کرنا ہے؛ چنانچہ عید کی نماز کو جاتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات ہوجائے اور اس میں سلام ومصافحہ نہ ہو پھر عید کی نماز کے بعد وہی لوگ جوساتھ میں گفتگو کرتے ہوئے آتے ہیں آپس میں مصافحہ کرنے لگیں تو یہ محض رسمی مصافحہ ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

وقديكون جماعة......إلى...... من البدع المذمومة. (مرقاة المفاتيح ملتان ٧٤/٩، عون المعبود ٥٢١/٤، حاشية أبوداؤد ٧٠٨/٢)

لیکن اگر عید کو جاتے وقت راستہ میں ملاقات پر سلام مصافحہ ہو چکا ہے، پھر عید کی نماز کے بعد عید کی مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مصافحہ بھی ہو جائے تو یہ شکل نماز کے بعد کی خصوصیت اور اہتمام کے دائرہ میں شامل نہ ہوگی؛ بلکہ ہر ملاقات پر مصافحہ کے حکم میں شامل ہوگی؛ اس لئے کہ نماز سے پہلے کی ملاقات میں بھی مصافحہ ہوا ہے اور بعد کی ملاقات میں بھی مصافحہ ہوا ہے؛ لہٰذا اس کو بدعت یا مکروہ کہنا درست نہیں اور درمختار کی ذیل کی عبارت کے حکم میں شامل ہو جائے گا۔

عبارت ملاحظہ فرمائیے:

تجوز المصافحة؛ لأنها سنة قديمة متواترة لقوله عليه السلام من صافح أخاه المسلم وحرك يده تناثرت ذنوبه . (در مختار مع الرد، كتاب الحظروالإباحة، باب الاستبراء وغيره كراچي ٣٨١/٦، زكريا ٥٤٧/٩)

عید کی مبارک باد پیش کرنے کا جواز ذیل کی احادیث اور جزئیات سے ہوتا ہے۔

احادیث شریفہ ملاحظہ فرمائیں:

حدثني حبيب بن عمر الأنصاري، أخبرني أبي قال: لقيت واثلة يوم عيد فقلت: تقبل الله منا و منك فقال: نعم! تقبل الله منا و منك . (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٥٢/٢٢، رقم:١٢٣)

عن خالد بن معدان قال: لقيت واثلة بن الأسقع في يوم عيد، فقلت: تقبل الله منك، فقال: نعم! تقبل الله منا و منك ، قال واثلة: لقيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عيد فقلت: تقبل الله منا و منك، قال: نعم! تقبل الله منا و منك . (السنن الكبري للبيهقي، باب ماروي في قول الناس يوم العيد بعضهم لبعض: تقبل الله مناو منك ١١١/٥، رقم: ٦٣٨٧، دارالفكر بيروت، كتاب صلاة العيدين)

عن أدهم مولىٰ عمر بن عبد العزيز، قال: كنا نقول لعمر بن عبد العزيز في العيدين: تقبل الله مناومنک ياأمير المؤمنيين، فيرد علينا ولاينكر ذلک علينا. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في الصيام، في ليلة العيدين، ويومها ۳/۳٤٥، رقم: ۳۷۲۰، المعجم الكبير للطبراني، ۲۲/۵۳، رقم:۱۲۳، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب صلاة العيدين، باب ماروي في قول الناس يوم العيدين بعضهم لبعض: تقبل الله منا و منك ، جديد ٥/١١١ ، رقم:٦٣٨٩، دارالفكر بيروت)

اورشامی وغیرہ میں اس حکم کوان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

والمتعامل في البلاد الشامية، والمصرية عيد مبارک عليک ونحوه، وقال: يمكن أن يلحق بذلک في المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم، فإن من قبلت طاعته في زمان كان ذلک الزمان عليه مباركاً على أنه قدورد الدعاء بالبركة في أمور شتى فيؤخذ منه استحباب الدعاء بها هنا أيضاً. (شامي، كتاب الصلاة، باب العدين مطلب يطلق المستحب على السنة و بالعكس، زكريا ۳/۵۰، كراچي ۲/۱٦۹، ومثله في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ، كتاب الصلاة، باب أحكام العيدين، دار الكتاب ديوبند ۵۳۰ ، حلبي كبير، صلاة العيد، فروع خروج إلى المصلى، مطبع لاهور ۵۷۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٤/٩٩)

(۵) عید کی نماز کے بعدلوگوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا؛ جبکہ اس میں کسی کی کسی سے مہینہ بھر کے بعد ملاقات ہورہی ہے، کسی کی ہفتوں اورکسی کی ایک دودن کے بعد ملاقات ہورہی ہے، تو ایسی صورت میں عید کی نماز اورخطبہ کے بعد واپسی کے موقعہ پر ایک دوسرے سے ملاقات پر مصافحہ کرنا نہ صرف جائز اور درست ہے؛ بلکہ ایک دوسرے سے فرط محبت میں اس موقعہ پر مصافحہ کرنا باعث اجر وثواب اور گناہوں کے جھڑنے اورمعاف ہونے کا سبب بنے گا۔

عن أنسؓ قال: كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم إذا تلاقوا

تصافحوا. الحدیث (المعجم الأوسط، دار الکتب العلمیة بیروت ۱/ ۴۱، رقم: ۹۷)

عن أیوب بن بشیر عن رجل من عنزة أنه قال: قلت لأبي ذر ......هل کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصافحکم إذا لقیتموهٗ؟ قال: ما لقیته قط إلا صافحني. (سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب في المعانقة، النسخة الهندیة ۲/ ۷۰۸، دارالسلام رقم:۵۲۱۴، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۱۶۳، رقم:۲۱۷۷۴، ۲۱۷۷۵)

عن حذیفة بن الیمان عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: إن المؤمن إذا لقي المؤمن فسلم علیه، وأخذ بیده، فصافحه، تناثرت خطایاهما کما یتناثرورق الشجر. (المعجم الأوسط للطبراني، دارالفکر بیروت ۱/ ۸۵، رقم: ۲۴۵)

عن البراء قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، مامن مسلمین یلتقیان، فیتصافحان إلاغفر لهما قبل أن یفترقا. (سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب في المصافحة، النسخة الهندیة ۲/ ۷۰۸، دارالسلام رقم: ۵۲۱۲، جامع الترمذي، کتاب الإستئذان، باب ماجاء في المصافحة، النسخة الهندیة ۲/ ۱۰۲، دارالسلام رقم:۲۷۲۷)

(۲) عید کی نماز کے بعد امام صاحب سے مصافحہ کرنا، یہاں یہ بات واضح رہے کہ امام صاحب سے کسی شخص کی ملاقات سال بھر کے بعد کسی کی مہینہ، کسی کی ہفتہ اور کسی کی چند دنوں کے بعد ہوتی ہے، اب اگر محض امام صاحب سے محبت اور امام صاحب کے مصافحہ سے برکت حاصل کرنے کے ارادہ سے عید کی نماز کے بعد امام صاحب سے مصافحہ کریں تو اس میں کوئی قباحت اور کراہت نہیں ہے؛ بلکہ بلا کراہت و بلاشبہ جائز ہے اور یہ مصافحہ اول ملاقات پر مصافحہ کے حکم میں ہے؛ اس لئے امام صاحب سے عید کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا ہر حال میں بلاکراہت جائز ہے۔

عن الحکم قال: سمعت أباجحیفة قال: خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بالهاجرة إلی البطحاء فتوضأ، ثم صلی الظهر رکعتین، والعصر رکعتین، وبین یدیه عنزة، قال شعبة: وزاد فیه عون عن أبیه عن أبي جحیفة

قال: كان تمر من ورائها المرأة، وقام الناس فجعلوا يأخذون يديه فيمسحون بهما وجوههم، قال: فأخذت بيده فوضعتها على وجهي، فإذا هي أبرد من الثلج، وأطيب رائحة من المسک. (صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۱/ ۵۰۲، رقم:۳۴۲۸، ف:۳۵۵۳، مسند أحمد بن حنبل ۴/ ۳۰۹،رقم:۱۸۹۷۴، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۲۲/ ۱۱۵، رقم:۲۹۴)

عن البراء بن عازبؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا التقى المسلمان، فتصافحا وحمدا الله واستغفراه غفر لهما. (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في المصافحة، النسخة الهندية ۲/ ۷۰۸، دارالسلام رقم: ۵۲۱۱)

عن أنسؓ أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصافح بعضهم بعضاً. (سنن الترمذي، كتاب الاستئذان والأدب، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۳، دارالسلام رقم:۲۷۲۹، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن جديد ۱۳/ ۱۸۵، رقم:۲۶۲۳۳، صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب في المصافحة، النسخة الهندية ۲/ ۹۲۶، رقم:۶۰۲۲، ف:۶۲۶۳)

عن أنسؓ قال: كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم إذا تلاقوا تصافحوا. الحديث (المعجم الأوسط للطبراني، دارالفكر بيروت ۱/ ۴۱، رقم: ۹۲، ومثله في شرح معاني الأثار، كتاب الكراهة، باب المعانقة، دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۹۲، رقم:۶۷۶۶، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن جديد تحقيق شيخ محمد عوامه ۱۳/ ۱۸۵، رقم: ۲۶۲۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۷۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۱۷ھ

عید کی مبارک باد پیش کرنا

سوال [۴۷۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل لوگوں میں عید کے موقعہ پر اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک دوسرے کو عید کی مبارک بادی پیش کرتے ہیں، تو کیا شرعاً عید مبارک کہہ کر عید کی مبارک باد پیش کرنا مشروع ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبیداللہ، بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کا دن اسلام میں سال بھر کی خوشی کا دن ہے اور اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی اجتماعیت کے ساتھ ایک نماز کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بہت بڑی خوشی کا بھی دن ہے۔ اور اپنے لباس سے، اپنے کردار سے، چلت، پھرت سے خوشی کے اظہار کرنے کا دن ہے، اس دن اسلامی، سرکاری چھٹی بھی ہوتی ہے، اتنی خوشیاں جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرنا اور ایک دوسرے کو خیر وبرکت کی دعائیں دینا بلاکراہت جائز اور درست ہے؛ بلکہ افضل اور پسندیدہ عمل ہے، جو فقہاء کے حسب ذیل جزئیہ سے واضح ہوتا ہے۔

قال المحقق ابن أمير الحاج: بل الأشبه أنها جائزة مستحبة في الجملة، ثم ساق آثاراً بأسانيد صحيحة عن الصحابة في فعل ذلک، ثم قال: والمتعامل في البلاد الشامية، والمصرية عيد مبارک عليک، ونحوه وقال: يمكن أن يلحق بذلک في المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم، فإن من قبلت طاعته في زمان كان ذلک الزمان عليه مباركاً على أنه قدورد الدعاء بالبركة في أمور شتى فيؤخذ منه استحباب الدعاء بها هنا أيضاً. (شامي، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب: يطلق المستحب

علی السنة و بالعکس، زکریا ۳/ ۵۰، کراچي ۲/ ۱٦۹، حاشیة الطحطاوي علی المراقي، کتاب الصلاة، باب أحکام العیدین، مکتبه دارالکتاب ص: ۵۳۰، حلبي کبیر، صلاة العیدین، خروج إلی المصلی ص:۵۷۳)

عن أدهم مولیٰ عمر بن عبد العزیزؓ، قال: کنا نقول لعمر بن عبد العزیز في العیدین، تقبل اللہ مناومنک یاأمیر المؤمنین، فیرد علینا و لاینکر ذلک علینا. (شعب الإیمان للبیهقي، باب في الصیام في لیلة العیدین و یومها ۳/ ۳۴۵، رقم: ۳۷۲۰، المعجم الکبیر للطبراني، ۲۲/ ۵۳، رقم:۱۲۳، السنن الکبری للبیهقي، کتاب صلاة العیدین، باب ماروي في قول الناس یوم العیدین بعضهم لبعض تقبل اللہ منا و منک جدید ۵/ ۱۱۱، ٦۳۸۷، ٦۳۸۸، رقم:٦۳۸۹، دارالفکر بیروت) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۷۲٦)	۱۴/۳۵/۱۱/۱۸ھ

عید کے دن معانقہ کی شرعی حیثیت

سوال [۳۷۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عوام الناس میں عید کے دن عید کی نماز کے بعد اور پھر پورے دن آنے جانے والے ملاقات کرنے والوں کے ساتھ معانقہ کا بازار گرم رہتا ہے، راستہ میں گھروں میں، ہوٹلوں میں، چوراہوں پر، غرضیکہ عید کے دن جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملاقات ہورہی ہے، تو لوگ معانقہ کرتے نظر آرہے ہیں، مفتی صاحب! دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس طرح عید کے دن معانقہ کا التزام واہتمام شریعت سے ثابت بھی ہے یانہیں؟ اگر نہیں تو اس معانقہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبیداللہ بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کے دن معانقہ کرنا محض رسمی معانقہ ہے، شریعت میں کہیں سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اور اس رسمی معانقہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو خواہ مخواہ بہ تکلف مشقت اٹھانی پڑتی ہے کہ ہر آنے جانے والے سے گلے ملنے کے لئے کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ اور راستوں میں بھی رسمی مصافحہ کا عجیب وغریب سلسلہ دیکھنے میں آتا ہے، خاص طور پر نوجوان طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ معانقہ کے بغیر عید کے دن کی ملاقات مکمل نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے یہ معانقہ مکروہ اور بدعت ہے؛ لہٰذا اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ رسمی معانقہ لوگوں کے درمیان سے ختم ہوجائے، ہاں البتہ عید کے دن اگر کوئی رشتہ دار یا دوست واحباب دوسری جگہ سے یا دور دراز سفر سے آجائیں، تو ان کے ساتھ معانقہ کرنا نہ صرف بلا کراہت جائز بلکہ مسنون ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

والمعانقة بعد صلوة العيدين من البدع المذمومة المخالفة للشرع، والله أعلم. (عون المعبود، كتاب الأدب، باب في المصافحة تحت رقم الحديث: ٥٢١١، مكتبه دار الكتب العربية ٤/٥٢١)

حدیث پاک کے اندر موجود ہے کہ صحابہ کرام جب دور دراز سے سفر سے آتے یا دیرینہ ملاقات ہوتی تو آپس میں معانقہ کرتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کی آمد پر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور معانقہ کیا اور حضرت جعفرؓ جب حبشہؓ سے تشریف لائے تو ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ان سے معانقہ فرمایا؛ لہٰذا اس طرح دور دراز سفر سے آمد پر یا دیرینہ ملاقات پر معانقہ مسنون ہے، مگر خاص طور پر عید کے دن معانقہ کو لازم سمجھ کر کرنا بدعت ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أنسؓ قال: كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم إذا تلاقوا

تصافحوا، وإذا قدموا من سفر تعانقوا. (المعجم الأوسط للطبراني، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ٤١، رقم: ۹۷، اسناده صحيح انظر مجمع الزوائد ۸/ ۳۹)

عن عائشة رضؓ قالت: قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله صلى الله عليه وسلم في بيتي، فأتاه، فقرع الباب، فقام إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم عريانًا يجرُّ ثوبه، والله مارأيته عرياناً قبله ولابعده، فاعتنقه وقبله. (سنن الترمذي، كتاب الآداب، باب ماجاء في المعانقة والقبلة، ۲/ ۱۰۲، رقم: ۲۷۳۲)

عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه، قال: لما قدم جعفر من هجرة الحبشة تلقاهُ النبي صلى الله عليه وسلم فعانقه و قبل مابين عينيه. الحديث (المعجم الكبير للطبراني ۲/ ۱۰۸، رقم: ۱٤۷۰، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ۱۳/ ۱۸۸، رقم: ۲٦۲٤۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۷۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۱۹ھ

عام نماز وعیدین کے بعد مصافحہ کی حیثیت

سوال [۳۷۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ علامہ شامی وغیرہ نے نمازوں کے بعد مصافحہ کو مکروہ اور بدعت لکھا ہے اور اسے روافض کا شعار بھی قرار دیا ہے، تو اس سے کون سا مصافحہ مراد ہے؟ واضح فرمائیے۔

اوراس عبارت کے ذریعہ بعض لوگ بے دھڑک لکھ دیتے ہیں کہ نماز او رعیدین کے بعد مصافحہ بدعت ہے؛ لہٰذا ان عبارتوں کا محمل کیا ہے؟ اور صحابہ کا عمل کیا ہے؟ عمل صحابہؓ سے متعلق حوالہ مل جائے تو بہتر ہوگا اور عبارتوں کے درمیان تطبیق بھی فرمادیں۔

المستفتی: ذاکر اللہ، میسور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: علامہ شامیؒ نے نماز کے بعد جس مصافحہ کو بدعت اور روافض کا طریقہ لکھا ہے اس کا محمل اس صورت میں ہے کہ جب سلام کے بعد متصلاً اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دائیں بائیں طوعاً وکرہاً مصافحہ کیا جائے اور دیگر مقامات پر مصافحہ سے زیادہ ثواب بعد الصلوۃ مصافحہ میں سمجھے، تو یہ بدعت ہے، روافض اور شیعوں میں یہی طریقہ رائج ہے۔

ان عبارتوں سے مصافحہ بعد الصلوۃ کو بے دھڑک بدعت قرار دینا مناسب نہیں ہے؛ بلکہ یہ حکم مقید بالقید ہے۔ اور صحابہؓ کا عمل ملاقاتی مصافحہ کے طور پر تھا اور ملاقاتی مصافحہ ثابت ہے۔علامہ نوویؒ نے ملاقات پر مصافحہ کرنے کو متفق علیہ سنت تحریر فرمایا ہے، بریں بنا عیدین کے بعد مصافحہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں دیکھنے میں آتا ہے کہ رافضی لوگ سلام پھیرتے ہی فوراً دائیں بائیں لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں، شامی وغیرہ میں اسی کو مکروہ کہا ہے۔

إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة، قد يؤدّي الجهلة إلياعتقاد سنيتها في خصوص هذه المواضع، وأن لها خصوصية زائدة على غيرها، مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف في هذه المواضع؛ لأن الصحابةؓ ماصافحوا بعد أداء الصلاة؛ ولأنها من سنن الروافض، ثم نقل عن ابن جحر عن الشافعية: أنها بدعة مكروهة لاأصل لها في الشرع......وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء، زكريا٩/٥٤٧، كراچي ٦/٣٨١)

قال النووي: المصافحة سنة مجمع عليها عند التلاقي. (فتح الباري، كتاب الاستئذان، باب المصافحة، تحت رقم الحديث ٦٢٦٤، دارالريان للتراث ١١/٥٧، اشرفية ديوبند ١١/٦٥)

أصل المصافحة، سنة وكونهم حافظوا عليها في بعض الأحوال لا يخرج

ذلک من أصل السنة. (فتح الباري، كتاب الاستئذان، باب المصافحة، تحت رقم الحديث ٦٢٦٤، دارالريان للتراث ١١/٥٧، اشرفية ديوبند ١١/٦٥)

ويظهر البشاشة في وجه من يلقاه من المؤمنين (تحته) والمتعامل به في البلاد الشامية، والمصرية قول الرجل لصاحبه عيد مبارك عليك ونحوه، ويمكن أن يلحق هذا اللفظ بذلك في الجواز الحسن واستحبابه لما بينهما من التَّلازم، وكذا تطلب المصافحة فهي سنة عقب الصلاة كلها وعند كل لقيٍ. (حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب أحكام العيدين، داراكتاب ديوبندص: ٥٣٠)

عن البراء بن عازب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مامن مسلمين يلتقيان فيصافحان إلا غفرلهما قبل أن يتفرقا. (ترمذي شريف، كتاب الاستئذان، باب ماجاء في المصافحة، النسخة الهندية ٢/١٠٢، دارالسلام رقم: ٢٧٢٧)

عن أنس رضـ أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصافح بعضهم بعضًا. (مصنف ابن أبي شبية، مؤسسة علوم القرآن بيروت ١٣/١٨٥، رقم:٢٦٢٣٣)

عن حذيفة رضـ، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إذا لقي المؤمن المؤمن فقبض أحدهما على يد صاحبه، تناثرت الخطايا منهما كما تناثر أوراق الشجر. (شعب الإيمان ٦/٤٧٤، رقم:٨٩٥٣)

قال أنس رضـ: كانت المصافحة في أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهم الحجة والقدوة للأمة،ثم أتباعهم. (عمدة القاري، كتاب الاستئذان، باب المصافحة، تحت رقم الحديث: ٦٢٦٣، دار إحياء التراث العربي بيروت ٢٢/٢٥٢، زكريا ديوبند ١٥/٣٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۳/۴۰)

عید کے دن معانقہ کا التزام

سوال [۳۷۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد یا کسی کے بھی آنے جانے پر معانقہ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عید کے دن عید کی نماز کے بعد یا کسی کے بھی آنے جانے پر معانقہ کرنا حضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اس میں خود کو مشقت اور تنگی میں ڈالنا ہے؛ لیکن اگر کوئی دور دراز سے آنے والا ہے، تو اس سے معانقہ کرنا درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۱۴۸)

كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يتصافحون، وإذا قدم أحدهم من سفر عانق صاحبه. (مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن بيروت ۱۳/۱۸۵، رقم:۲۶۲۳٤)

عن جابر رضـ قال: لما قدم جعفر رضـ من أرض الحبشة عانقه النبي صلى الله عليه وسلم. (مسند أبي يعلي الموصلي، دارالكتب العلمية ۲/۲۲۷، رقم:۱۸۷۱، المعجم الكبير للطبراني ۲/۱۰۸، رقم:۱٤۷۰)

عن أنس رضـ قال: كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم: إذا تلاقوا تصافحوا، وإذا قدموا من سفر تعانقوا. (المعجم الأوسط للطبراني ۱/٤۱، رقم:۹۷، إسناده صحيح، انظر مجمع الزوائد ۸/۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۷۶)

نماز عیدین کے بعد مصافحہ کا جواز

سوال[۳۷۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عیدین کی نماز کے بعد سلام ومصافحہ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد فضیل الہ آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عیدین کی نماز کے بعد سلام ومصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تاہم اگر کوئی کسی اور وقت میں مصافحہ نہ کرے اور نماز کے بعد ہی اس کو خاص کرلے تو یہ جائز نہیں ہے۔اور بعض کتب فقہ میں بعد الصلوۃ مصافحہ کو روافض کا شعار جو لکھا گیا ہے، اس کا مطلب اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے، روافض اور شیعوں کے یہاں دستور یہ ہے کہ سلام کے فوراً بعد دائیں بائیں کے لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں اور عیدین کے بعد مصافحہ کرلینا نہیں۔

عن البراء بن عازبؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مامن مسلمين يلتقيان، فيتصافحان إلا غفر لهما قبل أن يتفرقا. (ترمذي، أبواب الأداب، باب ماجاء في المصافحة، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۲، دارالسلام رقم:۲۷۲۷، مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۳/ ۱۸۵، رقم: ۲۶۲۳۱)

عن البراء بن عازبؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا التقى المسلمان، فتصافحا، فحمدا الله واستغفراه غفرلهما. (شعب الإيمان للبيهقي، دالكتب العلمية بيروت ۶/ ۴۷۴، رقم:۸۹۵۶)

عن الشعبي أنه قال: كان أصحاب محمد صلى عليه وسلم: إذا التقوا صافحوا، فإذا قدموا من سفر عانق بعضهم بعضًا. (شعب الإيمان ۶/ ۴۷۵، رقم:۸۹۵۸، مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۳/ ۱۸۵، رقم:۲۶۲۳۴)

عن جابرؓ قال: لما قدم جعفرؓ من أرض الحبشة عانقه النبي صلى الله عليه وسلم. (مسند أبي يعلي الموصلي، دارالكتب العلمية ٢/ ٢٢٧، رقم: ١٨٧١، المعجم الكبير للطبراني ٢/ ١٠٨، رقم: ١٤٧٠)

إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة، قد يؤدّي الجهلة إلى اعتقاد سنيتها في خصوص هذه المواضع مع أن ظاهر كلامهم، أنه لم يفعلها أحد من السلف في هذه المواضع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء، فصل في البيع، زكريا٩/ ٥٤٧، كراچي ٦/ ٣٨١)

فإن محل المصافحة المشروعة أول الملاقاة، وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة، ويتصاحبون بالكلام، ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة، ثم إذا صلوا يتصافحون، فأين هذا من السنة المشروعة؛ ولهذا صرح بعض علمائنا، بأنها مكروهة حينئذ، وإنها من البدع المذمومة. (مرقاة المفاتيح، كتاب الأداب، باب المصافحة والمعانقة، مكتبة امداديه ملتان، اشرفية ديوبند ٩/ ٧٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۲۲/۴۰)

۱۰/ کتاب الجنائز

(۱) باب الجنائز و متعلقاتها

انتقال کے وقت کے مسنون اعمال

سوال [۴۷۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انتقال کے وقت کیا کرنا ہے؟ سنت طریقہ کیا ہے؟ غسل کس طرح دینا ہے؟ دفن کرتے وقت کیا کرنا ہے؟

المستفتی: محمد شمس تبریز (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انتقال کے وقت اس کے پاس بیٹھ کر سورۂ یٰسین پڑھنی چاہئے اور قریب المرگ شخص کو داہنی کروٹ پر قبلہ رخ لٹا دینا چاہئے اور اس کے پاس بیٹھنے والے لوگ کسی قدر بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھیں؛ لیکن میت کو پڑھنے کے لئے نہ کہا جائے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۲/ ۷۷)

ویسن توجیه المحتضر أي من قرب من الموت علی یمینه؛ لأنه السنة، وجاز الاستلقاء علی ظهره. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، باب أحکام الجنائز قدیم ۳۰۵، جدید دارالکتاب دیوبند ۵۵۸، هدایة، کتاب الصلوة، باب الجنائز اشرفي دیوبند ۱/ ۱۷۸)

اور غسل کے وقت بھی مذکورہ طریقہ پر لٹا کر غسل دینا چاہئے، سب سے پہلے میت کو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر استنجاء کرائے، پھر وضو کرائے؛ لیکن ناک، کان میں پانی نہ ڈالے؛ بلکہ بھیگے

کپڑے سے اس کو پونچھ دے اور پورے بدن پر تین مرتبہ پانی بہادیا جائے۔ (مستفاد: بہشتی زیور۲/۵۲)

وصورة استنجاءه أن يلف الغاسل على يديه خرقة، ويغسل السوءة؛ لأن مس العورة حرام كالنظرإليها، ولاينظر الرجل إلى فخذالرجل، وكذا المرأة لاتنظر إلى فخذ المرأة، ثم يوضأ وضوءه للصلاة، ولايمضمض، ولايستنشق. ومن العلماء من قال: يجعل الغاسل على إصبعه خرقة رقيقة، ويدخل الإصبع في فمه ويمسح بها أسنانه ويدخل في منخريه أيضاً.

(هندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، زكريا قديم ١/١٥٨، جديد ١/٢١٩)

دفن کے وقت میت کو قبلہ کی جانب سے اتارا جائے اور قبر میں اتارتے وقت **بسم الله وعلى ملة رسول الله** پڑھنا چاہئے، میت کو قبر میں اتارنے کے بعد دائیں کروٹ قبلہ رخ لٹادیا جائے، اس کے بعد اس کی کفن کی گرہوں کو کھول دیا جائے، پھر مٹی ڈالتے وقت "**منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرى**" پڑھے۔

ويدخل الميت ممايلى القبلة، وذلک أن يوضع في جانب القبلة من القبر ويحمل الميت منه ويوضع في اللحد، فيكون الأخذ له مستقبل القبلة حالة الأخذ، كذا في الفتح، ويقول واضعه: بسم الله وعلى ملة رسول الله، ويوضع في القبر على جنبه الأيمن مستقبل القبلة، وتحل العقد. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في صلوة الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن، زكريا قديم١/١٦٦)

ويستحب لمن شهد دفن الميت أن يحثو في قبره ثلاث حثيات من التراب بيديه جميعاً، ويكون من قبل رأس الميت ويقول في الحثية الأولىٰ "منها خلقناكم" وفي الثانية "وفيها نعيدكم" وفي الثالثة "ومنها نخرجكم

تارة أخرى" كذا في الجوهرة النيرة. (هندية، زكريا قديم ١/ ١٦٦، جديد ١/ ٢٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۹۴)	۱۴۲۰/۴/۳ھ

جاں کنی کے وقت کس طرح لٹایا جائے

سوال [۴۷۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہدایہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے کو وضع فی القبر کا اعتبار کرتے ہوئے دائیں کروٹ قبلہ رخ کر دیا جائے۔ نیز وضع فی القبر کو دیکھا جائے، تو سر جانب شمال اور قدم جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔ عبارت یہ ہے کہ **وجه إلى القبلة على شقه الأيمن اعتبارًا بحال الوضع في القبر، والأول هو السنة.**

لیکن ایک چھوٹی سی کتاب دیکھنے کو ملی، جس میں مسنون طریقہ یہ لکھا ہوا ہے "مسنون طریقہ اس شخص کے لئے جس کی موت نزدیک ہو یہ ہے کہ اس کا چہرہ قبلہ کی طرف کر دیا جائے، اس طرح اس کی چارپائی کو پورب، پچھّم کر دیا جائے کہ اس کے پیر قبلہ کی طرف ہو جائیں اور سر کو ٹیک لگا کر اوپر کر دیا جائے تا کہ چہرہ قبلہ کی طرف ہو جائے" کون سا طریقہ مسنون ہے یا دونوں ہی مسنون ہیں؟ (موت کی باتیں: ۵۰ از مولانا احترام الحسن کاندھلوی)

المستفتی: محمد اشتیاق نور قاسمی پیپر پیتی بازار، بھاگل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس کتاب کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں مباح صورت ذکر کی گئی ہے؛ لیکن مسنون اور افضل طریقہ وہی ہے، جو ہدایہ میں مذکور ہے کہ جس کے مرنے کا وقت قریب ہو جائے اور موت کے آثار شروع ہو جائیں تو اس وقت

اس کا سر شمال کی طرف، پیر جنوب کی طرف اور رخ قبلہ کی طرف کردیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۶/ ۴۸۷، جدید ڈابھیل ۸/ ۴۸۱)

يوجه المحتضر القبلة، وهو المعتاد في زماننا؛ ولكن يرفع رأسه قليلاً ليتوجه للقبلة. (در مختار، كتاب الصلاة، باب الجنائز، كراچي ۲/ ۱۸۹، زكريا ۳/ ۷۷، ۷۸، حاشية الطحطاوي على المراقي، باب أحكام الجنائز، قديم ۳۰۵، جديد دارالكتاب ديوبند ص: ۵۵۸)

إذا احتضر الرجل وجه إلى القبلة على شقه الأيمن اعتباراً بحال الوضع في القبر؛ لأنه أشرف عليه، والمختار في بلادنا استلقاء؛ لأنه أيسر لخروج الروح، والأول هو السنة. (هداية، كتاب الصلاة، باب الجنائز، اشرفى ديوبند ۱/ ۱۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
۱۴۲۱/۵/۷ھ	(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۵۵)

میت سے مکھی اڑانے کے لئے نیم کی ٹہنی استعمال کرنا

سوال [۴۷۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں علاقہ میں یہ رواج ہے کہ میت ہوجانے کے بعد اس کو چارپائی یا تخت پر لٹادیتے ہیں اور مکھی مچھر اڑانے کے لئے نیم کی ٹہنی کا استعمال کرتے ہیں، دستی پنکھے جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، وہ نہیں استعمال کرتے؛ بلکہ نیم کی ٹہنی سے ہوا کرتے ہیں۔ کیا کہیں اس کا ثبوت ملتا ہے یا یہ غلط رسم ہے؟

المستفتی: توقیر احمد، نہٹور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کی کوئی اصل نہیں ہے؛ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کو چارپائی پر رکھ کر اس کے بدن کے پورے حصے کو کپڑے سے ڈھانک دیں۔

وفي الهندية: ويستحب أن ينزع عنه ثيابه التى مات فيها و يسجي جميع بدنه بثوب ويترك على شيئ مرتفع من لوح، أو سرير. (هندية، الباب الحادي والعشرون في صلوة الجنائز، الفصل الاول في توجيه المحتضر، زكريا قديم ١/١٥٧، جديد ١/٢١٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٦/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۷۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۱۲/ ۱۴۲۹ھ

میت کا نماز جنازہ سے قبل چہرہ دیکھنا

سوال [۳۷۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں عام دستور ہے کہ میت کفنانے کے بعد جب قبرستان لے جاتے ہیں، تو نماز جنازہ سے قبل لائن لگا کر منھ دکھاتے ہیں، اس کے بعد نماز جنازہ ہوتی ہے، علماء کرام نے اس سے روکا تو اب دوسری صورت چند دنوں سے یہ ہوگئی ہے کہ میت کو نماز جنازہ کے لئے لے چلنے سے قبل گھر سے باہر نکال کر میت کا آخری دیدار کیا جاتا ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعاً یہ کیسا ہے؟ کفنانے کے بعد آخری دیدار کی کچھ گنجائش ہے، جو حضرات باہر سے نماز جنازہ میں شرکت کے لئے آتے ہوں، تو کیا ان کو چہرہ دکھلانے کی گنجائش ہے؟

المستفتی: محمد راشد ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قبرستان لیجانے کی تیاری سے پہلے جو غیر متعلق لوگ میت

کا منھ دیکھتے ہیں، اسی پر اکتفا کیا جائے، بعد میں اجتماعی طور پر منھ دکھانے اور آخری دیدار کرانے کی رسم شریعت سے ثابت نہیں ہے؛ کیونکہ اس سے دفن میت میں تاخیر ہوتی ہے، جو شرعاً ممنوع ہے؛ لہٰذا ایسے رسم ورواج کو ترک کردینا ضروری ہے اور ٹانڈہ میں تو ہم نے میت کے منھ کے دکھانے کی عجیب رسم دیکھی ہے، جو قطعاً درست نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲۱۹/۴)

عن عبد الله بن عمر قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مات أحدكم فلاتحبسوه وأسرعوا به إلى قبره الخ (المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي بيروت ۳۴۰/۱۲، رقم:۱۳۶۱۳)

وكره تأخير صلوته ودفنه؛ ليصلي عليه جمع عظيم. (الدر المختار على هامش رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، مطلب في حمل الميت، زكريا۱۳۶/۳، كراچي ۲۳۲/۲، هندية، كتاب الصلاة، الباب الاول في المواقيت، الفصل الثالث فيبيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلوة، زكريا قديم ۵۲/۱، جديد ۱۰۸/۱، حاشية الطحطاوي على المراقي الفلاح، أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، دارالكتاب ديوبند ۶۰۴)

وإذ تيقن موته يعجل بتجهيزه إكرامًا له لما في الحديث: عجلوا به، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، قديم ۳۰۹، جديد دارالكتاب ديوبند ۵۶۵، أبوداؤد شريف، كتاب الجنائز، باب تعجيل الجنازة، النسخة الهندية ۴۵۰/۲، دارالسلام رقم: ۳۱۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۴۱۸/۲۶)

کفن پہنانے کے بعد جنازہ سے قبل چہرہ دکھانا

سوال [۴۷۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ میت کو کفن پہنا دیا جائے، تو اس وقت کسی کو چہرہ دکھا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف مہرولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کو کفن پہنانے کے بعد نماز سے پہلے اس کا چہرہ دکھانا جائز اور درست ہے۔

ولابأس بأن يرفع ستر الميت؛ ليرى وجهه، وإنما يكره ذلك بعد الدفن، كذا في القنية. (هندية، كتاب الكراهية،الباب السادس عشر في زيارة القبور، زكريا قديم ٥/ ٣٥١، جديد ٥/ ٤٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۲۴/۳۸)

نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا

سوال [۳۷۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے ایضاح المسائل میں جنائز کے مسئلہ میں لکھا ہے احسن الفتاوی کے حوالہ سے کہ جنازہ کی نماز کے بعد میت کا منھ دیکھنا منع ہے، جس کی بناء پر میں سال گذشتہ ایک جنازہ میں شریک تھا، تو نماز جنازہ کے بعد میت کے والد صاحب نے میت کو پھر دیکھنا چاہا، تو میں نے منع کر دیا تھا؛ لیکن فتاوی رشیدیہ مکتبہ تھانوی دیوبند ۱۷۱/ پر ایک سوال کے جواب میں ہے، منھ دیکھنا میت کا گو قبر میں دیکھے یا قبل دفن کے دیکھے درست ہے؛ اس لئے حضور والا سے درخواست ہے کہ دونوں میں تطبیق کی صورت بتا کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: محمد عباس، بردوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا فی نفسہ جائز ہے؛

لیکن چونکہ فی زمانا یہ ایک رسم بن گئی ہے اور اس میں بہت سی خرافات اور مفسدات شامل ہوگئی ہیں، جیسا کہ کارثواب اور مسنون سمجھ کر باقاعدہ اعلان کر کے چہرہ دیکھنے کے لئے لوگوں کو بلایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے دفن میں تاخیر ہوتی ہے، جو ممنوع ہے۔

کما قال الشامي: ویسرع في جهازه لما رواه أبو داؤد عنه صلی اللّٰه علیه وسلم لما عاد طلحة بن البراءؓ، وانصرف قال: لا أری طلحة إلا وقدحدث فیه الموت، فإذا مات فأذنوني حتی أصلی علیه و عجلو به، فإنه لاینبغي لجیفة مسلم أن تحبس بین ظهراني أهله. (شامي، کتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبیل مطلب في القرأة عند المیت، کراچي ۲/۱۹۳، زکریا ۳/۸۳، سنن ابوداؤد شریف، کتاب الجنائز، باب تعجیل الجنازة، النسخة الهندیة ۲/۴۵۰، دارالسلام رقم:۳۱۵۹)

نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر خدانخواستہ چہرے میں کچھ تغیر یا عیب ظاہر ہو گیا، تو ایک مسلمان کی ہتک حرمت اور افشاء عیب لازم آتا ہے جو منع ہے۔

قال الشامي: وینبغي للغاسل ولمن حضر إذا رأی مایحب المیت ستره أن یستره ولایحدث به لأنه غیبة، وکذا إذا کان عیباً حادثاً بالموت کسواد وجه ونحوه. (شامي، کتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبیل مطلب في الکفن، کراچي ۲/۲۰۲، زکریا ۳/۹۵)

ان خرابیوں کی وجہ سے منع کیا جاتا ہے؛ لہٰذا فتاوی رشیدیہ قدیم ۱۷۱/۲ کے فتوی کا تعلق اس صورت سے ہے؛ جبکہ مفسدات اور خرابیاں نہ پائی جائیں، اور ایضاح المسائل میں درج مسئلہ کا تعلق اس صورت سے ہے کہ جب مفسدات اور خرابیاں شامل ہوجائیں؛ کیونکہ ایسی صورت میں امر مباح محظور ہوجاتا ہے؛ لہٰذا دونوں فتاوی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۲۹۷/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۷/۱۴۲۰ھ

کن لوگوں کے لئے نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا جائز ہے؟

سوال [۳۷۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ ہوجانے کے بعد میت کی صورت کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: حافظ رئیس احمد، محلّہ شیشگران نگینہ، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ کے بعد دفن سے قبل میت کی صورت دیکھنا صرف دور دراز سے آئے ہوئے اعزاء واقرباء کے لئے جائز ہے کہ جنہوں نے ابھی صورت نہیں دیکھی ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/۴۴، جدید زکریا ۴/ ۵۶، جدید زکریا مطول ۵/۴۸۹، مدارج النبوۃ بحوالہ فتاوی رشیدیہ قدیم ۱/۱۷۲، جدید زکریا ۲۵۰)

ولا بأس بأن يرفع ستر الميت؛ ليرى وجهه، وإنما يكره ذلك بعد الدفن. (هندية، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيارة القبور، زكريا قديم ۵/ ۳۵۱، جديد ۱/ ۴۰۶)

لیکن عام لوگوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے مبادا آثار برزخ کی وجہ سے میت کی صورت وغیرہ میں تغیر آجائے تو ایک مسلمان کی ہتک حرمت ہوگی جو ممنوع ہے۔ نیز اس کی وجہ سے دفن وغیرہ میں تاخیر لازم آئے گی جو بروئے حدیث ممنوع ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۴/ ۷، احسن الفتاوی ۴/ ۲۱۰، فتاوی دار العلوم ۵/ ۳۶۹، محمودیہ قدیم ۳/ ۳۹۹، جدید ڈابھیل ۹/ ۷۹)

عن الحصين بن وحوح أن طلحة البراءؓ مرض فأتاه النبي صلى الله عليه وسلم يعوده، فقال: إني لا أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فأذنوني به و عجلوا. الحديث (سنن أبي داؤد شريف، كتاب الجنائز، باب تعجيل الجنازة، النسخة الهندية ۲/ ۴۵۰، دار السلام رقم: ۳۱۵۹)

عن أبي هريرةؓ، يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تک صالحة فخير تقدمونها إليه، وإن تک سوى ذلک فشر تضعونه عن رقابكم. الحديث (أبوداؤد شريف، كتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، النسخة الهندية ۲/ ٤٥٣، دارالسلام رقم: ۳۱۸۱)

وفي الشامية: ويسرع في جهازه الخ . (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبيل مطلب في القرأة عند الميت، كراچي ۲/ ۱۹۳، زكريا ۳/ ۸۳)

وكره تأخير صلوته، ودفنه الخ (شامي، كتاب الصلاة، با ب صلوة الجنائز، مطلب في حمل الميت، كراچي ۲/ ۲۳۲، زكريا ۳/ ۱۳٦، هندية، كتاب الصلاة، الباب الأول في المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لايجوز فيها الصلوة، زكريا قديم۱/ ۵۲، جديد ۱/ ۱۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۲۳)

نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنے کا اعلان کرنا

سوال [۴۷۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے شہر رامپور میں میت کا چہرہ دیکھنا نماز جنازہ کے بعد ایک رواج بن گیا ہے، میت کا ولی نماز جنازہ کے بعد اعلان کرتا ہے کہ جس کو دیکھنا ہے دیکھ لیں اور باقاعدہ میت کا چہرہ دکھلایا جاتا ہے؛ جبکہ کچھ لوگ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوتے، وہ صرف اسی غرض سے باہر کھڑے رہتے ہیں کہ ہم نماز کے بعد میت کا چہرہ دیکھیں گے،اس مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

المستفتی: تصورخاں، محلّہ تھانہ ٹین رامپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا ممنوع ہے اور یہ رسم قابل ترک ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے دفن میں تاخیر ہوتی ہے جو ممنوع ہے۔

عن الحصين بن وحوح أن طلحة البراءؓ مرض فأتاه النبي صلى الله عليه وسلم يعوده، فقال: إني لا أرى طلحة ألا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فإذا مات فأذنوني به و عجلوا. الحديث (سنن أبي داؤاد شريف، كتاب الجنائز، باب تعجيل الجنازة، النسخة الهندية ٢ / ٤٥٠، دارالسلام رقم: ٣١٥٩)

كما قال الشامي: ويسرع في جهازه لما رواه أبوداؤد عنه لما عاد طلحة البراءؓ وانصرف، قال: لا أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فأذنوني حتى أصلى عليه و عجلوبه، فإنه لاينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبيل مطلب في القراءة عند الميت، كراچي ٢ /١٩٣، زكريا ٣ /٨٣)

نیز بعض دفعہ میت پر آثار آخرت کا ظہور ہونے لگتا ہے، خدانخواستہ صورت میں تغیر آجائے یا کوئی عیب ظاہر ہوجائے، تو ایک مسلمان کی ہتک حرمت اور افشاء عیب لازم آتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔

كما قال الشامي: وينبغي للغاسل ولمن حضر إذا رأى ما يحب الميت ستره أن يستره ولايحدث به؛ لأنه غيبة، وكذا إذا كان عيباً حادثاً بالموت كسواد وجه ونحوه. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبيل مطلب في الكفن، زكريا ٣ /٩٥، كراچي ٢ /٢٠٢)

لہٰذا یہ رسم قابل ترک ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۷۴، احسن الفتاوی ۲۱۹/۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

صفوں کی درستگی کے بعد میت کا چہرہ دکھانا اور عورتوں کا اکٹھا ہونا

سوال [۴۷۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میت کو غسل دینے کے بعد اور نماز جنازہ کی تیاری کے وقت جبکہ صفیں درست ہو چکی ہوں نماز بالکل تیار ہو جنازہ سامنے رکھا ہو، پھر آخری دیدار سمجھتے ہوئے قطار در قطار میت کی زیارت کرنا جیسا کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ چہرہ دیکھتے ہیں، یہ کہاں تک درست ہے؟ شرعی رائے سے نوازیں، ہمارے یہاں اس میں ابتلائے عام ہے۔

ہمارے یہاں یہ بھی بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ میت محرم ہو یا غیر محرم عورتوں کا ہجوم رہتا ہے اور جس وقت میت کو قبرستان لیجاتے ہیں، اس وقت تو اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ معلوم ہوتا ہے ساری بستی کی عورتیں میت کو وداع کرنے کے لئے یہیں جمع ہیں؟

المستفتی: محمد جاوید رشید فاروقی دڑھیال، رامپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کی تیاری سے پہلے جب میت کو دیکھنے کا سلسلہ رہا ہے، پھر اس کے بعد نماز کی تیاری پر نیز نماز کے لئے صف بندی ہو جانے کے بعد دوبارہ دیکھنے کا سلسلہ محض رسم ورواج پر مبنی ہے؛ اس لئے یہ سلسلہ ختم کرنا ضروری ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں یک گونہ تاخیر بھی ہوتی ہے جو خلاف سنت ہے، ہاں البتہ اسی وقت دور دراز سے کوئی ولی اور بہت قریبی رشتہ دار پہونچتا ہے تو اس کے لئے معمولی گنجائش ہو سکتی ہے، مگر عام لوگوں کو دکھانے کی رسم خلاف سنت ہے، اس سے گریز کرنا چاہئے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/۲۱۹)

عن عليؓ بن أبي طالب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال له: يا علي ثلاث لاتؤخرها الصلوة إذا آنت و الجنازة إذا حضرت، والأيم إذا

وجدت لها كفواً. (ترمذي شريف، أبواب الجنائز، باب ماجاء في تعجيل الجنازة، النسخة الهندية ١/٢٠٦، دارالسلام رقم: ١٠٧٥)

والأفضل أن يعجل بتجهيزه كله حين يموت. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في حمل الميت، كراچي ٢/٢٣٢، زكريا ٣/١٣٦)

جس طرح غیر محرم مردوں کا غیر محرم عورتوں کو دیکھنا جائز نہیں، اسی طرح غیر محرم عورتوں کا بھی غیر محرم مردوں کو دیکھنا جائز نہیں۔

نیز غیر محرم عورتوں کی بھیڑ قطعاً درست نہیں ہے، اس سے گریز کرنا ضروری ہے اور اس میں بے پردگی کا گناہ بھی ہوتا ہے۔

في حديث أم سلمةؓ، فقلت: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم! أليس هو أعمىٰ لايبصرنا ولايعرفنا؟ فقال: عليه السلام أفعميا وان أنتما؟ ألستما تبصرانه.

(سنن الترمذي، أبواب الآداب، باب ماجاء في احتجاب النساء من الرجال، النسخة الهندية٢/١٠٦، دارالسلام رقم:٢٧٧٨، مشكاة ٢/٢٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍رجب المرجب ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۰۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍۷؍۱۴۲۷ھ

قبر میں اتارنے کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا

سوال [۴۷۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کی نماز جنازہ ہوجانے کے قبل بعد دفن یا قبر میں اتارنے کے بعد منھ دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا وجہ ہے؟

المستفتی: نورالعابدین، یونانی دواخانہ، بڑا بازار، کرھٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز جنازہ ہوجانے کے بعد دفن سے قبل اور دفن کے بعد

میت کا منھ دیکھنا ممنوع اور قابل ترک اُمر ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خدانخواستہ اگر صورت میں تغیر آجائے تو ایک مسلمان کی ہتک حرمت لازم آئے گی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲۱۹/۴، ایضاح المسائل ۴۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۳۹۸/۲، جدید ڈابھیل ۷۹/۹)

وینبغي للغاسل ولمن حضر إذا رأى ما يحب الميت ستره أن يستره ولا يحدثبه لأنه غيبة، وكذا إذا كان عيباً حادثاً بالموت كسواد وجه ونحوه.

(شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، قبيل مطلب في الكفن، كراچي ۲۰۲/۲، زكريا ۹۵/۳، حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في الجنائز اشرفية ديوبند ۵۸۰، حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ۵۷۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ربیع الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹۷۳/۳۱)

میت کا چہرہ دیکھنا

سوال [۴۷۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ کی کتاب **ایضاح المسائل** اور **فتاوی دارالعلوم دیوبند** جلد نمبر ۵/ کے متعلق وضاحت مطلوب ہے، ایضاح المسائل مسئلہ نمبر ۱۳۱/ نماز جنازہ کے بعد میت کی صورت دکھانا ممنوع اور قابل ترک ہے، اس میں خطرہ ہے کہ خدانخواستہ اگر صورت میں تغیر ہو جائے تو ایک مسلمان کی ہتک حرمت لازم آتی ہے۔ نیز اس کی وجہ سے دفن میں تاخیر ہوتی ہے جو ممنوع ہے۔

(احسن الفتاوی ۲۱۹/۴، فتاوی دارالعلوم جدید جلد ۵/ سوال ۳۰۵۰/ صفحہ ۴۳۹۸)

میت کو لب گور یا قبر میں اتارنے کے بعد کفن کھول کر ورثاء وغیرہ کو صورت دیکھنا ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: ثابت نہیں ہے، اسی کتاب کے صفحہ ۴۰۶/۵/ پر یہ سوال وجواب بھی مذکور ہے۔

سوال: میت کو قبر میں اتارنے کے بعد منھ دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قبر میں اتارنے کے بعد منھ دیکھنا نہ چاہئے، اس کے بالمقابل دو کتابیں جو ہمارے اکابر دیوبند ہی کی ہیں، اس میں اس طرح مذکور ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/۴۴، جدید زکریا ۴/۵۶، جدید زکریا مطول ۵/۴۸۹)

سوال: مردے کو قبر میں لٹا کر اس کا منھ دیکھنا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب: جائز ہے۔ فتاوی رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے فتاوی کی کتاب ۲۷۲، کتاب الجنائز الموتی والقبور۔

سوال: منھ دیکھنا میت کا قبل دفن کے گو قبر میں دیکھے درست ہے یا نہیں؟

جواب: منھ دیکھنا میت کا گو قبر میں دیکھے یا قبل دفن کے دیکھے درست ہے۔

قال في فتاوی عالمگیری: ولابأس بأن يرفع ستر الميت عن وجهه، وإنما يكره بعد الدفن، وفي مدارج النبوة.

واضح آن است کہ علی وعباس وفضل وقثم در قبر آمدند وبود قثم آخر کسے کہ برآمد از قبر واز وی ارند کہ گفت آخر کسے کہ روئے مبارک آنحضرت را دید در قبر من بودم. انتہی (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۲۷۱، زکریا جدید ۲۵۰) واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ عبدالحیؒ عفی عنہ　　　　الجواب صحیح: بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی

نوٹ: حضرت قثم بن عباس کا حضور ﷺ کو قبر میں دیکھنا ثابت ہے، ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ کی مکمل وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: ڈاکٹر جمیل احمد قاسمی، بازار پہاڑی دروازہ، نگینہ، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت گنگوہیؒ کا اس بارے میں کوئی فتوی نہیں ہے؛ البتہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے فتوی پر تصدیق ہے، بہر حال کفایت المفتی اور فتاوی رشیدیہ میں

حضور ﷺ کے چہرہ مبارک کو قبر اطہر میں دیکھنے کے واقعہ سے استدلال کر کے جائز قرار دیا ہے اور حضور ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور انبیاء کے چہرہ میں تغیر نہیں آسکتا اور نہ ہی ان کے بدن میں قیامت تک تغیر آسکتا ہے اور فتاوی رشیدیہ اور کفایت المفتی میں انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام پر قیاس کر کے جائز قرار دیا ہے اور فتاوی دار العلوم، احسن الفتاوی اور ایضاح المسائل میں یہ قیاس نہیں کیا گیا؛ بلکہ عام مسلمانوں کا حکم بیان کیا گیا ہے اور غیر انبیاء میں تغیر ہو جانے کا امکان بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۴۱۹/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۴/۲۸ھ

مرنے کے بعد شوہر اپنی بیوی کو دیکھ سکتا ہے یا نہیں

سوال [۴۷۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیوی کے مرنے پر شوہر اس کی صورت دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح بیوی شوہر کی صورت دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟ نیز کیا یہ دونوں ایک دوسرے کو چھو سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: فضل اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوی کے مرنے کے بعد شوہر اس کو دیکھ سکتا ہے؛ لیکن مس وغیرہ جائز نہیں۔ اور بیوی شوہر کو دیکھ بھی سکتی ہے۔ نیز بیوی کا شوہر کو چھونا بھی جائز ہے اور اگر کوئی مرد غسل دینے والا نہ ہو تو بیوی کا شوہر کو غسل دینا بھی جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۲۷۱، جدید زکریا ۲۵۰، احسن الفتاوی ۲۲۵/۴)

ويمنع زوجها من غسلها و مسها لا من النظر إليها على الأصح...... وهي لا تمنع من ذلك أي من تغسيل زوجها دخل بها

أولا......لأنها تلزمها عدة الوفاة ولو لم يدخل بها. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، مطلب في حديث كل سبب ونسب منقطع إلا سببي و نسبي، زكريا ۳/ ۹۰، كراچي ۲/ ۱۹۸، سكب الأنهر على هامش مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز ۱/ ۲٦٦، فقيه الأمة، و كذا في الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، زكريا ۱/ ۱٦۰، الفقه الإسلامي وأدلته، الفصل العاشر أنواع الصلوة، المبحث الثامن صلوة الجنازة الفرض الأول تغسيل الميت، ھدیٰ انٹر نیشنل دیوبند ۲/ ٤۰٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۵۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۲۴ھ

کیا شوہر اپنی متوفی بیوی کے قریب جاسکتا ہے؟

سوال [۴۷۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بیوی انتقال کرچکی ،تو وہ شخص اپنی بیوی کی میت کے قریب جاسکتا ہے یانہیں؟ یا اسے چھوسکتا ہے؟ جنازہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد منظور الحق، سمستی پور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنی بیوی کی میت کے قریب جانا اور اس کو دیکھنا اور اس کا جنازہ اٹھانا سب جائز ہے؛ البتہ بلا حائل چھونا جائز نہیں ۔(مستفاد: احسن الفتاوی ۴/ ۲۱۵)

ويمنع زوجها من غسلها، ومسها لا من النظر إليها على الأصح. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في حديث: كل سبب و نسب منقطع إلا سببي و نسبي، زكريا۳/ ۹۰، كراچي ۲/ ۱۹۸، سكب الأنهر على هامش مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة،

دارالکتب العلمیة بیروت ۱/ ۲٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱٦ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۷۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ٦/ ۱۴۱٦ھ

شوہر کا اپنی متوفیہ بیوی کا چہرہ دیکھنا

سوال [۱۷۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی کی بیوی کا انتقال ہوجائے، تو وہ مرنے کے بعد اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: نصیر اختر، محلّہ: باڑہ شاہ صفا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بیوی کے مرنے کے بعد شوہر کے لئے بیوی کا چہرہ دیکھنا بلاتردد جائز ہے، اس میں کسی شبہ کی ضرورت نہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۴۷، فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۸/ ۴۹۳)

قال الطحطاوي: ولا يمنع من النظر إليها في الأصح. (حاشية الطحطاوي على المراقي، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ۵۷۲)

ويمنع زوجها من غسلها، ومسها لا من النظر إليها على الأصح. (الدر مع الرد، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، زكريا۳/ ۹۰، كراچي ۲/ ۱۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۱۷)

شوہر کا بیوی کی وفات کے بعد اس کا چہرہ دیکھنا

سوال[۱۷۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ ہارون کی بیوی انتقال کر گئی، تو ہارون صاحب اپنی بیوی کی صورت دیکھ سکتے ہیں یانہیں؟ اسی طرح سے نماز جنازہ میں شرکت اور کاندھا لگا سکتے ہیں یانہیں؟ اور قبر میں کون کون اتار سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عارف، دھنورہ منڈی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد ہارون اپنی مردہ بیوی کو دیکھ سکتا ہے؛ البتہ چھونا جائز نہیں ہے۔ اور نماز میں شرکت کرنا بھی صحیح ہے اور جنازہ کو اٹھانا بھی جائز ہے اور قبر میں ضرورت کے وقت جو مسلمان چاہے اتار سکتے ہیں؛ البتہ اگر اس عورت کے باپ، بھائی وغیرہ محرم ہوں تو ان کو قبر میں اتارنے کا زیادہ حق پہونچتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۳۷۷، جدید ڈابھیل ۴۹۳/۸، امداد الفتاوی، زکریا ۳۹۷/۱، ایضاح المسائل ۷۴)

ویمنع زوجها من غسلها، ومسها لا من النظر إليها على الأصح. منية. و في رد المختار: عزاه في المنح إلى القنية، ونقل عن الخانية أنه إذا كان للمرأة محرم يممها بيده و أما الأجنبي فبخرقة على يده. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، زكريا ٩٠/٣، كراچي ١٩٨/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۵۲۹/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۷/۵ھ

کیا ناپاک عورت بھی اپنے متوفی شوہر کا چہرہ دیکھ سکتی ہے؟

سوال [۳۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر عورت کئی ایام سے ناپاکی کی حالت میں ہو، مثلاً حیض، نفاس، استحاضہ کا خون جاری ہو اور ایسی حالت میں شوہر کا انتقال ہوجائے، تو کیا ایسی عورت اپنے شوہر کا منھ دیکھ سکتی ہے یانہیں؟

المستفتی: ولی اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر مرجائے تو حالت حیض یا نفاس یا استحاضہ میں بیوی اس کا منھ دیکھ سکتی ہے، مستحاضہ اس کے پاس بیٹھ بھی سکتی ہے؛ البتہ حائضہ اور نفساء دیکھنے کے بعد ہرگز نہ بیٹھے،فوری طور پراس کے پاس سے ہٹ جائے۔

ویمنع زوجها من غسلها، ومسها لا من النظر إليها على الأصح، وهي لاتمنع من ذلك (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في حديث: كل سبب و نسب منقطع إلا سببي ونسبي، زكريا۳/۹۰، كراچي ۱۹۸/۲)

ويخرج من عنده الحائض، والنفساء، والجنب. (در مختار، باب الجنازة، مطلب في القرأة عند الميت، زكريا ۸۳/۳، كراچي ۱۹۳/۲،البنايه شرح الهداية، كتاب الصلاة، باب الجنائز اشرفيه ديوبند ۱۸۷/۳، حاشية چلپي على التبيين، كتاب الصلاة، باب الجنائز،امداديه ملتان ۲۳٤/۱، زكريا ديوبند ٥٦١/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۲۵۱/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

والد صاحب کا بیٹے کو اپنے جنازہ میں شرکت سے روکنا

سوال [۳۷۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حامد کا والد تیز مزاج کا ہے، کسی دن غصہ کی حالت میں حامد کو باپ یہ کہتا ہے کہ تم پر میرا جنازہ اٹھانا اور مٹی دینا حرام ہے اور ان کا والد زید دوسرے دن راضی ہوجاتا ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد والد کا انتقال ہوجاتا ہے، تو کیا زید کے لئے باپ کا جنازہ اٹھا کر لے جانا اور ایصال ثواب، مٹی دینا شرعاً درست ہوگا؟

المستفتی: محمد ظفر عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ خواہ کیسے بھی ہوں اولاد پر والدین کی فرمانبرداری، عزت واحترام لازم اور ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلۡ رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىۡ صَغِيۡرًا. [سورة نبی اسرائیل: ٢٤]

والدین کے سامنے عاجزی وانکساری کے ساتھ رہو۔ اور مسئولہ صورت میں خالد کے لئے والد کا جنازہ اٹھانا، مٹی دینا اور ایصال ثواب کرنا درست ہی نہیں؛ بلکہ زندگی میں اگر کوئی رنجش رہی ہے، تو بعد الوفات والد مرحوم کو خوش کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن العبد ليموت والداه أو أحدهما، وإنه لهما لعاق، فلايزال يدعو لهما، ويستغفر لهما حتى يكتبه الله بارًا. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في بر الوالدين، فصل في حفظ حق الوالدين بعد موتهما، دارالكتاب العلمية بيروت٦/٢٠٢، رقم:٧٩٠٢، مشکوۃ شریف،٤٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٨/محرم الحرام ١٤٢٢ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٥/ ٧٠١٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٢/١/٨ھ

(۲) باب غسل المیت

انسانی اعضاء کے ٹکڑوں کو جمع کر کے غسل دینا

سوال [۴۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بم دھماکہ میں ایک شخص کے پرخچے اڑ گئے، اس کا جسم تین چار ٹکڑوں میں منتشر ہوگیا، اس کو غسل کیسے دیا جائے، اس کے اعضاء کو جوڑ کر غسل دیں گے یا الگ الگ اجزاء کو غسل دیا جائے؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: محمد محمود عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب جسم کے اجزاء منتشر ہوجائیں، تو ان کو جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، ان کو ایک ساتھ رکھ کر پانی بہادیا جائے گا اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان اجزاء پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور دفن کردیا جائے؛ کیونکہ میت کا اکثر بدن موجود ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی جدید ۱/ ۴۷۳)

وعلی هذا یخرج ما إذا وجد طرف من أطراف الإنسان کید ورجل أنه لایغسل؛ لأن الشرع ورد بغسل المیت، والمیت اسم لکله، ولو وجد الأکثر منه غسل؛ لأن للأکثر حکم الکل. (بدائع الصنائع، کتاب الجنائز، فصل في شرائط وجوب الغسل قدیم ۱/ ۳۰۲، زکریا ۲/ ۲۸)

ولو وجد أکثر البدن أو نصفه مع الرأس یغسل و یکفن ویصلی علیه. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، زکریا قدیم ۱/ ۱۵۹، زکریا جدید ۱/ ۲۱۹، البحرالرائق، کتاب الجنائز، زکریا ۲/ ۳۰۵، کراچی ۲/ ۱۷۴)

لو وجد طرف من أطراف إنسان-یلف في خرقة إلا إذا کان معه

الرأس فيكفن. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، مطلب في الكفن، زكريا ۳/ ۹۹، كراچي ۲/ ۲۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۲۳)

آپریشن کی وجہ سے میت پر ٹیپ لگے ہونے کی حالت میں غسل کا حکم

سوال [۶۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو غسل دیتے وقت اگر جسم پر ٹیپ چپکے ہوں، آپریشن یا ایکسیڈنٹ کی وجہ سے تو ٹیپ الگ کرنا چاہئے یا ایسے ہی غسل دیدینا چاہئے؟

المستفتی: ناصر رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کو غسل دیتے وقت آپریشن یا ایکسیڈنٹ کی وجہ سے جسم پر جو ٹیپ لگے ہوں، تو اس کو الگ کرنا ضروری ہے، ٹیپ الگ کئے بغیر غسل دینا درست نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/ ۲۲۷)

ويجرد الميت إذا أريد غسله، وهذا مذهبنا، كذا في الظهيرية.

(هندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، زكريا قديم ۱/ ۱۵۸، جديد ۱/ ۲۱۸)

يجرد الميت إذا أريد غسله - ولنا: أن المقصود من الغسل هو التطهير، ومعنى التطهير لايحصل بالغسل وعليه الثوب لتنجس الثوب بالغسالات التي تنجست بما عليه من النجاسات الحقيقية، وتعذر عصره وحصوله بالتجريد أبلغ فكان أولىٰ. (بدائع الصنائع، صلاة الجنائز، فصل في بيان كيفية الغسل قديم ۱/ ۳۰۰، زكريا ۲/ ۲۴، المبسوط للسرخسي،

دارالکتب العلمیة بیروت ۲/ ۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۷۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۳/۲۲ھ

کیا جلے ہوئے شخص کو غسل دینا لازم ہے؟

سوال [۳۷۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک خاتون اسٹوپ پھٹنے کے نتیجہ میں بدن میں آگ لگنے کی وجہ سے جل کر انتقال کرگئی، اس کے بدن کا سر اور چہرہ کے علاوہ پورا چمڑا جلنے سے متاثر ہوگیا اور پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، اس حالت میں غسل دینا لازم ہے یا نہیں؟ یا تیمّم سے کام چل جائے گا؟

المستفتی: محمد عمر کارخانے دار، ریتی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: غسل دینا لازم ہے، تیمّم کافی نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۵۰۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۱۵۹۰)

شوہر کا بیوی کو انتقال کے بعد چھونا اور غسل دینا

سوال [۳۷۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مفتی صاحب مدعی ہیں کہ شوہر عورت کو غسل دے سکتا ہے، دلیل میں حضرت علیؓ کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔

نیز مدعی ہے کہ شوہر عورت کا بعد الموت ہر وقت تا تدفین وزمین دوز تک چہرہ دیکھ سکتا ہے، اس

مسئلہ کی بحوالہ وضاحت فرمائیں؟

المستفتی: محمد سلیم الدین عفااللہ عنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر اپنی مردہ بیوی کی صرف صورت دیکھ سکتا ہے، غسل دینا، چھونا جائز نہیں ہے اور حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ کو غسل دینا حضرت علیؓ وفاطمہؓ کی خصوصیت ہے یہ حکم اور کسی پر جاری نہ ہوگا؛ کیونکہ موت کے بعد بھی حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ کے ساتھ باقی تھا اور بقیہ امتی کا نکاح بیوی سے ختم ہو جاتا ہے۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: إن فاطمةؓ زوجتک في الدنیا والآخرة. فادعاؤہ الخصوصیة دلیل علی ان المذھب عندھم عدم الجواز.

(شامي، کتاب الصلاة، باب الجنائز، قبیل مطلب في حدیث کل سبب و نسب منقطع إلا سببي و نسبي، زکریا ۳/ ۹۰، کراچي ۲/ ۱۹۸)

ویمنع زوجھا من غسلھا و مسھا لا من النظر إلیھا علی الأصح.

(در مختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الجنائز، قبیل مطلب في حدیث کل سبب و نسب منقطع إلا سببي و نسبي، کراچي ۲/ ۱۹۸، زکریا ۳/ ۹۰، سکب الأنھر علی ھامش مجمع الأنھر، دارالکتب العلمیة بیروت ۱/ ۲۶۶، مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، باب أحکام الجنائز، دارالکتاب دیوبند ۵۷۱، ایضاح المسائل ۷۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفااللہ عنہ
۹؍ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۸۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۹/ ۱۴۱۲ھ

کیا میت کو شروع سے آخر تک دستانہ پہن کر غسل دینا چاہئے؟

سوال [۴۷۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو نہلاتے وقت بائیں ہاتھ میں شروع میں دستانہ پہن لیتے ہیں؛ چونکہ استنجاء

کرانا ہوتا ہے، پھر جب وضو کراتے ہیں تو دستانہ نکال دیتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا پھر جب میت کو وضو کرانے کے بعد پورے جسم کو دھویا جاتا ہے، صابن لگایا جاتا ہے، پھر صابن کو دھویا جاتا ہے، ستر کو بھی دھویا جاتا ہے، کیا اس حالت میں بھی دستانہ پہننا چاہئے اور بائیں ہاتھ میں پہنیں یا دائیں ہاتھ میں؛ چونکہ ستر کو تو اب بھی ہاتھ لگے گا، فقہاء کی کیا رائے ہے؟

المستفتی: توقیر احمد نہٹور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کو استنجاء دستانے پہن کر کرانا چاہئے، اسی طرح ناف سے لے کر گھٹنوں تک میت کے جثّے کو بلا دستانوں کے نہیں چھونا چاہئے؛ بلکہ یوں ہی پانی بہادے اگر ملنے کی ضرورت پڑے، تو دستانوں کا استعمال کیا جائے۔ نیز ستر پر بغیر دستانوں کے ہاتھ نہیں لگانا چاہئے۔

وصورته أن يلف الغاسل على يديه خرقة، ويغسل السوأة؛ لأن مسها حرام كالنظر إليها. (شامي، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، كراچي ۱۹٦/۲، زكريا ۸۷/۳، حاشية الطحطاوي على المراقي، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ص:٥٦٨، هندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، زكريا قديم۱/۱٥۸، جديد ۱/۲۱۹ البنايه، باب الجنائز، فصل في الغسل اشرفية ديوبند ۳/۱۸۲)

عن ابن سيرين في الميت يغسل قال: ...... ولايكشف الخرقة التي علىٰ فرجه؛ ولكنه يلف على يده خرقة، إذا أراد أن يغسل فرجه، فيغسل ماتحت الخرقة التي على فرجه بماء. الحديث (مصنف عبد الرزاق، باب غسل الميت، المجلس العلمي بيروت ۳/۱ ٤۰، رقم:٦۰۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ؍ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ ؍ ۹۷۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱۲/۱ھ

بوقت غسل میت کا پیر کس جانب ہو؟

سوال [۳۷۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ یعنی مردہ کو جب غسل دیا جائے تو اس کا پیر کس جانب ہونا چاہئے دکھن یا پچھّم؛ کیونکہ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ مردے کو پورب پچھّم لٹا کر غسل دیا جائے تا کہ اس کا رخ قبلہ کی طرف ہو اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اتر، دکھن مردے کو غسل دیا جائے، ان دونوں میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردے کو غسل کے لئے دائیں کروٹ قبلہ رخ لٹانا مسنون ہے۔

یسن توجیه المحتضر أي للقبلة.....علی یمینه.....وجاز الاستلقاء، ویوضع هکذا في الغسل. قال في شرح الطحاوي: وهو العرف بین الناس. قال في الزاد والأول أفضل؛ لأنه السنة، کذا في المضمرات. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، باب أحکام الجنائز قدیم ۱/۳۰۵، جدید دارالکتاب دیوبند ۵۵۸، درمختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الجنائز، کراچي ۲/۱۸۹، زکریا ۳/۷۷، ۷۸، هدایه، کتاب الصلاة، باب الجنائز، اشرفی دیوبند ۱/۱۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۱۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۴/۶ھ

میت کو غسل دینے کے بعد لٹانے کا طریقہ

سوال [۳۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو غسل دے کر بعد کفنانے کے بعد کس طرح لٹایا جائے؟ قبلہ کی طرف پیر کر

کے لٹایا جائے یا شمالاً وجنوباً؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد رضوان، مدرسہ امداد العلوم، حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کو غسل دینے یا کفنانے کے بعد جنوب، شمال لٹایا جائے کہ اس کا سر شمال کی طرف ہو اور پیر جنوب کی طرف اور معمولی سی دائیں کروٹ پر چہرہ رکھا جائے، جس سے چہرہ قبلہ کی طرف ہو۔ اور سوالنامہ میں جو لکھا ہے کہ قبلہ کی طرف پیر کر کے لٹایا جائے درست نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۵۲/۱۳، ڈابھیل ۴۹۱/۸)

یوجه المحتضر ......القبلة...... وهو المعتاد في زماننا؛ ولكن يرفع رأسه قليلا ليتوجه للقبلة. (در مختار، كتاب الصلاة، باب الجنائز، كراچي ۱۸۹/۲، زكريا ۷۷/۳، ۷۸، حاشية الطحطاوي على المراقي، باب أحكام الجنائز قديم ۳۰۵، جديد دارالكتاب ديوبند ۵۵۸، حلبي كبير، فصل في الجنائز، اشرفية ديوبند ۵۷٦، هندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في توجيه المحتضر، زكريا قديم ۱۵۷/۱، جديد ۲۱۷/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ررمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰ /۱۱۲۴۳)

میت کو کافور لگانے کا ثبوت

سوال [۳۷۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو کافور لگانا شرعاً ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: نوشے صاحب، محلّہ: نواب پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت اسلامیہ میں میت کی پیشانی اور دونوں ہاتھ، گھٹنوں، قدموں، اور ناک پر کافور لگانا مسنون اور درست ہے۔

عن ابن مسعود قال: الکافور یوضع علی مواضع السجود. (السنن الکبری للبیهقي، کتاب الجنائز، باب الکافور والمسك للحنوط، دارالفکر بیروت ۲۷۵/۵، رقم: ٦٨٠٦)

وجعل الحنوط علی رأسه، ولحیته، والکافور علی مساجده. وتحته في البحر: وانها الجبهة، والیدان، والأنف، والقدمان، والرکبتان الخ (البحر الرائق، کتاب الجائز، زکریا ۳۰۳/۲، کوئٹه ۱۷۳/۲، فتاوی عالمگیري، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التکفین، زکریا قدیم ۱۶۱/۱، جدید ۲۲۲/۱، مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، باب أحکام الجنائز، دارالکتاب دیوبند ص: ۵۷۱، حلبي کبیر، فصل في الجنائز، اشرفیة دیوبند ۵۷۹، الفتاوی التاتار خانیة، کتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، قسم آخر في کیفیة التکفین، زکریا دیوبند ۲۹/۳، رقم: ۳٦۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷۶۱/۲۷)

میت کے بدن پر صابن لگانا

سوال [۳۷۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو غسل دینے کا طریقہ جو کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ وضو کرانے کے بعد سر اور داڑھی کو گل خیرو یا صابن وغیرہ سے خوب اچھی طرح دھوئے، پھر بیری کا پانی، یا نیم گرم پانی تین تین دفعہ دائیں، بائیں کروٹ پر خوب اچھی طرح بہاوے، میت کے جسم پر ہاتھ ملتے ہوئے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میت کے

جسم پر بھی صابن کا استعمال کرے بغیر مبالغہ کے قابل ستر حصہ کو چھوڑ کر، تو کیا اس میں شرعاً قباحت ہے؟ یا اس کی اجازت ہے شرعی نقطۂ نظر سے؟

المستفتی: محمد رضوان مدرسہ امداد العلوم، حیدرآباد، (اے پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عام کتب فقہ میں اتنی ہی بات لکھی ہوئی ہے کہ سر اور داڑھی کو خطمی اور صابن وغیرہ سے دھوکر صاف کریں اور پورے بدن کو بیری وغیرہ کے نیم گرم پانی سے دھویا جائے؛ لیکن بعض کتب فقہ میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ پورے بدن کو بھی صابن لگا کر کے دھویا جائے، پہلی اور دوسری مرتبہ میں صابن لگایا جائے، اور تیسری مرتبہ میں بغیر صابن کے دھوکر بدن کو صاف کرلیا جائے، اس سلسلہ میں دو کتابوں کے حوالے درج ذیل ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

أما السنة فإنه يزاد على هذه الغسلة غسلتان أخريان، وذلک بأن يضجع ثانياً على يمينه، ثم يصب الماء على شقه الأيسر ثلاثاً بالكيفية المتقدمة –إلي– وهذه هي الغسلة الثانية، ثم يضجع بعد ذلک على يساره ويصب الماء على يمينه بالكيفية المتقدمة، وهذه هي الغسلة. الثالثة: وتكون الغسلتان الأوليان بماء ساخن مصحوب بمنظف كورق النبق، والصابون. أما الغسلة الثالثة فتكون بماء مصحوب بكافور، ثم بعد ذلک يجفف الميت، ويوضع عليه الطيب، كما تقدم. (الفقه على المذاهب الأربعة، مباحث الجنائز، كيفية غسل الميت، دارالفكر بيروت ۱/ ۵۱۰، مكمل جديد ۲۸۴)

ثم يغسل الرأس، ثم اللحية بسدر. (ورق النبق يستعمل في التنظيف) اؤ خِطمي، بأن يسحق ويضرب بماء قليل في إناء حتى تبدوله رغوة، ثم يعرک به الموضع لإزالة الوسخ، ثم يصب عليه الماء الطهور الذي هو شرط لصحة الغسل، فإن لم يوجد سدر فيستعمل الصابون، أو نحوه من أشنان.

(الفقه الإسلامي وأدلته، المبحث الثامن من صلوة الجنازه، وأحكام الجنائز، سادساً، كيفية

الغسل ومقداره ومندوباته، الهدیٰ انٹرنیشنل دیوبند ۲/ ۴۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۸/۱ھ

کیا میت کو غسل دینے والے پر غسل کرنا ضروری ہے؟

سوال [۳۷۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کو جو شخص غسل دے، میت کو غسل دینے کے بعد اس شخص کو غسل کرنا ضروری ہے؟ کیونکہ بعض لوگ غسل دینے کی وجہ سے جو چھینٹیں آتی ہیں، ان کی وجہ سے غسل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

المستفتی: محمد کاظم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: میت کو غسل دینے کے بعد غسل دینے والے پر غسل کرنا واجب اور ضروری نہیں ہے؛ البتہ مستحب ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۵/ ۲۵۳، احسن الفتاوی ۴/ ۲۴۳)

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتاً فليغتسل. (مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۲۸۱، رقم: ۷۷۵۷، سنن الترمذي، أبواب الجنائز، باب ماجاء في الغسل من غسل الميت، النسخة الهندية ۱/ ۱۹۳، دارالسلام رقم: ۹۹۳، سنن ابن ماجه، أبواب الجنائز، باب ماجاء في غسل الميت ۱۰۵، دارالسلام رقم: ۱۴۶۳، سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب في الغسل من غسل الميت، النسخة الهندية ۲/ ۴۵۰)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس عليكم في غسل ميتكم غسل إذا غسلتموه، فإن ميتكم ليس بنجس، فحسبكم أن تغسلوا أيديكم. (المستدرك للحاكم، كتاب الجنائز قديم ۱/ ۳۸۶، جديد مكتبه نزار مصطفى الباز ۲/ ۵۴۹، رقم: ۱۴۲۶، سنن دار قطني، باب حث التراب على

الميت،دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٣، رقم: ١٨٢١، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الطهارة، جماع أبواب الغسل للجمعة والأعياد، دارالفكر بيروت ١/ ٤٥١، رقم:١٥٠٥)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتاً، فليغتسل ومن حمله فليتوضأ، رواه الإمام أحمد وأصحاب السنن إلا النسائي، والأمر فيه للندب، وصرفه عن الوجوب حديث ابن عباس المصرح فيه بعدم الوجوب. (حاشية الطحطاوي على المراقي، باب أحكام الجنائز، قبيل فصل الصلاة عليه قديم ٣١٧، جديد دارالكتاب ديوبند ٥٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۶)

میت کے غسالہ کا کیا کریں؟

سوال[۳۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کے نہلائے ہوئے پانی کو گڑھا کھود کر جمع کر دینا چاہئے یا بہا دینا چاہئے؟ اگر بہا دیا گیا تو از روئے شرع کوئی حرج نہیں؟

المستفتی: جلیس احمد ٹانڈہ، رام پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہا دینا اور گڑھا کھدوا کر اس میں جمع کر دینا دونوں صورتیں بلا کراہت جائز اور درست ہیں؛ ہاں البتہ بہتر شکل یہی ہے کہ گڑھا کھدوا کر سارا پانی اس میں جمع کر دیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۲/ ۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۳۱۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۵/۲ھ

حضرت فاطمہؓ کے غسل کا واقعہ

سوال [۳۷۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کو وفات کے بعد غسل نہیں دیا گیا؛ بلکہ انہوں نے وفات سے پہلے خود اپنا غسل کر کے حضرت ام سلمیٰ کو وصیت کی تھی کہ میری موت کے بعد میرے بدن کو کوئی نہ کھولے، میں نے اپنا غسل خود کرلیا ہے، یہ بات کہاں تک درست ہے؟ اس بارے میں حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کون سی بات پایۂ ثبوت تک ہے؟ کہ ان کو وفات کے بعد غسل دیا گیا تھا یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت فاطمہؓ کو وفات کے بعد غسل دیا گیا تھا یا نہیں؟ اس سلسلے میں دو طرح کی روایات ملتی ہیں:

نمبر۱: وہ روایات ہیں جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ انہوں نے وفات سے پہلے خود غسل کر کے کپڑا پہن لیا تھا اور کپڑے میں حانوط وغیرہ یعنی کافور اور خوشبو وغیرہ لگا لیا تھا اور ام المؤمنین حضرت ام سلمیٰؓ کو وصیت کردی تھی کہ ان کا بدن نہ کھولا جائے اور ایک روایت میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت علیؓ کو وصیت کی تھی کہ وفات کے بعد ان کا بدن نہ کھولا جائے۔

یہ روایات حسب ذیل ہیں: مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

عن أم سلمیؓ، قالت: اشتکت فاطمةؓ شکواها التي قبضت فیه، فکنت أمرِّضها فأصبحت یومًا کأمثل ما رأیتها في شکواها تلک، قالت: وخرج عليؓ لبعض حاجته، فقالت: یا أمه! اسکبي لی غسلا فسکبت لها غسلاً فاغتسلت کأحسن ما رأیتها تغتسل ثم قالت: یا أمه! أعطني ثیابي الجدد فأعطیتها فلبستها، ثم قالت: یا أمه! قدمي لي فراشي وسط البیت، ففعلت، واضطجعت، واستقبلت القبلة وجعلت یدها تحت خدها، ثم قالت: یا أمه! إني مقبوضة الآن وقد تطهرت فلا یکشفني أحد، فقبضت مکانها، قالت: فجاء علي فأخبرته. (مسند إمام أحمد بن حنبل ۶/ ۴۶۱- ۴۶۲، رقم:۶۷ ۲۸۱)

المعجم الکبیر میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

عن عبد الله بن محمد بن عقيل أن فاطمة لما حضرتها الوفاة أمرت عليًّا، فوضع لها غسلاً فاغتسلت وتطهرت ودعت بثياب أكفانها فأتيت بثياب غلاظ خشن ولبستها ومست من الحنوط وأمرت عليًّا أن لا تكشف إذا قبضت، وأن تدرج كما هى في ثيابها، فقلت له هل علمت أحد أفعل ذلك، قال: نعم! كثير بن عباس وكتب في أطراف أكفانه "يشهد كثير بن عباس" أن لا إله الله. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العلمي ٢٢/٣٩٩، رقم: ٩٩٦، المصنف لعبد الرزاق، المكتب الإسلامي، بيروت ٣/٤١١، رقم: ٦١٢٦)

دوسری قسم کی وہ روایات ہیں جن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ کو وصیت کی تھی یہی دونوں ان کو وفات کے بعد غسل دیں گے، ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے غسل میں شریک نہ ہو، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو وفات کے بعد باضابطہ غسل دیا گیا ہے اور یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے کہ موت کے بعد جو غسل دیا جاتا ہے، وہ غسل واجب ہے اور موت سے پہلے اس غسل واجب کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا؛ بلکہ موت کے بعد ہی ادا ہوسکتا ہے اور دونوں روایات میں تطبیق کی شکل یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے وفات سے پہلے اطمینان سے غسل فرمالیا تھا اور کفن والا کپڑا ابھی پہن لیا تھا اور حضرت ام سلمٰی اور حضرت علیؓ کو وصیت کردی تھی کہ ان کا بدن نہ کھولا جائے، پھر بعد میں ان کو احساس پیدا ہوا کہ موت کے بعد غسل واجب ہوتا ہے؛ اس لئے حضرت اسماء بنت عمیسؓ اور حضرت علیؓ کو دوبارہ وصیت کردی کہ مجھے غسل صرف آپ ہی دونوں حضرات دیں اور آپ دونوں کے علاوہ کوئی اور میرے غسل میں شریک نہ رہے، اصل واقعہ وصحیح بات یہی ہے کہ بعد میں اس طرح غسل بھی دیا گیا ہے اور دونوں روایتوں کے درمیان اس صورت میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا؛ بلکہ دونوں روایتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

اب غسل دینے کی روایات ملاحظہ فرمائیے: چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں ان الفاظ سے مروی ہے:

عن عون بن محمد عن أمه عن أسماء بنت عميس أن فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم أوصت أن يغسلها زوجها على بن أبي طالب رضي الله عنه فغسلها هو وأسماء بنت عميس. (السنن الكبرى للبيهقي، دار الفكر بيروت ٥/٢٥٦، رقم: ٦٧٦٠، ومكتبة دار الحديث القاهرة ٤/١٠٥، رقم: ٦٦٦١)

سنن کبریٰ بیہقی میں دوسری روایت عمارہ بن المہاجر کے طریق سے الفاظ کے فرق کے ساتھ مروی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن عمارة بن المهاجر عن أم جعفر أن فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم، قالت: يا أسماء! إذا أنا مت فاغسليني أنت وعلي بن أبي طالب فغسلها عليؓ وأسماء رضي الله عنهما. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، مطبع دار الحديث القاهره ٤/١٠٥، رقم: ٦٦٦٠، ومطبع دار الفكر بيروت ٥/٢٥٦، رقم: ٦٧٥٩)

مستدرک حاکم میں مختصر فرق کے ساتھ یہی روات مروی ہے۔

عن عون بن محمد بن على وعمارة بن المهاجر عن أم جعفر زوجة محمد بن علي قالت: حدثني أسماء بنت عميس قالت: غسلت أنا وعليؓ فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم. (المستدرك للحاكم، دار لكتب العلمية ٣/١٧٩، رقم: ٤٧٦٩، ومكتبة نزار مصطفى الباز مكة المكرمة ٥/١٧٩٠، رقم: ٤٧٦٩)

اور سنن دار قطنی میں سند صحیح کے ساتھ عون بن محمد کے طریق سے یہ روایت مروی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن عون بن محمد عن أمه عن أسماء بنت عميس أن فاطمة أوصت أن يغسلها زوجها عليٌّ وأسماء فغسلاها. (سنن الدار قطنى، دار الايمان سهارن پور ٢/٦، رقم: ١٨٣٣)

اور مصنف عبد الرزاق میں عمارہ بن المہاجر کی روایت تھوڑے سے الفاظ کے فرق کے ساتھ مروی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

عن عمارة بن مهاجر عن أم جعفر بنت محمد عن جدتها أسماء بنت عميس قالت أوصت فاطمة إذا ماتت أن لا يغسلها إلا أنا وعليٌّ قالت: فغسلتها أنا وعليٌّ فحديث بنت عميس أرجح للأدلة الدالة على وجوب غسل الميت مطلقاً. (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ بيروت ۳/ ۹۰٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
ا؍صفر المظفر ۱۴۳۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍ ۱۲۳۴۷)

(۳) باب تکفین المیت

آب زمزم سے کفن کا کپڑا اتر کرنا

سوال [۴۷۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بہت سے حجاج کرام اپنے ساتھ کفن کا کپڑا لیجاتے ہیں اور آب زمزم میں تر کر کے واپس لاتے ہیں، یہ عمل حصول تبرک کے لئے کرتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد کلیم اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تبرک کے طور پر آب زمزم سے کفن کے کپڑے دھونے میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ باعث برکت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۷/۲۳۲، جدید ڈابھیل ۸/۵۲۰، میرٹھ ۱۳/۸۳)

لو وُضِع شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو عصاه، أو سوطه على قبر عاصٍ، لنجا بذلك العاصي ببركات تلك الذخيرة من العذاب -إلى قوله- ومن هذا القبيل: ماء زمزم، والكفن المبلول، وبطانة أستار الكعبة، والتكفن بها الخ. (روح البيان، تحت سورة التوبة، الآية:٨٤، مصري ٢/٥٥٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۳۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۱۵ھ

آب زمزم سے کفن دھونا

سوال [۴۷۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ کفن کے کپڑے کو آب زمزم سے اس عقیدے سے دھونا کہ اس سے کچھ فائدہ پہنچے گا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد حارث، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حصول برکت کے لئے کفن کا کپڑا آب زمزم سے دھونا بلا کراہت جائز ہے، پہلے حضرت تھانویؒ نے اس کو ماء زمزم سے استنجاء کرنے پر قیاس کرتے ہوئے ناجائز کہا تھا؛ لیکن بعد میں حضرت نے اس سے رجوع فرمالیا۔

نیز مفتیٔ اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ’’کفنِ مبلول بماء زمزم میں میرے نزدیک جواز کی جہت راجح ہے اور اس کو استنجاء بماء زمزم پر قیاس نہ کرنا چاہئے‘‘۔ (مستفاد: کفایت المفتی جدید ۴/۳۴، جدید زکریا مطول ۵/۳۳۰، قدیم ۴/۲۳، امداد الفتاوی ۱/۵۱۷، محمودیہ ڈابھیل ۸/۵۲۰، میرٹھ ۱۳/۸۳، انوار مناسک ۳۹۸)

لو وُضِع شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو عصاه، أو سوطه على قبر عاصٍ، لنجا بذلك العاصي ببركات تلك الذخيرة من العذاب –إلى قوله– ومن هذا القبيل: ماء زمزم، والكفن المبلول به، وبطانة أستار الكعبة. (تفسير روح البيان، مصري ٢/٥٥٩، بحواله أنوار مناسك ٣٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۵۱۶)

غلاف کعبہ کا ٹکڑا کفن میں دینا

سوال [۳۷۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیت اللہ شریف کے غلاف کے ٹکڑے کو میت کے کفن میں رکھ دینا اس عقیدہ سے

کہ اس کے ذریعہ اس کو فائدہ پہونچے گا، اس بارے میں کوئی دلیل شرعی ہو تو ضرور تحریر فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد جابر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیت اللہ شریف کے غلاف کا ٹکڑا میت کے کفن میں بطور تبرک کے رکھنا جائز اور درست ہے، بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام یا کوئی آیت کریمہ نہ لکھی ہوئی ہو، رہا یہ کہ اس سے میت کو کوئی فائدہ پہونچے گا یا نہیں؟ تو حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ فائدہ بھی پہونچ سکتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۸۲/۱۳، ڈابھیل ۵۱۹/۸)

عن أم عطیة رضـ قالت: دخل علینا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ونحن نغسل ابنته، فقال: اغسلنها ثلاثاً، أو أکثر من ذلک بماء، وسدر، واجعلن في الآخرة کافوراً، فإذا فرغتن فاٰذنني، فلما فرغنا أذناه، فألقي إلینا حقوهٗ، فقال: أشعر نها إیاه. (صحیح البخاري، کتاب الجنائز، باب مایستحب أن یغسل وتراً، النسخة الهندیة ۱۶۷/۱، رقم: ۱۲٤۰، ف: ۱۲۵٤)

قال الطِّیبي أي اجعلن هذا الحقو تحت الأکفان بحیث یلاصق بشرتها، والمراد إیصال البرکة إلیها. (مرقاة المفاتیح، اشرفي ۳۳/٤، رقم: ۱٦۳۵)

وهو أصل في التبرک باٰثر الصالحین. (عمدة القاري ٦۳/۸، مصري قدیم ٤۱/۸)

وهذا الحدیث أصل في التبرک بآثار الصالحین ولباسهم کما یفعله بعض مریدي المشایخ، من لبس أقمصتهم في القبر لمعات. (حاشیة مشکوۃ ۱٤۳/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۶۰/۴۰)

جس کپڑے میں انتقال ہوا ہے اس کو نکالنا

سوال [۴۷۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ میت کی روح جن کپڑوں میں نکلے وہ کپڑے اتار دینے چاہئیں اور میت کے اوپر صاف چادر ڈال دینی چاہئے، کیا یہ بات صحیح ہے کہ میت کو ننگا کر کے اوپر صرف چادر ڈال دیں؟ یا جو بہتر شکل ہو تحریر فرما دیں۔

المستفتی: توقیر احمد نہٹور، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ مستحب ہے کہ میت سے وہ کپڑے نکال کر اس کے اوپر صاف چادر ڈال دی جائے، جس سے میت کا سارا بدن ڈھک جائے۔

ویستحب أن ینزع عنه ثیابه التي مات فیها، ویسجی جمیع بدنه بثوب .

(هندیة، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الأول في المحتضر، زکریا ۱/۱۵۷،جدید ۱/۲۱۸، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱۶/۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۲۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱۲/۱ھ

کفن کس کپڑے کا ہو؟

سوال [۴۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردے کا کفن سوتی کپڑے کا ہونا ہی ضروری ہے یا ٹیری کاٹ وغیرہ کا کفن بھی دیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: انیس الرحمٰن سیوہارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سفید سوتی کپڑے کا کفن دینا مستحب ہے، حضور ﷺ نے سفید کپڑے میں کفن دینے کی ترغیب دی ہے، اگر سوتی کپڑا بالکل میسر نہ ہو تو مجبوراً ٹیری کاٹ کپڑا میں کفن دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن وہ بھی سفید ہونا چاہئے۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألبسوا من ثيابكم البياض، فإنها من خير ثيابكم، وكفنوا فيها موتاكم. (سنن الترمذي، كتاب الجنائز، باب ما يستحب من الأكفان، النسخة الهندية ١٩٣/١، دارالسلام رقم:٩٩٤، مسند أحمد بن حنبل ٢٤٧/١، رقم:٢٢١٩، شمائل ترمذي ١٣/١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ربیع الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۴/۱۴۲۰ھ

مرد میت کے لیے کتنے کپڑے مسنون ہیں؟

سوال [۳۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد میت کے کفن میں شرعاً کتنے کپڑے ضروری ہیں، تہبند اس کفن میں شامل ہے یا نہیں؟

المستفتی: تصدق حسین، کھرک پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد میت کے لئے شرعاً تین کپڑے مسنون ہیں۔ ۱. کرتا ۲. ازار ۳. لفافہ، ازار لفافہ سے چھوٹی چادر کا نام ہے، جو سر سے پاؤں تک ہوتی ہے۔ اور لفافہ سب سے بڑی چادر کا نام ہے، جس میں میت کو لپیٹ کر گرہ لگائی جاتی ہے، اس کے علاوہ علیحدہ سے تہبند نامی کوئی چیز مرد کے کفن میں شامل نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۲۶۱/۵)

عن عائشة رضـ **قالت: دخلت على أبي بكر، فقال: في كم كفنتم النبي صلى الله عليه وسلم؟ قالت: في ثلاثة أثواب بيضسحولية ليس فيها قميص، ولاعمامة. الحديث** (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب موت يوم الإثنين، النسخة الهندية ١/١٨٦، رقم: ١٣٧١، ف:١٣٨٧)

ويسن في الكفن إزار، وقميص، ولفافة. (در مختار) **إزار هو من القرن إلى القدم، واللفافة تزيد على ما فوق القرن والقدم ليلف فيها الميت، وتربط من الأعلى والأسفل.** (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچي ٢/٢٠٢، زكريا٣/٩٥، هندية، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الثالث في التكفين، زكريا ١/١٦٠، جديد ١/٢٢١، هداية، باب الجنائز، فصل في التكفين، اشرفي ديوبند ١/١٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۲۲۹)

عورت اور مرد کے کفنِ مسنون کے کپڑوں کی تعداد

سوال [۳۷۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کفن میں کتنے کپڑے مرد کے لگتے ہیں اور کتنے عورت کے؟ اور کون کون سے کپڑے لگتے ہیں؟

المستفتی: سیف اللہ، مجھوڑہ، فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کفن میں مرد کے لئے تین کپڑے ہیں، کرتا، ازار، چادر، پہلے چادر بچھائی جائے پھر ازار، پھر اس پر کرتہ پھر میت کو رکھدیا جائے، اور پہلے کرتہ لپیٹا جائے، پھر ازار، پھر چادر۔

السنة أن يكفن الرجل في ثلاثة أثواب: إزار، وقميص، ولفافة، الخ
(هداية، كتاب الجنائز، فصل في التكفين، اشرفي ديو بند ۱/ ۱۷۹)

اور عورت کے لئے پانچ کپڑے چادر، ازار، قمیص، سینہ بند، سر بند، پہلے چادر بچھائی جائے، پھراس پرازار، پھراس کے اوپر کرتہ، پھر کرتا پہنا کرسر بند بالوں پر رکھا جائے، پھر ازار لپیٹنے کے بعد سینہ بند باندھا جائے، اس کے بعد چادر لپیٹ دی جائے۔ (مستفاد: بہشتی زیور اختری ۲/ ۵۵)

عن ليلى بنت قانف الثقفية رضؓ**، قالت: كنت فيمن غسل أم كلثوم ابنة رسول الله صلى الله عليه وسلم عند وفاتها، فكان أول ما أعطانا رسول الله صلى الله عليه وسلم الحقاء، ثم الدرع، ثم الخمار، ثم الملحفة، ثم أدرجت بعد في الثوب الأخر.** (سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب في كفن المرأة، النسخة الهندية ۲/ ۴۵۰، دارالسلام رقم: ۳۱۵۷، مسند أحمد بن حنبل ۶/ ۳۸۰، رقم: ۲۷۶۷۶، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۲۵/ ۲۹، رقم: ۴۶)

وتكفن المرأة في خمسة أثواب: درع، وإزار، وخمار، ولفافة، وخرقة تربط فوق ثدييها. (هداية، باب الجنائز، فصل في التكفين، اشرفي ديو بند ۱/ ۱۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رمحرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۵۰)

مرد عورت کے کفن میں مسنون کپڑوں کی مقدار

سوال [۳۷۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کے کفن میں عورت کے لئے کتنے کپڑے اور مرد کے لئے کتنے کپڑے مسلک حنفی میں حضور ﷺ سے ثابت ہیں؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد نصیر، نون برّا، ضلع: کوریا، چھتیس گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے کفن میں اگر میسر ہوتو پانچ کپڑے دینا مسنون ہے اور اگر میسر نہ ہوتو تین بھی کافی ہیں اور مرد کے کفن میں تین کپڑے دینا مسنون ہے اور اگر میسر نہ ہوتو دو بھی کپڑے کافی ہیں۔

عن ابن عباسؓ قال: بينما رجل واقف بعرفة إذ وقع عن راحلته، فوقصته أو قال: فأوقصته، قال النبي صلى الله عليه وسلم: إغسلوه بماء وسدر، وكفنوه في ثوبين، ولاتحنطوه، ولاتخمروا رأسه، فإنه يبعث يوم القيامة ملبياً.

(صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الكفن في ثوبين، النسخة الهندية ١/١٦٩، رقم:١٢٥١، ف:١٢٦٥، صحيح مسلم، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات، النسخة الهندية ١/٣٨٤، بيت الأفكار رقم:١٢٠٦، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/١١٧٤، رقم:١٨٩٤)

ويسن في الكفن له إزار، وقميص، ولفافة، ولها درع أي قميص، وإزار، وخمار، ولفافة، وخرقة تربط بها ثدياها، وكفاية له إزار، ولفافة، ولها ثوبان وخمار. (الدر مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، كراچي ٢/٢٠٢، ٢٠٣، زكريا ٣/٩٥ تا ٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۱۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۸ھ

کفن میں آیات یا دعا لکھ کر قبر میں دفن کرنا

سوال [۳۷۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ **سبحان من هو بالجلال موحدا، وبالتوحيد معروفا وبالمعروف موصوفا وبالصفة على لسان كل قائل ربا وبالربوبية للعالم قاهرًا وبالقهر للعالم جبارًا وبالجبروت عليما حليما وبالعلم والحلم رؤوفا رحيمًا سبحانه**

عما يقولون وسبحانه عما هم قائلون تسبيحًا، تخشع له السموات، والأرض ومن عليها، ويحمد من حول عرش اسمي الله عند غير منتهي كتابي وليا وانا اسرع الحاسبين.

وروي الترمذي عن النبي صلى الله عليه وسلم: من كتب هذا الدعاء وجعله بين صدر الميت وكفنه لم ينل عذاب القبر ولم ير منكرا ونكيرا. (ترشيح المستفيد ۱۳۸)

(۱) منسلک پرچہ پر جو حدیث شریف ہے، وہ کہاں تک صحیح ہے؟ تحریر فرمائیں۔

(۲) ایسی کوئی دعاء ماثورہ یا منقولہ یا بزرگوں سے دعاء منقول ہے، جو میت کے ساتھ لکھ کر رکھ دی جائے یا کفن میں لکھ دی جائے، تو عذاب قبر سے یا فتنۂ قبر سے محفوظ رہ سکتا ہو؟ تحریر فرمائیں۔

(۳) سلسلہ قادریہ کیا ہے اور اس کے اعمال ووظائف کیا ہیں؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ حدیث پاک اصل کتاب ترمذی شریف میں نہیں ہے؛ اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں؛ البتہ حضرات فقہاء نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ چونکہ میت کے جسم سے نجاست وغیرہ نکلتی ہے؛ اس لئے کفن وغیرہ پر کوئی دعا یا قرآن کی آیت لکھنا احتراماً ممنوع ہے، ہاں البتہ کوئی دعا انگلی کے اشارہ سے اس طرح لکھ دے کہ حروف نہ بنیں تو اس کی گنجائش ہے۔

وقد أفتى ابن الصلاح بأنه لايجوز أن يكتب على الكفن، يٰس، والكهف وغيرهما خوفًا من صديد الميت (إلى قوله) نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالأصبع المسبحة الخ. (شامي، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، قبيل باب الشهيد، كراچي ۲/ ۲٤٦، زكريا ۳/ ۱٥٧)

جاء في الجمل على شرح المنهج: لايجوز له أن يكتب عليها شيئاً من القرآن، أو الأسماء المعظمة صيانة لها من الصديد به، قال ابن الصلاح.
(الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۳/ ۲٤۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۸۹۳۷)

جنازہ کے اوپر کلمہ طیبہ لکھی چادر ڈالنا

سوال [۳۷۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کے اوپر ایک چادر ڈالنے کا رواج کچھ دنوں سے شروع ہوگیا ہے، اس چادر پر آیۃ الکرسی، کلمہ طیبہ وغیرہ لکھا ہوتا ہے، ایسی چادر ڈالنا کیسا ہے؟ امام صاحب اسی طرح نماز جنازہ پڑھا دیں یا چادر اتروائیں؟

المستفتی: حامد علی ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چادر نہ ہٹائے؛ بلکہ کبھی کسی مجمع عام میں بیان کردے کہ یہ بے ثبوت امر ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی، زکریا ۱/ ۳۵۱)

وقد أفتى ابن الصلاح، بأنه لايجوز أن يكتب على الكفن يٰس، والكهف وغيرهما خوفًا من صديد الميت، والقياس المذكور ممنوع؛ لأن القصد ثم التمييز، وهنا التبرك، فالأسماء المعظمة باقية على حالها، فلايجوز تعريضها للنجاسة، والقول بأنه يطلب فعله مردود؛ لأن مثل ذلك لا يحتج به إلا إذا صح عن النبي صلى الله عليه وسلم طلب ذلك، وليس كذلك. (شامي، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، قبيل باب

الشهيد، زكريا ٣/١٥٧، كراچي ٢/٢٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۴۶/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۲ھ

جنازہ پر قرآنی آیات لکھی ہوئی چادر ڈالنا

سوال [۳۷۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردے کو قبرستان لیجاتے وقت اس کے اوپر کالی چادر جس پر قرآن کی آیتیں لکھی ہوتی ہیں ڈال کرلے جاتے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شعیب ، مقبرہ اول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت میں اس رسم کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور قرآن کریم کی ایک آیت چھونے کے لئے وضو کرنا فرض ہے، تو کتنے آدمی بغیر وضو اس کو پکڑتے ہوں گے، اس میں قرآنی آیات کی انتہائی بے ادبی اور بے احتیاطی کا خطرہ ہے؛ اس لئے آیت لکھی ہوئی چادر استعمال کرنے سے احتراز کی ضرورت ہے۔

تكره كتابة القرآن، وأسماء الله تعالىٰ على الدراهم، والمحاريب، والجدران وما يفرش وما ذاك إلا لاحترامه وخشية وطئه ونحوه مما فيه إهانة، فالمنع هنا أولى مالم يثبت عن المجتهد، أوينقل فيه حديث ثابت. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، قبيل باب الشهيد، كراچي ٢/٢٤٦، زكريا ٣/١٥٧، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٣/٢٤٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۵۱۶/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ

آیات قرآنیہ لکھی ہوئی چادر میت پر ڈالنا

سوال [۳۷۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں جب مردہ کو قبرستان لے جاتے ہیں، تو اس کی چار پائی پر ایک چادر ڈال دیتے ہیں یہ چادر عام طور پر حج سے لاتے ہیں اور اس پر آیت قرآنیہ لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس چادر کے بارے میں ایک صاحب یوں بھی کہہ رہے تھے کہ یہودی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے؛ لہٰذا آپ بتائیں کہ مذکورہ بالا چادر ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟

نیز پاؤں کی جانب سے اونچی کردی جائے یا پاؤں کی جانب بھی لٹکی رہے؟ کیا دونوں کا ایک ہی حکم ہے یا علیحدہ؟ مدلل فرمائیں۔

المستفتی: عبدالسلام سیٹھ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آیات قرآنیہ کے احترام کے خلاف ہونے کی وجہ سے ایسی چادر میت کے اوپر ڈالنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/ ۲۵۱)

وقد أفتى ابن الصلاح، بأنه لايجوز أن يكتب على الكفن يٰس، والكهف وغيرهما خوفاً من صديد الميت، والقياس المذكور ممنوع (إلى قوله) عن الفتح أنه تكره كتابة القرآن وأسماء الله تعالىٰ على الدراهم، والمحاريب، والجدران، ومايفرش، وما ذاك إلا لاحترامه، وخشية، وطئه ونحوه مما فيه إهانته فالمنع هنا بالأولىٰ. (شامي، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، قبيل باب الشهيد، زكريا ۳/ ۱۵۷، كراچي ۲/ ۲۴۶، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۳/ ۲۴۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۸۰۶)

عورت کے کفن پر لال چادر ڈالنا

سوال [۴۷۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد کی (شوہر) موجودگی میں اگر عورت انتقال کر جائے، تو کیا میت کے اوپر لال کپڑا ڈال کر قبرستان لے جانا فقہ حنفی میں کہیں جائز لکھا ہے؟ شریعت کا ایک جز قرار دے کر جائز ہے تو واضح تحریر فرمائیں اور ایسا کرنے والا اور کروانے والا شرعی حیثیت سے کیا ہے؟

المستفتی: محمد نصیر، چھتیس گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کا جنازہ چارپائی پر رکھنے کے بعد چارپائی کے اوپر مزید پردہ کے لئے سفید چادر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن لال چادر ڈالنا غیر مسلم کے ارتھی کے مشابہ ہے؛ اس لئے لال چادر نہیں ڈالنی چاہئے، سفید ہی چادر ڈالی جائے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۲۶۰/۵)

عن ابن عمر رضي الله عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم، فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۵۵۹/۲، دارالسلام رقم: ۴۰۳۱، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۳۶۸/۷، رقم: ۲۹۶۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۱۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۸ھ

تجہیز وتکفین کے بعد میت کی پیشانی پر تسمیہ لکھنا

سوال [۴۸۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ مردے کونہلانے اور کفنانے کے بعداس کے ماتھے پربعض لوگ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھواتے ہیں، یہ صحیح ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد ابوذر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کی پیشانی پرصرف انگلی کے اشارہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا جائز ہے، کسی ایسی چیز سے نہ لکھی جائے، جس سے پیشانی پرنقش بنے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۴/۴۸، جدید زکریا ۴/۵۹، جدید زکریا مطول ۵/۳۳۷)

نعم نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي بعد الغسل قبل التكفين. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل باب الشهيد، كراچي ۲/۲٤۷، شامي، زكريا ۳/۱٥۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۵۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۳ھ

میت کی پیشانی پر بسم اللہ لکھنا

سوال [۳۸۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کوغسل دینے کے بعد کفن پہنانے سے پہلے پیشانی پر بسم اللہ لکھنے کا رواج ہے اورجنازہ لے کر جاتے ہوئے میں جنازہ کے اوپر آیۃ الکرسی والی چادر الگ سے ڈال دیتے ہیں، کیا یہ از روئے شرع جائز ہے؟ جواز اور عدم جواز مدلل لکھیں۔

المستفتی: سیرت حسین، مانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کوغسل دینے کے بعد تکفین سے قبل صرف انگلی سے جس سے کوئی نشان نہ بنے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کی اجازت ہے، لازم نہیں۔

نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي: أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالإصبع المسحبة بسم الله الرحمن الرحيم، وعلى الصدر لااله إلا الله محمد رسول الله، وذلك بعد الغسل قبل التكفين.

(شامي، باب صلاة الجنازة، مطلب فيمايكتب على كفن الميت، كراچي ۲/۲٤٦، زكريا ۳/۱۵۷)

اور جنازہ کے اوپر آیۃ الکرسی لکھی ہوئی چادر ڈالنا آیات قرآنیہ کے احترام کے خلاف ہے؛ لہٰذا درست نہیں ہے۔

وقد أفتى ابن الصلاح بأنه لايجوز أن يكتب على الكفن يٰس، والكهف وغيرهما خوفًا من صديد الميت. (شامي، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، قبيل باب الشهيد، كراچي ۲/۲٤٦، زكريا ۳/۱۵۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۳/۲٤۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۹۲)	۱۴۲۵/۳/۱۳ھ

کیا بیوی کی تجہیز و تکفین وتدفین کی ذمہ داری شوہر پر ہے؟

سوال [۳۸۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا، تو اس نے اپنی بیوی سے تعلق کی بنیاد پر اس بات کی خواہش کی کہ اس کی بیوی شوہر کے آبائی قبرستان میں دفن ہو اور اس کی نماز جنازہ بھی اور کفن کے مصارف بھی وہ خود ہی کرے؛ لیکن ایک صاحب نے جو خود تو عالم نہیں؛ البتہ علماء سے وابستہ ہیں، یہ کہا کہ انتقال کے بعد شوہر کا بیوی سے کوئی تعلق نہیں؛ جبکہ اس کے ماں، باپ اور بھائی بہن موجود ہیں، شوہر کو مذکورہ معاملات میں دخل دینے کا شرعًا کوئی جواز نہیں اور اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی، وہ جن کی بیٹی اور بہن ہے وہی اس کے ولی اور وارث ہیں بحوالہ شریعت انہوں نے روک دیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا شوہر کو اس کی بیوی کے انتقال کے بعد (جبکہ وہ نکاح میں رہتے ہوئے شوہر کے مکان پر ہی تھی) مذکورہ معاملات میں دخل دینے اور اپنی مرضی سے کفن، دفن اور نماز جنازہ پڑھانے کا حق شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟ اور کیا رسول اللہ کا اپنی کسی بیوی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ براہ کرم شرعی حکم سے آگاہی بخشیں، نیز مطلع فرمائیں کہ اگر شوہر کی خواہش پوری کردی جاتی تو گناہ تو نہیں ہوتا؟

المستفتی: محمد مشفق ولد جناب حماد خاں، معرفت مدرسہ سراج العلوم، ہلائی سرائے، سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انتقال کے بعد اگرچہ نکاح ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن پھر بھی شوہر کو مذکورہ معاملات، یعنی بیوی کی تجہیز وتکفین کے مصارف پورے کرنے اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے؛ لہٰذا شوہر کو ان کاموں سے روکنا درست نہیں۔ اور شوہر کی مذکورہ خواہش پوری کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲/۷۷، جدید ڈابھیل ۹/۶۴، امداد الفتاویٰ ۱/۵۰۸)

واختلف في الزوج، والفتوى على وجوب كفنها عليه. قال في الشامية: والأصل فيه أن من يجبر على نفقته في حياته يجبر عليها بعد موته. وقال محمدؒ: لا يجبر الزوج، والصحيح الأول، ثم اعلم أن الواجب عليه تكفينها، وتجهيزها الشرعيان من كفن السنة أو الكفاية، وحنوط وأجرة غسل، وحمل، ودفن. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في كفن الزوجة على الزوج، كراچي ۲/۲۰۶، زكريا ۳/۱۰۱)

يندب دفنه في جهة موته. وتحته في الشامية: أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في دفن الميت، كراچي ۲/۲۳۹، زكريا ۳/۱۴۶)

البتہ اگر جنازے میں بیوی کے محرم یعنی باپ، بیٹے، بھائی وغیرہ موجود ہوں، تو نماز جنازہ پڑھانے اور میت کو قبر میں اتارنے میں وہ مقدم ہوں گے۔ اور ان کی عدم موجودگی میں شوہر کو یہ حقوق حاصل ہوں گے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲/ ۳۷۷، جدید ڈابھیل ۹/ ۶۳، ۶۴)

ثم الولي بترتيب عصوبة الإ نكاح إلا الأب، فيقدم على الابن اتفاقاً، فإن لم يكن له ولي فالزوج. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب تعظيم أولى الأمر واجب، كراچي ٢/ ٢٢٠، زكريا٣/ ١٢١)

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات پر حضور ﷺ خود قبر میں اترے اور تدفین فرمائی۔

ودفنت بالحجون ونزل النبي صلى الله عليه وسلم في حفرتها، ولم تكن شرعت الصلوة على الجنائز. (الاصابة في تمييز الصحابة، بيروت ٨/ ١٠٣)

اسی طرح حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات پر تجہیز و تکفین کے سارے کام خود انجام دیئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نماز جنازہ بھی خود پڑھائی۔ (بخاری شریف ۲/ ۶۰۹، رقم: ۴۰۸۲، ف: ۴۲۴۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۵۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۱۹ھ

(۴) باب فضل صلوة الجنازة وغيرها

نماز جنازہ کی ابتداء کب ہوئی ؟

سوال[۳۸۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ کی ابتداء کب سے ہوئی اور سب سے پہلے نماز جنازہ کس نے پڑھائی اور کس کی نماز جنازہ پڑھائی گئی؟ اور اس نماز جنازہ کے پڑھانے کا حکم کس نے دیا؟

المستفتی: عبداللطیف، لکھیم پوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: سب سے پہلے نماز جنازہ ۱ھ ہجری میں مدینۃ المنورہ میں ہوئی اور سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہؓ کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور سب سے پہلے حضور ﷺ نے پڑھائی اور حضرت اسعد بن زرارہؓ کے جنازہ سے شروع فرمائی ہے۔

شرعت صلوة الجنازة بالمدينة المنورة في السنة الأولىٰ من الهجره، فمن مات بمكة المشرفة لم يصل عليه الخ . (أوجز المسالك، كتاب الجنائز، قبيل غسل الميت، قديم ۲/ ٤۲، جديد دار القلم بيروت ٤/ ۳۸۸)

أنه أول من مات من الصحابة بعد الهجرة وأنه أول ميت صلى عليه النبي صلى الله عليه وسلم (إلى قوله) أول من دفن بالبقيع أسعد بن زرارة هذا قول الأنصار، وأما المهاجرون فقالوا: أول من دفن به عثمان بن مظعون الخ (الإصابة في تمييز الصحابة، رقم الترجمة: ۱۱۱، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۰۹، قديم ۱/ ۳۳)

عن عبد الله بن أبي بكر بن عمرو بن حزمؓ، قال: أول من دفن بالبقيع

أسعد بن زرارة. (المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة، قديم ۱۸۷/۳، مكتبه نزار مصطفیٰ الباز جديد ۸۲۰/۵، رقم:۴۸۵۷، الاستيعاب في معرفة الأصحاب، كتاب الكنى، باب الألف دارالكتب العلمية بيروت ۱۶۳/۴، رقم الترجمة: ۲۸۷۹، الطبقات الكبرى لابن سعد، دار الكتب العلمية بيروت ۴۵۹/۳، رقم: الترجمة: ۳۲۹)

اور بعض روایات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے جنت البقیع میں حضرت عثمان بن مظعون مدفون ہوئے ہیں۔

عن علي بن أبي طالب قال: أول من دفن بالبقيع عثمان بن مظعون. الحديث (المصنف لابن أبي شبية، كتاب الأوائل، موسسة علوم القرآن جديد ۶۰۲/۱۹، رقم: ۳۷۱۷۶، ۱۹/ ۵۶۷، رقم: ۳۷۰۶۷، اسد الغابة في معرفة الصحابة، دارالفكر ۴۹۵/۳ رقم الترجمة ۳۵۸۸، الطبقات الكبرى لإبن سعد، دارالكتب العلمية بيروت ۳۰۴/۳، رقم الترجمة ۶۹، الاستيعاب في معرفة الأصحاب، دارالكتب العلمية بيروت ۱۷۵/۱، رقم: ۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۳۹/۳۲)	۱۴۱۶/۲/۱۸ھ

جنازۂ نبی ﷺ کی تجہیز و تکفین کی کیفیت اور آپ کی نماز جنازہ

سوال [۳۸۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اللہ کے نبی ﷺ کی نماز جنازہ ہوئی یا نہیں؟ ہوئی تھی تو کس نے پڑھائی تھی؟

(۲) آپ کو غسل کس نے دیا؟

(۳) اور روضۂ مبارک میں آپ کو کس نے اتارا تھا، ان صحابہ کے نام کیا تھے؟

المستفتی: عمران خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) آنحضرت ﷺ کی وفات ۱۲؍ربیع الاول بروز پیر

کو ہوئی اور تمام صحابہ وصحابیات، بچوں اور غلاموں نے انفرداً حجرۂ شریفہ میں نماز جنازہ ادا فرمائی، جس کی ترتیب یہ رہی کہ ایک جماعت آتی اور نماز پڑھ کر واپس آجاتی، تو دوسری جماعت جاتی، یہ سلسلہ منگل سے لے کر بدھ تک جاری رہا، اس کے بعد تدفین عمل میں آئی، نماز جنازہ میں کسی نے بھی کسی کی امامت نہیں کی؛ بلکہ تمام لوگوں نے الگ الگ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ (سیرت مصطفیٰ ۲/۱۸۷)

عن ابن عباسؓ...... فلما فرغوا من جهازه يوم الثلثاء، وضع على سريره في بيته، ثم دخل الناس على رسول الله صلى الله عليه وسلم أرسالاً يصلون عليه، حتى إذا فرغوا أدخلوا النساء، حتى إذا فرغوا أدخلوا الصبيان، ولم يؤم الناس على رسول الله صلى الله عليه وسلم أحد–إلى–ثم دفن رسول الله صلى الله عليه وسلم وسط الليل من ليلة الأربعاء. الحديث

(ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۱/۱۱۸، دارالسلام رقم:۱۶۲۸، شمائل ترمذي، باب ماجاء في وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۲۷، الروض الأنف، دفن الرسول والصلاة عليه، تحقيق عبد الرحمن الوكيل ۷/۵۵۹ تا ۵٦۰، البداية والنهاية، دارالفكر ۵/۲٦۷، تاريخ طبرى ۲/۱۱۸، اسد الغابه ۳/۲۱۳، دارالفكر ۱/۴۱)

(۲) حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور ان کے دونوں بیٹے حضرت فضلؓ اور حضرت قثمؓ اور حضرت اسامہ بن زید اور حضرت شقران (جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے) نے آپ کو غسل دیا، جس میں حضرت علیؓ غسل دے رہے تھے اور حضرت ابن عباس اور ان کے دونوں بیٹے فضل اور قثم کروٹ بدلتے تھے اور حضرت اسامہ بن زید اور حضرت شقران پانی ڈالتے تھے۔

فأسنده علي بن أبي طالبؓ إلى صدره وكان العباسؓ، والفضلؓ، والقثمؓ يقلبونه معه وكان أسامة بن زيد وشقران مولاه هما اللذان يصبان الماء عليه وعلي يغسله قد أسنده إلى صدره وعليه قميصه يدلكه به من ورائه.

(الروض الأنف، جهاز رسول الله صلى الله عليه وسلم ودفنه من تولى غسل الرسول، تحقيق عبد الرحمن الوكيل ۷/ ۵۵۷، ۵۵۸، البدايه والنهاية، صفة غسله عليه السلام، دارالفكره/ ۲٦٠، تاريخ طبرى ۲/ ۲۳۸)

(۳) جب تمام حضرات بدھ کی رات میں نماز جنازہ سے فارغ ہوگئے، تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ اوران کے دونوں بیٹے فضل اور حضرت قثم اورآپ ﷺ کے غلام شقران نے آپ ﷺ کو قبر شریف میں اتارا۔

وكان الذين نزلوا في قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم علي بن أبي طالبؓ، والفضل بن العباسؓ، وقثم بن العباسؓ، وشقران مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم. (الروض الأنف، تحقيق عبد الرحمن الول ۷/ ۵٦٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۱/ ۲۰۸، رقم:۱۱۵۱٦، ودخل في حفرته العباس، وعلي، وقثم، والفضل، وشقران۔ (البداية والنهاية، صفة دفنه عليه السلام وأين دفن ......دارالفكره/ ۲٦۹، ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۸، دارالسلام رقم: ۱٦۲۸، اسد الغابه ۱/ ٤۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۲۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۶/۲۹ھ

حضرت فاطمہؓ کو غسل کس نے دیا، نماز کس نے پڑھائی؟

سوال [۳۸۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضرت فاطمہؓ کی وفات پران کو غسل کس نے دیا اور نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟

المستفتی: محمد یعقوب، غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرت فاطمہؓ کو حضرت اسماء بنت عمیس اور حضرت ام

ایمنؓ نے غسل دیا تھا اور حضرت علیؓ نے پانی لاکر دیا تھا اور نماز جنازہ حضرت علیؓ نے پڑھائی تھی۔

عن أم جعفر زوجة محمد بن علي قالت: حدثتني أسماء بنت عميسؓ قالت: غسلت أنا وعلي فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم. (مستدرك حاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ۳/ ۱٦٤، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ٥/ ۱۷۹۰، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الجنائز، باب الرجل يغسل امرأته إذاماتت، دارالفكر ٥/ ۲٥٦، رقم: ٦۷٥۹، ٦۷٦۰، مصنف عبد الرزاق، باب المرأة تغسل الرجل، المجلس العلمي ۳/ ۲۱۰، رقم: ٦۱۲۲)

ومن طريق عمرة: صلى العباس على فاطمة، ونزل في حفرتها هو وعلي، والفضل، ومن طريق علي بن حسين: أن علياً صلى عليها. (الاصابة في تمييز الصحابة، دارالكتب العلمية بيروت ۸/ ۲٦۸، رقم الترجمة ۱۱٥۸۷، الطبقات الكبرى، دارالكتب العلمية بيروت ۸/ ۲٤، رقم الترجمة: ٤۰۹۷)

عن عائشة قالت: دفنت فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلاً دفنها علي، ولم يشعربها أبو بكر رضي الله عنه حتى دفنت و صلى عليها عليّ بن أبي طالب رضي الله عنه. (مستدرك حاكم، كتاب معرفة الصحابة، ذكروفاة فاطمة رضي الله عنها، والاختلاف في وقتها، قديم ۳/ ۱٦۲، ۱٦۳، مكتبة نزار مصطفىٰ الباز جديد ٥/ ۱۷۸۹، رقم: ٤۷٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ شعبان المعظم ۱٤۳٤ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٤۰/ ۱۱۲٤۰)

ہجرت سے قبل فوت ہونے والوں کی اور حضرت خدیجہؓ کی نماز جنازہ

سوال [۳۸۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟

المستفتی: محمد عادل، کانٹھ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت خدیجہؓ کی وفات کے وقت نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی؛ اس لئے ان کی نماز جنازہ پڑھنا ثابت نہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۱۳/۱۸۴)

قال الواقدي: لم تکن شرعت یوم موت خدیجةؓ، وموتهاؓ بعد النبوة بعشر سنین علی الأصح. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، أحکام الجنائز، فصل الصلاة علیه، المکتبة الأشرفیة دیوبند ص: ۵۸۰)

ودفنت بالحجون، ونزل النبي صلی اللّٰه علیه وسلم في حفرتها، ولم تکن شرعت الصلاة علی الجنائز. (الإصابة، بیروت ۴/۲۴۸۲، رقم:۱۱۰۸۳، دارالکتب العلمیة بیروت، کتاب النساء ۸/۱۰۳، رقم الترجمة ۱۱۰۹۲، البدایة والنهایة بیروت ۳/۱۰۲، أسد الغابة بیروت ۶/۸۵)

شرعت صلاة الجنائز بالمدینة المنورة في السنة الأولیٰ من الهجرة فمن مات بمکة المشرفة لم یصل علیه. (أوجز المسالك بیروت، کتاب الجنائز، قبیل غسل المیت جدید دمشق ۴/۳۸۸)

ومات بمکة قبل الهجرة بخمس سنین ودفنت بالحجون.

(الإکمال في أسماء الرجال علی مشکوة المصابیح، مکتبة یاسر ندیم دیوبند، تحت خدیجة ص:۵۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۱/۴۰)

نابالغ بچوں کے فوت ہوجانے پر ماں باپ کے صبر کی فضیلت

سوال [۳۸۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جونابالغ بچے فوت ہوجاتے ہیں، تو وہ بچے ماں، باپ کو جنت میں لے جانے کا سبب بنیں گے، یہ حدیث ہے یا نہیں؟

المستفتی: فضل اللہ سیتاپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث پاک میں وارد ہوا ہے، جس کے تین بالغ بچے فوت ہوگئے ہوں اوراس نے اس پر صبر کرلیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت لازم کردیتے ہیں، آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ جس کے دو بچے فوت ہوگئے ہوں اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کے لئے بھی جنت لازم ہے، پھر حضرت ام ایمنؓ نے سوال فرمایا کہ جس کا ایک بچہ فوت ہوا ہو، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا ایک بچہ فوت ہوا ہو اوراس نے اس پر صبر کیا ہو، اس کے لئے بھی جنت واجب ہوگئی ہے۔

عن جابر بن سمرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دفن ثلاثةً من الولد، فصبر عليهم واحتسبهم وجبت له الجنة، فقالت أم أيمن: أو اثنين؟ قال: من دفن اثنين فصبر عليهما وجبت له الجنة، فقالت أم أيمن: أو واحدةً؟ قال: فسكت أو أمسك، فقال: سمعت أم أيمن من دفن واحداً، فصبر واحتسب كانت له الجنة. (المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ٢/٢٤٥، رقم: ٢٠٣٠)

عن عبد الله بن مسعودؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من مات له ولد ذكر أو أُنثىٰ، سلم أو لم يسلم رضي أو لم يرضَ لم يكن له ثواب إلا الجنة. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/٨٦، رقم: ١٠٠٣٤)

وفي رواية المعجم الأوسط زيادة: صبر أو لم يصبر، بعد قوله: رضي أو لم يرض. (المعجم الأوسط، دار الفكر ٤/٢١٢، رقم:٥٧٥٣، مجمع الزوائد ٣/١٠)

عن أبي سعيد رضي الله عنه، أن النساء قلن للنبي صلى الله عليه وسلم: إجعل لنا يوماً، فوعظهن، وقال أيما امرأة مات لها ثلاثة من الولد، كانوا حجابا من النار، قالت امرأة: و اثنان؟ فقال: واثنان. (بخاري شريف، باب فضل من مات له ولد فاحتسب، وقال الله عزوجل: و بشرالصابرين، النسخة الهندية ١/١٦٧، رقم: ١٢٣٥، ف:١٢٤٩، مسند أحمد بن حنبل ٣/٣٤، رقم: ١١٣١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۰۰)

پیر کے دن مرنے کی کیا فضیلت ہے؟

سوال [۳۸۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ جمعہ کے دن یا رات میں مرنے والوں پر عذاب نہیں ہوگا؟ کس قدر فضیلت ہے، تو کیا پیر کے دن کی بھی یہی فضیلت ہے جس میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں جہاں پر پیر کے دن کی خصوصیت کا ذکر ہے، وہاں یہ بات نہیں ملتی ہے کہ اس دن مرنے والے پر عذاب نہ ہوگا، معلوم ہوا کہ یہ فضیلت صرف جمعہ کے ساتھ خاص ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ پیر کے دن کو نبی علیہ السلام کی ذات اور زندگی کے ساتھ خاص مناسبت ہے؛ کیونکہ حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کی پیدائش پیر کے دن ہوئی اور پیر ہی کے دن آپ کو نبوت ملی، ہجرت کی ابتداء پیر کے

دن ہوئی، پیر ہی کے دن آپ علیہ السلام مدینہ منورہ پہنچے، حجر اسود کو پیر کے دن رکھا گیا اور آپ علیہ السلام کی وفات بھی پیر کے دن ہوئی، پیر کا دن روزہ رکھنے کا حکم ہے، فرشتوں کے آنے جانے کا دن ہے، ان وجوہات کی بنا پر پیر کا دن ایک عظیم دن ہے، اس دن کی فضیلت دیگر ایام پر زیادہ ہے۔ (مستفاد: انوار نبوت ص:۱۰۳)

عن ابن عباس رضي الله عنه، قال: ولد النبي صلى الله عليه وسلم يوم الإثنين و اُستنبئ يوم الإثنين و توفي يوم الإثنين وخرج مهاجرا من مكة إلى المدينة يوم الإثنين، ورفع الحجر أسود يوم الإثنين. (مسند أحمد ابن حنبل ۱/۲۷۷، رقم: ۲۵۰۶، البدايه و النهاية، دار الفكر ۲/۲٦۰)

عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يصوم الإثنين والخميس. (سنن النسائي، الصيام، باب صوم النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۱/۲۵۲، دار السلام رقم: ۲۳٦٦، صحيح ابن خزيمة المكتب الإسلامي ۲/۱۰۱۵، رقم: ۲۱۱٦)

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تعرض الأعمال يوم الإثنين و الخميس، فأحب أن يعرض عملي وأنا صائم. (سنن الترمذي، الصيام، باب ماجاء في صوم يوم الإثنين والخميس، النسخة الهندية ۱/۱۵۷، دارالسلام رقم:۷٤۷)

عن عبد الله بن عمروؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مامن مسلم يموت يوم الجمعة أو ليلة الجمعة إلا وقاه الله فتنة القبر. (ترمذي شريف، كتاب الجنائز، باب ماجاء فيمن مات يوم الجمعة، النسخة الهندية ۱/۲۰۵، دارالسلام رقم:۱۰۷٤، مسند أحمد بن حنبل ۲/۱٦۹، رقم:٦۵۸۲، مكتبة البدر ديو بند) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۴۵۵)

جنازہ کو چالیس قدم تک کندھا دینے کی فضیلت

سوال[۴۸۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کو چالیس قدم تک کندھا دینا بایں طور کہ ہر دس قدم پر کندھا بدلا جائے کیا حکم رکھتا ہے اور اس کی کیا فضیلت ہے؟

المستفتی: محمد نوید، علی گڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم تک کندھا دینا اس طرح کہ ہر دس قدم پر کندھا بدلا جائے، حدیث پاک سے ثابت ہے اور اس عمل کی فضیلت بعض حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس شخص کے چالیس گناہ کبیرہ معاف کردیئے جائیں گے۔

ثم اعلم أن في حمل الجنازة شيئين، نفس السنة وكمالها، أما نفس السنة: هي أن يأخذ بقوائمها الأربع على طريق التعاقب بأن يحمل من كل جانب عشر خطوات. جاء في الحديث: من حمل جنازة أربعين خطوة كفرت له أربعون كبيرة. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، حمل الجنازة زكريا ٣/٣٤، رقم:٣٦٦٨)

سمعت أنس بن مالكؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حمل جوانب السرير الأربع كفر الله عنه أربعين كبيرةً. (المعجم الأوسط للطبراني، دارالفكر ٤/٢٥٩، ٢٦٠، رقم: ٥٩٢٠، بيروت ٦/٤٢٨، رقم:٥٩١٦، كذا في جامع الأحاديث ٧/٢٠١، رقم:٢١٨٨٤، كنز العمال بيروت ١٥/٢٥٣، رقم:٤٢٣٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۳/۴۰)

جنازہ کوکندھا دینے کی فضیلت

سوال [۳۸۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جنازہ کوکاندھا دینے کی کیا فضیلت ہے؟

المستفتی: ولی الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ کوکاندھا دینے کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے کہ جو شخص کندھا لگاکر چالیس قدم چلے گا اس کے بڑے بڑے چالیس گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

علي بن أبي سارةؓ، قال: سمعت ثابتًا البناني، قال: سمعت أنس بن مالک قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من حمل جوانب السریر الأربع کفر اللّٰہ عنه أربعین کبیرة. (المعجم الأوسط، دار الفکر ٤/٢٥٩، ٢٦٠، رقم: ٥٩٢٠) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۰۵)

نماز جنازہ میں آخری صف میں کھڑا ہونا کیوں افضل ہے؟

سوال [۳۸۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پانچوں وقت کی نماز میں اگلی صف میں کھڑا ہونا افضل ہے، کیا نماز جنازہ میں بھی یہی حکم ہے؟

المستفتی: محمد فہیم، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ میں یہ حکم نہیں؛ بلکہ اس میں آخری صف میں

کھڑا ہونا افضل اور بہتر ہے؛ اس لئے کہ اسی میں تواضع اور انکساری پائی جاتی ہے۔

أفضل صفوف الرجال فی الجنازة اٰخرها، و فی غير ها أوّلها إظهاراً للتواضع لتكون شفاعته أدعىٰ للقبول. (حلبي كبير، فصل فی الجنائز، اشرفيه ديوبند ٥٨٨، كذا في الشامي: كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ١١٢/٣، كراچي ٢١٤/٢، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع مقام الإمام والمأموم، زكريا ٢٧٥/٢، رقم: ٢٤١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۰۵/۴۰)

نماز جنازہ پڑھنے کے فضائل

سوال [۳۸۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کی نماز پڑھنے کے کیا فضائل ہیں؟

المستفتی: ولی الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ میں شرکت کرنے سے ایک قیراط کا ثواب ملتا ہے اور نماز کے ساتھ ساتھ تدفین میں بھی شرکت کی جائے تو دو قیراط کا ثواب ملتا ہے۔

عبد الرحمن الأعرجؒ، أن أباهريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من شهد الجنازة حتى يصلي عليه، فله قيراط، ومن شهد حتى يدفن كان له قيراطان، قيل: وما القيراط؟ قال: مثل الجبلين العظيمين. (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، النسخة الهندية ١٧٧/١، رقم: ١٣١٠، ف:١٣٢٥، صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب فضل الصلاة على الجنازة واتباعها، النسخة الهندية ٣٠٧/١، بيت الأفكار رقم:٩٤٥)

اور قیراط کا لفظ جب آخرت کے اجر وثواب کے لئے بولا جائے تو ایک قیراط کی مقدار احد پہاڑ کے برابر ہوتی ہے، جیسے بخاری شریف ۱/۱۷۷ میں ہے اور جب قیراط کا لفظ دنیا کی کسی چیز کے وزن کے لئے بولا جائے تو اس سے ایک درہم کا چودھواں حصہ مراد ہوتا ہے اور ایک دینار کا بیسواں حصہ مراد ہوتا ہے، جس کو نصف دانق بھی کہا جاتا ہے۔ (مستفاد: الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۸/۳۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۵۰۵)

جنازہ کے ساتھ پیدل جانے کے فضائل

سوال [۳۸۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کے ساتھ پیدل جانے کے کیا فضائل ہیں؟

المستفتی: ولی الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ کے ساتھ سواری پر جانا گناہ تو نہیں ہے؛ لیکن فضیلت اور ثواب سے محرومی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ کچھ لوگ سواری پر جا رہے تھے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ رحمت پیدل چل رہے ہیں اور تم سواری پر چلتے ہو؟

أما الركوب خلفها فلا بأس به، والمشي أفضل. (كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ٣/١٣٧، كراچي ٢/٢٣٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٦/١٣)

عن ثوبانؓ، قال: خرجنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في جنازة فرأى ناساً راكباناً، فقال: ألا تستحيون؟ إن ملائكة الله على أقدامهم

وأنتم علی ظهور الدواب. (سنن الترمذي، کتاب الجنائز، باب ماجاء في کراهة الرکوب خلف الجنازة، النسخة الهندیة ۱/۱۹۶، دار السلام رقم: ۱۰۱۲، سنن ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء في شهود الجنائز، السنخة الهندیة ص: ۱۰۶، دارالسلام رقم: ۱۴۸۰، المستدرك للحاکم، کتاب الجنائز قدیم ۱/۳۵۶، مکتبه نزار مصطفیٰ الباز جدید ۲/۵۰۹، رقم: ۱۳۱۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۵۰۵/۳۶)

زندگی میں کفن دفن کا انتظام کرنا

سوال [۳۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں ہی کفن دفن کا مکمل انتظام کر کے جائے، جیسے قبر کے تختے وغیرہ، تو شریعت میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالملک فاروقی، بدایوں (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کفن دفن کا انتظام آدمی پہلے سے کر لے تو اس کی گنجائش ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حدیث شریف آتا ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ نے اپنے کفن کا کپڑا سالہا سال تک اپنے ساتھ محفوظ رکھا ہے، جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی عطا کردہ چادر کو اپنے کفن میں دینے کے لئے ہمیشہ ساتھ رکھا ہے۔ نیز میت کے ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کا خرچہ سب سے پہلے نکالا جاتا ہے، جو میت اپنی زندگی میں تجہیز وتکفین کی اشیاء وخرچے کو مہیا کر کے اور متعلقین کو اس کے بارے میں وصیت کر دے تو اس کی گنجائش ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عن سهل رضي الله عنه، أن امرأة جاء ت النبي صلى الله عليه وسلم ببردة منسوجة فيها حاشيتها، أتدرون ما البردة؟ قالوا: الشملة، قال: نعم! قالت: نسجتها بيدي فجئت لأكسوكها، فأخذها النبي صلى الله عليه وسلم محتاجًا إليها، فخرج إلينا وإنها إزاره، فحسنها فلان فقال: أكسنيها ما أحسنها، قال القوم: ما أحسنت لبسها النبي صلى الله عليه وسلم محتاجًا إليها، ثم سألته وعلمت أنه لايرد، قال: إني والله ماسألته لألبسه، إنها سألته؛ لتكون كفني، قال سهل: فكانت كفنه. (بخاري شريف، كتاب الجنائز، باب من استعد الكفن في زمن النبي صلى الله عليه وسلم فلم ينكر عليه، النسخة الهندية ١/ ١٧٠، رقم: ١٢٦٣، ف: ١٢٧٧)

والتركة تتعلق بها حقوق أربعة جهاز الميت و دفنه والدين، والوصية، فيبدأ أولا بجهازه وكفنه ومايحتاج إليه في دفنه بالمعروف.

(هندية، كتاب الفرائض، زكريا قديم ٦/ ٤٤٧، جديد ٦/ ٤٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۸۱۴)	۱۴۳۶/۱/۷ھ

مشترک جنازوں کا الگ الگ ثواب

سوال [۳۸۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک میت کے جنازہ پڑھنے کا ثواب احد پہاڑ کے برابر ملتا ہے، حرمین شریفین میں ہر نماز کے بعد کئی کئی جنازے ہوتے ہیں اور سب کی ایک ہی نماز ہوتی ہے، تو کیا جتنے جنازے ہوں گے اتنا ہی ثواب ہوگا، یا صرف ایک ہی جنازہ پڑھنے کا ثواب ملے گا؟ ازروئے شرع کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث پاک میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ ایک میت کے جنازہ میں شریک ہونے سے ایک قیراط یعنی احد پہاڑ کے برابر ثواب ملتا ہے اور متعدد میت کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھنا حدیث سے ثابت اور مشروع ہے۔

نیز بعض روایت میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ شہداء احد کی نماز جنازہ کے موقع پر حضرت حمزہؓ کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور دس دس جنازے ایک ساتھ حضرت حمزہؓ کے جنازے کے پاس رکھ کر نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی اور بعض روایت میں ایک ایک جنازہ لا کر اس پر نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی، تو ہر ایک کے لئے ایک ایک اور حضرت حمزہؓ کے لئے ستر ہوئی۔ جب دوسرے کے ساتھ حضرت حمزہ کی نماز کا اعتبار کیا گیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک ساتھ جتنے بھی جنازے ہوں گے اتنی مرتبہ ہر ایک کی جانب سے ایک ایک قیراط اور پہاڑ کے برابر ثواب نماز پڑھنے والوں کو ملے گا۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

أن أبا هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من شهد الجنازة حتى يصلي عليه فله قيراط، ومن شهد حتى يدفن كان له قيراطان قيل: و ما القيراطان؟ قال: مثل الجبلين العظيمين. (بخاري شريف، كتاب الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، النسخة الهندية ١/١٧٧، رقم: ١٣١٠، ف: ١٣٢٥)

عن أبي مالكؓ، قال: أتي رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم أحد بحمزة بن عبد المطلب، فوضع، وجيئ بتسعة، فصلى عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، فرفعوا وترک حمزة، ثم جيئ بتسعة، فوضعوا، فصلى عليهم سبع صلوات حتى صلى على سبعين رجلاً.

(مراسيل ابو داؤد ص: ١٨، رقم: ٤٢٧)

عن الشعبيؓ قال: صلى النبي صلى الله عليه وسلم علىٰ حمزةؓ يوم أحد سبعين صلاة، بدأ بحمزة، فصلى عليه، ثم جعل يدعو بالشهداء فيصلي

عليهم، وحمزة مكانه. (مراسيل ابوداؤد ص:۱۸، رقم:۴۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۶۲/۳۷)

نماز جنازہ کی صفوف میں طاق عدد کا حکم

سوال [۳۸۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ کی صفوں میں طاق عدد کا اس درجہ اہتمام کرنا کہ صفیں مکمل ہونے کے بعد، نماز شروع کرنے سے قبل یہ معلوم ہونے پر کہ صفوں کی تعداد طاق نہیں، ہر صف سے کچھ آدمیوں کو لے کر ایک صف اور بنائی جائے تاکہ صفوں کی تعداد طاق ہی رہے، کیا نماز جنازہ میں صفوں کی تعداد میں عدد طاق کا لحاظ رکھنا مستحب سنت یا اولویت کا درجہ رکھتا ہے اور پھر اتنا لحاظ کیوں؟

المستفتی: مفتی شباہت علی، سہس پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز جنازہ میں صفوں کی تعداد تین سے کم نہ ہونی چاہئے؛ لہٰذا مقتدی اگر صرف پانچ ہیں، تو پہلی صف میں دو اور دوسری صف میں دو اور تیسری صف میں ایک کر دیا جائے تاکہ تین صفوں کی فضیلت حاصل ہوجائے، باقی تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کی صراحت نہیں ملی؛ لہٰذا اگر مقتدیوں کی تعداد کم ہو تو تین صفوں کا اہتمام کر لینا چاہئے اور اگر مقتدی زیادہ ہیں تو تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کا لحاظ ضروری نہیں ہے، کبھی لحاظ کر لیا جائے تو اس پر نکیر کی بھی ضرورت نہیں۔

كان مالك بن هبيره إذا صلى على جنازة فتقال الناس عليها جزأهم ثلاثة أجزاء، ثم قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى عليه ثلاثة صفوف، فقد أوجب. (ترمذي، كتاب الجنائز، باب ماجاء في الصلاة على

الجنازة والشفاعة للميت، النسخة الهندية ١/ ٢٠٠، دارالسلام رقم: ١٠٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۶۸/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۲/۲۴ھ

میت کے استعمالی کپڑے غیر مسلم کو خیرات میں دینا

سوال [۳۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردہ کے استعمالی کپڑے یا نئے کپڑے یا کسی قسم کی خیرات غیر مسلم کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: امام مسجد بش پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: غیر مسلم کو نئے پرانے کپڑے دینا جائز ہے۔

عن سعيد بن جبيرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتصدقوا إلا على أهل دينكم، فأنزل الله تعالىٰ: ليس عليك هداهم -إلى- وماتنفقوا من خير يوف إليكم. (البقرة: ٢٧٢)

قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تصدقوا على أهل الأديان.

(المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الزكوة، ماقالوا في الصدقة في غير الإسلام، مؤسسة علوم القرآن ٦/ ٥١٣، رقم: ١٠٤٩٩)

ويجوز صرف صدقة التطوع إليهم بالاتفاق الخ. (هندية، كتاب الزكوة، الباب السابع في المصارف، زكريا قديم ١/ ١٨٨، زكريا جديد ١/ ٢٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۴۲۶/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۴/۲۲ھ

(۵) باب تعجيل صلاة الجنازة وتأخيرها ونقلها

نمازعید کے وقت جنازہ آجائے تو کیا کریں؟

سوال [۳۸۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کی نماز میں جنازہ آجائے تو نماز جنازہ خطبہ سے پہلے پڑھیں یا بعد میں؟

المستفتی: جلیس احمد، ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عید کی نماز وخطبہ دونوں سے فراغت کے بعد نماز جنازہ پڑھنا افضل واولیٰ ہے، جیسا کہ فرض نماز اور سنت مؤکدہ سے فراغت کے بعد نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۷۴۳)

عن قتادةؓ، قال: إذا حضرت صلوة مكتوبة وجنازة بدئ بالمكتوبة. (مصنف عبد الرزاق، باب إذا حضرت المكتوبة، والجنازة، المجلس العلمي ۳/ ۵۲۵، رقم: ۶۵۷۱)

عن معمرؓ قال: بلغني أن عليا قال: إذا حضرت الجنازة و صلوة المكتوبة أبدأ بالمكتوبة. (مصنف عبد الرزاق، باب إذا حضرت المكتوبة والجنازة، المجلس العلمي ۳/ ۵۲۵، رقم:۶۵۷۳)

وتقدم صلوتها أي صلوة العيد على صلوة الجنازة إذا اجتمعا؛ لإنه واجب عينًا والجنازة كفاية. (در مختار، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب فيما يترجح تقديمه من صلاة عيد وجنازة، كراچي ۲/ ۱۶۷، زکریا۳/ ۴۶)

ولو حضرت وقت العيد قدمت العيد عليها. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في صلوة الجنائز اشرفيه ديو بند۶۰۷)

وتقدم صلوة العيد على صلاة الجنازة إذا اجتمعا. (هندية، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلوة العيدين، زكريا قديم ۱/ ۱۵۲، جديد ۱/ ۲۱۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۹۰/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۱۹ھ

فرض نمازوں کے بعد سنن پڑھنا افضل ہے یا نماز جنازہ؟

سوال [۳۸۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فرض ادا کرنے کے بعد پہلے صلوۃ جنازہ پڑھی جائے یا سنت مؤکدہ پہلے پڑھی جائے، ان دونوں میں افضل کون سی ہے؟

المستفتی: محمد سلیمان، غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں جائز ہیں؛ لیکن سنت مؤکدہ کو مقدم کرنا افضل اور اولیٰ ہے، یہی فقہاء محققین کا مفتی بہ قول ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رشیدیہ قدیم، ص: ۴۳۳، جدید زکریا ص: ۴۰۸، احسن الفتاویٰ ۴/ ۲۱۸، فتاوی دار العلوم ۵/ ۲۵۸)

الفتوىٰ على تأخير الجنازة عن السنة الخ. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلوٰة، باب العيدين زكريا ۳/ ۴۷، كراچي ۲/ ۱۶۷، شامي، باب صلوٰة الجنازة، مطلب في حمل الميت زكريا ۳/ ۱۳۶، كراچي ۲/ ۲۳۲)

إن الفتوىٰ على تأخير صلاة الجنازة عن سنة الجمعة وهي سنة،

فعلى هذا تؤخر عن سنة المغرب؛ لأنها آكد. (البحر الرائق، كتاب الصلوٰة، قبيل باب الأذان زكريا ١/ ٤٤٠، كوئٹه ١/ ٢٥٣)

ولو حضرت الجنازة في وقت المغرب تقدم صلوٰة المغرب، ثم تصلي الجنازة، ثم سنة المغرب، وقيل: تقدم السنة أيضا على الجنازة.

(حلبي كبير، كتاب الصلوٰة، فصل في صلوٰة الجنائز، الثامن في المتفرقات، اشرفيه ديوبند ٦٠٧)

وقال القاضي شمس الأئمة الأوزجندى: يبدأ بالسنة كيلا ينقطع الفور.

(الفتاوى التاتارخانيه الصلاة، الفصل الثانى والثلاثون في الجنائز، المتفرقات ٣/ ٨٦، رقم: ٣٧٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۸۰۳)

نماز جنازہ سنن ونوافل سے قبل پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال [۳۸۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کا منہ بعد نماز جنازہ دیکھنا درست ہے یا نہیں اور یہ کہ میت کی نماز فرض نماز کے بعد فوراً پڑھی جائے یا سنن ونوافل پڑھ لینے کے بعد؟۔

المستفتی: محمد یامین، بیگوسرائے بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز جنازہ کے بعد میت کا چہرہ دیکھنا ممنوع ہے اور اس کئی وجہ ہیں:

(۱) منھ دکھائی کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے۔

(۲) اگر کوئی عیب ظاہر ہو جاوے تو اس کے افشاء ہو جانے کا خطرہ ہے وغیرہ؛ البتہ اگر کوئی

بہت قریبی عزیز جو بوقت وفات حاضر نہ رہا ہو اور نماز جنازہ کے بعد آوے تو اس کے لئے گنجائش ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۴/۲۱۶)

عن أبي هريرةؓ يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة. الحديث. (سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، النسخة الهندية ۴۵۳/۲، رقم: ۳۱۸۱)

عن الحصين بن وحوحؓ، أن طلحة بن البراءؓ مرض، فأتاه النبي صلى الله عليه وسلم يعوده فقال: إني لأرىٰ طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فأذنوني به وعجلوا، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهر اني أهله. (سنن أبی داؤد، كتاب الجنائز، باب تعجيل الجنازة، النسخة الهندية ۴۵۰/۲، دار السلام رقم: ۳۱۵۹)

ويسرع في جهازه لما رواه أبو داؤد عنه: لما عاد طلحة بن البراء وانصرف قال: ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فاٰذنونی حتی أصلي عليه وعجلوا به، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهرانی أهله. (شامي، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، قبيل مطلب في القرأة عند الميت، زكريا ۸۳/۳، كراچي ۱۹۳/۲)

وينبغي للغاسل ولمن حضر إذا رأى ما يحب الميت ستره أن يستره ولا يحدث به؛ لأنه غيبة، وكذا إذا كان عيبا حادثاً بالموت كسواد وجه ونحوه.

(شامي، باب صلوٰة الجنازة، قبيل مطلب في الكفن، زكريا ۹۵/۳، كراچي ۲۰۲/۲)

نیز مفتی بہ قول یہی ہے کہ فرض وسنت کے بعد نماز جنازہ ادا کی جائے اور نوافل کو مؤخر کر دیں۔

الفتوى تأخير الجنازة عن السنة، وأقره المصنف كأنه إلحاق لها بالصلاة. (الدر المختار، كتاب الصلوٰة، باب العيدين، كراچي ۱۶۷/۲،

زکریا ۴۷/۳، شامي، کتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، مطلب في حمل المیت، زکریا۱۳۶/۳، کراچي ۲۳۲/۲)

إن الفتوی علیٰ تأخیر صلاۃ الجنازة عن سنة الجمعة، وهي سنة، فعلی هذا تؤخر عن سنة المغرب، لأنها آکد. (البحر الرائق، کتاب الصلوٰة، قبیل باب الأذان زکریا ۴۴۰/۱، کوئٹه ۲۵۳/۱)

ولو حضرت الجنازة في وقت المغرب تقدم صلوٰة المغرب، ثم تصلی الجنازة، ثم سنة المغرب، وقیل تقدم السنة أیضا علی الجنازة.

(حلبي کبیر، کتاب الصلوٰة، فصل في صلوٰة الجنائز، اشرفیه دیو بند ۶۰۷)

وقال القاضي شمس الأئمة الأوزجندي: یبدأ بالسنة کیلا ینقطع الفور.

(الفتاوی التاتارخانیة، الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، المتفرقات ۸۶/۳، رقم: ۳۷۸۳، امداد الفتاویٰ ۲۳۷/۱، فتاویٰ رشیدیه، قدیم ص: ۴۳۳، جدید زکریا ص: ۴۰۸، أحسن الفتاویٰ ۲۱۸/۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۴۸۱)

پہلے نماز جنازہ ادا کی جائے یا نماز تراویح؟

سوال [۳۸۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر رمضان میں تراویح شروع ہونے سے پہلے جنازہ آجائے تو پہلے نماز جنازہ ادا کی جائے یا نماز تراویح اور تدفین تراویح سے پہلے ہو یا بعد میں؟

المستفتی: ابرار حسین ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں میں اختیار ہے، جس کو چاہے پہلے پڑھے؛ البتہ

تدفین بعد میں ہونا بہتر ہے؛ تاکہ نماز تراویح میں خلل واقع نہ ہو۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ، زکریا ۱/۳۶۷)

روى الحسن أنه يخير الخ. (شامي، كتاب الصلوٰة، باب العيدين، قبيل مطلب يطلق المستحب على السنة وبالعكس، زكريا ۴۷/۳، كراچي ۱۶۸/۲)

وروى الحسن ابن زياد في صلاته المجرد أنه يبدأ بأيهما شاء.

(الفتاویٰ التاتارخانیه، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، المتفرقات زكريا ۸۶/۳، رقم: ۳۷۸۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/شعبان ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۶۸/۲۵)

بوقت زوال آفتاب نماز جنازہ

سوال [۳۸۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ میت نابالغ ہو یا بالغ ہو، کیا بوقت زوال نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

(۲) میت کی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً ہی زوال کا وقت شروع ہوگیا، کیا زوال کے وقت میت کو دفن کیا جاسکتا ہے؟ بحوالہ احادیث مدلل جواب سے مستفید فرمائیں۔

المستفتی: عزیز الرحمٰن خاں، محلّہ قانون گویاں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بوقت زوال اور نصف النہار نماز جنازہ جائز نہیں ہے۔

(۲) بوقت زوال نماز جنازہ ممنوع ہے اور دفن کرنا ممنوع نہیں ہے، دفن کرنا جائز ہے۔

عن عقبة عامر بن الجهنيؓ: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله

عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن وأن نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تضيف للغروب حتى تغرب. (سنن الترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء في كراهية الصلوٰة على الجنازة، النسخة الهندية ۱/ ۲۰۰، دار السلام، رقم: ۱۰۳۰)

تكره الصلاة على الجنازة عند طلوع الشمس وغروبها و نصف النهار، لما روينا من حديث عقبة بن عامر أنه قال: ثلاث ساعات نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نصلي فيها وأن نقبر فيها موتانا،والمراد من قوله: أن نقبر فيها موتانا الصلاة على الجنازة دون الدفن، إذ لا بأس بالدفن في هذه الأوقات. (بدائع الصنائع، باب الجنائز، فصل وأما بيان ما يكره فيها، زكريا ۱/۵۷)

لا تجوز الصلوٰة عند طلوع الشمس ولا عند قيامها في الظهيرة: ولاعند غروبها لحديث عقبة بن عامرؓ قال: ثلثة أوقات نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نصلى وأن نقبر فيها موتانا عند طلوع الشمس حتى ترتفع وعند زوالها حتى تزول وحين تضيف للغروب حتى تغرب، والمراد بقوله وأن نقبر: صلوٰة الجنازة لأن الدفن غير مكروه. (هدايه، كتاب الصلوٰة، باب المواقيت، فصل في الأوقات التى تكره فيها الصلوٰة، اشرفي ديو بند ۱/ ۸٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۴۹۵)

اوقات مکروہہ میں نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ زید کہتا ہے کہ بحوالۂ کتاب نظام شریعت جنازہ اگر اوقات ممنوعہ ومکروہہ میں لایا گیا تو اسی وقت نماز بلا کراہت پڑھنی جائز ہے، عمر کہتا ہے بحوالہ کتاب ہدایہ ۱/۶۸، **لاتجوز الصلوۃ عند طلوع الشمس** وغیرہ سے پتہ چلتا ہے ضحوۂ کبری ونصف النہار وغیرہ وقتوں میں نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے، ہدایہ کی اس عبارت کا صحیح ترجمہ ومکروہ وقت میں نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ وضاحت فرما کر جواب سے مستفیض فرمائیں۔

المستفتی: سلامت احمد، محمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جنازہ پہلے سے تیار تھا تو طلوع آفتاب وغروب اور نصف النہار کے وقت اس پر نماز مکروہ تحریمی ہے، یہی ہدایہ کی عبارت کا مطلب ہے، اگر وقت مکروہ میں ہی تیار ہوا ہے تو کوئی کراہت نہیں ہے، اسی وقت نماز پڑھ لی جائے، یہی کتاب نظام شریعت وغیرہ کا مطلب ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ص:۱۳۶)

عن عقبة بن عامر الجهني رضي الله عنه: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن وأن نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تضيف للغروب حتى تغرب. (سنن الترمذي، أبواب الجنائز، باب ما جاء في كراهية الصلوٰة على الجنازة، النسخة الهندية ۱/ ۲۰۰، دار السلام، رقم: ۱۰۳۰، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الأوقات التي نهى عن الصلوٰة فيها، النسخة الهندية ۱/ ۲۷٦، بيت الأفكار، رقم: ۸۳۱)

والمراد بقوله وأن نقبر: صلوٰة الجنازة؛ لأن الدفن غير مكروه. (هدايه، كتاب الصلوٰة، باب المواقيت، فصل في الأوقات التى تكره فيها الصلوٰة، اشرفي ديوبند ۱/ ۸٤)

ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة ولا صلوٰة جنازة ولا سجدة تلاوة، هٰذا إذا وجبت صلاة الجنازة وسجدة التلاوة في وقت مباح وأخرتا

إلي هـذا الوقت، فأنه لايجوز قطعًا، أما لو وجبا في هذا الوقت وأديتا فيه جاز، لأنه أديت ناقصة كما وجبت. (هـنـديه الصلاة، الفصل الثالث في بيان الاوقات التى لاتجوز فيها الصلوٰة وتكره فيها، زكريا ١/٥٢، جديد ١/١٠٨، مجمع الانهر، كتاب الصلوٰة، دار الكتاب العلميه بيروت ١/١١٠)

وحضرت الجنازة قبل لوجوبه كاملا فلا يتأدى ناقصًا، فلو وجبتا فيها لـم يكره فعلهما أي تحريما وفي التحفة الأفضل أن لا تؤخر الجنازة. و في الشـامي: إذا كـان الأفـضـل عدم التأخير في الجنازة فلا كراهة أصلاً الخ.

(الـدرر الـمـختـار، كتـاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، كراچي ١/٣٧٤، زكريا ٢/٣٤، كوئٹه ١/٢٧٥، مصرى ١/٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١/ شعبان ١۴٠٨ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٢۴/ ٨۵۴)

عین زوال اور قبر پر نماز جنازہ کا حکم

سوال [٣٨٢۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا انتقال ہوا بعد المغرب اعزہ کو خبر دینا رسم بن گیا ہے، بنابریں جنازہ میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ زوال سے قبل جنازہ تیار ہوگیا؛ لیکن امام صاحب کے انتظار میں زوال کا وقت شروع ہوگیا، لوگوں نے کہا زوال کا وقت شروع ہوگیا ہے تو امام نے کہا اوقات ممنوعہ میں سجدہ والی نماز پڑھنا جائز نہیں، نماز جنازہ ہر وقت میں پڑھنا جائز ہے؛ کیونکہ اس میں سجدہ نہیں ہوتا، تو کیا زوال کے وقت میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ تقریباً ٢٠ / منٹ قبل جنازہ تیار تھا۔

(٢) اگر نماز نہ ہو تو دوبارہ قبر پر نماز کب تک پڑھ سکتے ہیں؟ اس کا جواب مدلل دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

المستفتی: عبدالرحیم، معصوم پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) عین طلوع شمس کے وقت اور عین زوال کے وقت نماز جنازہ بھی جائز نہیں ہے؛ ہاں البتہ اوقات ممنوعہ میں سے صبح صادق سے طلوع شمس تک کے درمیان اور نماز عصر سے غروب شمس کے درمیان نفلیں پڑھنا جائز نہیں، مگر نماز جنازہ جائز ہے، امام صاحب کو فرق سمجھنے میں دھوکہ ہوا ہے، انہوں نے صبح صادق سے طلوع شمس تک کے درمیان اور عصر سے غروب تک کے درمیان وقت کی طرح عین طلوع اور عین زوال کے وقت کو بھی برابر سمجھا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

عن عقبة بن عامر الجهني رضي الله عنه: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن وأن نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب. (صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الأوقات التي نهى عن الصلوٰة فيها، النسخة الهندية ۱/۲۷۶، بيت الأفكار، رقم: ۸۳۱)

والمراد بقوله "وأن نقبر" صلوٰة الجنازة؛ لأن الدفن غير مكروه. (هدايه، كتاب الصلوٰة، باب المواقيت، فصل في الأوقات التى تكره فيها الصلوٰة، اشرفي ديوبند ۱/۸۴)

لا تجوز الصلوٰة عند طلوع الشمس ولا عند قيامها في الظهيرة ولا عند غروبها، قال: ولا صلوٰة جنازة. (هدايه، كتاب الصلوٰة، باب المواقيت، فصل في الأوقات التى تكره فيها الصلوٰة، اشرفي ديو بند ۱/۸۴)، هنديه الصلاة، باب المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات التى لا تجوز فيها الصلوٰة، زكريا ۱/۵۳)

(۲) جنازہ کو بغیر نماز پڑھے ہی دفن کر دیا جائے تو اگر جنازہ کے پھولنے اور پھٹنے کا غالب گمان نہ ہو تو پھولنے اور پھٹنے سے پہلے اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز اور درست ہے اور اس کا وقت فقہاء نے تین دن مقرر کیا ہے کہ تین دن سے پہلے پہلے جائز ہے۔

عن أبی هریرةؓ، أن امرأة سوداء أو رجلا کان یقم المسجد، ففقده النبي صلی الله علیه وسلم فسأل عنه، فقیل: مات، فقال ألا آذنتمونی به، قال: دلوني علی قبره، فدلوه فصلی علیه. (سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب الصلوٰة علی القبر، النسخة الهندیة ۲/۴۵۷، دارالسلام، رقم: ۳۲۰۳)

فإن دفن بلا صلاة صلی علی قبره ما لم یتفسخ؛ لأن النبی صلی الله علیه وسلم صلی علی قبر المرأة من الأنصار. (البحر الرائق، کتاب الصلوٰة، باب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زکریا ۲/۳۱۹، کوئٹه ۲/۱۸۲، هندیه، الصلاة، الباب الحادی و العشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوٰة علی المیت، زکریا قدیم ۱/۱۶۵، جدید ۱/۲۲۶)

وإن دفن وأهیل علیه التراب بغیر صلوٰة صلي علی قبره استحساناً مالم یغلب علی الظن تفسخه. (شامي، لصلوة، باب الجنائز، کراچي ۲/۲۲٤، زکریا ۳/۱۲۵)

وفي الأمالي عن أبي یوسفؒ أنه قال: یصلی علیه إلی ثلاثة أیام. (بدائع الصنائع، صلاة الجنازة، وأما بیان ماتصح به وما تفسد، زکریا ۲/۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍رجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍۸۵۰۰)

رشتہ داروں کے انتظار میں تجہیز وتکفین میں تاخیر کرنا

سوال [۳۸۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کا انتقال ہوگیا اور متعلقین رشتہ دار دوسرے شہر میں رہتے ہیں، ان کو بلایا جاتا ہے اور ان کے آنے میں چار پانچ گھنٹے تک لگ جاتے ہیں، ان کے انتظار میں تجہیز وتکفین میں دیر کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عقیل ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کی تجہیز وتکفین میں عجلت کا حکم ہے تاخیر ممنوع ہے؛ البتہ معمولی تاخیر مثلاً ایک آدھا گھنٹہ کی تاخیر جس سے رشتہ دار لوگ جنازہ میں شرکت کرسکیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ لیکن تیاری اوقات کے علاوہ چار چار پانچ پانچ گھنٹہ یا آدھا دن یا پورا دن صرف کسی کے آنے کی وجہ سے تاخیر کی جائے تو اس کی اجازت نہیں؛ نیز فقہاء نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ مثلاً جمعہ کی نماز کا انتظار کیا جائے؛ تاکہ مجمع کثیر نماز میں شرکت کرے؛ لہٰذا رشتہ داروں کے آنے کے لئے بھی زیادہ تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي هريرةؓ عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تک صالحة فخير تقدمونها، وإن تک سوی ذٰلک فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ۱/۱۷٦، رقم: ۱۳۰۱، ف: ۱۳۱۵)

وكره تأخير صلوٰته ودفنه ليصلي عليه جمع عظيم بعد صلوة الجمعة. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنائز، مطلب في حمل الميت، زكريا ۳/۱۳٦، كراچي ۲/۲۳۲)

وفي صلوٰة الجنازة التأخير مكروه. (هنديه، كتاب الصلوٰة، الباب الأول في المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات التی لا تجوز فيها الصلوٰة، زكريا قديم ۱/۵۲، جديد ۱/۱۰۸)

فلو جهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تأخير الصلاة عليه ليصلي عليه الجمع العظيم بعد صلاة الجمعة. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، دار الكتاب ديوبند ٦۰٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۱؍ رجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۵۶/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۷/۱۴۱۷ھ

رشتہ دار کے لئے میت کی تجہیز وتکفین میں تاخیر

سوال [۳۸۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی گھر والی کا انتقال ہوا، بعد انتقال زید اور زید کے رشتہ دار زید کے ساس سسر، چچا، تایا کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اوران کے آنے کے انتظار میں اس کی تجہیز وتکفین میں تاخیر سے کام لے سکتے ہیں؟ کیا جب تک میت گھر میں رہے گی اس وقت تک اس کے حساب وکتاب میں بھی تاخیر ہوگی؟

المستفتی: محمد فاروق جھنجھنوی (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کی تجہیز وتکفین میں عجلت کا حکم ہے تاخیر ممنوع ہے؛ البتہ معمولی تاخیر مثلاً ایک آدھا گھنٹہ کی تاخیر جس سے رشتہ دار لوگ جنازہ میں شرکت کرسکیں، تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ لیکن تیاری کے اوقات کے علاوہ چار چار پانچ پانچ گھنٹہ یا آدھا دن یا پورا دن صرف کسی کے آنے کی وجہ سے تاخیر کی جائے تو اس کی اجازت نہیں۔ نیز فقہاء نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ مثلاً جمعہ کی نماز کا انتظار کیا جائے؛ تاکہ مجمع کثیر نماز میں شرکت کرے؛ لہٰذا رشتہ داروں کے آنے کے لئے بھی زیادہ تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبی هريرة عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تک صالحة فخير تقدمونها، وإن تک سوی ذٰلک فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ۱/۱۷۶، رقم: ۱۳۰۱، ف: ۱۳۱۵)

ولذا كره تأخير صلوٰته ودفنه ليصلی عليه جمع عظيم بعد صلوة الجمعة الخ. (شامي، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنائز، مطلب في دفن الميت،

زکریا۳/۱۴۶، کراچي ۲/۲۳۹، هندیه، کتاب الصلوٰة، الباب الأول في المواقیت، الفصل الثالث في بیان الأوقات التی لا تجوز فیها الصلوٰة، زکریا قدیم۱/۵۲، جدید ۱/۱۰۸، حاشیة الطحطاوی علی المراقی، أحکام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، دار الکتاب دیوبند ص:۶۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف۳۲/۴۷۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۳/۱۱ھ

لاش کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال [۳۸۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی دہلی میں مرگیا، اور یہاں سے دہلی دو دن کا راستہ ہے؛ اس لئے مردہ کے خراب یا سڑ جانے کے خوف سے اگر برف لگا کر رکھیں تو برف رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں اصل حکم یہ ہے کہ انسان کا جہاں انتقال ہوا ہو وہیں اس کو دفن کیا جائے۔

إن النقل من بلد إلی بلد مکروه. (مراقی الفلاح مع حاشیة الطحطاوی، أحکام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، دار الکتاب دیوبند ۶۱۳، قدیم ص:۳۳۷، خانیة علی هامش الهندیه، باب في غسل المیت وما یتعلق به زکریا قدیم ۱/۱۹۵، جدید۱/۱۲۱)

لیکن اگر منتقل ہی کیا جا رہا ہے تو لاش کی حفاظت کے لئے برف لگانے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ میت کی لاش کے ساتھ ہر وہ کام کرنا مشروع ہے جس سے اہانت نہ ہو اور یہاں بھی سڑنے گلنے سے حفاظت کے لئے برف لگایا جاتا ہے۔

قال ابن حجر: ومن لوازمه أن یستلذ بما یستلذ به الحي.

(مرقاة، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، قبيل الفصل الثالث: الميت يتألم و يستلذ كالحي، امداديه ملتان ٧٩/٤، مطبع بمبئى ٣٨٠/٢، حاشية أبو داؤد، كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذٰلك المكان ٤٥٨/٢)

قال الطيبي: إنه لا يهان الميت كما لا يهان الحي. (مرقاة، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، قبيل الفصل الثالث، الميت يتألم و يستلذ كالحي، امداديه ملتان ٧٩/٤، مطبع بمبئى ٣٨٠/٢)

إكرام الميت مندوب إليه في جميع ما يجب كإكرامه حيًا وإهانته منهي عنها كما في الحيوٰة. (شرح الطيبى، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، كراچي ٣٨٧/٣، رقم:١٧١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۷۵۲/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۶ھ

میت کی منتقلی سے متعلق ایک تحقیقی فتویٰ

مکرمی جناب مفتی شبیر صاحب زیدلطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال [۳۸۲۸]: ایک سوال میرے نام آیا ہے اس کی فوٹو کاپی مرسل ہے، یہاں کے مفتی صاحب رخصت پر ہیں، خیال تھا کہ ان سے جواب لکھا کر آپ جیسے حضرات کے پاس بھی ارسال کروں گا؛ لیکن ایک صاحب مرادآباد جانے والے مل گئے؛ اس لئے آپ کے پاس بغرض جواب مرسل ہے، جواب لکھ کر میرے پاس ارسال کریں۔ **جزاک اللہ خیرا.**

والسلام
(جناب) ابرارالحق
۳/ جمادی الثانیہ/ ۱۴۱۸ھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

بقية السلف عارف بالله محي السنة بركة العصر

حضرت والا ہردوئی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ معروض خدمت اقدس میں نہایت عاجزانہ وپرخلوص گزارش یہ ہے کہ حضرت ہر انسان کا مقدر دنیا میں آنے سے قبل لکھا جاچکا ہے؛ یہاں تک کہ اہل علم حضرات سے بارہا سنا کہ روح کے قبض ہونے کا وقت ومقام اور جہاں انسان کو دفن ہونا ہے وہاں کی مٹی بھی مقرر رہے، چاہے انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، موت اس کی وہاں اس کو کھینچ کر لے جائے گی جہاں دفن ہونا ہے، وہاں کی مٹی اس کو وہاں کھینچ لے گی، اس کی تائید وتصدیق حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ کے وصال سے ہوتی ہے، حضرت کو جب باندہ سے لکھنؤ لے جانے کا ارادہ ہوا تو حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا یہ موت کی تکلیف ہے، آگے یہ فرمایا کہ میرا اسلام سب ملنے والوں کو کہہ دینا اور مدرسہ کا خیال رکھنا، اتنا فرما کر ذکر میں مشغول ہوگئے، یہاں تک کہ آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں تھوڑی دیر کے بعد ہی روح کو اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کردیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

پھر وہاں سے حضرت والا کو ہتھورا لانے کی تیاری ہونے لگی، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انکار فرمایا کہ حضرت کو یہیں دفن کردیا جائے اور حضرت والا آپ نے بھی اس بات پر اصرار فرمایا کہ حضرت کو ہتھورا نہ لے جایا جائے، ہزار کوششوں کے باوجود ایسا نہ ہوسکا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موت اور مٹی کو اپنے مقام پر کھینچنے میں دخل ہے، ان تمام باتوں پر یقین کے باوجود پھر کوئی انسان اس ضد پر اڑ جائے کہ جہاں روح قبض ہوئی ہے وہیں دفن کیا جائے گا، تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں اور اس بات پر قسم کھالے کہ میں اس مقام پر کبھی نہیں جاؤں گا، جہاں اس کو دفن کیا ہے، اس ضد پر اڑے رہنا

کیا یہ صحیح ہوگا؟ حضرت والا سے مؤدبانہ اور عاجزانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم لوگوں کی رہبری فرمائیں اور خصوصی توجہ فرما کر جلد سے جلد جواب تحریر فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محتاج دعا: عبدالخالق، امام جامع مسجد رسلی کرد بھوپال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے سے متعلق مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور زیادہ الجھا ہوا بھی ہے، اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے کچھ تفصیل کی ضرورت ہے؛ لہٰذا ہم اس سلسلہ میں علی الترتیب چھ باتیں عرض کریں گے۔

(۱) حضرات انبیاء کرام کے بارے میں۔

(۲) حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے منتقلی پر اشکال وجواب۔

(۳) شہداء کے بارے میں۔

(۴) عامۃ المسلمین کے بارے میں اور اس مسئلہ سے متعلق نصوص وروایات۔

(۵) حضرات محدثین کی تشریح۔

(۶) حضرات فقہاء احناف کی رائے۔

اور فقہاء کی آرا کے تحت اس مسئلہ میں چار درجات ہیں۔

پہلی بات: حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی کی روح اسی جگہ قبض فرماتا ہے، جس جگہ اس نبی کو دفن کرنا پسند ہوتا ہے؛ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حدیث شریف کے پیش نظر بعینہ اسی جگہ دفن کیا گیا ہے، جس جگہ پر روح پرواز ہوگئی تھی، ترمذی شریف میں اس کی صراحت موجود ہے۔

عن عائشة رضـ قالت: لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم اختلفوا في دفنه، فقال أبو بكر رضـ: سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئاً ما نسيته، فقال: ما قبض الله نبيًا إلا في الموضع الذي يحب أن يدفن فيه،

فدفنوه في موضع فراشه. (الترمذي، أبواب الجنائز، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية، ۱۹۸/۱، دار السلام، رقم: ۱۰۱۸)

دوسری بات: مذکورہ حدیث شریف پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مصر سے ملک شام منتقل کیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے تابوت کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک زمانہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ السلام کے شہر میں ان کے جوار میں منتقل فرمایا، تو اس پر یہ اشکال ہے کہ جب نبی کو اللہ تعالیٰ وہیں موت دیتے ہیں جہاں پر دفن ہونا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جائے وفات سے دوسری جگہ کیسے منتقل فرمایا؟ تو اس کا جواب علامہ بدرالدین عینیؒ نے یوں دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رائے سے منتقل نہیں فرمایا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہونے کی وجہ سے منتقل فرمایا؛ لہٰذا یہ انتقال مکانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہوگا کسی اور کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا؛ اس لئے حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے حضور کی حدیث پر اشکال نہ ہوگا۔

لأن النبي عليه الصلوٰة والسلام يدفن حيث يموت ولا ينقل، قيل: فيه نظر، لأن موسىٰ عليه السلام قد نقل يوسف عليه السلام إلى بلد إبراهيم الخليل عليه الصلوٰة والسلام، قلت: وفيه نظر؛ لأن موسىٰ عليه السلام مانقله إلا بالوحي، فكان ذٰلک مخصوصاً به الخ. (عمدة القارى، كتاب الجنائز، باب من أحب الدفن في الأرض المقدسة، دار إحياء الترث العربي بيروت ۱۴۹/۸، زكريا ديوبند ۲۰۶/۶)

تیسری بات: شہداء کے بارے میں، شہداء کو جائے شہادت سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ ان کی جائے شہادت قیامت کے دن ان کے لئے گواہی دے گی، اسی وجہ سے جب احد کے موقع پر بعض شہداء کو مدینہ منتقل کیا گیا، تو حضور ﷺ نے ان کو واپس کرادیا اور فرمایا کہ یہ لوگ احد میں شہید ہوئے ہیں وہیں دفن ہوں گے۔

عن جابرؓ، قال: كنا حملنا القتلى يوم أحد لندفنهم، فجاء منادى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمركم أن تدفنوا القتلي في مضاجعهم فرددناهم. (ابو داؤد، كتاب الجنائز، باب في الميت يحمل من ارض إلى ارض، النسخة الهنديه ۲/ ۴۵۱، دار السلام، رقم: ۳۱۶۵)

چوتھی بات: عام مسلمانوں کو جائے وفات سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا مسئلہ، یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس سلسلہ میں اولاً تین روایات نقل کی جاتی ہیں، جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

(۱) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کسی جگہ موت دینے کا فیصلہ فرماتا ہے، تو اس کے لئے اس جگہ کوئی ضرورت اور بہانا بنادیتا ہے؛ چنانچہ وہ اسی جگہ جا کر مرتا ہے۔

عن أبي عزةؓ، قال: قال رسول الله عليه وسلم: إذا قضى الله لعبد أن يموت بأرض جعل له إليها حاجة. (ترمذی، أبواب القدر، باب ما جاء أن النفس تموت حيث ما كتب لها، النسخة الهندية، ۲/ ۳۶، دار السلام رقم: ۲۱۴۷)

(۲) حضرت سعد ابن ابی وقاص اور حضرت سعید ابن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہم، ان دونوں صحابی رسول کا انتقال وادی عقیق میں ہوا جو مدینۃ المنورہ سے چار فرسخ کے فاصلہ پر ہے اور ایک فرسخ میں تین میل شرعی ہوتے ہیں؛ لہٰذا تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ان دونوں کا انتقال ہوا، اور دونوں کو مدینۃ المنورہ منتقل کیا گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اس پر کسی نے نکیر بھی نہیں فرمائی۔

مالک عن غير واحد ممن يثق به أن سعد ابن أبي وقاص و سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل توفيا بالعقيق و حملا إلى المدينة ودفنا بها. (مؤطا إمام مالك مع أوجز المسالك، كتاب الجنائز، بحث نقل الميت، جديد دار القلم دمشق ۴/ ۵۱۳، قديم۲/ ۴۷۲، مسند إمام أحمد بن حنبل ۶/ ۷۹، رقم: ۲۵۰۰۳- ۲۵۰۰۴)

(۳) حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ مکۃ المکرّمہ سے کچھ فاصلہ پر مقام حبشی میں وفات پا گئے، ان کو وہاں سے مکۃ المکرّمہ منتقل کردیا گیا، جب حضرت عائشہؓ ان کی قبر پر تشریف لے گئیں، تو فرمایا کہ اگر میں تمہاری موت کے وقت وہاں ہوتی تو تم کو وہیں دفن کردیتی۔

عن عبداللہ ابن أبي مليكۃؓ، قال: توفي عبد الرحمن ابن أبي بكرؓ بالحبشي إلی قوله، ثم قالت واللہ لو حضرتک ما دفنت إلا حيث مت، ولو شهدتک ما زرتک. (ترمذي شريف، أبواب الجنائز، باب ما جاء في زيارة القبور للنساء، النسخة الهنديه ۲۰۳/۱، دارالسلام رقم:۱۰۵۵)

اب تینوں قسم کی روایات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) کا تقاضہ یہ ہے کہ جہاں وفات پائے وہیں دفن کردیا جائے۔

(۲) کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر مسافت سفر سے کم ہے تو منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

(۳) کا تقاضہ بھی یہی ہے؛ اس لئے کہ مقام عقیق سے مدینۃ المنورہ مسافت سفر سے کم ہے اور اسی طرح مقام حبشی سے مکۃ المکرّمہ بھی مسافت سفر سے کم ہے؛ لہٰذا مسافت سفر سے زائد میں منتقل کرنے کے جواز پر کوئی بھی روایت ناطق نہیں ہے۔

پانچویں بات: محدثین کی تشریح: حضرات محدثین مذکورہ روایات کو پیش نظر رکھ کر یہ تشریح کرتے ہیں کہ مقامات مقدسہ میں منتقل کرنے کی اجازت ہے؛ لہٰذا جنت البقیع اور جنت المعلی اور بیت المقدس میں دفن کرنے کی غرض سے دوسری جگہ سے منتقل کرنا علی الاطلاق جائز ہوگا۔ نیز ایسے قبرستان میں بھی منتقل کرنا جائز ہے؛ جہاں نیک لوگوں کی قبریں ہوں؛ اس لئے کہ نیک لوگوں کے جوار میں دفن ہونے میں حفاظت ہوتی ہے اور برے لوگوں کے جوار میں دفن ہونے میں ایذاء پہونچتی ہے، مگر اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اس دوران میت کے جسم میں تغیر پیدا نہ ہوا ہو، اس کو حضرات محدثین نے اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

يحرم نقل الميت قبل دفنه من محل موته إلی محل أبعد من مقبرة

محل موته ليدفن فيه إلا أن يكون بقرب مكة، أو المدينة، أو بيت المقدس، وفي الحاشية: المراد بالقرب مسافة لا يتغير الميت فيها قبل وصوله، والمراد بمكة جميع الحرم، ولا ينبغي التخصيص بالثلاثة؛ بل لو كان بقرب مقابر أهل الصلاح و الخير، فالحكم كذٰلک لأن الشخص يقصد الجار الحسن.

(أوجز المسالك، كتاب الجنائز، بحث نقل الميت، جديد دارالقلم دمشق ٥١٤/٤، قديم ٤٧٥/٢)

اور بعض محدثین نے چار اغراض کی بناء پر منتقلی کو جائز لکھا ہے۔

(۱) حرمین شریفین میں سے کسی ایک کی طرف منتقل کرنا۔

(۲) انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی ایک کی قبر کے قریب منتقل کرنا۔

(۳) اولیاء اللہ میں سے کسی کی قبر سے قریب منتقل کرنا۔

(۴) دوسری جگہ منتقل کرنے کی غرض یہ ہو کہ وہاں لوگ زیادہ سے زیادہ قبر کی زیارت کر سکیں گے اور ایصال ثواب کر سکیں گے، ایسی صورت میں منتقل کرنا مکروہ نہیں ہے، شاید ان تشریحات کے پیش نظر حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کو دہلی سے دیوبند منتقل کیا گیا تھا۔

فإذا كان يترتب عليه فائدة من نقله إلى أحد الحرمين أو إلى قرب قبر أحد من الأنبياء أو الأولياء أو ليزوره أقاربه من ذلک البلد وغير ذلک فلا كراهة. (مرقاة، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، الفصل الثانی، نقل الميت من موضع إلى موضع، ملتانی ٧٣/٤، حاشيه ابوداؤد، كتاب الجنائز، باب في الميت يحمل من أرض إلى أرض، ٤٥١/٢، رقم الحاشية: ٤)

اور بذل المجہود میں یہ نقل فرمایا ہے کہ بغیر عذر کے منتقل کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ کسی اہم خصوصیت کی بناء پر منتقل کرنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو صحابہ کی ایک جماعت کی موجودگی میں منتقل کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر نکیر بھی نہیں کی اور اس میں جنت البقیع میں دفن کرنے کی خصوصیت تھی اور ممانعت کی روایت کو بغیر عذر کے دفن کے بعد منتقل کرنے پر محمول فرمایا ہے۔

والأظهر أن يحمل النهي على نقلهم بعد دفنهم بغير عذر. قال الطيبي الظاهر: إن دعت الضرورة إلى النقل نقل وإلا فلا. (بذل المجهود، كتاب الجنائز، باب في الميت يحمل من ارض إلى ارض، جديد دار البشائر الإسلاميه، بيروت ۱۰/۴۴۳، قديم مطبوعة سهارن پور ۴/۱۹۷)

اعلاء السنن میں ایسے قبرستان میں منتقلی کو مستحب لکھا ہے کہ جس میں شہداء اور صالحین کی قبریں کثرت کے ساتھ ہوں۔

يستحب الدفن في المقبرة التي يكثر فيها الصالحون والشهداء لتناله بركتهم وكذلک في البقاع الشريفة. (اعلاء السنن ۲/۲۶۸، المغنى ۳/۱۹۳)

چھٹی بات فقہاء کی تشریح: حضرات فقہاء کی تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں چار درجات ہیں۔

درجہ نمبر (۱) جہاں منتقل کرنا ہے اگر وہاں کی مسافت دو میل کے اندر اندر ہے تو بالاتفاق جائز اور اس کی گنجائش ہے اور جہاں جہاں حضرات فقہاء کرام کی **لا بأس بنقله قبل دفنه** اور **فان نقل إلى مصر اٰخر لا بأس به** جیسی عبارتیں جو کثرت کے ساتھ فقہ حنفی کی کتابوں میں موجود ہیں، ان سب کے اندر **إلى ميل أو ميلين** کی قید بھی موجود ہے؛ جیسا کہ کتب فقہ میں اس طرح کی عبارت ساتھ ساتھ لکھی گئی ہے۔

وإن نقل قبل الدفن إلى قدر ميل أو ميلين فلا بأس به، (قاضی خان، باب في غسل الميت وما يتعلق به الخ، جديد زكريا ۱/۱۲۱، وعلى هامش الهندية، زكريا ۱/۱۹۵، طحطاوى على المراقى، أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، دارالكتاب ديوبند ۶۱۳، قديم ۳۳۷، هنديه، كتاب الصلوٰة، الباب الحادى والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن الخ، زكريا قديم ۱/۱۶۷، جديد ۱/۲۲۸، كبيرى، فصل في الجنائز، المتفرقات، اشرفيه ديوبند ۶۰۷، قديم ۵۶۳)

واختلفوا في نقل الميت من موضع إلى موضع فكرهه جماعة

وجوزه اٰخرون. وقيل: إن نقل ميلا، أو ميلين، فلا بأس به وقيل ما دون السفر، وقيل لا يكره السفر أيضا. (اوجز المسالك، كتاب الجنائز، باب نقل الميت، جديد دار القلم دمشق ٥١٣/٤، قديم ٤٧٥/٢)

درجه نمبر (۲) دو میل سے زیادہ اور مدت سفر سے کم مسافت میں منتقل کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے۔

لا تظهر الكراهة في نقله من بلد إلى بلد إلا إذا كانت المسافة أكثر من ميلين، وقيل يجوز ذلک إلى ما دون مدة السفر، جیسی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔ (حاشية الطحطاوي، أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، دار الكتاب ديو بند ٦١٣، قديم ٣٣٧، كبيري، فصل في الجنائز،المتفرقات، اشرفيه ديو بند ص:٤٠٧)

اوراس میں اس بات کا لحاظ بھی اہم ہے کہ جس زمانہ میں یہ مسائل لکھے گئے ہیں، اس زمانہ میں منتقلی کے بیشتر ذرائع موجود نہیں تھے اور آج کے زمانہ میں گھنٹہ بھر میں اتنی لمبی مسافت بآسانی طے ہوجاتی ہے، جس کا اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

درجه نمبر (۳) مدت سفر سے زیادہ مسافت پر منتقل کرنا، فقہاء احناف میں سے اکثر اس کو مکروہ تحریمی لکھتے ہیں۔

بيان أن النقل من بلد إلى بلد مكروه أي تحريمًا (إلى قوله) وقيل في مدة السفر. (حاشية الطحطاوى على المراقى، أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، دار الكتاب ديوبند ٦١٣، قديم ٣٣٧)

اوپر کی تشریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بغیر عذر شدید کے منتقل کرنا ممنوع ہے اور مقامات مقدسہ اور صالحین کے جوار میں دفن کرنے کے لئے منتقل کرنا جائز ہے۔

نیز مدت سفر سے کم مسافت میں بھی منتقل کرنا جائز ہے، شاید کہ تطبیق کی یہ شکل ہوسکے کہ مقامات مقدسہ اور صالحین کی قبریں مدت سفر سے کم مسافت میں ہونے میں جائز ہو؛ اس لئے کہ جنۃ البقیع اور جنۃ المعلی میں جن حضرات کو منتقل کیا گیا ہے، ان کی مسافت مدت سفر سے کم ہے، تاہم

اگر مدت سفر سے زائد مسافت میں میت کے جسم میں تغیر آنے کا خطرہ نہ ہو، تو بعض محدثین کی بیان کردہ چار وجوہات میں سے ایک کی بنا پر منتقل کیا جائے تو ان کی رائے کے مطابق گنجائش ہوسکتی ہے اور اس تفصیل سے منتقلی کی ممانعت کی چار علتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) میت کے جسم میں تغیر کا خطرہ۔ **كما في الأوجز:**

لا يتغير الميت فيها قبل وصوله الخ. (أوجز المسالك، كتاب الجنائز، بحث نقل الميت، جديد دار القلم دمشق ٤/٥١٥، قديم ٢/٤٧٥)

(۲) ایسے امور میں مشغول ہوجانا جس میں شرعاً کوئی فائدہ نہیں۔

من مات في بلدة يكره نقله إلى آخرى؛ لأنه اشتغال بمالا يفيد بما فيه تأخير دفنه وكفى بذلك كراهة. (مرقاة، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، الفصل الثانى، نقل الميت من موضع إلى موضع، ملتانى ٤/٧٣)

(۳) حدیث شریف میں جنازہ میں عجلت کا حکم ہے؛ لہٰذا تاخیر کی ممانعت ہوگی۔

عن أبي هريرةؓ يبلغ به النبى صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة. (ترمذى، أبواب الجنائز، باب ما جاء في الإسراع بالجنازة، النسخة الهندية ١/١٩٦، دارالسلام رقم: ١٠١٥)

(۴) حدیث پاک میں ہے کہ جب کسی کو کسی جگہ موت دینی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کسی بہانہ سے اس کو وہاں پہنچا دیتا ہے، پھر وہاں سے منتقل کرنا حدیث شریف کے تقاضہ کے خلاف ہے۔

درجہ نمبر (٤) اکابر کا فتویٰ، حضرات اکابر نے منتقل کرنے کو مکروہ لکھا ہے، شاید ان کی مراد بھی یہی ہو کہ مدت سفر سے زیادہ مسافت پر منتقل کرنا ممنوع ہے؛ چنانچہ بہشتی زیور ۱۱/۱۰۲ میں مکروہ تحریر فرمایا ہے۔

احقر نے ان تمام تفصیلات سے یہ سمجھا ہے کہ مسافت سفر سے کم فاصلہ پر منتقل کرنے کی بہر حال گنجائش ہوگی؛ جبکہ تغیر کا خطرہ نہ ہو؛ اس لئے کہ یہ درمیانی قول ہے اور کسی اہم وجہ اور اہم عذر کی وجہ سے مسافت سفر سے زائد فاصلہ پر بھی منتقل کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ

زیادہ تاخیر نہ ہواور اس درمیان میں میت کے جسم میں کسی قسم کا تغیر بھی نہ آتا ہواور اگر کوئی اہم وجہ اور اہم عذر نہیں ہے، تو مسافت سفر سے زائد فاصلہ پر منتقل کرنا ممنوع اور مکروہ ہوگا اور خلاف اولیٰ اور خلاف تقویٰ تو ہر حال میں ہے ہی؛ لہٰذا اگر کوئی شہرۂ آفاق شخصیت اور ان کے ہر عمل کو لوگ سنت کے مطابق ہی سمجھتے ہوں، ان کو اگر چہ کسی خاص عذر کی بنا پر منتقل کیا جائے تو لوگوں کی نگاہوں میں وہ عذر پیش نظر نہیں ہوگا؛ بلکہ لوگ اسی کو عین سنت سمجھیں گے؛ اس لئے ایسی صورت میں ایسی شخصیت کو منتقل نہ کرنا ہی بہتر ہوگا؛ لہٰذا سوالنامہ میں جن صاحب کا ذکر ہے شاید انہوں نے اسی مصلحت کی بناء پر سختی سے نکیر کی ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۳۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۶/۱۴۱۸ھ

(۶) باب صلاة الجنازة في المسجد وغيره

مسجد حرام کے اندر جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا

سوال [۳۸۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حرم شریف کے اندر جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ اگر بلا کراہت درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور دیگر مساجد میں اس کی اجازت کیوں نہیں؟ براہ کرم جو بھی حکم ہو اسے عام فہم انداز میں ارشاد فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: فرید احمد قاسمی، خادم مدرسہ شاہی مرادآباد یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد حرام عام مساجد سے مختلف وجوہ سے مستثنیٰ ہے کہ دیگر مساجد کی بنیاد اداء فرض کے لئے رکھی گئی ہے۔ اور سنن ونوافل ان مساجد میں پڑھنا اگرچہ جائز ہے؛ لیکن گھر یا حجرے میں ادا کرنا مسنون وبہتر ہے اور مسجد حرام میں سنن ونوافل پڑھنا گھر یا کمرے میں پڑھنے کے مقابلہ میں بہت زیادہ افضل ہے، اسی طرح نماز عیدین، نماز خسوف وکسوف، نماز استسقاء اور نماز جنازہ یہ سب مسجد حرام میں زیادہ افضل ہیں؛ لیکن دیگر مساجد میں افضل نہیں ہیں؛ اس لئے بلا کراہت مسجد حرام میں نماز جنازہ جائز ہے۔

وأما المسجد الحرام فمستثنیٰ كما صرح به ابن الضياء إذهو موضوع لأداء المكتوبات، والجمعة، والعيدين، وصلوة الكسوف والخسوف، وصلوة الجنازة، والاستسقاء ...... أولكبره وسعة قدره أولتعظيم أمره أولاشتماله على جهات كل جهة بمنزلة مسجد أولأنه قبلة المساجد كلها الخ (شرح النقایہ، کتاب الصلوة، باب فی الجنائز، اعزازیۃ دیوبند ۱/ ۱۳۷،

تقریرات رافعی، کتاب الصلوۃ، باب صلاۃ الجنازۃ ۳/ ۱۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۱۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۲/۲۶ھ

مسجد میں نماز جنازہ

سوال [۳۸۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ مسجد سے باہر رکھ کر کچھ لوگ مسجد کے باہر کھڑے ہو جائیں اور کچھ لوگ مسجد کے اندر کھڑے ہو جائیں تو سب کی نماز مکروہ ہوگی یا سب کی بلا کراہت ادا ہو جائے گی؟ اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: انوار حسین، خادم مسجد کچا باغ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس صورت میں سب کی نماز جنازہ ادا ہو جائے گی؛ البتہ جو لوگ مسجد کے باہر کھڑے ہوں گے، ان کی نماز بلا کراہت ادا ہو جائیگی اور جو اندرون مسجد کھڑے ہوں گے ان کی نماز بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک بلا کراہت ادا ہو جائے گی؛ اس لئے حتی الامکان اندرون مسجد نہ کھڑے ہوں۔

واختلف في الخارجة عن المسجد وحده، أو مع بعض القوم، والمختار الكراهة مطلقاً الخ (الدر المختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ، مطلب فی کراھۃ صلوۃ الجنازۃ فی المسجد، زکریا ۳/ ۱۲۶، کراچی ۲/ ۲۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۱۱۱)

کیا مسجد کے اندر نماز جنازہ نہیں ہوتی ہے؟

سوال [۳۸۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کی نماز مسجد کے اندر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے اس مسئلہ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب دین کی باتیں ص:۱۶۸/ پر دیکھا ہے، جس میں یہ لکھا ہے کہ جنازہ کی نماز ان مساجد میں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جو پنج وقتی نمازوں یا جمعہ یا عیدین کی نماز کے لئے بنائی گئی ہیں، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر ہو اور نماز پڑھنے والے اندر ہو یا باہر اس مسئلہ کو میں نے عوام کو بتایا کہ نماز جنازہ نہیں ہوتی ہے، نا جائز ہے، تو ایک مفتی صاحب نے بتایا کہ جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھنا جائز ہے۔ میں نے حضرت مولانا اشرف علیؒ کا مسئلہ بتایا تو انھوں نے فرمایا کہ ہم مولانا اشرف علیؒ کے مسئلہ کو نہیں مانتے، ہمیں دلیل چاہئے، مفتی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ چبوترہ مسجد کے باہر بنا ہوا ہے اور جنازہ مسجد سے باہر ہے، اور نمازی اندر ہیں تو نماز جائز ہے۔

المستفتی: حافظ محمد عرفان، مسجد عثمانیہ، نئی بستی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا یہ بیان کرنا صحیح نہیں ہے کہ مسجد کے اندر نماز جنازہ ہوتی ہی نہیں اور نہ ہی حضرت مولانا اشرف علیؒ کا مقصد یہ ہے کہ نماز ہوتی ہی نہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ نماز کراہت کے ساتھ ہوتی ہے، لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے اور مذکورہ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ نماز ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کراہت کے ساتھ صحیح ہو جاتی ہے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى على جنازة في المسجد فلا شئ عليه. (سنن ابی داؤد، الجنائز، باب الصلوۃ علی الجنازۃ

فی المسجد، النسخة الهندیه ۲/ ٤٥٤،دارالسلام رقم: ۳۱۹۱، سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء فی الصلوة علی الجنازة فی المسجد ، النسخةالهندیه ۱۰۹ ، دارالسلام رقم: ۱۵۱۷، مسند أحمد ابن حنبل ۲/ ٤٥٥، رقم: ۹۸٦٥)

وکرهت تحریماً وقیل تنزیهاً فی مسجد جماعة هو أي المیت فیه وحده، أو مع القوم الخ (درمختار، کتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة،مطلب فی کراهة صلاة الجنازة فی المسجد، زکریا۳/ ۱۲٦، درمختار، کراچی ۲/ ۲۲٤، هندیه، الباب الحادی العشرون فی الجنائز،الفصل الخامس فی الصلوة علی المیت، زکریا قدیم ۱/ ۱٦٥، جدید ۱/ ۲۲٦، الفتاوی التاتارخانیه، الصلوة، الفصل الثانی والثلاثون فی الجنائز،المتفرقات زکریادیوبند۳/ ۸۷، رقم: ۳۷۸٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۸۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۱۸ھ

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ اس مسجد میں جائز نہیں ہے جس میں پنجوقتہ نماز ہوتی ہو یا عیدین کے لئے بنائی گئی ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟ کچھ مسجدیں ایسی ہیں جس میں پنج وقتہ نماز بھی ہوتی ہے اور جنازہ کی نماز کے وقت سارے مقتدی مسجد کے اندر رہوتے ہیں، کیا اس جگہ نماز جنازہ ہوسکتی ہے؟ اس کا خلاصہ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد حبیب اللہ، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔

عن أبي هریرةؓ ، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من صلی

علیٰ جنازة فی المسجد فلاشئ علیه. (سنن أبي داؤد، الجنائز ،باب الصلوة علیٰ الجنازة في المسجد، النسخةالهندیه ۲/۴۵٤، دارالسلام رقم: ۳۱۹۱، سنن ابن ماجه،کتاب الجنائز، بـاب ماجاء فی الصلوة علیٰ الجنازة فی المسجد، النسخة الهندیه ٤/۱۰۹، دارالسلام رقم: ۱۵۱۷، مسند أحمد بن حنبل ۲/٤۵۵، رقم: ۹۸٦۵)

وکـرهـت تـحریماً وقیل تنزیهاً فی مسجد جماعة هو أي المیت فیه أومـع القوم. واختلف في الخارجة عن المسجد وحده، أومع بعض القوم. (درمـختار، کتاب الـصلـوة، باب صلوة الـجنازة، مـطـلـب فـي کـراهة صلوة الجنازة في المسجد، کراچي ۲/۲۲۵، زکریا ۳/۱۲٦)

البتہ عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھنا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۱۴۲/۳)

لاتـکره في مسجد أعدلها، وکذا في مدرسة ومصلیٰ عید؛ لأنه لیس لها حکم المسجد الخ. (حـاشیة الـطحطاوی علی المراقی، کتاب الصلوة، فصل في الـمـکـروهـات، دارالکتاب دیو بند ۳۵۷، شامي، کتاب الصلوة، باب ما یفسد الصلوة وما یکره فیها، کراچي ۱/٦۵٤، زکریا ۲/٤۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۶۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۲/۲۹ھ

مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے سے ادا ہوگی یا نہیں؟

سوال [۳۸۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ جنازہ کی نماز فرض کفایہ ہے، اگر ایک مرد اور ایک عورت مل کر بھی نماز جنازہ پڑھ لیں تو نماز ادا ہو جائے گی ،مسلک حنفیہ کے نزدیک نماز جنازہ مسجد میں ادا کرنے سے نماز جنازہ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

(۲) جنازہ مسجد کے اندر خارجی حصہ میں ہو یا مسجد کے باہر ہو؛ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ مسجد میں صفیں بنا کر نماز میں شریک ہوجاتے ہیں، بحوالہ احادیث مستند کے جواب دے کر تشفی فرمائیں۔

المستفتی: ایم این حسن، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں! نفس جنازہ ایسی صورت میں بھی ادا ہوجاتی ہے، مگر دوسرے لوگوں پر سخت افسوس ہے۔

عن حذيفة بن أسيدؓ، أن النبي صلى الله عليه وسلم بلغه موت النجاشي، فقال لأصحابه: إن أخاكم النجاشي قد مات، فمن أراد أن يصلي عليه فليصل عليه، فتوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم نحو الحبشة، فكبر عليه أربعاً.

(المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۷۹/۳، رقم: ۳۰۴۸)

ومن صفتها أنها فرض كفاية، إذا قام بها البعض وفى شرح المتفق: واحداً كان أو جماعة ذكراً كان أو أنثىٰ- سقط عن الباقين وإذا ترك كلهم أثموا الخ. (تاتارخانيه، الصلوٰة، الفصل الثانى والثلاثون فى صلوٰة الجنازة، قديم ۱۵۳/۲، جديد زكريا ديوبند ۴۰/۳، رقم: ۳۶۸۱، هنديه، الباب الحادى والعشرون فى الجنائز، الفصل الخامس فى الصلوٰة على الميت، زكريا قديم ۱۶۲/۱، جديد ۲۲۳/۱، حاشية الطحطاوى على المراقى، فصل فى الصلوٰة عليه، دار الكتاب ديوبند ۵۸۰، دار الكتاب ديو بند ۵۹۶)

(۲) مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنے سے نماز جنازہ کا فریضہ ادا ہوجاتا ہے؛ ہاں البتہ مسجد میں ادا کرنا حنفیہ کے یہاں مکروہ ہے، جنازہ حدود مسجد میں چاہے اندر کے حصہ میں ہو یا باہر صحن کے حصہ میں، حکم یکساں ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله عليه وسلم: من صلى علىٰ جنازة في المسجد فلا شيئ عليه. (سنن أبي داؤد، الجنائز، باب الصلاة على الجنازة في المسجد، النسخة الهنديه ۴۵۴/۲، دار السلام رقم: ۳۱۹۱ مسند أحمد بن حنبل ۴۵۵/۲، رقم: ۹۸۶۵)

تکره سواء کان المیت و القوم فی المسجد أو أحدهما الخ. (البحر الرائق، کتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، کوئٹه ۱۸۷/۲، زکریا ۳۲۸/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۷۴۰/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۵/۱۴۱۹ھ

احاطۂ مسجد میں جنازہ کی چارپائی رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال [۳۸۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بنگال کے اکثر وبیشتر گاؤوں میں یہ رواج عام ہے کہ جنازہ کی چارپائی کبھی مسجد میں رکھی جاتی ہے، کبھی مسجد کے برآمدہ میں اور کبھی احاطۂ مسجد میں امام صاحب کے کمرے میں، بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ احاطۂ مسجد میں جنازہ کی چارپائی رکھنا درست نہیں ہے، اس بارے میں حکم شرعی وضاحت کے ساتھ مطلوب ہے۔

المستفتی: منجانب مدرسہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ کی چارپائی احاطۂ مسجد میں، مسجد کے کسی کونہ میں یا مسجد کے برآمدہ میں رکھنے میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ وہ پاک اور صاف ستھری ہوتی ہے، اس میں کوئی ناپاکی لگی ہوئی نہیں ہوتی ہے۔

فما کان فیه نوع عبادة ولیس فیه إهانة ولا تلویث لا یکره. (حلبي کبیر، فصل في أحکام المسجد، ص: ۶۱۱، مطبوعه لاهور پاکستان) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۰۳۲/۴۰)

مسجد میں جنازہ کی نماز پڑھنا

سوال [۳۸۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری جامع مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ مسجد میں پڑھنا؛ جبکہ جنازہ مسجد کے باہر ہو اور جماعت جنازہ کے نمازی مسجد کے اندر ہوں، یا دو ہی نمازی مسجد کے اندر ہوں باقی باہر ہوں، تو اس صورت میں نماز جنازہ ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے اور کہتے ہیں کہ فتاویٰ دار العلوم میں یہی لکھا ہے، اس وقت پر ایک جنازہ نماز ادا کرنے کے لئے موجود تھا، جس کی نماز امام صاحب نے باہر سڑک پر ادا کرائی اور مسجد میں اسی وقت یہ مسئلہ بیان کیا، مطابق فرمودہ امام صاحب یہ مکروہ تحریمی ہے یا غیر تحریمی، جائز ہے کہ ناجائز؟

المستفتی: سید افتخار احمد زیدی، چاند پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صرف جنازہ مسجد سے باہر ہو اور امام سمیت تمام نمازی مسجد کے اندر ہوں، تو ایسی صورت میں سب کی نماز مکروہ ہوگی اور امام مذکور کی بات صحیح ہے اور اگر صرف دو ہی نمازی مسجد کے اندر ہوں باقی سب مسجد کے باہر ہوں تو مسجد کے اندر کھڑے ہونے والے دونوں نمازیوں کی نماز مکروہ ہوگی، بقیہ کی نماز مکروہ نہ ہوگی اور مسجد میں نماز جنازہ کو صاحب درمختار نے راجح قول کے مطابق مکروہ تحریمی نقل فرمایا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص: ۷۵، امداد الفتاویٰ ۱/۲۶۷، فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۳۳/۴، جدید زکریا ۴۰۷)

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله عليه وسلم: من صلى علىٰ جنازة في المسجد فلا شيئ عليه. (سنن أبی داؤد، الجنائز، باب الصلاة على الجنازة في المسجد، النسخة الهندية ۲/۴۵۴، دار السلام رقم: ۳۱۹۱)

وكرهت تحريمًا وقيل تنزيها في مسجد جماعة هو أي الميت فيه وحده،

أو مع بعض القوم الخ. (درمختار) **واختلف فی الخارجة عن المسجد وحده، أو مع بعض القوم، والمختار الکراهة مطلقاً الخ.** (در مختار، کتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، مطلب فی کراهة صلوٰة الجنازة فی المسجد، زکریا ۱۲٦/۳، کراچی ۲۲۵/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰۹۲/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱؍۷؍۱۴۱۵ھ

مسجد کے حصہ میں نماز جنازہ

سوال [٦ ۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے قصبہ ہندو پور کی جامع مسجد ہے، جس کی بائیں جانب یعنی جنوب کی جانب ایک بڑا ہال بنا ہوا ہے، جس میں تقریباً چار سال سے چھت پڑ چکی ہے، چار سال قبل چھت نہیں تھی بروز جمعہ نماز جمعہ میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے لوگ اس حصہ میں بھی نماز ادا کرتے تھے، لوگوں نے دھوپ اور برسات کی غرض سے غالباً چھت کا اہتمام کیا ہوگا، اب بھی صرف نماز جمعہ اور رمضان کی دو نمازوں مغرب اور عشاء میں بھی اس حصہ میں نماز جماعت کے وقت لوگوں کی صفیں قائم کی جاتی ہیں، کیا اس حصہ میں نماز جنازہ پڑھی اور پڑھائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو کراہت کے ساتھ یا بنا کراہت کے، نیز کراہت بھی کون سی تحریمی یا تنزیہی؟

المستفتی: عبد الجبار، اننت پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے سوال نامہ میں ذکر کردہ ہال مسجد سے خارج معلوم ہوتا ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں اس کے اندر نماز جنازہ بلا کراہت درست ہے اور مسجد کے اندر نماز جنازہ بلا عذر مکروہ ہے؛ لہٰذا اگر ہال مسجد میں داخل ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱/۵۰۶، جدید ڈابھیل ۸/۶۹۱، امداد الفتاویٰ ۱/۳۰۷، فتاوی رشیدیہ ۴۳۳، جدید زکریا ۴۰۷، احسن الفتاویٰ ۴/۲۳۴)

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول اللّٰہ علیه وسلم: من صلی علیٰ جنازة فی المسجد فلا شیئ علیه. (سنن أبی داؤد، الجنائز، باب الصلاة علی الجنازة فی المسجد، النسخة الهندیه ۲/۴۵٤، دار السلام رقم: ۳۱۹۱، سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء فی الصلوٰة علی الجنازة فی المسجد، النسخة الهندیة ۱/۱۰۹، دار السلام رقم: ۱۵۱۷، مسند احمد بن حنبل ۲/٤٥٥، رقم: ۹۸٦٥)

وصلوٰة الجنازة فی المسجد الذی تقام فیه الجماعة مکروہ. (عالمگیری، الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت، زکریا قدیم ۱/۱٦٥، جدید ۱/۲۲٦، الفتاویٰ التاتارخانیه، الصلاة، الفصل الثانی والثلاثون فی الجنائز، المتفرقات، زکریا دیوبند ۳/۸۷، رقم: ۳۷۸٦، در مختار مع الشامی، کتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، مطلب فی کراهة صلوٰة الجنازة فی المسجد، زکریا ۳/۱۲٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۱۶۲/۳۴)

خارج مسجد صحن میں نماز جنازہ ادا کرنا

سوال [۳۸۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد کبیر ہے جس میں جماعت خانہ سے متصل اور کچھ جگہ ہے، جس پر چھت نہیں ہے، تو ایسی مسجد میں نماز جنازہ کہاں پڑھی جائے، اب تک جماعت خانہ سے متصل صحن میں نماز جنازہ ہوتی ہے، ایک مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ نماز جنازہ مسجد سے جتنی دور ہو اتنا اچھا ہے؛ لہٰذا صحن سے متصل جو کھلی جگہ ہے وہاں پڑھی جائے، متولی صاحب کا کہنا ہے کہ صحن میں

نماز صحیح ہے؛ کیونکہ تعمیر کے وقت ہی سے صحن کو جماعت خانہ سے باہر تسلیم کیا گیا ہے۔

المستفتی: محمد وسیم، ٹانڈہ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن مفتی صاحب نے کہا کہ نماز جنازہ مسجد سے جتنا دور ہوا تنا ہی اچھا ہے، وہ تقریباً صحیح ہے؛ اس لئے کہ نماز جنازہ خارج مسجد ہی میں ادا کرنا مسنون ہے اور اگر متولی صاحب کی یہ بات صحیح ہے کہ صحن مسجد حدود مسجد اور جماعت خانہ سے خارج ہے، تو اس میں بلا کراہت نماز جنازہ جائز ہے۔

إنما تکرہ فی المسجد بلا عذر فإن کان فلا. (شامی، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ الجنازۃ، کراچی ۲/ ۲۲٦، زکریا ۳/ ۱۲۹)

لا یکرہ إذا کان المیت خارج المسجد. (شامی، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ الجنازۃ، کراچی ۲/ ۲۲۵، زکریا ۳/ ۱۲٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شعبان ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۴۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۸/۱۴۲۸ھ

مسجد میں ہونے والی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کا حکم

سوال [۳۸۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ مسجد میں ہورہی ہے جو کہ مکروہ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا دوسرے لوگ جو ابھی تک شریک جماعت نہیں ہوئے ہیں وہ مع کراہت جماعت میں شریک ہوں یا نہیں؛ نیز جو صف میں کھڑے ہو گئے ہیں، ان لوگوں کو کراہت کا علم ہونے پر وہاں سے نکل جانا چاہئے یا نہیں؟

المستفتی: محمد نور الحسن امینی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جن لوگوں کو خارج مسجد جگہ نہیں مل سکی ان کو بوجہ عذر مسجد میں ہی کھڑا ہو جانا چاہئے اور جو لوگ پہلے سے مسجد کی صفوں میں کھڑے ہوگئے ہیں ان کو وہاں سے نہیں نکلنا چاہئے؛ اس لئے کہ نماز جنازہ کی اہمیت ارتکاب کراہت سے فائق ہے؛ لہٰذا مسجد میں جماعت ہونے کی وجہ سے اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱/۶۷۷، ۱/۶۸۷، فتاویٰ رشیدیہ قدیم ص: ۴۳۳، جدید زکریا ص: ۴۰۷)

واعلم أن ظاهر الحديث و كلامهم أنه لا أجر أصلاً لمن صلى عليها فى المسجد، ولا يلزم منه عدم سقوط الفرض لعدم الملازمة بينهما. (البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا ۲/۳۲۸، كوئٹه ۲/۱۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۲۹ھ

مسجد کی توسیع کے وقت جنازہ گاہ کو مسجد کے اندر داخل کرنا

سوال [۳۸۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جمشید پور کی جامع مسجد میں نماز جنازہ کے لئے مسجد کے باہر خالی جگہ کا انتظام ہے، جہاں گرمی سردی برسات یعنی سبھی موسم میں نماز جنازہ ادا ہوتی ہے، مسجد کی توسیع کی آج کل بہت ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور توسیع کرنے کے لئے جنازہ کی نماز کی جگہ کو بھی مسجد میں شامل کرنا پڑ رہا ہے؛ لہٰذا عام رائے یہ ہورہی ہے کہ جنازے کی نماز کے لئے مسجد کے پچھّم جانب امام کے محراب کے آگے مسجد کے باہر ایک کمرہ تعمیر کر دیا جائے، جس کا دروازہ مسجد کی پچھمی دیوار سے ہوگا، اس باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی صف لگا کر مقتدیوں کے

ساتھ نماز جنازہ پڑھائیں اور اس کمرے کا دروازہ کھلا رہے اور باقی نمازی مسجد میں صف بندی کرلیں تو ایسی صورت میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں؟ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جنازہ کی نماز میں بے قاعدگی سے صف بندی ہوتی ہے اور بہت سے مقتدی نوافل اور سنتوں میں مسجد میں مشغول رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں امام صاحب فرض نماز کے بعد سنت اور نوافل سے قبل نماز جنازہ پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر اس طرح جو اوپر تحریر ہے کردیا جائے تو امام صاحب فرض نماز کے بعد باہر جنازہ کے کمرے میں مع چند مقتدیوں کے نماز جنازہ ادا کریں تو مرحوم مسلمان کی نماز جنازہ احترام کے ساتھ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

المستفتی: محمد شہاب الدین، جامع مسجد کمیٹی، جمشید پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد کی توسیع کی سخت ضرورت ہے اور جس جگہ نماز پڑھی جاتی ہے وہ مسجد کی ملکیت ہے، تو ایسی صورت میں جنازہ کی مذکورہ جگہ توسیع مسجد کے اندر داخل کرلینا جائز اور درست ہے، پھر جب نماز جنازہ کے لئے حدود مسجد سے خارج کوئی وسیع جگہ نہیں ہے یا مجمع اتنا بڑا ہے اور کثیر تعداد میں ہے کہ نماز جنازہ کے لئے حدود مسجد سے خارج کوئی وسیع جگہ نہیں ہے یا مجمع اتنا بڑا اور کثیر تعداد میں ہے کہ نماز کے بعد سب نمازیوں کا مسجد سے منتقل ہو کر میدان اور کھلی جگہ جانے میں بڑا انتشار پیدا ہو سکتا ہو تو تنگی اور مجبوری کی وجہ سے مسجد کی محراب سے متصل خارج مسجد میں جنازہ رکھنے کے لئے جس نوعیت کا کمرہ بنانے کا ذکر ہے اس کی گنجائش ہے۔

نیز باضابطہ کمرہ بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ ایسی جگہ بنالینا کافی ہے، جس میں جنازہ رکھنے کے بعد امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہو اور امام کے پیچھے چند افراد کے کھڑے ہونے کے لئے ایک صف کی جگہ ہو اور باقی نمازی اس صف سے متصل ہو کر تسلسل کے ساتھ مسجد کے اندر کھڑے ہو جائیں، تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر آس پاس میں اتنی بڑی خالی جگہ یا میدان موجود ہے، جس میں آسانی کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، تو ایسی صورت

میں حدود مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مذکورہ نظام قائم کرنا مکروہ ہوگا اور جو لوگ حدود مسجد میں جماعت خانہ کے اندر کھڑے ہوں گے، عذر نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کی نماز جنازہ مکروہ ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱/۶۷۷)

إنما تكره في المسجد بلا عذر فإن كان فلا...... وإذا كان ما ذكرناه عذراً فلا كراهة أصلاً. (شامی، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، مطلب مهم إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد الخ، زكريا ۳/۱۲۹، كراچی ۲/۲۲۶)

ولو كانت الجنازة والإمام وبعض القوم خارج المسجد و باقي القوم في المسجد كما هو المعهود في جوامعنا لا يكره باتفاق أصحابنا. (مجمع الأنهر، كتاب الصلوٰة، صلوة الجنائز، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۲۷۲، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، دار الكتاب ديوبند ۵۹۶)

جگہ کی تنگی کی صورت میں جانب قبلہ میں اوپر بیان کردہ صفات کے مطابق جنازہ کے لئے جگہ بنا کر نماز پڑھنے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، اس میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ جن نمازوں کے بعد سنتیں مؤکدہ ہیں، جیسا کہ ظہر، مغرب اور عشاء ہے، جب ان نمازوں کے بعد نماز جنازہ پڑھنی ہو، تو سنتوں سے فراغت کے بعد نماز جنازہ ادا کرنا مسنون اور افضل ہے؛ تاکہ نماز جنازہ میں آسانی کے ساتھ مسبوق حضرات بھی شریک ہو جائیں، اور نماز جنازہ سے فراغت کے بعد سنت پڑھنے کے لئے جنازہ کو وہاں چھوڑ کر نہ رکھا جائے؛ بلکہ فوراً قبرستان کے لئے روانہ ہو جائیں۔

الفتویٰ على تأخير الجنازة عن السنة، وأقره المصنف كأنه إلحاق لها بالصلوٰة أي للسنة بالصلاة أي صلاة الفرض. (شامی، كتاب الصلوٰة، باب العيدين، مطلب الفقهاء قد يذكرون ما لا يوجد عادة، زكريا ۳/۴۷، كراچی ۲/۱۶۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبه: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۹/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۲/۱۴۲۳ھ

امام اور کچھ مقتدی مسجد سے باہر اور مابقیہ مسجد میں، تو کیا حکم ہے؟

سوال [۳۸۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد کی سہ نشین کے باہر جنازہ گاہ بنایا گیا ہے، سہ نشین اور جنازہ گاہ کے درمیان دروازہ لگایا گیا ہے، باہر جنازہ رکھا جاتا ہے، امام صاحب اور دو صفیں باہر رہتی ہیں جس میں بیس افراد ہوتے ہیں، باقی نمازی مسجد کے اندر جنازے کی نماز پڑھتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

المستفتی: نسیم احمد شیش گراں بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔

ولو كانت الجنازة والإمام وبعض القوم خارج المسجد و باقي القوم في المسجد كما هو المعهود في جوا معنا لا يكره باتفاق أصحابنا.

(مجمع الأنهر، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنائز، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۲۷۲، قديم ۱/۱۸٤، حاشية الطحطاوی علی مراقي الفلاح، كتاب الصلوٰة، باب أحكام الجنائز، دار الكتاب ديو بند ٥٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۸ھ

اعتراض بر جواب مذکور

محترم ومکرم حضرت مفتی شبیر صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسجد میں جنازہ سے متعلق حضرت والا کا ایک فتویٰ موصول ہوا جس پر حضرت مفتی محمد سلمان صاحب دامت برکاتہم کے دستخط بھی ہیں، اس میں دو سوال ہیں، ایک نماز جنازہ سے متعلق

اوردوسرا مسجد سے متصل زمین سے متعلق، مجھے پہلے سوال وجواب کے سلسلے میں عرض کرنا ہے، وہ فتویٰ یہ ہے۔الف ۴۰/۱۲۰۱۸۔

سوال [۳۸۴۱]: مسجد کی سہ نشین کے باہر جنازہ گاہ بنایا گیا ہے، سہ نشین اور جنازہ گاہ کے درمیان دروازہ لگایا گیا ہے، باہر جنازہ رکھا جاتا ہے، امام صاحب اور دو صفیں باہر رہتی ہیں، جس میں بیس افراد ہوتے ہیں، باقی نمازی مسجد کے اندر جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

المستفتی: نسیم احمد واہل محلّہ شیش گراں کرتپور، نجیب آباد بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔

ولو كانت الجنازة والإمام وبعض القوم خارج المسجد و باقي القوم في المسجد كما هو المعهود في جوا معنا لا يكره بإتفاق أصحابنا.

(مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، دار الكتب العلمية بيروت ۲۷۲/۱، قديم ۱۸٤/۱، عنايه مع فتح القدير، كوئٹه ۹۰/۲، زكريا ۱۳۲/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰/۱۲۰۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۸ھ

آپ کا یہ مذکورہ فتویٰ مندرجہ ذیل احادیث نبوی علیہ السلام، کتب فقہ اور آپ کی بھی گزشتہ تحقیق (جو ایضاح المسائل ص:۵۷/ میں ہے) کے خلاف معلوم ہو رہا ہے، برائے کرم ان کا مدلل جواب راجح قول کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله عليه وسلم من صلى علىٰ جنازة فى المسجد فلا شيئ عليه. (رواه أبو داؤد، كتاب الجنائز، باب الصلاة على الجنازة في المسجد، النسخة الهندية ٤٥٤/٢، مكتبة دار السلام رياض رقم: ۳۱۹۱، والإمام أحمد

في مسنده، رقم: ٩٧٢٨، وقال المحشي: إسناده حسن، وابن ماجه، باب ماجاء في الصلاة على الجنائزة في المسجد،النسخة الهندية ١٠٩/١، دار السلام رياض رقم: ١٥١٧،وفي رواية مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن، رقم: ١٢٠٩٧)

نعي النجاشي في اليوم الذى مات فيه وخرج إلى المصلى فصف بهم وكبر. (أخرجه البخاري، باب الصفوف على الجنازة ص:٢٥٦، مكتبة بيت الأفكار رقم: ١٣١٨، مسلم ٣٠٩/١، وفي در مختار مع الشامي ١٢٨/٣)

واختلف في الخارجة من المسجد وحدهاأو مع بعض القوم. والمختار الكراهة مطلقًا خلاصة...... وهو الموافق لإطلاق حديث أبي داؤد: من صلى الخ. (البحر الرائق ٣٢٧/٢)

ولا فى المسجد لحديث أبى داؤد مرفوعاً...... أطلقه فشمل الميت والقوم فى المسجد، أو كان الإمام مع بعض القوم خارج المسجد، والقوم الباقون فى المسجد...... وهو المختار. (مراقى الفلاح مع الطحطاوى ٥٩٥)

وتكره الصلوٰة عليه في مسجد الجماعة......أو كان الميت خارجه أي المسجد مع بعض القوم وكان بعض الناس فى المسجد أو عكسه ولو مع الإمام على المختار. كما فى الفتاوىٰ الصغرىٰ: وعلى هامش الهندية زكريا ١٦٥/١، جديد زكريا ٢٢٦/١.

صلوٰة الجنازة فى المسجد الذى فيه الجماعة مكروهة سواء......كان الإمام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقون فى المسجد...... هو المختار، كذا في الخلاصة، خلاصة الفتاوىٰ ٢٢٢/١.

صلوٰة الجنازة في المسجد الذى يقام فيه الجماعة مكروه سواء...... كان الإمام مع بعض القوم خارج المسجد، والقوم الباقون فيالمسجد. وكذا في تبيين الحقائق ٥٨٠/١، وفي فتاوىٰ النوازل ص: ١٢١.

لا يصلى الجنازة فى مسجد يصلى فيه الجماعة عندنا للحديث

سواء كان الميت فيه أو خارجاً منه في ظاهر الرواية، وفي الحاشية عن أبي حنيفة لاتصح الصلاة عليه. (النووي في شرح مسلم ١/٣١٣، وكذا في بذل المجهود ١٠/٢٧٢، وفي مجمع الأنهر ١/٢٧٢)

وتكره في مسجد جماعة وإن كان الميت خارجه أي المسجد، وقام الإمام خارج المسجد ومعه صف، والباقي في المسجد كذا في أكثر الكتب.

فتاویٰ رشیدیہ ص: ۴۳۳؍ پر نماز جنازہ کو مسجد میں پڑھنا ہر حال میں مکروہ لکھا ہے، امداد الفتاویٰ ۱؍۶۶۷، پر بالکل اسی جیسے سوال کے جواب میں لکھا ہے۔ **مكروه على الأرجح كما في الشامي**، مگر صرف ان ہی کی جو مسجد میں ہیں۔

احسن الفتاوی ۴؍۱۹۳؍ پر ہے: بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر؛ البتہ اگر نماز کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہو تو عذر کی وجہ سے مسجد میں کراہت نہیں۔ ردالمحتار ج: ۱، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۴؍۳۸۰، پر بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

کفایت المفتی ۴؍۱۰۷؍ پر ہے جنازہ خارج مسجد ہو اور نمازی بھی بعض مسجد میں ہوں، تو یہ صورت مختلف فیہ ہے، راجح یہ ہے جو لوگ مسجد میں ہیں ان کی نماز مکروہ ہے، اگر بعذر ہو تو کوئی صورت بھی مکروہ نہیں۔

فتاوی دارالعلوم ۵؍۳۰۴؍ پر ہے مسجد میں نماز جنازہ اس طرح کہ نعش باہر ہو، کے تحت لکھا ہے کہ صحیح ومختار یہ ہے کہ اس سے کراہت مرتفع نہیں ہوتی۔ **كما في الدر المختار.**

اور آپ نے بھی ایضاح المسائل ص: ۷۵ پر لکھا ہے کہ اگر میت اور امام اور کچھ مقتدی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ مقتدی مسجد کے اندر ہوں تو جو لوگ مسجد کے اندر ہیں تو ان کی نماز مکروہ ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱؍۶۶۷، فتاویٰ رشیدیہ ص: ۴۳۳، درمختار کراچی ۲؍۲۲۵)

لیکن فتوی میں آپ نے سب لوگوں کی نماز کو بلا کراہت درست قرار دے دیا اس کی کیا وجہ ہوئی؟ کیا آپ کی تحقیق اب بدل گئی؟ اور کیا آپ نے پہلے قول سے رجوع کرلیا؟

آپ نے فتوی میں جو عبارت پیش کی ہے، اس سلسلے میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:

قلت: بل ذكر في غاية البيان والعناية أنه لا كراهة فيها بالاتفاق؛ لكن رده في البحر وأجاب في النهر بحمل الاتفاق على عدم الكراهة في حق من كان خارج المسجد وما مر في حق من كان داخله. (رد المحتار ۱۲۷/۳، مطبع زکریا)

اور شیخ زین الدین ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

فما في غاية البيان والعناية من أن الميت وبعض القوم إذا كانا خارج المسجد والباقون فيه لا كراهة اتفاقاً ممنوع......وما اختارو كما نقلناه لم يوافق واحدًا من الاحتمالات الثلاثة؛ لأنهم قالوا بالكراهة إذ وجد أحدهما في المسجد المصلي أو الميت كما قال في المجتبى: وتكره سواء كان الميت والقوم في المسجد أو أحدهما، ولعل وجهه أنه لما لم يكن دليل على واحد من الاحتمالات بعينه قالوا بالكراهة بوجود أحدهما أيا كان.

(البحر الرائق زکریا ۳۲۷/۲)

جس مسجد کے سلسلے میں سائل نے سوال کیا ہے اس مسجد کے سامنے مدرسہ کا میدان ہے اور مسجد کے بائیں جانب کافی زمین خالی پڑی ہے جس زمین کے متعلق سائل نے سوال دوم میں ذکر بھی کیا ہے۔

احادیث اور شروحات احادیث میں اس کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ دور نبوی میں مسجد سے باہر نماز جنازہ کی مستقل جگہ مقرر تھی اور حضور اکرم ﷺ کی دائمی عادت شریفہ بھی مسجد سے باہر نماز جنازہ پڑھنے کی تھی۔ (بخاری شریف ۱۷۷/۱، رقم: ۱۳۱۴، مسلم شریف ۳۱۳/۱، مرقاۃ ۳۴۳/۳، فتح الباری ۵۵۸/۳)

لیکن اس دور میں مستقل جنازہ گاہ کے نام سے کوئی جگہ کیوں مقرر نہیں کی جاتی اور یہ سنت کیوں فوت ہوگئی؟ اور علماء کرام و مفتیان عظام اس کی ترغیب اپنے بیانات وتحریرات میں

کیوں نہیں دیتے ؟ جیسے شہروں اور قصبوں میں عید گاہ کا اہتمام ہوتا ہے، اسی طرح مستقل جنازہ گاہ کا بھی اہتمام ہمیں کرنا چاہئے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالقادر کرتپوری قاسمی، خادم دارالافتاء، اسعد العلوم چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایضاح المسائل میں جو لکھا گیا ہے، یہ اس صورت میں ہے؛ جبکہ مسجد کے باہر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کوئی جگہ موجود ہو، اس کے باوجود مسجد میں نماز جنازہ اس طریقہ سے پڑھی جارہی ہے، اور اس کے متعلق حوالہ ایضاح المسائل میں اپنی جگہ موجود ہے اور ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ میں جو فتویٰ لکھا گیا تھا، وہ اس صورت میں ہے: جبکہ مسجد سے ہٹ کر کے اتنی بڑی کوئی جگہ موجود نہ ہو، جس میں نماز جنازہ آسانی کے ساتھ سب لوگ پڑھ سکیں، تو ایسی تنگی کی صورت میں اس فتویٰ میں لکھی ہوئی شکل بلا کراہت درست ہے اور اس کے ذیل میں جو عربی عبارت لکھی گئی ہے، اس میں اس بات کی صراحت موجود ہے، تو معلوم ہوگیا کہ ایضاح المسائل اور بعد میں لکھے ہوئے فتویٰ میں کوئی تعارض نہیں ہے اور فتویٰ کے سوال نامہ میں ایسی وضاحت نہیں ہے، جو آں جناب نے اس وقت کی تحریر میں صاف لکھا ہے، مسجد سے متصل مدرسہ کا میدان پڑا ہوا ہے، جس میں نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، ایسی صاف وضاحت کے ساتھ ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ کا سوال نامہ نہیں ہے؛ لہٰذا آں جناب نے اس وقت جو وضاحت کی ہے، اس اعتبار سے فتنہ اور اختلاف نہ ہوتا ہو اور اگر فتنہ، اختلاف اور رکاوٹ ہے، تو پھر مسجد میں مذکورہ طریقے سے نماز جنازہ پڑھنا بلا کراہت درست ہو جائے گا۔ اب وہاں کیا صورت حال ہے، آں جناب خود اس کا جائزہ لے لیں، تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آں جناب ایک عالم دین اور مفتی بھی ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(رجسٹر خاص)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۲۹ھ

نماز جنازہ میں کچھ مقتدیوں کا اندرون مسجد کھڑا ہونا

سوال [۴۸۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد ہے اس مسجد کے حدود مسجد سے باہر ایک جگہ ہے، جس میں نماز جنازہ پڑھی جائے گی، وہاں پر جنازہ بھی رکھا جائے گا، امام بھی کھڑا ہوگا اور کچھ متقدی بھی کھڑے ہوں گے؛ لیکن جب تعداد زیادہ ہوجائے گی تو کچھ لوگ حدود مسجد میں بھی کھڑے ہوں گے، اب یہاں سوال یہ ہے کہ جولوگ حدود مسجد میں کھڑے ہوں گے، ان کی نماز میں خرابی تو نہیں آئے گی، اگر خرابی آئے گی تو کون سی خرابی ہوگی؟ واضح رہے کہ نماز جنازہ کے لئے قرب و جوار میں اور کوئی جگہ بھی سرکاری سڑک کے علاوہ نہیں ہے۔

المستفتی: الحاج سید ولی الدین (ریٹائر ریلوے ڈرائیور) محلہ کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب جنازہ امام اور کچھ مقتدی خارج مسجد میں اور کچھ دوسرے مقتدی حدود مسجد میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں، تو جولوگ حدود مسجد کے اندر کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے ہیں، ان کے بارے میں فقہاء کی عبارات دوطرح کی ہیں۔

(۱) وہ عبارت جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حدود مسجد کے اندر کھڑے ہونے والے کی نماز بلاکراہت درست ہوجائے گی، جیسا کہ شرح کبیری کی عبارت ہے۔

ولو وضعت خارج المسجد، والإمام، وبعض القوم معها، والباقي في المسجد، والصفوف متصلة لا يكره. (شرح كبيري، كتاب الصلاة، فصل في الجنازة، نسخه قديم ٥٤٦، مكتبه، اشرفية ديو بند ٥٨٩)

(۲) اور فقہاء کی بعض عبارتیں ایسی ہیں، جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جولوگ حدود مسجد کے اندر کھڑے ہیں، ان کی نماز مکروہ ہوگی جیسا کہ خلاصہ کے حوالے سے فتح القدیر وغیرہ میں منقول ہے۔

في الخلاصة: مكروه سواء كان الميت والقوم في المسجد، أو كان الـميت خارج المسجد، والقوم في المسجد، أو كان الإمام مع بعض القوم خـارج الـمسـجـد، والـقـوم الباقـون في المسجد، أو الميت في المسجد، والإمام، والقوم خارج المسجد، وهو المختار. (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة بيروت ۲/۱۲۸، زكريا ۲/۱۳۳، کوئٹہ۲/۹۰)

اب فقہاء کی دونوں طرح کی عبارات میں مطابقت کے ساتھ عمل کی یہی صورت ہوگی کہ اگر مسجد کے علاوہ محلّہ اوراطراف یا قبرستان میں یا وسیع سڑک اور میدان میں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، تو ایسی صورت میں مسجد کے اندراس طریقے سے نماز جنازہ پڑھی جائے، تو مکروہ ہوگی اور اگر نماز جنازہ کے لئے نہ قبرستان میں جگہ ہے اور نہ محلے کے اطراف میں کوئی میدان ہےاور نہ ہی وسیع سڑک ہے اور نہ کوئی ایسا پھاٹک ہے، جس میں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہو یا نماز جنازہ کے لئے جگہ موجود ہو؛ لیکن بارش ہورہی ہو، تو اس طرح کی ضرورت اور تنگی کی صورت میں مسجد کے اندر مذکورہ طریقے سے نماز جنازہ پڑھی جائے، تو ایسی صورت میں بلا کراہت نماز جنازہ درست ہے اور جولوگ حدود مسجد میں کھڑے ہوں، ان کی نماز جنازہ بھی بلا کراہت درست ہوجائے گی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۱۲/۳۰ھ

مسجد میں نماز جنازہ جبکہ امام اور کچھ مقتدی خارج مسجد ہوں

سوال [۳۸۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پنجوقتہ نماز با جماعت والی مسجد ہے اور وہ جامع مسجد بھی ہے، جگہ کی تنگی اور نمازیوں کی کثرت ہے، اگر نماز جنازہ اس طرح پڑھی جائے کہ میت اور امام اور کچھ لوگ تقریباً دو صف مسجد سے آگے متصلاً خارج مسجد ہوں اور باقی نماز جنازہ پڑھنے والے

نمازیوں کی بڑی تعداد مسجد کے اندر ہو، تو کیا اس طرح نماز جنازہ پڑھنا درست ہے؟ جبکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں خاص طور پر اس جگہ بہت سی سماجی اور مسلکی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہاں کا اکثر معمول بھی یہی ہے کہ لوگ جنازہ کو کسی نہ کسی نماز باجماعت کے بعد ہی لاتے اور پڑھتے ہیں۔

المستفتی: انجمن اسلامیہ کمیٹی، جامع مسجد گاندھی نگر بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر خارج مسجد نماز جنازہ کے لئے اتنی بڑی جگہ میسر نہیں ہے، جس میں جنازہ کی نماز صحیح طور پر ادا کی جا سکے، تو ایسی تنگی کی صورت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ جنازہ کو باہر رکھا جائے اور امام اور کچھ لوگ مسجد سے باہر کھڑے ہو جائیں اور بڑا مجمع مسجد کے اندر ہو؛ لیکن بعض فقہاء نے ایسی صورت میں مسجد کے اندر کے لوگوں کی نماز کو مکروہ تنزیہی کہا ہے اور مسجد کے باہر کے لوگوں کی نماز کو بلا کراہت درست کہا ہے اور مجبوری کی حالت میں یہی قول راجح ہے کہ سب کی نماز بلا کراہت درست ہو جائے گی اور جو مجبوری سائل نے سوال نامہ میں درج کی ہے، تو ایسی مجبوری کی صورت میں انشاء اللہ سب کی نماز بلا کراہت درست ہو جائے گی۔

واختلف في الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم، والمختار الكراهة مطلقاً. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچي ٢/٢٢٥، زكريا ٣/١٢٦)

وإن كانت الجنازة والإمام، وبعض القوم خارج المسجد والباقي فيه لم تكره بالاتفاق. (عناية مع فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة بيروت ٢/١٢٨، زكريا ٢/١٣٢، كوئٹه ٢/٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٤ / ربیع الثانیہ ١٤٢٨ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٨ / ٩٢٥٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٨/٤/١٤ھ

جنازہ مسجد سے باہر ہو اور امام و مقتدی سب اندر ہوں تو کیا حکم ہے؟

سوال [۳۸۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ جنازہ خارج مسجد ہو اور نمازی و امام داخل مسجد ہو؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد فضل اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بلاضرورت اور مجبوری کے مسجد میں اس طرح نماز جنازہ پڑھنا کہ جنازہ مسجد کے باہر ہو، امام اور تمام نمازی داخل مسجد ہوں تو سب کی نماز مکروہ ہوگی۔

(مستفاد: ایضاح المسائل ۷۵، امداد الفتاوی ۱/۶۶۷، فتاوی رشیدیہ ۴۳۲)

إن الميت إذا وضع خارج المسجد لعذر، والقوم كلهم في المسجد ...... لايكره ولو كان من غير عذر اختلف المشايخ فيه بناء على اختلافهم أن الكراهية لأجل التلويث؛ أو لأن المسجد بني لأداء المكتوبات لا لصلوة الجنازة.

(تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ۱/۵۸۰، امداديه ملتان ۱/۲۴۳)

واختلف في الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم، والمختار الكراهة مطلقاً بناء على أن المسجد إنما بنى للمكتوبة. (الدر مع الرد، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا۳/۱۲۶، كراچي ۲/۲۲۵، خلاصة الفتاوى، كوئٹه ۱/۲۲۲)

لو كانت الجنازة وحدها خارج المسجد، والإمام، والقوم في المسجد قيل: يكره؛ لأن المسجد لِأداء المكتوبات، فلا يقام فيه غيرها إلا لعذر. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/۲۷۲، قديم ۱/۱۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۵۴/۴۰)

نماز جنازہ میں امام کے ساتھ کچھ مقتدی مسجد سے باہر اور کچھ اندر ہوں

سوال [۳۸۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی اور میت خارج مسجد دائیں بائیں رکھی ہوئی تھی، تو کیا اس صورت میں نماز ہ جنازہ ہوئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو جس امام نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے متعلق کیا مسئلہ ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد یامین، فرید نگر، ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جنازہ، امام اور کچھ مقتدی مسجد سے خارج ہوں اور صفوف بھی متصل ہوں، تو بلا کراہت نماز درست ہوجائے گی۔

ولو وضعت خارج المسجد، والإمام، وبعض القوم معها، والباقي في المسجد، والصفوف متصلة لايكره (إلى قوله) وإلى عدمها مال في المبسوط، وفي المحيط: وعليه العمل وهوالمختار الخ (غنية المستملي شرح منية المصلي، فصل في الجنائز، مكتبه رحيمية ديوبند، قديم ٥٤٦، اشرفية ديو بند ٥٨٩، صغيري، مكتبه مجتبائى دهلي ٢٩١)

أما إذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره إذا كان الميت خارج المسجد وحده أو مع بعض القوم. قال في شرح المنية: وإليه مال في المبسوط والمحيط، وعليه العمل وهو المختار. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا٣/١٢٦، كراچي ٢/٢٢٥)

وإن كان الإمام مع بعض القوم والجنازة خارج المسجد، وما بقي في المسجد ذكر نجم الأئمة النسفي في فتاواه: أن الصلاة غير مكروهة بالاتفاق. (المحيط البرهاني، كتاب الكراهة والإستحسان، الفصل الرابع، الصلاة والتسبيح وتلاوة القرآن والذكر، المجلس العلمي ٧/٥٠٤، رقم:٩٤١٨)

اور اگر جنازہ خارج مسجد ہے اور امام ومقتدی سب داخل مسجد ہیں، یا بعض مقتدی باہر ہیں او ربعض مسجد یا صفوف متصل میں ہیں، تو نماز کراہت کے ساتھ ادا ہوگی۔

واختلف في الخارجة عن المسجد وحده، أو مع بعض القوم والمختار الكراهة. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ١٢٦/٣، كراچي ٢٢٥/٢، مصري نعمانية ٦٥٣/١، وهكذا في تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، امداديه ملتان ٢٤٣/١، زكريا ديوبند ٥٨٠/١، أحسن الفتاوى ١٨٣/٤، امداد الفتاوى ٧٦٦/١)

ایسی صورت میں مذکورہ امام کو نہ فاسق کہا جائے گا اور نہ اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۵۵۵)

عیدگاہ میں نماز جنازہ

سوال [۳۸۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے قصبہ میں قبرستان کے ایک کونے میں عیدگاہ بنائی گئی ہے اور عیدگاہ میں نماز جنازہ ہمیشہ سے پڑھتے آئے ہیں، تقریباً پانچ سال قبل عیدگاہ کے بازو میں ایک ہال بنایا گیا ہے؛ لیکن نماز جنازہ پڑھنے کے لئے یہ ہال چھوٹا پڑتا ہے اور دوسری جگہ بھی نہیں ہے، اگر عید گاہ میں نماز جنازہ پڑھی جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟

المستفتی: شبیر احمد قاسمی، خادم مدرسہ اشرف العلوم (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عیدگاہ ہر پہلو سے مسجد کے حکم میں نہیں ہے؛ بلکہ بعض پہلو سے مسجد کے حکم میں ہے؛ لہٰذا عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھنا بلا کراہت درست ہے۔

لاتكره صلوٰة الجنازة في مسجد أعدلها، و كذا في مدرسة ومصلى عيد؛ لأنه ليس لها حكم المسجد في الأصح. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ٥٩٥، قديم ٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵ / ۷۰۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۲/۱۴۲۲ھ

عیدگاہ میں نماز جنازہ اور چپل پہن کر چلنے کا حکم

سوال [۷۳۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض مقامات پر نماز جنازہ عیدگاہ میں ہوتی ہے، عیدگاہ کے بارے میں بھی تحریر فرمائیں کہ عیدگاہ میں جوتے وغیرہ پہن کر جاسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: خلیل احمد، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کی حالت میں عیدگاہ کا حکم مسجد کی طرح ہے اور نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں اس کا حکم ایک میدان کے مانند ہے، اس میں جوتے چپل پہن کر جانا یا حائضہ اور نفساء عورتوں کا داخل ہونا سب جائز ہے؛ البتہ عید کی نماز وغیرہ کے موقع پر جوتے چپل پہن کر عیدگاہ میں داخل ہونا بے ادبی ہے، جس طرح مسجد میں اس کو پہن کر داخل ہونا بے ادبی ہے؛ اس لئے اس طرح عیدگاہ میں جانے سے احتراز کرنا چاہئے۔

واما المتخذ لصلوة جنازة أو عيد، فهو مسجد في حق جواز الاقتداء لا في حق غيره فحل دخوله لجنب حائض كفناء المسجد ورباط ومدرسة. (الدر مع الرد، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة و ما يكره فيها، كراچي ١/٦٥٧، زكريا٢/ ٤٣٠)

واختلفوا أيضاً في مصلى العيدين، أنه هل هو مسجد؟ والصحيح أنه مسجد في حق جواز الإقتداء، وإن لم تتصل الصفوف،

لأنه أعد للصلاة حقيقة لا في حرمة دخول الجنب و الحائض.

(البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا ۳۲۸/۲، كوئٹه ۱۸۷/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۰۶۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۲۸ھ

قبرستان میں نماز جنازہ

سوال [۴۸۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قبرستان کے اندر جنازہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور جگہ کی مجبوری کی وجہ سے قبرستان میں پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالستار، مدرسہ اسلامیہ فیض العلوم، بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قبرستان کے اندر کوئی خالی جگہ ہو، جس میں کوئی قبر نہ ہو، تو اس میں نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے اور اگر خالی جگہ میں کچھ قبریں بھی ہوں، تو نماز جنازہ کے وقت سامنے کوئی قبر نہ ہو تب بھی بلا کراہت جائز ہے اور اگر سامنے کوئی قبر ہو اور اس جگہ کے علاوہ نماز جنازہ کے لئے دوسری جگہ بھی نہ ہو، تو اس قبر کے سامنے کسی چیز کی آڑ کر دی جائے تب بھی بلا کراہت نماز جنازہ صحیح ہو جائے گی اور اگر آڑ پیدا کرنے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے، تو مجبوری کے تحت آس پاس میں آمنے سامنے قبریں ہونے کے باوجود نماز جنازہ درست ہو جاتی ہے اور بلا عذر مکروہ ہے۔

قال أبو حنيفة: لاينبغي أن يصلى على ميت بين القبور -إلى- ثم محل الكراهة إذا لم يكن عذراً، فإن كان فلا كراهة اتفاقاً. (حاشية الطحطاوي

علی المراقي الفلاح، کتاب الصلاۃ، باب أحکام الجنائز، دارالکتاب دیوبند ۵۹۵، قدیم ۳۲۶، بدائع الصنائع، کتاب الصلاۃ، سنن الدفن، زکریا ۲/۶۵، کراچي ۱/۳۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۴۷۳؍۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱؍۲؍۱۴۲۳ھ

قبرستان کی خالی جگہ میں نماز جنازہ

سوال [۳۸۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضلع پورنیہ میں ہندو مسلم کی پارس منی نام کی ایک بستی ہے، یہاں کا قبرستان تقریباً ۹؍بیگھہ زمین میں واقع ہے، قبرستان کی چوطرفہ آراضی غیر مسلموں کی ہے، نماز جنازہ کے لئے ہمیشہ پریشانی رہتی ہے، کسی غیر متعین جگہ میں غیر مسلم کی جگہ پر نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے، خرید کے لئے بھی کوئی جگہ موقع کی ملتی نہیں ہے اور ادھر قبرستان کے حدود میں پچھّم اور دکھن جانب سے اسی جگہ تقریباً ۴؍کٹھا خالی ہے نہ تو کوئی قبر ہے اور نہ ہی ہم لوگوں نے اپنی عمر میں کسی کو دفن کیا ہے اور نہ ہی کرتے دیکھا ہے، اس صورت میں اگر جنازہ کی نماز کے لئے ضرورت کے مطابق کچھ حصہ کو مقرر کر لیا جائے اور قبلہ کی جانب سے نشان کے لئے دیوار وغیرہ قائم کرلی جائے تو از روئے شریعت کیسا ہے؟

المستفتی: اہلیان پارس منی، پورنیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں مذکور قبرستان کی خالی جگہ میں نماز جنازہ پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، مگر اس کو دیوار وغیرہ قائم کر کے اس طرح سے متعین کر لینا کہ یہ قبرستان سے الگ جنازے کے لئے متعین جگہ سمجھی جانے لگے اور اس جگہ مردے دفن کرنے کی ضرورت کے وقت وہ جگہ مانع بن جائے یہ جائز نہیں؛ ہاں البتہ اگر سامنے قبریں

ہوں تو میت کی چارپائی کی لمبائی کے برابر دیوار قائم کردینا کافی ہے، مقتدیوں کی صفوں کے برابر پوری سمت قبلہ میں دیوار بنانے کی ضرورت نہیں۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۹/۱۰۵، ۱۰۶، امداد الفتاوی ۱/۷۳۳)

وعن أبي حنيفةؒ أنه قال: لاينبغي أن يصلى على ميت بين القبور، وإن صلى أجزأهم. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون، كتاب الجائز، المجلس العلمي ۳/۹٤، رقم: ۲٤۸٥، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون، كتاب الجنائز، القبر الدفن، زكريا ۳/۷۳، رقم: ۳۷٤۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۴۲)

قبرستان کی خالی جگہ پر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال [۳۸۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک قبرستان کافی بڑا ہے، اس کے ایک حصہ میں ابھی مردیت دفین نہیں ہیں، تو قبرستان کی اس خالی جگہ پر نماز جنازہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز قبرستان میں نماز پڑھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد تعظیم قاسمی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قبرستان کی وہ خالی جگہ جس میں تدفین شروع نہیں ہوئی، اس میں نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے جائز اور درست ہے، ہاں البتہ نماز پنج گانہ قبرستان میں اگر پڑھنا ہے تو اس جگہ پڑھنا جائز ہے جہاں نماز پڑھنے میں سامنے کوئی قبر نہ ہو، ورنہ مکروہ ہوگی۔

عن أبي مرثد الغنويؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تجلسوا

علی القبور، ولا تصلوا إلیها. (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب النهی عن الجلوس علی القبر، والصلاة علیه، النسخة الهندیة ۱/۳۱۲، بیت الأفکار رقم: ۹۷۲، سنن الترمذي، ابواب الجنائز، باب ماجاء في کراهة الوطي علی القبور والجلوس علیها، النسخة الهندیة ۱/۲۰۳، دارالسلام رقم: ۱۰۵۰، صحیح ابن خزیمة المکتب الإسلامي ۱/۴۰۸، رقم:۷۹۳)

أو کان في المقبرة موضع أعد للصلوة، ولاقبر ولا نجاسة فیه، فلابأس کما في الخانیة–إلی قوله– وفي القهستاني: لاتکره الصلوة في جهة قبر إلا إذا کان بین یدیه بحیث لو صلی صلوة الخاشعین وقع بصره علیه کما في جنائز المضمرات. (شامي، کتاب الصلاة، باب ما یفسد الصلاة وما یکره، قبیل مطلب في أحکام المسجد، زکریا ۲/۴۲۵، کراچي ۱/۶۵۴، حاشیة الطحطاوي علی المراقي، کتاب الصلاة، فصل في المکروهات اشرفي ۳۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ /۹۴۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۲ھ

قبرستان میں دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بار نماز جنازہ با جماعت ہوجانے کے بعد جبکہ جنازہ دفن ہوچکا؛ لیکن لوگ ابھی قبر کے پاس موجود ہیں، کیا دوبارہ قبرستان ہی کی حدود میں قبر سے ہٹ کر نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: بشیرالدین، مونگیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب باقاعدہ نماز جنازہ کے بعد دفن کیا جاچکا ہے، تو پھر اس

کے بعد دوبارہ قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنا حدیث وفقہ اور ائمہ مجتہدین میں سے کسی سے ثابت نہیں ہے۔

ولایصلی علی میت إلا مرة واحدةً. (الفتاوی التاتار خانیة، کتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون الجنائز، المتفرقات، زکریا ۳/ ۸۵، رقم: ۳۷۸۰، هندیة، کتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة علی المیت، زکریا قدیم ۱/ ۱۶۵، جدید ۱/ ۲۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۱۹/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۱/۱۸ھ

عیدگاہ یا صحن مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹانڈہ بادلی کی عیدگاہ قبرستان کے بیچ واقع ہے، عیدگاہ کی چہار دیواری ہے، نماز جنازہ عیدگاہ میں ہوتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ نماز جنازہ عیدگاہ میں پڑھنے میں کوئی کراہت تو نہیں؟

(۲) ٹانڈہ کی جامع مسجد کی سہ دری میں نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، اس طرح پر کہ جنازہ اور امام اور کچھ مقتدی سہ دری میں ہوتے ہیں اور اکثر مقتدی مسجد کے صحن میں ہوتے ہیں، صحن والے مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مولانا جلیس احمد، محلّہ نیب ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدگاہ میں نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/۱۴۲، جدید زکریا ۳/ ۱۸۶، جدید زکریا مطول ۵/ ۳۹۱، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۲۹۱، جدید ڈابھیل ۹/ ۷۰۵، احسن الفتاوی ۴/ ۲۱۶)

لأنها لا تكره في مسجد أعدلها، وكذا في مدرسة ومصلي عيد؛ لأنه ليس لها حكم المسجد في الأصح إلا في جواز الاقتداء. (حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، دار الكتاب ديوبند ٥٩٥، قديم ٣٤٧)

(۲) صحن مسجد چونکہ حدود مسجد میں داخل ہے؛ اس لئے ان کی نماز مکروہ اور خلاف سنت ہوگی۔

(مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/۶۶۷، فتاوی رشیدیہ ۴۳۳، جدید زکریا ۴۰۷، ایضاح المسائل ص: ۷۵)

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى على جنازة في المسجد فلا شيئ عليه. (سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الصلاة على الجنازة في المسجد، النسخة الهندية ٢/٤٥٤، دارالسلام رقم: ٣١٩١)

وكرهت تحريمًا وقيل تنزيهًا في مسجد جماعة، هو أي الميت فيه وحده، أو مع القوم. (در مختارمع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة، مطلب في كراهة صلوة الجنازة في المسجد، كراچي ٢/٢٢٥، زكريا ٣/١٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۳۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۲/۱۴۱۶ھ

جوتے پہن کرنماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز جنازہ کے وقت کچھ لوگ اپنے جوتے اتار لیتے ہیں، کچھ لوگ اپنے جوتے اتار کر پیر ان پر رکھ لیتے ہیں، کچھ جوتے چپل اتار کر نماز پڑھتے ہیں، کچھ لوگ جوتے چپل پہنے ہوئے ہی نماز پڑھ لیتے ہیں، اس نماز کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: مظہر حیات، رحمت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر نماز جنازہ صاف ستھری ایسی پاک زمین پر ہو رہی

ہو، جس میں کسی قسم کی نجاست اور گندگی کا اندیشہ نہیں ہے، ہر طرح کی گندگیوں سے پاک ہے، تو ایسی زمین پر جوتا اتار کر زمین پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا بہتر ہے، جیسا کہ مسجد اور مدرسہ وغیرہ کے فرش اور اگر نماز جنازہ عام سڑک پر ہو رہی ہے، جس میں جانوروں کی نجاست، پیشاب اور خشک گوبر کے ذرات وغیرہ ہر چیز کا اندیشہ ہے، تو اس میں بہتر شکل یہی ہے کہ جوتا اتار کر جوتے کے اوپر پیر رکھ کر کھڑا ہو جائے، اگر چہ جوتے کے نیچے نجاست لگی ہو تب بھی اس طرح نماز جنازہ پڑھنے میں کسی قسم کی خرابی نہیں اور سڑکوں پر نماز جنازہ پڑھنے میں یہی شکل اختیار کرنی چاہئے؛ اس لئے کہ سڑک کی زمین کا اعتبار نہیں ہے اور اگر جوتا اتارا نہ جائے؛ بلکہ پہننے کی حالت میں نماز جنازہ پڑھی جائے، تو اس کی دو شکلیں ہیں۔

(۱) جوتے کے نیچے کسی قسم کی نجاست لگی ہوئی نہیں ہے، تو نماز درست ہو جاتی ہے۔

(۲) جوتے کے نیچے نجاست لگی ہوئی ہو، تو ایسی صورت میں جوتا پہننے کی حالت میں نماز جنازہ درست نہیں ہے اور پیر سے اتار کر جوتے کے اوپر پیر رکھنا پہننا نہیں ہے؛ اس لئے جس جوتے کے نیچے ناپاکی ہو، اس کے اوپر پاک حصہ پر پیر رکھ کر نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے۔

(مستفاد: امداد الاحکام ۲/۴۴۶)

ولو قام على النجاسة وفي رجليه نعلان أو جوربان لم تجز صلاته. كذا في المحيط السرخسي، ولو خلع نعليه وقام عليهما جاز سواء كان ما يلي الأرض منه نجسًا أو طاهراً إذا كان ما يلي القدم طاهراً. (عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الثاني في طهارة ما يستربه العورة وغيره، زكريا قديم ۱/۶۲، جديد ۱/۱۱۹، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ۵۸۲، قديم ۳۱۹، الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في الفرائض، زكريا ۲/۳۱، رقم: ۱۵۹٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۱۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۱ھ

سڑک پر نماز جنازہ

سوال[۴۸۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محلّہ پیر غیب زیارت والی مسجد میں اندر جنازہ لے جانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جنازہ کی نماز سڑک پر ہوتی ہے، تو آنے جانے والوں کو پریشانی ہوگی۔

(۲) مسجد کے پیش طاق پر پشت میں درگاہ سلطان صاحب کا صحن ہے، جنازہ اس صحن میں رکھ کر پیش طاق کی کھڑکی کھول کر امام صاحب اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر کیا جنازہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: متولی پرویز نبی خاں، سلطان صاحب والی مسجد، پیر غیب مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جنازہ کی نماز میں ۵/منٹ سے زائد نہیں لگتے، اتنی دیر ایک مسلمان کی نماز جنازہ کے لئے آمد و رفت ملتوی کرنے میں کوئی پریشانی نہیں، کیا تقریبات وغیرہ کے لئے سڑکوں پر خیمہ وغیرہ سے چار چار پانچ گھنٹے تک آمد ورفت پر روک لگانے پر اشکال کیا جاتا ہے؟ لہٰذا یہ عذر معقول نہیں، نماز جنازہ مسجد میں ایسی صورت میں مکروہ رہے گی۔

عن أبي هريرة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى على جنازة في المسجد فلا شيئ عليه. الحديث (ابو داؤد، كتاب الجنائز، باب الصلوة على الجنائزة في المسجد، النسخة الهندية ۲/ ۴۵۴، دارالسلام رقم: ۳۱۹۱، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۴۵۵، رقم: ۹۸۶۵)

(۲) ایسی صورت میں صحن میں کھڑے ہونے والوں کی نماز بلاکراہت اور مسجد میں کھڑے ہونے والوں کی کراہت کے ساتھ نماز ہوجائے گی اور یہاں سب مسجد میں ہوں گے؛ لہٰذا سب کی مکروہ ہوگی۔

فشمل ما إذا كان الميت والقوم في المسجد أو كان الإمام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقون في المسجد، أو الميت في المسجد والإمام والقوم خارج المسجد هو المختار (إلى قوله) هذا الإطلاق في الكراهة بناء على أن المسجد إنما بنى للصلوة المكتوبة وتوابعها من النوافل. (البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا٢/٣٢٧، كوئٹہ ٢/١٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۵۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۲/۲۲ھ

سڑکوں پر نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کثرت جماعت کی وجہ سے کبھی نماز جنازہ مسجد کے باہر ایسی سڑک پر پڑھی جاتی ہے جہاں عموماً گائے، بیل وغیرہ جانوروں کا گذر ہوتا رہتا ہے؛ لہٰذا بعض لوگ جوتے پہن کر، بعض لوگ جوتے اتار کر ان پر کھڑے ہوکر اور بعض لوگ بغیر جوتوں کے ایسے ہی زمین پر کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھتے ہیں، ان تینوں میں کون سا عمل صحیح اور کون سا غلط ہے؟ اگر سب صحیح ہیں تو کون سی صورت افضل ہے؟

المستفتی: محمد جنید، پلیڑی، متعلم مدرسہ مفتاح العلوم، میل وشارم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب سڑکوں پر گوبر اور گندگیاں ہوتی ہیں، تو ایسی سڑک پر ننگے پیر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے؛ اس لئے کہ سڑک اگرچہ خشک بھی ہوجائے اور اس پر گندگیاں ہوں تو ناپاک ہوتی ہے؛ اس لئے سڑک پر جب نماز جنازہ پڑھی جائے تو جوتا،

چپل پیروں سے اتار کر جوتے، چپل کے اوپر کے حصہ پر پیر رکھ کر نماز جنازہ پڑھی جائے، یہی سڑکوں پر نماز پڑھنے کا بہتر طریقہ ہے، ایسی صورت میں اگر جوتا، چپل میں بھی ناپاکی لگی ہوئی ہوگی تب بھی نماز کے صحیح ہونے میں شکوک وشبہات باقی نہیں رہیں گے؛ اس لئے کہ ایسے جوتے، چپل پہن کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی جن کے نیچے ناپاکی لگی ہوتی ہے؛ لیکن اس طرح ناپاکی لگے ہوئے جوتوں کو پیروں سے اتار کر پھر جوتے کے اوپر کا حصہ جو پاک ہے اس پر پیر رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے سے نماز درست ہوجاتی ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۳۷، احسن الفتاوی ۴/۱۹۲)

ولو قام على النجاسة و في رجليه نعلان،أو جوربان لم تجز صلاته؛ لأنه قام على مكان نجس، ولو افترش نعليه وقام عليهما جازت الصلاة.

(البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، زكريا ١/٤٦٦، كراچي ١/١٦٨، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب أحكام الجنائز، فصل في الصلاة عليه، دارالكتاب ديوبند ص:٥٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ ر شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۱۱۹)	۱۴۲۷/۸/۸ھ

(۷) باب من يستحق بالصلاة على الميت

نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار کون ہے؟

سوال [۳۸۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں جماعت اسلامی کے ہم خیال آدمی کے گھر میں ایک میت ہوئی، تواس نے محلّہ کے امام کو چھوڑ کر جماعت اسلامی خیال کے ایک عام آدمی سے نماز جنازہ پڑھوائی، جو عالم نہیں ہے؛ بلکہ اس کا کام گھر گھر جا کر جماعت اسلامی کی تبلیغ کرنا ہے، جس وقت نماز جنازہ ہوئی امام صاحب موجود تھے، محلّہ کے امام کی کوئی پرواہ نہیں کی؛ تو اب معلوم کرنا ہے کہ:

(۱) میت کی نماز محلّہ کے امام کی اہانت کر کے دوسرے عام جماعت اسلامی خیال کے آدمی سے پڑھوا کر یہ کام ٹھیک کیا ہے یا غلط کیا ہے؟

(۲) یہ نماز کامل ہوئی ہے یا نہیں؟

(۳) پڑھانے والے اور پڑھوانے والوں کی سزا کیا ہوگی؟

المستفتی: مفتی لیاقت علی قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: میت کے ولی نے امام مسجد کو چھوڑ کر کسی اور سے نماز جنازہ پڑھوالی تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں، نہ پڑھنے والوں پر کوئی گناہ، اور نہ پڑھوانے والوں پر کوئی گناہ ہے، نماز بالکل درست ہے؛ البتہ محلّہ کے امام سے نماز پڑھوانا زیادہ بہتر تھا؛ لیکن جب ولی نے کسی دوسرے سے نماز پڑھوالی تو یہ بھی جائز ہے، اس سے محلّہ کے امام کی توہین نہیں ہوئی۔

أخرج البخاري تعليقاً: قال الحسن: أدركت الناس وأحقهم بالصلاة

علی جنائزهم من رضوه لفرائضهم. (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب سنة الصلاة على الجنازة، النسخة الهندية ۱/۱۷۶)

عن حماد قال: يقدم الولي على الجنازة من أحب. (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، ما قالوا في تقدم الإمام على الجنازة، مؤسسة علوم القرآن جديد ۷/۲۳۲، رقم: ۱۱۴۳۵)

ثم إمام الحی وهو إمام المسجد الخاص بالمحلة، وإنما كان اولیٰ لأن الميت رضی بالصلوٰة خلفه في حال حياته فينبغی أن يصلی عليه بعد وفاته. (شامی، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچی ۲/۲۲۰، زكريا ۳/۱۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۳۴ ۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

اولاً نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار کون؟

سوال [۳۸۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محلّہ کے امام کی موجودگی میں مسجد سے متعلق کسی نمازی یا مقتدی کا انتقال ہوجائے تو نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار مسجد کا امام ہے یا ولی کا نامزد کیا ہوا دوسرا امام، جوابات دیکر ممنون ومشکور فرمائیں۔

المستفتی: اہلیان جامع مسجد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد سے متعلق کسی مقتدی یا نمازی کا انتقال ہوجاتا ہے تو جنازے کی نماز پڑھانے کا زیادہ حقدار امام مسجد ہے، ولی کا نام زد کیا ہوا حقدار نہیں ہے، دوسرے سے پڑھوانے کی صورت میں امام سے اجازت لینی ضروری ہے۔

عن عروةؓ، قال: لما قتل عمر ابتدر علي و عثمان للصلاة عليه، فقال

لهما صهيب: إليكما عني فقد وليت من أمر كما أكثر من الصلاة على عمر وأنا أصلي بكم المكتوبة، فصلى عليه صهيب. (المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز، ۱۷۰۲/۵، رقم: ۴۵۱۷)

وأما بيان من له ولاية الصلاة على الميت، فذكر في الأصل أن إمام الحى أحق بالصلاة علىٰ الميت، وروى الحسن عن أبى حنيفة رحمهما الله تعالىٰ أن الإمام الأعظم أحق بالصلاة إن حضر، فإن لم يحضر فأمير المصر، وإن لم يحضر فإمام الحى، فإن لم يحضر فالأقرب من ذوى قراباته وهٰذا هو حاصل المذهب عندنا. (بدائع الصنائع، فصل في بيان من له ولاية الصلاة، کراچی ۳۱۷/۱، زکریا ۵۸/۲، البناية، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، اشرفيه ديوبند ۲۰۸/۳)

ثم إمام الحى أى الطائفة، وهو إمام المسجد الخاص بالمحلة، وإنما كان أولىٰ لأن الميت رضى بالصلاة خلفه في حال حياته، فينبغى أن يصلى عليه بعد وفاته. (شامی، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، کراچی ۲۲۰/۲، زکریا ۱۱۹/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۸؍ رمضان ۱۴۲۲ھ
۱۴۲۲/۹/۱۸ھ	(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۷۶)

باشرع حافظ قرآن ولی کی موجودگی میں نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار کون ہوگا؟

سوال [۳۸۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے والد کا انتقال ہوا، زید مسائل ضروریہ سے واقف ہے اور قرآن پاک کا حفظ کر رہا ہے؛ نیز متشرع ہے، زید کا بڑا بھائی تارک صلاۃ اور بے شرع ہے، مرحوم باپ کی نماز ہ زید خود پڑھانا چاہتا تھا؛ لیکن زید کے کنبہ کے ایک آدمی نے بغیر زید کی مرضی کے محض بڑے بھائی کی اجازت پر نماز پڑھائی، زید نے کہا کہ میری طرف سے کوئی اجازت نہیں ہے؛ جبکہ بڑا

بھائی جس نے نماز کی اجازت دی خود شریک نماز نہیں ہوا، ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے اور جس شخص نے نماز جنازہ زبردستی پڑھائی وہ عالم حافظ کچھ نہیں اور نہ ہی کسی مسجد کا امام ہے، ایسے شخص کے لئے شرعی حکم کیا ہے، جواب عنایت فرمایا جائے۔

المستفتی: محمد اسلام الدین، بشن پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب اولیاء میں متقی باشرع حافظ قرآن آدمی موجود ہے تو تارک صلوۃ ولی جو زید کا بڑا بھائی ہے؛ اس کے لئے غیر ولی کو نماز جنازہ پڑھانے کے لئے آگے بڑھانا درست نہیں تھا، نماز پڑھانے کا حق زید کو تھا؛ لہٰذا اگر زید اس نماز میں شریک نہیں ہوا ہے تو زید کو دوبارہ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے نماز پڑھنے کی اجازت ہے؛ لیکن اس میں وہ لوگ شریک نہ ہوں گے جنہوں نے نماز پڑھ لی ہے؛ نیز زید کی اجازت کے بغیر جو نماز پڑھی گئی ہے وہ بھی شرعاً درست ہو چکی ہے اور زید کو صرف اپنا حق حاصل کرنے کے لئے دوبارہ پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے، اور جس نے بڑے بھائی کی اجازت سے نماز پڑھائی ہے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

فإن أراد الأسن أن يقدم أحداً كان للأصغر أن يمنع الخ. (البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا، ۲/۳۱۷، كوئٹه، ۲/۱۸۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳/ شوال ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۴۳۲)	۲۳/۱۰/۱۴۱۱ھ

نماز جنازہ ولی سے اجازت لے کر پڑھائی جائے

سوال [۴۸۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے محلّہ کے امام صاحب کو میت کے ولی سے اجازت لینا

بالکل ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم رتن پوراسو پول بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محلّہ کے امام کو نماز جنازہ پڑھانے کا حق حاصل ہے، جس کے پیچھے میت نے ہمیشہ نماز پڑھی؛ لیکن چونکہ بعض دفعہ ولی بھی پڑھا لکھا ہوتا ہے؛ اس لئے ولی سے اجازت لے کر نماز جنازہ پڑھائی جائے۔ (مستفاد بہشتی زیور، ۹۶/۱۱)

عن عمرؓ أنه قال: الولي أحق بالصلاة عليها. (مصنف عبد الرزاق، الجنائز، باب من أحق بالصلاة على الميت المجلس العلمي، ۴۷۲/۳، رقم: ۶۳۷۳)

أخرج البخاری تعلیقاً: وقال الحسن: أدرکت الناس و أحقهم بالصلاة على جنائزهم من رضوهم لفرائضهم. (صحيح بخاري، الجنائز، باب سنة الصلاة على الجنائز، النسخة الهنديه ۱۷۶/۱)

ثم إمام الحی وإنما کان اولیٰ لأن المیت رضی بالصلاة خلفه في حال حیاته فینبغي أن یصلی علیه بعد وفاته. (شامی، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، کراچی ۲۲۰/۲، زکریا ۱۱۹/۳) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۵۲۷/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۳ھ

ولی کی طرف سے اجازت شدہ شخص کے علاوہ دوسرے کا نماز جنازہ پڑھانا

سوال [۳۸۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بڑی مسجد کے علاقہ میں میت ہوئی، ولی میت نے امام کو مصلے پر کھڑا کیا اور اجازت دے کر جماعت سے الگ ہو گیا اور نمازی صفیں درست کرنے لگے، ولی جماعت میں نہیں تھا، ایک فاسق وفاجر نے یہ کہہ کر کہ ہم اس امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے، اپنے خاندان کے

ایک فرد کو نماز پڑھانے کے لئے کھڑا کیا، پھر دوبارہ ولی میت سے جو کہ دور تھا کہا کہ نماز پڑھائیں؟ ولی نے کہا پڑھاؤ نماز ادا کی گئی، نماز کے بعد ولی میت سے کہا گیا کہ تمہارے امام کو ہٹا کر دوسرے فرد نے نماز پڑھائی ہے، کیا تم نے دوسرے فرد کو اجازت دی تھی، ولی میت نے کہا کہ میں تو اپنی مسجد کے امام ہی کو سمجھ رہا تھا، عرض یہ ہے کہ اس صورت میں نماز جنازہ ادا ہوئی یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ صوفی نعیمی، سرائے کھجور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جنازہ بہرصورت صحیح ہوچکی ہے؛ البتہ حق تقدم کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے؛ تو اس بارے میں حکم شرعی یہ ہے اگر شرعی حاکم وغیرہ نہ ہو تو محلّہ کا امام سب سے زیادہ حقدار ہے اور محلّہ کے امام کے بعد ولی حقدار ہوتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں نماز پنجگانہ کے امام کو ہٹانا درست نہیں تھا وہی حقدار تھا، جس نے ہٹایا ہے غلط کیا ہے، آئندہ ایسی حرکت سے باز رہے۔

عن عروةؓ، قال: لما قتل عمر ابتدر عليٌّ و عثمانؓ للصلاة عليه، فقال لهما صهيب: إليكما عني فقد وليت من أمر كما أكثر من الصلاة على عمر وأنا أصلي بكم المكتوبة، فصلى عليه صهيب. (المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة قديم ٩٢/٣، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ١٧٠٢/٥، رقم: ٤٥١٧)

عن عمرؓ، أنه قال: الولي أحق بالصلاة عليها. (مصنف عبد الرزاق، الجنائز، باب من أحق بالصلاة على الميت المجلس العلمي، ٤٧٢/٣، رقم: ٦٣٧٣)

عن حمادؒ، قال: يقدم الولي على الجنازة من أحب. (المصنف لابن شيبة الجنائز، ما قالوا في تقدم الإمام على الجنازة، مؤسسة علوم القرآن جديد ٢٣٢/٧، رقم: ١١٤٣٥)

ويقدم في الصلوٰة عليه السلطان أو نائبه، ثم القاضي، ثم إمام الحي، ثم الولي الخ. (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ١١٩/٣،

کراچی ۲/ ۹ ۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ رجب ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۷۶۵)

ولی نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار ہے یا محلّہ کی مسجد کا امام؟

سوال [۴۸۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک اپنے کنبہ میں ملا جی ہیں جو کچھ پڑھے لکھے ہیں، ان کے کنبہ میں ایک موت واقع ہوگئی، جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے ملا جی نے کہا کہ یہ حق میرا ہے امام کا نہیں ہے؛ کیونکہ میرا حق امام سے زیادہ ہوتا ہے؛ کیونکہ میں کنبہ کا ہوں؛ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کو بتائیں کہ امام کی بغیر اجازت ملا جی یا اور کوئی کنبے کا شخص نماز جنازہ پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب مرحمت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: ماسٹر ابرار حسین، ڈھکیہ جمعہ، کندرکی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محلّہ کے امام یا کنبہ میں سے کوئی ولی اور رشتہ دار نماز جنازہ پڑھائے تو نماز ہر صورت میں ہوجائے گی؛ ہاں البتہ فضیلت میں فرق ہے، اگر میت کے اولیاء میں سے کوئی محلّہ کے امام سے زیادہ افضل موجود ہے تو وہ زیادہ حقدار ہوگا؛ ورنہ محلّہ کا امام ہی زیادہ حقدار ہوگا؛ لہٰذا اگر ملا جی امام صاحب سے زیادہ افضل ہے تو وہ زیادہ حقدار ہوگا، ورنہ محلّہ کا امام زیادہ حقدار ہوگا۔

عن عمرؓ أنه قال: الولي أحق بالصلاة عليها. (مصنف عبد الرزاق، الجنائز، باب من أحق بالصلاة على الميت، المجلس العلمي، ۳/ ۴۷۲، رقم: ۶۳۷۳)

عن عروةؓ، قال: لما قتل عمر ابتدر عليؓ، و عثمانؓ للصلاة عليه، فقال

لهما صهيب : إليكما عني، فقد وليت من أمر كما أكثر من الصلاة على عمر، وأنا اصلي بكم المكتوبة، فصلى عليه صهيب. (المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى البازجديد ۲/۵ ۱۷۰، رقم: ۴۵۱۷)

وتقديم إمام الحي مندوب فقط بشرط أن يكون أفضل من الولي وإلا فالولي أولىٰ الخ. (در المختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ۳/ ۱۲۰، كراچی ج:۲/ ۲۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍ ۲۱۷۲)

نماز جنازہ پڑھانے کا زیادہ حقدار کون ہے امام جامع مسجد یا امام حي؟

سوال [۳۹۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ زید ایک قصبہ کی جامع مسجد کا امام ہے۔ نیز زید چونکہ عالم فاضل ہے؛ اس لئے عیدین کی نماز بھی پڑھاتا ہے، حتی کہ رویت ہلال رمضان ورویت ہلال عید کا اعلان بھی سب سے پہلے زید ہی کرتا ہے، لوگ اس کو قاضی شہر سمجھتے ہیں، تو کیا زید جب کسی جنازہ کی نماز میں شرکت کرے گا، تو امام حي سے مقدم ہوگا یا نہیں؟

(۲) اگر زید کو مذکورہ صورت میں حق تقدم حاصل ہے، تو اس کی نوعیت وجوب کی ہے یا استحباب کی؟

(۳) امام حي کا اخلاقی وشرعی فریضہ کیا ہے؟ کیا اس کو امام جامع مسجد کو نماز پڑھانے کے لئے کہنا چاہئے یا خود آگے بڑھ جانا چاہئے؟ جبکہ میت کے ولی نماز جامع مسجد کے امام سے پڑھوانا چاہتے ہوں؛ لیکن امام حي جب خود ہی آگے بڑھ گیا تو مصلحۃً خاموش رہتے ہوں۔

(۴) امام حي جب نماز جنازہ پڑھائے تو اس کو اولیاء میت سے صراحۃً اجازت لینی ضروری

ہے یا بغیر اجازت لئے ہی نماز پڑھا سکتا ہے؟ مذکورہ چاروں صورتوں سے متعلق سوال اس صورت میں ہے؛ جبکہ نماز جنازہ میت کے محلّہ کی مسجد میں ادا کی جا رہی ہے (یعنی جس میں امام حي نماز پڑھاتا ہے)

(۵) اور اگر نماز جنازہ نہ تو جامع مسجد میں ہو رہی ہے اور نہ ہی محلّہ کی مسجد میں؛ بلکہ ایک تیسری مسجد میں نماز ادا کی جا رہی ہے اور میت جس محلّہ کی ہے اس کا امام بھی موجود ہے، تو پھر امام حي کون سی مسجد کا امام ہوگا، جس میں نماز ہو رہی ہے یا جو میت کے محلّہ کی مسجد کا ہے۔

المستفتی: سلیم الدین رشیدی، سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) راجح قول یہی ہے کہ امام جامع مسجد امام محلّہ پر مقدم ہوگا؛ جبکہ میت اپنی زندگی میں امام جامع مسجد کے پیچھے نماز پڑھتا رہا ہو اور یہ حق تقدم صرف افضلیت میں ہے، وجوب میں نہیں ہے۔

إمام المسجد الجامع أولیٰ من إمام الحي أي مسجد محلة. و تحته في الشامية: لأن الميت رضي بالصلوٰة خلفه في حال حياته، فينبغي أن يصلي عليه بعد وفاته الخ. (در مختار مع الشامي، كتاب الصلوٰة، باب صلوٰة الجنازة، زكريا ۳/۱۱۹، كراچی ۲/۲۲۰)

إن تقديم الولاة واجب وتقديم إمام الحي مندوب فقط بشرط أن يكون أفضل من الولي الخ. (درمختار، كراچي ۲/۲۲۰، زكريا ۳/۱۱۹)

اور اگر امام جامع مسجد یا امام حي سے میت اپنی زندگی میں راضی نہیں رہا ہے تو ان میں سے کسی کو امامت کے لئے پیش کرنا مستحب نہیں ہے۔

فعلی هٰذا لو علم أنه كان غير راض به حال حياته ينبغي أن لا يستحب تقديمه الخ. (كبرى، فصل في صلوٰة الجنائز، اشرفيه ديو بند ۵۸۵ قديم)

(۳) امام جامع مسجد اور امام حي اگر ولی سے افضل ہوں تو ان کو حق تقدم بشرط اجازت ولی

کے حاصل ہے اور اگر ولی ان سے افضل ہے، تو امام جامع مسجد اور امام حي پر ولی کا مقدم ہونا اور اس کا نماز پڑھانا زیادہ افضل ہے۔ اسی طرح اگر جامع مسجد کا امام امام حي سے افضل ہے، تو ولی کی اجازت سے اس کا نماز پڑھانا افضل ہے اور اگر امام حي افضل ہے، تو ولی کی اجازت سے اس کا مقدم ہونا زیادہ افضل ہے، معلوم ہوا کہ امام جامع مسجد یا امام حي میں سے جو بھی مقدم ہوگا وہ ولی کی اجازت سے مقدم ہوگا؛ لہٰذا ولی جس کو نماز پڑھانے کے لئے کہے گا وہی نماز پڑھائے گا۔ (مستفاد فتاوی محمودیہ قدیم ج: ۳۹۹/۲، جدید ڈابھیل ۵۷۶/۸)

عن حمادؒ، **قال: يقدم الولي على الجنازة من أحب.** (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، ما قالوا في تقدم الإمام على الجنازة، مؤسسة علوم القرآن جديد ۲۳۲/۷، رقم: ۱۱۴۳۵)

عن عمرؓ، **أنه قال: الولي أحق بالصلاة عليها.** (مصنف عبد الرزاق، الجنائز، باب من أحق بالصلاة على الميت، المجلس العلمي، ۴۷۲/۳، رقم: ۶۳۷۳)

فإن حضر الوالي، أو خليفته، والقاضي، وصاحب الشرطة، وإمام الحي والأولياء فأبى الأولياء، أن يقدموا أحدًا من هٰؤلاء، وأرادوا أن يتقدموا فلهم ذٰلک، ولهم أن يقدموا من شاؤوا ولا يتقدم أحد من هٰؤلاء إلا بإذنهم الخ. (الفتاوى التاتارخانيه، الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، القسم الرابع في بيان من هو أولىٰ بالصلاة على الميت، زكريا ۶۰/۳، رقم: ۳۷۱۵، قديم ۱۶۴/۲)

(۴) امام حي یا امام جامع مسجد میں سے ہر ایک پر ضروری ہے کہ نماز پڑھانے کے لئے ولی سے صراحۃً اجازت لے۔

ولا يتقدم إمام الحي إلا بإذن الأب. (الفتاوى التاتارخانيه قديم ۱۶۴/۲، جديد زكريا ۵۹/۳، رقم: ۳۷۱۳)

(۵) ایسی صورت میں جس محلّہ کی میت ہے وہاں کی مسجد کا امام امام حي کہلائے گا، یہاں بھی ولی جس کو نماز پڑھانے کے لئے کہے گا، اسی کو نماز پڑھانے کا حق ہوسکتا ہے، کسی کے

ساتھ پہلے سے حق متعلق نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی تاتارخانیہ قدیم ۲/۱۶۴، جدید زکریا ۳/۵۹، رقم: ۳۷۱۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

عورت کی نماز جنازہ کے لئے امام کس سے اجازت لے گا؟

سوال [۴۸۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی کی بیوی کا انتقال ہوجائے تو جنازہ کی نماز کے لئے امام کس سے اجازت لے گا، ان کی اولاد سے یا ان کے شوہر سے، اگر آپ کا جواب اولاد سے ہے تو لڑکا سے یا لڑکی سے اور اگر اولاد نہ ہو، تو کس سے اجازت طلب کی جائے گی؟

المستفتی: عبدالقیوم، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اولاد نرینہ سے اجازت لینی ہوگی۔

عن الزهريؒ، قال: الأب، والإبن، والأخ أحق بالصلاة على المرأة من الزوج. (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، في الزوج والأخ أيهما أحق بالصلاة مؤسسة علوم القرآن جديد ۷/ ۲۴ ٤، رقم: ۱۲۰۸۷)

عن قتادةؒ، أنه كان يقول: الأولياء أحق بالصلاة عليها من الزوج (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، تحقيق الشيخ عوامه ۷/ ۲۴ ٤، رقم: ۱۲۰۸۸)

ثم الولي بترتيب عصوبة الإنكاح (إلى قوله) فإن لم يكن له ولي فالزوج الخ. (در مختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچی ۲/ ۲۲۰، ۲۲۱، زكريا ۳/ ۱۲۱، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب احكام الجنائز، دار الكتاب

دیو بند ص: ۵۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

بیوی کی نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار شوہر یا والد؟

سوال [۳۸۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بیوی انتقال کرگئی، اب حق نماز جنازہ کس کو حاصل ہوگا زید کو یا لڑکی کے والد بکر کو، اگر زید دوسرے کو نماز پڑھانے کی اجازت دیدے، تو اس کی یہ اجازت شرعاً کیسی ہوگی؟

المستفتی: محمد معین الدین، مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر جنازہ میں بیوی کے محارم باپ، دادا، بھائی، بیٹے وغیرہ موجود ہیں، تو نماز جنازہ پڑھانے اور میت کو قبر میں اتارنے کا حق انہیں کو ہوگا، ان کی موجودگی میں شوہر کو نہ خود یہ حقوق حاصل ہیں اور نہ شوہر کو ان کی موجودگی میں دوسرے کو نماز کے لئے آگے بڑھانے کا حق ہے؛ البتہ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں یہ تمام حقوق شوہر کو حاصل ہوں گے اور اپنی جگہ دوسرے کو نماز کے لئے آگے کرنا درست ہوگا۔

عن الزهريؒ، قال: الأب، والإبن، والأخ أحق بالصلاة على المرأة من الزوج. (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، في الزوج والأخ أيهما أحق بالصلاة مؤسسة علوم القرآن جديد ۷/ ۴۲۴، رقم: ۱۲۰۸۷)

عن قتادةؒ، أنه كان يقول: الأولياء أحق بالصلاة عليها من الزوج. (المصنف لابن أبي شيبة الجنائز، تحقيق الشيخ عوامه ۷/ ۴۲۴، رقم: ۱۲۰۸۸)

ثم الولي بترتيب عصوبة الإنكاح......، فإن لم يكن له ولي

فالزوج الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچی ۲/ ۲۲۱، زكريا ۳/ ۱۲۱، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب أحكام الجنائز، درا الكتاب ديوبند ص: ۵۹۰، هندية، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، زكريا قديم ۱/ ۱۶۳، زكريا جديد ۱/ ۲۲٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۶/ ۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۹۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۱۱/ ۱۴۲۱ھ

دیوبندی امام کے پیچھے بریلوی کی نماز جنازہ

سوال [۳۸۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید میرا لڑکا بریلوی خیال سے پختہ ہوگیا ہے، میں اور میرا پورا گھر خاندان پختہ اہل سنت والجماعت دیوبندی خیال کے ہیں، زید کے گھر خاندان کے جنازوں کی نماز اہل سنت والجماعت دیوبندی امام پڑھاتے آرہے ہیں، تو کیا اگر والد والدہ میں سے کسی کا انتقال ہو جائے، تو کیا دیوبندی امام کے پیچھے زید کی نماز جنازہ ادا ہو جائے گی یا نہیں؛ جبکہ زید اپنے ماں باپ کے متعلق اپنی طرف سے یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ مسئلہ کی رو سے کافر مرتد ہیں، تو کیا زید اپنے ماں باپ کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے، رہ سکتا ہے یا نہیں؟ زید کے ساتھ اس کے ماں باپ ایسی حالت میں کس طرح کا برتاؤ رکھیں؟

المستفتی: محمد اقبال، جامع مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دیوبندی اہل سنت والجماعت امام کے پیچھے زید بریلوی بدعتی کی نماز جنازہ درست ہو جائے گی؛ البتہ ماں باپ کو کافر کہنے کا گناہ عظیم اور

وبال زید پر ہوگا۔

والأصل في هٰذه المسائل أن حال الإمام إن كان مثل حال المقتدي أو فوقه جازت صلاة الكل. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، زكريا قديم ٨٦/١، جديد ١٤٤/١، الموسوعة الفقهيته الكويتية ٢٢/٦، فتاوى دار العلوم ١١١/٣)

اگر حسن اخلاق سے زید متاثر ہوکر بدعت کو ترک کردے یا اس کو سمجھانے سے دینی فائدہ کی امید ہو، تو اس سے تعلق باقی رکھ کر اصلاح کی کوشش کریں، اصلاح کی توقع نہ ہو، تو قطع تعلق کردیں اور اصلاح کی دعا بہر حال کرتے رہیں۔ (مستفاد فتاوی محمودیہ قدیم ۵۱۰/۱۷، جدید ڈابھیل ۵۳۰/۱۸)

وأما نصيحة عامة المسلمين– وهم من عدا ولاة الأمر– فإرشادهم لمصالحهم في آخرتهم ودنياهم، وكف الأذى عنهم، فيعلمهم ما يجهلونه من دينهم ودنياهم، ويعينهم عليه بالقول والفعل......وأمرهم بالمعروف ونهيهم عن المنكر برفق وإخلاص والشفقة عليهم. (شرح النووي على صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، النسخة الهندية ٥٤/١)

وإن هجرة أهل الأهواء والبدع واجبة على مر الأوقات مالم يظهر منه التوبة والرجوع إلى الحق. (مرقاة، كتاب الأدب، باب ما ينهى عنه من التهاجر والتقاطع، رشيدية ٧٥٩/٨، مكتبه امداديه ملتان، ٢٦٢/٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٨/ربیع الثانی ١٤١٧ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٤٧٥٨/٣٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٨/٤/١٤١٧ھ

شیعہ اور حنفیہ مل کر نماز جنازہ ادا کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال [۳۸۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر شیعہ اور حنفیہ مذہب کے آدمی ایک ساتھ مل کر جنازہ کی نماز پڑھیں اور جو امام ہے وہ حنفی مذہب کا ہے تو نماز جنازہ جائز ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں جواب دیجئے آپ کے فتوے کا منتظر ہوں۔

المستفتی: انعام اللہ، فتح پور، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں اس صورت میں نماز جنازہ صحیح و درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ج:۵/۳۱۱)

تجوز الصلاة خلف أهل الاهواء (إلى قوله) والرافضي الغالي الذي ينكره خلافة أبي بكر رضي الله عنه لا تجوز الخ. (الفتاوى التاتار خانيه، كتاب الصلاة، الفصل السادس في بيان من هو أحق بالإمامة، قديم ٦٠١/١، جديد زكريا ٢٤٩/٢، رقم: ٢٣٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۳۶/۲۵)

(۸) باب من یصلیٰ علیه ومن لا یصلیٰ علیه

فاسق شخص کی نماز جنازہ کا حکم

سوال[۳۸۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بشیر نام کے ایک شخص کا انتقال ہوگیا، اس کا پیشہ گانا بجانا تھا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں ہوگی، اس کو زنانہ لباس (زنخہ وہجڑا) بھی کہا جاتا ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں، اس کی نماز جنازہ ہوگی یا نہیں ہوگی؟

المستفتی: محمد رئیس، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گانا بجانا، زنانہ لباس اختیار کرنا، ہجڑہ بن جانا، سب اسباب فسق میں سے ہیں، ان افعال کو اختیار کرنے سے شرعاً فاسق ہوجاتا ہے؛ لیکن شریعت میں فاسق کی نماز جنازہ پڑھنا بھی لازم ہے؛ لہٰذا اس کی نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

عن أبي هريرة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ...... والصلاة واجبة على كل مسلم برًّا، كان أو فاجرًا، وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، النسخة الهندية ۱/۳۴۳، دار السلام رقم: ۲۵۳۳)

قوله عليه السلام: صلوا على كل بر و فاجر. الحديث (شرح نقايه، مكتبه اعزازيه ديوبند، باب الشهيد ۱/۱۴۲)

عن أبي هريرة رضـ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلوا خلف كل بر و فاجر، و صلو على كل بر و فاجر. (سنن الدار قطني، كتاب الصلاة، باب صفة

الصلاة معه والصلاة عليه، دار الكتب بيروت ٢/ ٤٤، رقم: ١٧٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣ر محرم الحرام ١٤١٠ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٢٥/ ١٥٩٣)

بے نمازی کی نماز جنازہ کا حکم

سوال [٣٨٦٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب یہ معلوم کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یا خلفاء راشدین میں سے کسی نے یا صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھائی ہے یا نہیں؟ اور بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا یا پڑھانا کیسا ہے؟ اور بے نمازی کا حکم کس پر لگایا جائے گا؟

المستفتی: نسیم احمد، امام نوارانی مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضور ﷺ یا خلفاء راشدین کے زمانہ میں کوئی مسلمان بے نمازی نہیں ہوتا تھا، سب ہی نمازی ہوتے تھے؛ اس لئے اس زمانہ میں بے نمازی کی نماز جنازہ کا سوال ہی نہیں ہوتا کہ کسی بے نمازی کی نماز جنازہ پڑھائی ہے یا نہیں؛ البتہ بے نمازی فاسق ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے فاسق کی بھی نماز جنازہ کا حکم فرمایا ہے؛ اس لئے بے نمازی کی نماز جنازہ پڑھنا بھی شرعی طور پر لازم ہے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: -إلى- والصلاة واجبة على كل مسلم براكان أو فاجراً، وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، النسخة الهندية ١/ ٣٤٣، دارالسلام رقم: ٢٥٣٣)

ويصلى على كل بر و فاجر إذا ماتت على الإيمان للإجماع. لقوله عليه الصلاة والسلام: لاتدعوا الصلوة على من مات من أهل القبلة.

(شرح عقائد نسفي ۱٦۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲ ر ۴۶۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹ر۲ر۱۴۱۷ھ

مردہ بچے کی نماز جنازہ سے متعلق تحقیقی فتویٰ

سوال [۴۸۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر بچہ ماں کے بطن سے مردہ پیدا ہو، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

(۱) امام بخاریؒ نے تعلیقاً یہ روایت ذکر کی ہے کہ ابن شہابؒ کہتے ہیں ہر مرنے والے بچہ پر نماز پڑھی جائے، خواہ وہ زانیہ ہی کا کیوں نہ ہو؛ کیونکہ بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین یا صرف والد مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور اس کی والدہ اسلام پر نہ ہو اور وہ بچہ چلا کر رودے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور جو چلا کر نہ روئے تو اس کے لئے نماز نہیں؛ کیونکہ وہ ساقط شمار ہوگا۔ (بخاری ۱/۱۸۱، رقم: ۱۳۴۲، ۲/۹۴، رقم: ۱۳۵۸، مطبوعہ دار طوق النجاۃ)

(۲) حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت مسور بن مخرمہؓ فرماتے ہیں کہ بچہ وارث نہیں بنے گا یہاں تک کہ چلا کر روئے اور اس کا استہلال یہ ہے کہ روئے یا چلائے یا چھینکے۔ (ابن ماجہ ۴/۵۰، رقم: ۲۷۵۰، صحہ البانی، مطبوعہ، دار الرسالۃ العالمیۃ، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۰/۲۰، مطبوعہ مکتبہ ابن تیمیہ، سنن الدارمی، ۴/۲۰۰۷، رقم: ۳۱۷۱، اسنادہ صحیح وھو مرسل، مطبوعہ دار المغنی، سعودیہ، السنن الکبری للبیہقی ۶/۴۲۱، رقم: ۱۲۴۸۶، دار الکتب العلمیہ، مصنف ابن ابی شیبہ ۷/۲۹۹، رقم: ۱۱۷۱۷، ۱۱۷۱۸، ۱۱۷۲۱، ۱۱۷۲۱، ۱۱۷۲۴، ۱۱۷۲۵، مطبوعہ دار القبلہ)

(۳) امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: جب بچہ پیدا ہونے کے بعد آواز کرے تو نام رکھا جائے گا اور غسل دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وہ وارث بنے گا اور اس کا بھی وارث ہوگا

اور جب بچہ پیدا ہونے کے بعد آواز نہ کرے تو نہ نام رکھا جائے گا اور نہ غسل دیا جائے گا اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ وہ وارث بنے گا۔ حدیث ابوہریرہؓ کی وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

إذا استهل المولود غسل وصلی علیه وورث، وإن لم یستهل لم یصل علیه ولم یورث.

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: غسل دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور اسی طرح مروی ہے امام محمدؒ سے ایک روایت میں اور اسی کو امام طحاویؒ نے اختیار کیا ہے۔ (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ۳/ ۴۹)

اور مختار قول یہی ہے کہ غسل دیا جائے گا اور کسی کپڑے میں لپیٹ دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ (مستفاد: فتاوی شامی ۲/ ۲۲۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

بہرکیف مذکورہ بالا روایات سے عدم استہلال کی صورت میں مطلقاً نماز جنازہ نہ پڑھنے کا حکم معلوم ہو رہا ہے؛ لیکن بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر بچہ ماں کے بطن سے ۴/ ماہ کے بعد مردہ پیدا ہو، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل روایات پیش کرتے ہیں۔

جو بچہ ساقط ہو جائے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کے والدین کے لئے رحمت اور مغفرت کی دعا کی جائے گی۔ (ابوداؤد ۳/ ۲۰۵، رقم: ۳۱۸۰، مطبوعہ المکتبۃ العصریۃ بیروت، مسند احمد بتحقیق شعیب الارنؤوط ۳۰/ ۱۱۰، رقم: ۱۸۱۷۴، مسند احمد بتحقیق شعیب الارنؤوط ۳۰/ ۱۱۰، رقم: ۱۸۱۸۱، السنن الکبری للبیہقی ۴/ ۱۱، رقم: ۶۷۷۹، السنن الکبری للبیہقی ۴/ ۳۸، رقم: ۶۸۶۶)

(۴) امام احمدؒ فرماتے ہیں: جب بچہ ۴/ ماہ پر پیدا ہو تو غسل دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ (المغنی لابن قدامہ ۲/ ۳۸۹، مطبوعہ المکتبۃ القاہرہ)

(۵) شیخ ناصر الدین البانیؒ کا قول ہے کہ: اور ظاہر یہ ہے کہ مردہ پیدا ہونے والے بچہ کی نماز

جنازہ پڑھی جائے گی؛ جبکہ اس میں روح پھونکی گئی ہو اور یہ جب ہے کہ ۴/ ماہ مکمل ہو جائے۔
(احکام الجنائز للالبانی ۱/۸۱، مطبوعہ المکتب الاسلامی)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جن روایات کی بنیاد پر خصم اپنا مدعی ثابت کر رہے ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے؟ اصول حدیث وفقہ کی بنیاد پر، نیز ہمارے مسلک کی وجوہ ترجیح کیا ہیں؟

المستفتی: نذیر الدین، حیدر آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مستفتی نے ایک عالمانہ شان سے سوال نامہ مرتب کیا ہے اور سوالنامہ میں مستفتی نے دو موقف پیش فرمائے ہیں۔

(۱) ایک موقف یہ پیش فرمایا ہے کہ جو بچے زندہ پیدا ہوں اور پیدائش کے بعد زندگی کے آثار ظاہر ہو جائیں، تو ان بچوں کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور زندگی کی علامات میں سے حدیث شریف میں جو استہلال (رونے اور چلانے) کو بتلایا گیا ہے، اس کو بھی نقل کر دیا ہے اور امام بخاریؒ نے کتاب الجنائز، "**باب إذا أسلم الصبي**" کے تحت ۱۸۱/ حدیث ۱۳۴۱، ۱۳۵۷، میں حضرت امام ابن شہاب زہری کا جو اثر نقل فرمایا ہے، اس کو بھی سوال نامہ میں پیش کر دیا ہے، اور حضرت جابر بن عبد اللہ اور مسور بن مخرمہ کی مشترکہ روایت بھی پیش فرمائی ہے اور اس روایت کے حوالہ میں ''ابن ماجہ شریف، معجم کبیر، سنن دارمی، سنن کبری بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے پیش فرمائے ہیں اور حضرات حنفیہ کا بھی یہی موقف نقل فرمایا ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اور ساتھ میں محیط برہانی اور فتاوی شامی کا حوالہ بھی پیش فرمایا ہے۔

(۲) دوسرا موقف مستفتی نے یہ پیش فرمایا ہے کہ ماں کے پیٹ سے چار مہینے کے بعد جو بچہ پیدا ہو جائے، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس موقف کی دلیل میں ابو داؤد شریف کی ایک روایت کا حوالہ پیش فرمایا ہے کہ جو بچہ ساقط ہو جائے، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کے والدین کے لئے رحمت اور مغفرت کی دعا کی جائے گی اور ساتھ میں

مسند احمد اور سنن کبری بیہقی کی دو دو حدیث کے حوالے بھی پیش فرمائے ہیں اور یہ بھی پیش فرمادیا ہے کہ یہ موقف امام احمد بن حنبل کا ہے کہ جب بچہ چار ماہ کے بعد پیدا ہو، تو اس کو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس پر ”المغنی لابن قدامه“ کا حوالہ نقل فرمایا ہے، اور شیخ ناصر الدین البانی کا قول بھی نقل فرمایا ہے کہ مردہ پیدا ہونے والے بچہ کی نماز جنازہ دو شرطوں کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

(۱) چار مہینے مکمل ہونے کے بعد پیدا ہوا ہو۔

(۲) اس بچہ میں روح پھونک دی گئی ہو یہی مستفتی کی طرف سے سوال نامہ کا حاصل ہے، اس کے بعد مستفتی نے دونوں موقفوں کی حیثیت معلوم فرمائی ہے۔

نیز حنفیہ کی وجوہ ترجیح کیا ہیں، اس کو بھی معلوم فرمایا ہے، یہ سوالات کی وضاحتی تمہید ہے، اس کے بعد جو کچھ بھی کتب حدیث کے مطالعہ کے ذریعہ جانبین کی روایات سامنے آئی ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔ ابن ماجہ شریف النسخۃ الہندیہ ۱۹۷، دار السلام رقم: ۱۷۵۱، اور امام طبرانی کی المعجم الکبیر ۲۰/۲۰، رقم: ۲۳ میں سوال نامہ میں دیئے گئے حوالہ کے مطابق حضرت جابر بن عبد اللہ اور مسور بن مخرمہ کی مشترکہ روایت موجود ہے، مگر اس روایت میں نومولود بچہ پر نماز جنازہ پڑھنے اور نہ پڑھنے سے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے، ہاں البتہ نومولود کے وارث ہونے اور استہلال سے متعلق جو بات لکھی ہے وہ بات موجود ہے اور سنن دارمی میں میراث الصبي کے عنوان کے ذیل میں حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی موقوف روایت بھی موجود ہے، اور سنن کبری بیہقی میں نومولود بچہ پر نماز جنازہ پڑھنے سے متعلق کتاب الفرائض میں کوئی روایت نہیں ملی؛ البتہ وراثت اور استہلال سے متعلق روایت موجود ہے اور مصنف بن ابی شیبہ کے حوالے اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اب اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ نومولود بچہ کی نماز جنازہ کے بارے میں حضرت جابرؓ سے ۹ / مرفوع روایات دستیاب ہوئیں، جن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ بچہ زندہ پیدا ہو جائے، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور جس بچہ کی

پیدائش پر زندگی کے آثار ظاہر نہ ہوں، تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور یہ روایات

(۱) سنن کبریٰ بیہقی، مطبع دارالفکر ۵/ ۳۰۴، ۳۰۵، رقم: ۶۸۸۲، ۶۸۸۳، ۶۸۸۴.

(۲) ابن ماجہ شریف ہندی ۱۰۸، دارالسلام رقم: ۱۵۰۸.

(۳) مستدرک حاکم، مطبع مصطفیٰ الباز ۸/ ۲۸۵۲، رقم: ۸۰۲۲، ۸۰۲۳.

(۴) مستدرک حاکم، مطبع مصطفیٰ الباز ۲/ ۵۲۰، رقم: ۱۳۴۵.

(۵) سنن ترمذی، ہندی نسخہ ۱/ ۲۰۰، دارالسلام رقم: ۱۰۳۲.

(۶) سنن کبریٰ نسائی ۴/ ۷۷، رقم: ۶۳۵۸ میں موجود ہیں.

اور حضرت جابرؓ سے پانچ موقوف روایتیں ملی ہیں، جو ذیل کے حوالوں میں موجود ہیں۔

(۱) سنن کبریٰ بیہقی، مطبع دارالفکر ۵/ ۳۰۴، رقم: ۶۸۸۱.

(۲) سنن دارمی، مطبع دارالمغنی ۴/ ۲۰۰۵، رقم: ۳۱۶۸، ۴/ ۲۰۰۷، رقم: ۳۱۷۲.

(۳) طحاوی شریف، مطبع دارالکتب العلمیہ ۲/ ۳۹، رقم: ۲۸۳۱.

(۴) اور عبداللہ بن عباسؓ کی بھی موقوف روایت سنن دارمی ۴/ ۲۰۰۶، رقم: ۳۱۶۹ میں موجود ہے.

ان روایات سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو بچہ زندہ پیدا ہو جائے، اس کے لئے غسل، کفن اور نماز جنازہ سارے احکام لاگو ہو جاتے ہیں۔ اور جو بچہ مردہ پیدا ہو جائے، جس میں زندگی کے آثار ظاہر نہ ہوں، اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور یہی امام امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے۔

اب رہا دوسرا موقف جس میں چار مہینہ کے بعد مردہ پیدا ہونے والے بچہ کی نماز جنازہ پڑھنے کی بات ہے، یہی امام احمد ابن حنبل اور شیخ ناصر الدین البانی کا موقف ہے، جس پر انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے استدلال فرمایا ہے، اس کے بارے میں گزارش یہ ہے کہ شیخ ناصر الدین البانی نے دو قیدوں کے ساتھ پیدا ہونے والے بچہ کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم لگایا ہے۔

(۱) بچہ میں روح پھونک دی گئی ہو۔
(۲) چار مہینے مکمل ہونے کے بعد بچہ مردہ پیدا ہوا ہو، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔
اس مضمون کے ساتھ ذخیرہ احادیث میں ہم کو کوئی مرفوع روایت نہیں ملی ہے اور مستفتی نے اس موقف سے متعلق جو حوالے پیش فرمائے ہیں، ان میں سے کسی بھی حوالہ میں اس مضمون کی کوئی مرفوع روایت ہم کو نہیں ملی اور نہ ہی کسی صحابی کی موقوف روایت ملی، ہاں البتہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت لفظ ''سقط'' اور لفظ ''طفل'' کے ساتھ مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح مل گئی ہے اور حضرت عبداللہؓ کا اثر بھی مل گیا ہے۔
اب حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کے بارے میں حسب ذیل گزارش ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس موضوع سے متعلق متعدد کتب حدیث میں ۲۱/روایتیں ملی ہیں، جن میں سے ۱۳/مرفوع رواتیں ایسی ہیں، جن میں ''الطفل يصلي عليه'' کے الفاظ موجود ہیں اور پانچ روایتیں ایسی ملی ہیں، جن میں ''السقط يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں اور تین رواتیں ایسی ملی ہیں جو مغیرہ بن شعبہؓ پر موقوف ہیں اور ان میں بھی '' السقط يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی پانچ مرفوع روایات میں ''السقط يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں اور تین موقوف روایات میں ''السقط يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں اور ۱۳/مرفوع روایتیں ایسی ملی ہیں، جن میں ''الطفل يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں۔
اب ہم کو ان دونوں قسم کی روایات پر غور کرنا ہے اور اس سلسلہ میں پہلے روایات کا حوالہ پیش کرتے ہیں، اس کے بعد ان روایات کی حقیقت اور جائزہ پیش کریں گے۔
حوالہ ملاحظہ فرمائیے:
آٹھ ایسی روایتوں کا حوالہ جن میں ''السقط يصلى عليه'' کے الفاظ موجود ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مسند احمد ۴/۲۴۹، رقم: ۱۸۳۵۸، مرفوعاً.

(۲) مسند احمد ۴/۲۴۹، رقم: ۱۸۳۶۵، موقوفاً.

(۳) سنن کبریٰ بیہقی، دار الفکر ۵/۳۰۳، رقم: ۶۸۷۸، مرفوعاً.

(۴) سنن ابوداؤد، ہندی نسخہ ۲/۴۵۳، دار السلام رقم: ۳۱۸۰، مرفوعاً.

(۵) مسند ابوداؤد الطیالسی، دار الکتب العلمیہ ۱/۳۸۱، رقم: ۷۳۷، موقوفاً.

(۶) مصنف بن ابی شیبہ ۷/۲۹۸، رقم: موقوفاً.

(۷) المعجم الکبیر للطبرانی ۲/۴۳۰، رقم: ۱۰۴۳، مرفوعاً.

(۸) مستدرک حاکم، مصطفیٰ الباز ۲/۵۱۹، رقم: ۱۳۴۴، مرفوعاً.

ان تمام روایات مرفوعہ وموقوفہ میں ’’**السقط يصلى عليه**‘‘ کے الفاظ موجود ہیں، اس کے برخلاف حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ۱۳/ مرفوع روایتیں ایسی ہیں، جن میں ’’**الطفل يصلى عليه**‘‘ کے الفاظ موجود ہیں، جن کے حوالے حسب ذیل ہیں:

(۱) سنن نسائی ہندی نسخہ ۱/۲۱۴، دار السلام رقم: ۱۹۵۰، مرفوعاً.

(۲) سنن کبریٰ بیہقی، دار الفکر ۵/۳۰۴، رقم: ۶۸۸۰، مرفوعاً.

(۳) سنن ابن ماجہ، ہندی نسخہ ۱۰۸، دار السلام رقم: ۱۵۰۷، مرفوعاً.

(۴) سنن ترمذی، ہندی نسخہ ۱/۲۰۰، دار السلام رقم: ۱۰۳۱، مرفوعاً.

(۵) صحیح ابن حبان، دار الفکر ۴/۱۶، رقم: ۳۰۴۵، مرفوعاً.

(۶) مصنف بن ابی شیبہ ۷/۲۱۱، ۷/۲۹۷، رقم: ۱۱۳۶۸، ۱۱۷۰۴، مرفوعاً.

(۷) طحاوی شریف، دار الکتب العلمیہ ۲/۳۸، رقم: ۲۸۲۶، مرفوعاً.

(۸) سنن کبریٰ نسائی ۱/۶۳۳، ۶۳۴، رقم: ۲۰۷۰، ۲۰۷۵، مرفوعاً.

(۹) معجم کبیر للطبرانی ۲/۴۳۰، ۴۳۱، رقم: ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، مرفوعاً.

(۱۰) مستدرک حاکم، مطبع مصطفیٰ الباز ۲/۵۱۹، رقم: ۱۳۴۳، مرفوعاً.

ان دس کتابوں میں ۱۳؍روایات ہیں، یہ تمام روایات حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مرفوعاً مروی ہیں اور سب میں ''**الطفل یصلی علیه**'' کے الفاظ ہیں۔

اب غور کرنا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی زیادہ مرفوع روایتوں میں ''**الطفل یصلی علیه**'' کے الفاظ موجود ہیں، اور یہ بات واضح ہے کہ طفل کا لفظ لغت کے اندر شیر خوار نرم و نازک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (القاموس الوحید ۱؍۱۰۰۳)

نیز لغت میں طفل کے معنی یہ بھی آتا ہے: ''**الصبي من حین الولادة إلی البلوغ**'' (لغة الفقهاء ۲۹۱) اور **المغرب** ۲؍۲۳، میں ہے: ''**الصبي حین یسقط من البطن إلی أن یحتلم**'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''**طفل**'' کا لفظ بچہ کی پیدائش سے لے کر قریب البلوغ تک کے لئے لغت میں مستعمل ہے؛ اس لئے جن روایات میں ''**الطفل یصلی علیه**'' کے الفاظ آئے ہیں، ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو بچہ زندہ پیدا ہوتا ہے، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؛ البتہ بعض روایات کی تعبیر اس طرح بھی آئی ہے۔

''**الطفل لایصلي علیه و لایرث ولا یورث حتی یستهل**'' (ترمذی، النسخة الهندیة ۱/ ۲۰۰، دارالسلام رقم: ۱۰۳۲)

اس سے مفہوم مخالف کے طور پر مردہ پیدا ہونے والے بچہ کے لئے بھی طفل کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو بچہ زندہ پیدا ہوا ہو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقی طور پر مردہ پیدا ہونے والے بچہ پر بھی طفل کا لفظ بولا جاتا ہے، ہاں البتہ مجازی طور پر اس کے لئے ''**طفل**'' کا لفظ بولا جاسکتا ہے؛ لہٰذا مغیرہ بن شعبہؓ کی یہ تمام روایات جن میں ''**الطفل یصلی علیه**'' کے الفاظ آئے ہیں، ان تمام روایتوں کے ہم معنی ہیں جن میں استہلال کی شرط کے ساتھ نومولود بچہ کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم بیان کیا گیا ہے، ان کے علاوہ مغیرہ بن شعبہؓ کی وہ آٹھ روایات جن میں ''**السقط یصلی علیه**'' کے الفاظ آئے ہیں، ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ

''السقط'' کے معنی ناتمام بچہ کے ہیں جو وقت سے پہلے گر جائے اور ''سُقط'' ایسے ناتمام بچہ کو کہا جاتا ہے، جو پیدائش کا وقت آنے سے پہلے گر جائے اور اس میں یہ شرط ہے کہ بچہ کے اعضاء وغیرہ سب مکمل ہو چکے ہوں اور ایسا بچہ عام طور پر مردہ پیدا ہوتا ہے؛ لیکن بسا اوقات ایسا بچہ زندہ بھی پیدا ہوجاتا ہے؛ لہٰذا مغیرہ بن شعبہؓ کی دونوں طرح کی روایتوں کے درمیان تطبیق کی یہی شکل ہے کہ ان کی روایات میں ''سقط'' سے مراد وہ ناتمام بچہ ہے، جو زندہ پیدا ہوا ہو اور زندہ پیدا ہونے والے بچہ پر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر ان کے وہ شاگرد جو ان کے علوم اور روایات کے امین ہیں یعنی حضرت نافع نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سقط پر نماز جنازہ پڑھی ہے۔

حدیث شریف کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

عن نافع أن ابن عمر صلى على السقط، قال نافع: لا أدري أحيا خرج أم ميتاً. (مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۲۹۷/۷، رقم: ۱۱۷۰۵)

اس کے الفاظ پر غور فرمائیے کہ نافع فرماتے ہیں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے جو سقط پر نماز جنازہ پڑھی ہے، اس میں تعین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بچہ زندہ پیدا ہوا ہے یا مردہ، معلوم ہوا کہ اس بچہ کے بارے میں دونوں احتمال ہیں کہ وہ بچہ زندہ تھا یا مردہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر نے زندہ بچہ کی نماز جنازہ پڑھائی ہے یا مردہ کی، تو اس سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ کی دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن نافع عن ابن عمرؓ أنه كان لا يصلى على السقط حتى يستهل.

(سنن كبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ۳۰۷/۵، رقم: ۶۸۹۱)

اس حدیث شریف میں یہ بات صاف واضح ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سقط کی نماز جنازہ اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک کہ وہ بچہ چلا کر نہ روئے اور اس کا زندہ ہونا معلوم نہ ہوجائے؛ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ نے جس بچہ کی نماز جنازہ پڑھائی وہ بچہ زندہ پیدا

ہوا تھا نہ کہ مردہ اور حدیث میں اس بچہ کے لئے سقط کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی بنا پر حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ان روایات میں جن میں ''**الطفل**'' کے بجائے ''**السقط**'' کے الفاظ آئے ہیں، سب میں زندہ بچہ مراد ہوگا نہ کہ مردہ؛ اس لئے کہ ناتمام بچہ جو وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے وہ زندہ بھی پیدا ہوسکتا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں سقط سے زندہ بچہ کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے، تو ایسے ہی حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ان تمام روایات میں جن میں ''**السقط**'' کا لفظ آیا ہے زندہ بچہ ہی مراد ہوگا؛ لہٰذا حضرات حنفیہ کے موقف ہی کا زیادہ راجح اور زیادہ صحیح ہونا واضح ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۸۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱/۴ھ

شکم مادر سے مردہ پیدا ہونے والے بچہ پر نماز جنازہ نہیں

سوال [۴۸۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو بچہ شکم مادر سے مرا ہوا پیدا ہوا، تو اس کے لئے مسنون طریقہ سے قبر کھودی جائے یا ویسے ہی گڑھا کھود کر دفنا دیا جائے؟

المستفتی: رئیس احمد، منگلور ہری دوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو بچہ مرا ہوا پیدا ہوا اس کو غسل دیا جائے اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر قبر کھود کر دفن کر دیا جائے؛ البتہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، سنت طریقہ پر غسل اور دفن کی ضرورت نہیں۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۲/۵۵)

وإن لم يستهل غسل في المختار وأدرج في خرقة، ودفن ولم يصل عليه الخ (نور الإيضاح، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة ص: ۱۳۸،

هـنـدية، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الثاني في الغسل، زكريا قـديـم ۱/۱۵۹، جـديـد ۱/۲۱۹، هـدايه، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، اشرفي ديو بند ۱/۱۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۸۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۱۹ھ

مرا ہوا بچہ پیدا ہو تو کیا اس کا نام رکھا جائے گا؟

سوال [۱۷۳۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے مرا ہوا پیدا ہوا، کوئی آواز وغیرہ نہیں نکالی، تو کیا اس بچے کا نام رکھ دینا چاہئے اور میدان حشر میں والدین کے لئے سفارشی ہوگا کہ نہیں؟

المستفتی: محمد طاہر، گودھنا، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں، قول راجح کے مطابق اس کا نام رکھ دینا چاہئے، امید ہے کہ وہ میدان حشر میں سفارشی بن جائے؛ البتہ اس پر نماز جنازہ نہیں ہے۔

غسل و سمي عند الثاني، وهو الأصح، فيفتي به على خلاف ظاهر الرواية، ووجهه أن تسميته تقتضي حشره الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچي ۲/۲۲۸، زكريا ۳/۱۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۴۰۷)

بچہ پیدا ہونے کے بعد انتقال کر جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال[۳۸۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پانچ مہینہ کے بعد بچہ پیدا ہوا زندہ، ایک دو سانس لینے کے بعد مر گیا، تو کیا اس بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟

المستفتی: افضل حسین قاسمی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پانچ مہینہ پر پیدا ہونے والا زندہ بچہ جو ایک دو سانس لینے کے بعد مرا ہو، اس کا نام رکھنا اور اس پر نماز جنازہ پڑھنا لازم ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱/۵۵)

من استهل بعد الولادة سمي، وغسل وصلي عليه. (عالمگيري، الباب الحادي العشر في صلاة الجنازة، الفصل الثاني في الغسل، زكريا قديم ۱/۱۵۹، جديد ۱/۲۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۲۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۱۱/۱۴۱۵ھ

بچہ مردہ پیدا ہو تو نماز جنازہ پڑھیں یا نہ پڑھیں؟

سوال[۳۸۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بچہ پیدا ہوا، جس نے ہی آنکھیں کھولی اور نہ ہی آواز نکالی، تو کیا اس کی نماز جنازہ ہوگی یا نہیں؟ اور یہ بھی بتادیں کہ آواز نکالنا شرط ہے یا نہیں؟ اور آثار زندگی ہم کیسے سمجھیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم، محلہ اصالت پورہ، گلی نمبر ۳، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پیدائش کے وقت واقعتاً زندگی کے آثار ظاہر نہیں

ہوئے ہیں، نہ حرکت کی اور نہ آواز نکالی اور نہ ہی آنکھیں کھولی ہیں، تو ایسی صورت میں نماز جنازہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے اور زندگی کے لئے اگر حرکت وغیرہ دیکھ کر آثار زندگی ظاہر ہوجائے تو وہ بھی کافی ہے؛ البتہ آواز نکالنا ایک عمومی فطری بات ہے، شرط نہیں ہے۔

إذا استهل المولود صلى عيله، وإن لم يستهل لم يصل عليه. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، اشرفي ۱/ ۱۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۳۱۹۱)

ڈکیت اور چور کی نماز جنازہ

سوال [۳۸۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چوروں اور ڈکیتوں کی نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد حبیب اللہ، بہڑ اسیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چور اور ڈکیٹ اگر چوری اور ڈکیتی کرتے ہوئے مارا جائے، تو اس کو نہ غسل دیا جائے گا اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؛ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو؛ ہاں البتہ اگر ڈکیتی کے دوران نہ مرا ہو؛ بلکہ عام حالات میں مرا یا مارا گیا، تو اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہئے۔

وهي فرض على كل مسلم مات خلا أربعة: بغاةٍ، وقطاع طريق، فلا يغسلوا، ولا يصلى عليهم إذا قتلوا في الحرب، و لو بعده صلي عليهم؛ لأنه حدّ أو قصاص. قوله فلا يغسلوا: إنما لم يغسلوا ولم يصل عليهم إهانة وزجراً لغيرهم عن فعلهم. (شامي كراچي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة

۲/۲۱۰، زکریا ۳/۱۰۷، تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في من يصلى عليه ومن لا ۳/۵۳، رقم: ۳۷۰٤)

ويصلى على كل مسلم -إلا البغاة، وقطاع الطريق، ومن بمثل حالهم. (هندية، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، زكريا ۱/۱٦۳، جديد ۱/۲۲٤)

والسارق الذي صلب بمنزلة قطاع الطريق. (تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في من يصلى عليه ومن لا، زكريا ۳/٥٤، رقم: ۳۷۰٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۸/۴۰)

ڈاکو کی نماز جنازہ اور غسل کا حکم

سوال [۳۸۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ڈاکو ہے اور ڈاکا ڈالنے کے وقت مارا گیا، تو کیا اس کو غسل دیا جائے گا؟ اور کیا اس کی نماز جنازہ پڑھائی جائے گی۔ نیز اگر ڈاکو نے مرتے وقت کلمہ بھی پڑھا ہو تو کیا اس صورت میں مسئلہ کی نوعیت بدل جائے گی یا وہی مذکورہ رہے گی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں، نوازش وکرم ہوگا۔

المستفتی: نجیب الرحمٰن بھاگل پوری، مدرس مدرسہ فیض الاسلام، بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈاکو اگر ڈاکہ ڈالتے وقت قتل کر دیا جائے، تو اس کو نہ غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کو اسلام سے خارج ہونے کی وجہ سے غسل وصلوۃ سے محروم نہیں کیا جاتا؛ بلکہ بطور سزا محروم کیا جاتا ہے؛ اس لئے اگر کلمہ بھی پڑھ لیا، تو بھی وہی حکم ہوگا۔

من قتل من البغاة، أو قطاع الطريق لم يصل عليه (وقوله) ولنا أن عليا رضي الله عنه لم يصل على البغاة، ولم يغسلهم (وقوله) إنما ترك الغسل والصلاة عليهم عقوبة لهم وزجراً لغيرهم. (فتح القدير، باب الشهيد، قبيل باب الصلاة في الكعبة، كوئٹه ۲/ ۱۰۹، زكريا ۲/ ۱۵۹، دار الفكر مصري قديم۲/ ۱۵۰، بنايه، باب الشهيد، قبيل باب الصلاة في الكعبة اشرفية ۳/ ۲۸۰، نعيمية ۱/ ۱۱۴۴، شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا۳/ ۱۱۰، كراچي ۲/ ۲۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۱/ ۱۴۱۳ھ

ڈاکہ زنی اور چوری کے دوران مقتول شخص کی نماز جنازہ

سوال [۴۸۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص داڑھی والا ہے، نماز بھی پڑھتا ہے؛ لیکن چوری ڈاکہ زنی میں بھی اعلی کمال رکھتا ہے، وہ شخص کسی ڈاکہ میں شریک تھا کہ اسی موقع پر مرگیا، اس کی تجہیز وتکفین شرعی طور پر ہوگی یا نہیں؟ نیز نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ امید ہے کہ بالتفصیل جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

المستفتی: عنایت علی مظفرنگری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعی طور پر نہیں؛ بلکہ عبرۃً شہید اکبر کے برعکس معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے گا کہ اس کو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

إن قتل لسعاية في الأرض فساداً، أو لبغي على الإمام العدل، أو قطع طريق غسل، ولايصلى عليه للفرق بينه و بين الشهداء. (شرح نقاية، باب الشهيد،

مکتبه اعزازیة دیوبند ۱/ ۱٤۲)

وفي الشامي: وعليه الفتویٰ. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ۳/ ۱۰۷، كراچي ۲/ ۲۱۰، شرح وقايه، باب الشهيد، قبيل باب الصلاة في الكعبة، اشرفي ديوبند ۱/ ۲۱۵، ملتقى الأبحر، قبيل باب الصلاة في داخل الكعبة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۸۱، مصري قديم، كراچي ۱/ ۱۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۴۸۶)

ڈاکو کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟

سوال [۳۸۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پہلی کتاب بہشتی گوہر ص: ۹۱/ پر نماز جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط میت کا مسلمان ہونا بھی بیان فرمایا ہے، پس کافر اور مرتد کی نماز جنازہ صحیح نہیں، مسلمان اگرچہ فاسق یا بدعتی ہو اس کی نماز صحیح ہے، سوائے ان لوگوں کے جو بادشاہ برحق سے بغاوت کریں یا ڈاکہ زنی کرتے ہیں بشرطیکہ یہ لوگ بادشاہ وقت سے لڑائی کی حالت میں مقتول ہوں اور اگر بعد لڑائی کے یا اپنی موت سے مرجائیں تو پھر ان کی نماز پڑھی جائے گی، اسی طرح جس شخص نے اپنے باپ یا ماں کو قتل کیا ہو اور اس کی سزا میں وہ مارا جائے، تو اس کی نماز پڑھی جائے گی اور ان لوگوں کی نماز زجراً نہیں پڑھی جاتی۔

دوسری کتاب فتاوی دارالعلوم جلد: ۵/ سوال: ۲۸۶۳/ مسلمان ڈاکو ڈاکہ زنی کی حالت میں مارا جائے، تو کیا اس کا ایمان قائم رہے گا اور اس کی نماز جنازہ جائز ہے؟

جواب: وہ شخص فاسق ہے کافر نہیں، اس کے جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی **لقوله عليه السلام: صلوا على كل بر وفاجر.** اسی صفحہ کے حاشیہ ۲/ پر یہ لکھا ہے کہ زانی کی نماز

جنازہ تو ضرور پڑھی جائے گی، مگر ڈاکو کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی؛ چونکہ ڈاکہ زنی اور قتل کی وارداتیں موجودہ دور میں عام ہورہی ہیں، اس لئے آپ سے معلومات کی جارہی ہے کہ جو شرائط بہشتی گوہر میں بیان فرمائی گئی ہیں کہ بادشاہ برحق سے بغاوت کی یا بادشاہ وقت سے لڑائی کی حالت میں مقتول ہوگیا وغیرہ، تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جہاں پر ہم لوگ آباد ہیں کیا یہاں پر بھی ان شرائط کا لحاظ رکھا جائے گا یا یہ شرائط ختم ہوجائیں گی، ان تمام باتوں کے پیش نظر چند امور دریافت طلب ہیں۔

(۱) ایک شخص ڈاکہ زنی بھی کرتا ہے اور قتل بھی کرتا ہے، پیسہ لے کر یا دشمنی میں کرتا ہے اور زنا کار بھی ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود نماز بھی پڑھتا ہے۔

الف: ایسا شخص کسی مکان میں ٹھہرا ہو، اس وقت اس کو بدمعاش ختم کردیں یا پولس مخبر کی اطلاع پر پہونچ کر اسے گولی مار کر ختم کردے۔

ب: ایسے ہی ڈاکہ زنی کی حالت میں عوام اسے ماردے یا پولیس سے مڈبھیڑ میں مارا جائے، تو ایسے شخص کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر ایسے آدمی کو بغیر نماز جنازہ کے دفن کیا جائے تو شریعت کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(۲) اگر موجودہ دور کے ڈاکو کی نماز جنازہ پڑھی گئی تو کیا نماز جنازہ پڑھانے والے اور پڑھنے والے گنہگار ہوں گے؟

(۳) نماز جنازہ صرف امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے یا تمام انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں نماز جنازہ کا ثبوت ملتا ہے؟ اس کی بھی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: جمیل احمد قاسمی، نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مسلمان ڈاکو کو اگر اس کے گھر یا ٹھکانہ پر حملہ کر کے دوسرے بدمعاش نے قتل کردیا، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

(۲) پولیس نے ڈاکو کو اگر اس کے مقام پر چھاپہ مار کر قتل کردیا تب بھی اس کی نماز جنازہ

پڑھی جائے گی۔

(۳) اگر مسلمان ڈاکو ڈاکہ زنی کی حالت میں عوام کے ہاتھوں مارا جائے، تو پھر بغیر نماز جنازہ کے اس کو دفن کردیا جائے گا۔

(۴) اور اگر ڈاکو پولیس سے مڈبھیڑ میں مارا جائے تبھی بطور زجر و عبرت کے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

ولا يصلي على باغ ولا قاطع طريق إذا قتلا حال الحرب زجراً عن مثل فعلهما. (كبيري شرح منيه، فصل في الجنائز، اشرفية ديوبند ٥٩٠، قديم ٤٥٧)

ولا يصلى عليهم إذا قتلوا في الحرب، ولو بعده صلى عليهم. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنائز، زكريا٣/١٠٧، كراچي٢/٢١٠، حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، دار الكتاب ديوبند ٦٠١، قديم ٣٣٠)

ڈاکو کو نماز جنازہ سے محروم رکھنے کا حکم زجر و توبیخ کی بناء پر ہے؛ لیکن اگر لاعلمی کی بنا پر اس کی نماز جنازہ پڑھ لی جائے یا کسی مصلحت کی بنا پر پڑھ لی جائے، تو پھر پڑھنے اور پڑھانے والا کوئی گنہگار نہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم دیوبند ۵/۳۰۹)

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلوا على كل بر وفاجر. الحديث (سنن دار قطني، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه ٢/٤٤، رقم:١٧٥٠، شامي، باب الجنائز، مطلب في صلاة الجنازة، زكريا ٣/١٠٢، كراچي ٢/٢٠٧، مشكوة ص:١٠٠)

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، مگر صحیح حدیث سے اس قول کی تردید ہوجاتی ہے، اس حدیث پاک میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے انتقال پر فرشتوں نے انہیں غسل دیا اور باقاعدہ نماز جنازہ بھی پڑھائی اور ان فرشتوں نے اس موقع پر یہ پیغام بھی سنایا کہ یہی طریقہ بعد والوں کے لئے بھی ہوگا، اس حدیث سے

معلوم ہوا کہ نماز جنازہ اس امت کے خصوصیات میں سے نہیں؛ بلکہ گذشتہ شریعتوں کے لئے بھی یہ نماز مشروع تھی۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲/۴۱۳، جدید ڈابھیل ۸/۵۴۴)

قيل هي من خصائص هذه الأمة، كالوصية بالثلث، ورد بما أخرجه الحاكم و صححه عنه صلى الله عليه وسلم، أنه قال: كان آدم رجلا أشقر طوالا كأنه نخلة سحوق، فلما حضره، الموت نزلت الملائكة (إلى قوله) وصلوا عليه، وقالوا: هذه سنة لمن بعده. (حاشية الطحطاوي على المراقي، باب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، دارالكتاب ديوبند ۵۸۰، قديم ۳۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۵/ ۱۴۱۷ھ

کیا خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی؟

سوال [۳۸۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے گھریلو الجھن اور آپس کے لڑائی جھگڑے سے پریشان ہوکر خودکشی کرلی۔

اب مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ واضح ہو کہ یہاں کے بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے صحیح کیا ہے؟ حکم شرعی تحریر فرمادیں۔

المستفتی: شمیم اختر، حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خودکشی کرنا بہت بڑا گناہ ہے؛ لیکن موجب کفر نہیں ہے؛ لہٰذا خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا فرض ہے؛ چنانچہ زید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

من قتل نفسه يغسل و يصلى عليه، قال الحجة: وهو الصحيح؛ لأنه مؤمن مذنب، فصار كغيره من أصحاب الكبائر. (تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون من يصلى عليه ومن لا يصلى، زكريا ٣/ ٥٦، رقم: ٣٧٠٨، كوئٹه ٢/ ١٦٢، عالمگيري، الباب الحادي والعشرون في صلاة الجنازة، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، زكريا قديم ١/ ١٦٣، جديد ١/ ٢٢٤، شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچي ٢/ ٢٠٨، زكريا ٣/ ١٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۰۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۸ھ

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا

سوال [۳۸۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد مقیض الدین، میسور، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خودکشی اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے؛ لیکن خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا لازم ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی، زکریا ۴/ ۱۹۶، امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۶۲۵، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۸/ ۶۲۵، میرٹھ ۱۳/ ۲۱۴)

وفي الجامع الصغير: من قتل نفسه يغسل ويصلى عليه. قال الحجة: وهو الصحيح؛ لأنه مؤمن مذنب، فصار كغيره من أصحاب الكبائر. (تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون من يصلي عليه ومن لا يصلي، زكريا ٣/ ٥٦، رقم: ٣٧٠٨)

من قتل نفسه ولو عمداً يغسل ويصلي عليه، به يفتى وإن كان أعظم وزراً. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ٣/ ١٠٨، كراچي ٢/ ٢٠٨، تبيين

الحقائق، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، مکتبه امدادیة ملتان ۱/ ۲۵۰، زکریا ۱/ ۵۹۷، سکب الأنهر علی مجمع الأنهر، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، دارالکتب العلمیة بیروت ۱/ ۲۸۱، هندیة، الباب الحادي والعشرون في صلاۃ الجنازۃ، الفصل الخامس في الصلاۃ علی المیت، زکریا قدیم ۱/ ۱۶۳، جدید ۱/ ۲۲۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۹۳)

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال [۳۸۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص خودکشی کرلے، تو نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اور اس کے لئے قرآن مجید پڑھ کر ایصال ثواب ودعاء مغفرت یا صدقۂ جاریہ کیا جائے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قبولیت یا بخشش ہوگی یا نہیں؟ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: انظار الاسلام، کمال پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خودکشی کے بارے میں سخت وعید آئی ہے، مگر شرعاً اس کی نماز جنازہ، سنت طریقہ سے کفن دفن کرنا ضروری ہے۔

نیز جب وہ مسلمان ہونے کی حالت میں مرا ہے، تو اس کے لئے ایصال ثواب بھی درست ہوگا، قبولیت کے بارے میں اللہ کو معلوم ہے۔

عن واثلة بن الأسقع قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: صلوا علی کل میت، وجاهدوا مع کل أمیر. (سنن ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب في الصلاۃ علی أهل القبلة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۰۹، دارالسلام رقم: ۱۵۲۵)

عن عمران قال: سألت إبراهيم النخعي عن إنسان قتل نفسه أ يصلى عليه؟ قال: نعم! إنما الصلاة سنة. (مصنف لابن أبي شيبة، كتاب الجنائز، باب في الرجل يقتل نفسه...... مؤسسه علوم القرآن جديد ۳۷۶/۷، رقم:۱۱۹۹۰)

من قتل نفسه ولو عمداً يغسل و يصلى عليه، به يفتي. (الدر مع الرد، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ۱۰۸/۳، كراچي ۲۱۱/۲)

إن رجلا قتل نفسه، فلم يصل عليه النبي صلى الله عليه وسلم...... فقال بعضهم: يصلى على كل من صلى للقبلة وعلى قاتل النفس. (ترمذي شريف، كتاب الجنائز، باب ماجاء فيمن قتل نفسه لم يصل عليه، النسخة الهندية ۲۰۵/۱، دارالسلام رقم:۱۰۶۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۷۷/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۲۹ھ

سیلاب میں بہہ کر آئی عورت کی نماز جنازہ کا حکم

سوال [۳۸۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سیلاب کے مہینہ میں ایک عورت پانی میں ڈوبی ہوئی ملی اور یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، تو کیا اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی یا نہیں؟ اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: سعد اللہ بیلا جاہی، سپول

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عورت جہاں پائی گئی وہ مسلمانوں کا علاقہ ہے یا جس طرف سے بہہ کر آرہی ہے ادھر مسلمانوں کا علاقہ ہے، تو ایسی صورت میں عورت مسلمان تسلیم کی جائے گی اور اسلامی طریقہ پر غسل ونماز جنازہ کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں

دفن کی جائے گا اور اگر جہاں پائی گئی ہے وہ غیر مسلموں کا علاقہ ہے یا جدھر سے بہہ کر آ رہی ہے ادھر بھی غیر مسلموں کا علاقہ ہے، تو وہ عورت غیر مسلم شمار کی جائے گی، اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، اور غیر مسلموں کے حوالہ کر دیا جائے گا اور اگر مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط آبادی ہے اور جدھر سے بہہ کر آئی ہے ادھر بھی مخلوط آبادی ہے، تو ایسی صورت میں بھی عورت کو مسلمان تسلیم کر کے اسلامی طریقہ پر اس کو دفن کیا جائے گا۔

وإذا اختلط موتى المسلمين وموتى الكفار، فمن كانت عليه علامة المسلمين صلى عليه، ومن كانت عليه علامة الكفار ترك، فإن لم تكن عليهم علاقة والمسلمون أكثر غسلوا، وكفنوا، وصلي عليهم، وينوون بالصلاة، والدعاء للمسلمين دون الكفار ويدفنون في مقابر المسلمين، وإن كان الفريقان سواء، أو كانت الكفار أكثر لم يصل عليهم، ويغسلون، ويكفنون، ويدفنون في مقابر المشركين. (الأشباه والنظائر، القاعده الثانية، إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام قديم ۱۸۱، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون، الجنائز المتفرقات ۳/۸۳، رقم:۳۷۷۲، المحيط البرهاني، الفصل الثاني الثلاثون، الجنائز، المجلس العلمي ۳/۱۰۱، رقم: ۲۵۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۵۲۱)	۱۴۲۵/۷/۲۹ھ

غیر مسلم کے نومولود بچہ کی تجہیز و تکفین

سوال [۳۸۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک غیر مسلمہ باؤلی عورت بدکاری سے حاملہ ہوگئی، محلّہ والوں نے اس کو بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہسپتال میں بھرتی کرا دیا، پھر ہسپتال میں لڑکا پیدا ہوا، پھر اس باؤلی عورت کو

کچھ دنوں ہسپتال میں رکھ کر رخصت کر دیا، اس بچہ کو ایک گاؤں کے مسلمان نے اپنی تربیت میں رکھ لیا یہ لڑکا حرامی ہے اور غیر مسلمہ کے بطن سے ہے؛ لیکن ایک ہفتہ کے بعد اس بچہ کا انتقال مسلمان شخص کے گھر پر ہو گیا، تو سوال یہ ہے کہ بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں اور اس بچے کا اسلامی نام بھی رکھا گیا تھا اور کفن دفن بھی مسلمان نے کیا، تو نماز جنازہ اور تدفین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: بشیرالدین بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مسلمان نے اس کو اپنی پرورش میں لے لیا ہے، تو وہ بچہ مسلمان ہی ہے؛ کیونکہ وہ بڑا ہو کر بھی لامحالہ مسلمان ہی رہتا؛ لہٰذا مذکورہ مسلمان نے جو اسلامی نام رکھ کر اسلامی طریقہ سے دفن کیا ہے صحیح کیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ ہر بچہ فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، مگر ماں، باپ بعد میں عقیدہ خراب کرتے ہیں اور مذکورہ لڑکا فطرت اسلام پر مرا ہے۔

عن أبي هريرةؓ، أنه كان يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه، وينصرانه، ويمجسانه الحديث. (صحيح مسلم، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، النسخة الهندية ٢/٣٦، بيت الأفكار رقم:٢٦٥٨، صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فهل يصلي عليه، النسخة الهندية ١/١٨١، رقم: ١٣٤٢، ف:١٣٥٨، مشكوة ١/٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ؍ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ ؍ ۴۲۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲ ؍ ۱۱ ؍ ۱۴۱۵ھ

غیر مسلم کی اسلامی طریقہ پر تدفین کرنا

سوال [۳۸۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مسلمان کو غیر مسلم کی تکفین وتدفین اپنے ہاتھ سے طریقۂ اسلام پر مع کلمۂ توحید و آیت قرآنی **منها خلقنكم الخ** کے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسے اگر کرلیا ہے، تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: جلال الدین، کٹیہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: غیر مسلم کو اگر مسلمان دفن کرتا ہے، تو ناپاک کپڑے دھونے کی طرح دھوکر کسی معمولی کپڑے میں لپیٹ کر بغیر سنت کی رعایت کرتے ہوئے کسی گڈھے میں کتے کی طرح ڈال کر داب دے، اسلامی طریقہ سے دفن کرنا جائز نہیں ہے، جس نے ایسا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرلے۔

عن علي بن أبي طالبؓ، قال: لما توفي أبو طالب أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: إن عمك الشيخ قدمات، فقال لي: اذهب فواره. الحديث. (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الطهارة، باب الغسل من غسل الميت، دارالفكر ۵۱۲/۱، رقم:۱۴۹۶)

عن علي بن أبي طالب قال: لما مات أبو طالب أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: يا رسول الله! مات الشيخ الضال، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذهب فاغسله، وكفنه. الحديث (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الطهارة، باب الغسل من غسل الميت، دارالفكر ۵۱۳/۱، رقم:۱۴۹۹، وهكذا في الطبقات الكبرى لإبن سعد، دارالكتب العلمية بيروت ۹۹/۱)

وإذا مات الكافر وله ولي مسلم، فإنه يغسله، ويكفنه، ويدفنه؛ لكن يغسل غسل الثوب النجس، ويلف في خرقة وتحفر حفيرة من غير مراعاة سنة التكفين واللحد. (هداية، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت

۱/۱۸۱-۱۸۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۵۶/۳۹۷۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۷/۱۴۳۱ھ

مرتد کے نابالغ بچہ کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال [۳۸۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید مسلمان پابند شرع ہے، اچانک اس کا لڑکا بیمار ہوگیا اور زیادہ عرصہ تک بیمار رہا، زید نے بہت زیادہ علاج کرایا کوئی فائدہ نہیں ہوا، زید کی ماں نے کہا کہ دیوی پاٹن میں جا کر کچھ دان دو؛ چنانچہ زید گیا اور وہاں مندر پر پجاری کو روپیہ دے دیا کہ پرساد چڑھا دو، پجاری نے آدھا پرساد اپنا لیا اور آدھا زید کو دیا، زید نے خود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلا دیا اور پجاری نے زید اور اس کے لڑکے کی پیشانی پر ٹیکہ بھی لگایا، دیوی پاٹن ہندؤں کی پوجا کا بہت بڑا استھان ہے، وہاں سے زید گھر آیا، کچھ لوگوں نے کہا وہ مسلمان نہیں رہا؛ کیونکہ اس کا عقیدہ صحیح نہیں ہے، اس سے کہا گیا کہ تو توبہ کرلے تو اس نے توبہ نہیں کیا، اسی حال میں رہا، پھر چار دن کے بعد اس کا لڑکا مر گیا، چند لوگوں کے سوا تمام لوگوں نے جنازہ کی نماز پڑھی لڑکے کی عمر تقریباً ۹؍سال تھی، گاؤں کے سب آدمیوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ مندر پر گیا تھا؛ اس لئے تمام لوگوں نے جنازہ کی نماز پڑھی، بعد میں جب معلوم ہوا تو گاؤں کے تمام لوگوں نے تجدید نکاح وایمان کیا۔

اب اس مسئلہ کے بارے میں صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا آدمی مندر پر جانے سے مرتد ہو جاتا ہے یا نہیں؟

(۲) کیا مرتد آدمی کا بچہ جو ابھی نابالغ ہے مر گیا اور ماں مسلمان ہے، اور ماں، باپ دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہے؟ جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی کہ نہیں؟

(۳) کیا اس بچہ کی نماز جنازہ پڑھنے سے صرف نکاح ہی ٹوٹ جاتا ہے یا اسلام سے خارج ہوجاتا ہے؟

(۴) جن لوگوں کا نکاح ٹوٹ گیا اور ابھی تک انہوں نے اپنا نکاح نہیں پڑھایا ہے ان کا کیا حکم ہے؟

(۵) نکاح ٹوٹ جانے کے بعد جن لوگوں نے دوبارہ نکاح نہیں پڑھوایا اور میاں بیوی کی طرح ساتھ ساتھ رہے، ان سے حمل ٹھہر گیا ان کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عنایت اللہ قاسمی، معرفت عبدالجلیل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اس شخص نے اپنے بچہ کو مندر میں لے جاکر جو حرکت کی ہے وہ کفریہ حرکت ہے تجدید ایمان اس پر لازم ہے۔

لو شبه نفسه باليهود، والنصارىٰ صورة، أو سيرة على طريق المزاح والهزل...... كفر. (شرح فقه اكبر ۲۲۸)

لو أن رجلا عبد الله خمسين سنة، ثم جاء يوم النيروز، فأهدىٰ إلى بعض المشركين بيضةً يريدبه تعظيم ذلك اليوم، فقد كفر بالله وأحبط عمله. (تاتارخانية، كتاب أحكام المرتدين، الفصل الحادى والعشرون في الخروج إلى النشيدة، زكريا ديوبند ۳٤٧/۷، رقم: ١٠٦٥٦، قديم ٥٢٢/٥)

نیز اس پر تجدید ایمان کے بعد تجدید نکاح لازم ہے۔

إذا ارتد أحد الزوجين عن الإسلام وقعت الفرقة بغير طلاق. (هداية، كتاب النكاح، باب نكاح أهل الشرك اشرفي ٢/٣٦٨)

(۲/۳) بچہ ماں کے تابع ہوکر مسلمان شمار ہوگا؛ لہٰذا اس کی نماز جنازہ جائز اور مشروع ہے۔

فإن كان أحد الزوجين مسلماً، فالولد على دينه، وكذلك إن أسلم أحدهما وله ولد صغير صار ولده مسلماً بإسلامه. (هداية، كتاب النكاح،

باب نكاح أهل الشرك، اشرفي ديو بند ۲/ ۳٤٦)

لہٰذا نماز جنازہ پڑھنے والوں میں سے کسی کا نکاح نہیں ٹوٹا، سب کا ایمان بدستور باقی ہے۔

(۴) نکاح ہی نہیں ٹوٹا تو ان پر تجدید نکاح کی کیا ضرورت؟

(۵) نکاح نہیں ٹوٹا اور نہ ہی ان پر کوئی حکم لاگو ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۵۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۱/ ۱۴۱۹ھ

مسلم لڑکی جس نے ہندو سے شادی کی اور غیر مسلم لڑکی جو مسلمان کے پاس ہے ان کے کفن دفن کا حکم

سوال [۳۸۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلم کی لڑکی ہندو مذہب کے لڑکے کے ساتھ چلی گئی، پھر کچھ دنوں کے بعد ماں باپ سے ملنے کے لئے آنے لگی، پورے تعلقات ہندو لڑکے سے ہیں، ایسی حالت میں لڑکی کی خدانخواستہ موت واقع ہوگئی، تو کس مذہب پر کفن دفن کیا جائے اور ہم لوگوں کو ان سے تعلقات رکھنے چاہیے یا نہیں؟

(۲) مسلم لڑکے نے ہندو مذہب کی لڑکی کو اپنے پاس رکھا ہے بغیر نکاح کے، خدانخواستہ موت واقع ہوگئی، تو کس مذہب پر کفن دفن کیا جائے؟ ایسے لوگوں سے ہم لوگوں کو تعلقات رکھنے چاہیے یا نہیں؟

(۳) ان دونوں شکلوں کے بارے میں لوگ پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، منظر عام پر لانا نہیں چاہتے، ایسے لوگوں کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبد السلام قریشی، تلودھی، چندر پور، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جب مسلم لڑکی ہندو مذہب لڑکے کے ساتھ چلی گئی تو

ظاہر ہے کہ لڑکی نے اپنے مذہب کو بتدیل کر کے لڑکے کے مذہب کو قبول کرلیا ہے محض والدین سے ملاقات کرنے کی وجہ سے اسے مسلمان نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ اس کا حکم مرتد کا ہوگا، اگر اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوجائے، تو کپڑے میں لپیٹ کر جانوروں کی طرح دفن کردیا جائے گا، نہ نماز پڑھی جائے گی اور نہ ہی سنت کے مطابق تجہیز وتکفین کی جائے گی؛ البتہ اگر وہ غیر مسلم کے ساتھ جانے کے بعد بھی مذہب اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے، تو پھر بھی دونوں کا ساتھ رہنا زندگی بھر بدکاری اور زنا کاری ہوگی اور اولاد بھی بدکاری کی ہوگی اور چونکہ مذہب اسلام پر مضبوطی سے قائم ہے؛ اس لئے اسلامی طریقہ پر تجہیز وتکفین کی جائے گی، اگر دین پر قائم ہونے کے باوجود غیر مسلم کے یہاں سے الگ نہیں ہوتی ہے، تو رشتہ داروں کو اس سے تعلقات ختم کردینا چاہئے۔

ولاتصل على أحدمنهم مات أبداً ولا تقم على قبره، بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِيْ الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْن. [التوبة: ٨٠]

والمرتد إذا قتل يحفرله حفيرة، ويلقي فيها كالكلب، ولايدفع إلى من انتقل إلى دينهم ليدفنوه. (البناية، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت اشرفية ديوبند ٣/٢٣٩، نعيمية ديوبند ٢/١١٦، الدر مع الرد، كاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، كراچي ٢/٢٣٠، زكريا٣/١٣٤)

(۲) اور اگر مسلم لڑکے نے ہندو مذہب کی لڑکی کو اپنے پاس رکھا ہے اور اس لڑکی نے اسلام قبول نہیں کیا ہے، تو اس کے اسلام قبول کرنے سے پہلے شرعی طور پر اس کا نکاح منعقد نہیں ہوگا؛ بلکہ باطل ہوگا؛ اس لئے نکاح کے ساتھ رکھے یا بغیر نکاح کے ہر حال میں اس لڑکی کے ساتھ بدکاری اور زنا کاری ہوگی، اس کے مرنے کے بعد اسلامی طریقہ پر کفن دفن نہیں کیا جائے گا؛ اس لئے کہ اس کے اسلام لانے کی کوئی علامت نہیں پائی گئی۔

وعلى هذا قالوا: اشترىٰ جارية، أو تزوج امرأة فاستوصفها صفة الإسلام، فلم تعرفه لا تكون مسلمة. (فتح القدير، باب الجنائز، فصل في الصلاة

علی المیت، کوئٹہ ۲/۹۳، زکریا ۲/۱۳۷، دار الفکر مصري قدیم ۲/۱۳۱، ۱۳۲،
حاشیة الطحطاوي علی مراقي الفلاح، باب أحکام الجنائز، دارالکتاب دیوبند ۶۰۰)

وکذا لو اشتریٰ جاریة، واستوصفها صفة الإسلام لایکون بذلک مؤمنة، وإنما یصلی علیه عند الإقرار بالإسلام؛ لأنه صح إسلامه استحسانًا.

(البنایة، باب الجنائز، فصل في الصلاة علی المیت، اشرفیة دیوبند ۳/۲۳۶، نعیمیة ۲/۱۱۱۳)

(۳) اگر لوگ اس مسئلہ کو منظر عام پر لانا نہیں چاہتے ہیں اور آپ کو مسئلہ معلوم ہو چکا ہے، تو اب آپ کو اختیار ہے آپ خود ہی یہ خدمت انجام دیں، دوسرے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷رذی قعدہ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۵۹۱)	۷/۱۱/۱۴۲۵ھ

مندروں میں جا کر بتوں کی پوجا کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال [۳۸۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کے مندر میں جا کر بتوں کی پوجا کرے اور ان کے سامنے اپنا سر ٹیکے، تو اس مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لئے صدقہ کرنا اور اس کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد گلفام، متولی مسجد بکر قصاب، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی مندروں میں جا کر پوجا کی ہے اور بت پرستی کی ہے، تو اسلام سے خارج ہو چکا ہے، لہٰذا اگر مرنے سے پہلے توبہ کر کے تجدید ایمان نہیں کی ہے اور اسی حالت میں مرا ہے، تو اس کی نماز جنازہ درست نہیں ہے اور اس کے لئے ایصال ثواب کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اگر توبہ کر کے تجدید ایمان کر لی تھی اور اس کے بعد مرا ہے، تو نماز

جنازہ جائز ہے ورنہ نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱/۲۹، جدید زکریا مطول ۱/۸۵، جدید زکریا مطول ۱/۲۰۳، فتاوی احیاء العلوم ۱/۹۶)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا اُوْلِيْ قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ. [التوبة:۱۱۳]

ولاتصل على أحدمنهم مات أبداً ولا تقم على قبره، بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. [التوبة: ۸۰]

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى. [طه: ۸۲]

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. [النساء:۱۷]

كما لو سجد لصنم، أو وضع مصحفاً في قاذورة، فإنه يكفر. (شامي، كتاب الجهاد، باب المرتد، زكريا ٦/٣٥٦، كراچي ٤/٢٢٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۵۰۴۱)

کفریہ عقائد رکھنے والوں کی نماز جنازہ کا حکم

سوال [۳۸۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بستی کی محلّہ کی مسجد میں زید عرصہ پندرہ سال سے امامت کررہا ہے، اسی محلّہ میں ایک ایسے فرقہ نے جنم لیا ہے، جو کہ نعوذ باللہ یہ کہتا ہے کہ نماز روزہ کوئی چیز نہیں، نماز کے بارے میں حکم ہے کہ نماز قائم کرو، جس طرح تم نماز پڑھتے ہو، اس طرح نماز قائم نہیں ہوتی؛ بلکہ نماز قائم کرنے والے ہم لوگ ہیں۔

اور روزہ کا مطلب ہے رکنا یہ نہیں کہ کھانے پینے سے رک جاؤ؛ بلکہ رکنا وہ ہے جو حالت ہم کو ہر وقت حاصل ہے اور قرآن ایک مثال ہے کہ اس میں ابابیلوں اور ہاتھی وغیرہ کا ذکر

ہے اور کوسنا کاٹنا ہے، جیسا کہ تبت یدا میں ہے اور ایسا نماز میں کرنا یعنی نماز میں چرندوں، پرندوں کا ذکر اور کسی کو بد دعا کرنا کہاں درست ہے یہ کوئی نماز ہے؟ اور روزہ ضروری نہیں اس کا فدیہ دے دو ادا ہو جائے گا، اسے تو بھوکا مارنا کہتے ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی نازیبا غلطیاں یہ لوگ کرتے ہیں، اگر منع کیا جائے تو رکتے نہیں، اس فرقہ کے لوگ اپنے پیر کے قدموں پر ماتھا رکھتے ہیں اور سر کو اس وقت تک نہیں اٹھاتے؛ جب تک پیر صاحب اپنا ہاتھ سر پر نہ رکھیں گے، پیر صاحب کے ہاتھوں کا دھوون آپس میں بہت بڑا جام حیات سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، یہ تبلیغ ان لوگوں کی عرصہ بیس سال سے چل رہی ہے اور امام زید کو ان کے ہر کام کا علم بخوبی ہے، یہ فرقہ کہتا ہے کہ قرآن کے چالیس پارے ہیں، اس کے دس پارے ہمارے پاس ہیں، جو سینہ در سینہ چلے آرہے ہیں، ان مولویوں کو ان کا علم نہیں ہے، جس کو وہ حاصل نے ہوں ہم جیسا ہو جائے، اس فرقہ کے ایک فرد کا انتقال ہو گیا تو زید نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی، اس کے بعد پھر ایک فرد کا اسی فرقہ کے انتقال ہو گیا، اس کی بھی زید نے بلا سوچ سمجھے نماز جنازہ پڑھا دی، تو اس فرقہ کے کسی فرد کی نماز جنازہ زید کو پڑھانا درست ہے یا نہیں؟ از روئے شرع اس فرقہ کی نماز جنازہ جو زید نے پڑھائی کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عمر، ایڈوکیٹ، منڈاور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکور فرقہ کے عقائد موجب کفر ہیں، ایسے عقائد رکھنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے، جو شخص ان کے عقائد معلوم ہونے کے باوجود ان کی میت کی نماز جنازہ پڑھائے، وہ عاصی اور فاسق ہے، ایسا شخص جب تک توبہ نہ کرے اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے اور جب توبہ کرے گا اور آئندہ اس میں شرکت نہ کرے گا، تو نماز بلا کراہت درست ہوگی۔

اوقال نماز کردہ یا نا کردہ یکے است = اوقال نماز چیزے نیست کہ اگر بماند کندہ شود

فهـذا كـلـه كفر. كذا في خزانة المفتيين. (عـالـمـگيري، ومنها ما يتعلق بالصلاة والصلام والزكاة، زكريا قديم ٢/٢٦٨، جديد ٢/٢٨٠)

أمـا المرتد فيلقي في حفرة كالكلب، أي يغسل ولايكفن. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، كراچي ٢/٢٣٠، زكريا ٣/١٣٤)

ويـكـره إمامة عبد، و فاسق، ومبتدع: أي صاحب بدعة، أما الفاسق، فـقد عللوا كراهة تقديمه، بأنه لا يهتم لأمر دينه؛ بل مشي في شرح المنية عـلـى أن كـراهة تقديمه كراهة تحريم. (شـامـي، كتـاب الصلاة، باب الإمامة، كراچي ١/٥٥٩-٥٦٠، زكريا ٢/٢٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۹۹۶/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۳/۱۴۲۴ھ

(۹) باب حمل الجنازة

جنازہ گھر سے نکالنے سے قبل میت کے لئے دعاءِ مغفرت کرنا

سوال [۳۸۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کے لئے جنازہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے مغفرت کی دعاء کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: انجمن علماء لکھیم پور نورتھ لکھیم پور (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: میت کے لئے دعاء مغفرت کرنا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، گھر سے نکلنے سے پہلے، گھر سے نکلنے کے بعد ہر حالت میں جائز ہے، کسی ایک وقت کو متعین کرلینا درست نہیں ہے۔

عن أم سلمةؓ –إلی– قالت: فلما مات أبو سلمةؓ أتيت النبي صلی اللہ عليه وسلم، فقلت: يا رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم، إن أبا سلمةؓ مات، قال: فقولي: اللّٰهم اغفرلي وله الخ (ترمذي، كتاب الجنائز، باب ماجاء في تلقين المريض عند الموت والدعاء له عنده، النسخة الهندية ۱/ ۱۹۲، دارالسلام رقم: ۹۷۷)

أن أبا هريرةؓ، أخبر هما أن رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم نعي لهم النجاشي صاحب الحبشة في اليوم الذي مات فيه، و قال: استغفروا لأخيكم. (بخاري شريف، المناقب، باب موت النجاشي، النسخة الهندية ۱/ ۵۴۸، رقم: ۳۷۴۲، ف: ۳۸۸۰)

ذكر ما يستفاد منه –إلي–: فيه: إباحة الدخول على الميت بعد

التكفين......وفيه: الدعاء للميت. (عمدة القاري، باب الدخول على الميت بعد الموت إذا أدرج في أكفانه، قديم مصري ۸/۱۷، زكريا ٦/۲۳)

صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلوةً، أو صوماً، أو صدقةً، أو غيرها. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القرأة للميت واهداء ثوابها له، كراچي ۲/۲۴۳، زكريا ۳/۱۵۱)

فإن من صام، أو صلى، أو تصدق، وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز، و يصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة. (البحر الرائق، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، زكريا۳/۱۰۵، كوئٹه ۳/۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۶۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۱/۱۴۳۳ھ

جنازہ لے جاتے وقت کیا پڑھیں؟

سوال [۳۸۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جب لوگ جنازہ کی چار پائی لے کر چلتے ہیں تو ان لوگوں کو کیا پڑھنا چاہئے، جو لوگ پیچھے پیچھے چلنے والے ہیں ان کو کیا پڑھنا چاہئے؟

المستفتی: شاہد علی، گونڈوی، امام محلہ کچا باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ لے کر چلنے والے اور پیچھے پیچھے چلنے والے سب کے لئے خاموش رہنا بہتر ہے؛ البتہ اگر کوئی ذکر وغیرہ کرنا چاہے، تو دل دل میں کیا کرے، آواز سے ذکر کرنا مکروہ ہے۔

عن زيد بن أرقمؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الله عزوجل يحب الصمت عند ثلاث: عند تلاوة القرآن، وعند الزحف، وعند الجنازة.

(المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٥/٢١٣، رقم: ٥١٣٠)

عن قتادة، عن الحسن رضـ **قال: أدركت أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يستحبون خفض الصوت عند الجنائز، وعند قراء ة القرآن، وعند القتال وبه نأخذ.** (مصنف عبد الرزاق الصنعاني الجنائز، باب خفض الصوت عند الجنائز، المجلس العلمي ٣/٤٥٣، رقم: ٦٢٨١)

وعلى متبعي الجنازه الصمت، ويكره لهم رفع الصوت بالذكر، وقراء ة القرآن الخ (فتاوى تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون الجنازة حمل الجنازة، زكريا٣/٣٧، رقم: ٣٦٧٥، كوئٹه ٢/١٥٢، البحرالرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاة، زكريا ٢/٣٣٦، كوئٹه ٢/١٩٢، الجوهرة النيره، باب الجنائز، دارالكتاب ديوبند ١/١٣٠، مكتبه امداديه ملتان ١/١٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/رجب المرجب ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۱۸۷۲)

قبرستان دور ہونے کی وجہ سے جنازہ کو راستہ میں رکھنا، پھر لے جانا

سوال [۳۸۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت کے گھر سے قبرستان ایک فرلانگ کی دوری پر ہے زید کے گاؤں سے جنازے کو قبرستان لے جاتے وقت عام طور سے لوگ قبرستان پہونچنے سے پہلے آدھی دوری پر منزل لیتے ہیں، یعنی تھوڑی دیر چارپائی کو زمین پر رکھ کر پھر اٹھا کر لے جاتے ہیں اور قبرستان تک پہونچاتے ہیں، کیا جنازے کو دوسری منزل لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جابر خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: احادیث طیبہ میں جنازہ میں جلدی کرنے کا حکم وارد ہوا

ہے؛ لہٰذا بلا وجہ تاخیر درست نہیں ہے، بریں بنا قبرستان پہونچنے سے پہلے تھوڑی دیر جنازہ کو بلا عذر زمین پر رکھنا یا اس کو لازم سمجھنا درست نہ ہوگا۔

عن أبي هريرةؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة فخير تقدمونها، وإن تك سوى ذلك فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، النسخة الهندية ١٧٦/١، رقم: ١٣٠١، ف: ١٣١٥)

ويسرع بها بلا خبب (در مختار) وحد التعجيل المسنون أن يسرع بها بحيث لا يضطرب الميت على الجنازة. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في حمل الميت، كراچي ٢٣٢/٢، زكريا ١٣٦/٣، هندية، الباب الحادى والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة زكريا قديم ١٦٢/١، جديد ٢٢٣/١، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مكتبه مصرى قديم ١٨٦/١، دار الكتب العلمية، بيروت ٢٧٤/١، البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا ٣٣٥/٢، كوئٹه ١٥١/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۳۵/۴۰)	۱۴۳۵/۲/۱۳ھ

اپنی متوفیہ عورت کو شوہر کا کندھا دینا

سوال [۳۸۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شوہر اپنی متوفیہ بیوی کے جنازے کو کندھا دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی شرع میں ممانعت ہے یا اجازت ہے؟ اگر ممانعت ہے تو اس کی وجہ بھی لکھی جائے، یہ سوال مجھ سے کئی آدمیوں نے کیا اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ شوہر اپنی مردہ بیوی کا کندھا نہیں دے سکتا۔

المستفتی: (مولانا) سہیل احمد، بمعرفت مقصود احمد بستوی، متعلم شعبۂ افتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صرف ہاتھ لگانا ممنوع ہے، اس کو دیکھنا اس کا جنازہ اٹھانا اور کندھا دینا سب جائز ہے۔

ويمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر إليها على الأصح.

(الدرالمختار على هامش رد المختار، باب صلاة الجنازة، مطلب في حديث كل سببي ونسب منقطع إلا سببي و نسبي، زكريا ۹۰/۳، كراچي ۱۹۸/۲، مطبوعه كوئٹه ۶۳۳/۱، فتاوى دارالعلوم ۲۷۵/۵، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب أحكام الجنائز، دارالكتاب ديوبند ۵۷۲، قديم ۳۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۴۵/۳۳)

کافر کا مسلم اور مسلم کا کافر کے جنازہ میں شرکت کرنا

سوال [۳۸۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم کے جنازہ میں ہماری شرکت پڑوسی ہونے کے سبب کی جاسکتی ہے؟ کیا ارتھی کے ہمراہ ہمارا کاندھا دینا جائز ہے؟ کیا اس کی آخری رسوم تک ہمارا وہاں رہنا درست ہے؟

المستفتی: تسلیم احمد، سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کا مسلمانوں کے جنازہ میں شرکت کرنے میں مسلمانوں کا کوئی مذہبی فائدہ نہیں اور میت کے حق میں بھی بجائے فائدہ کے نقصان ہوسکتا ہے: اس لئے مسلمانوں کے جنازہ میں شرکت کرنے کی وجہ سے مسلمان ان کے جنازہ میں شرکت کریں، اس کی شرعاً اجازت نہیں، ہاں البتہ پڑوسی ہونے کی وجہ سے صرف گھر جاکر تعزیت کرکے آجائے، جب جلانے کے لئے لے جائیں تو ان کے ساتھ نہ جائے اور نہ ہی ارتھی کا کندھا لگائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۱۶/۱۶، ۴۷، جدید ڈابھیل ۱۳۹/۹)

عن أبي اليمان قال: لما توفي أبو طالب خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم يعارض جنازته، قال: ابن عون فجعل يمشي مجانبًا لها، يقول: برتک رحم و جزيت خيراً و لم يقم على قبره. (المراسيل لأبي داؤد، ماجاء في الدفن رقم:۱۸)

إذا كان خلف جنازة الكافر من قومه من يتبع الجنازة لا ينبغي لقريبه المسلم أن يتبع الجنازة. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون، الجنائز، الكافر يموت وله ولي، زكريا ۷۷/۳، رقم:۳۷۵۳، كوئٹه ۱۷۳/۲، معارف القرآن ۳۷/٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۲۵۴/۳۳)

جنازہ کو دیکھ کر کھڑا ہونا

سوال [۳۸۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جنازہ کو دیکھ کر لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، شرع میں اس کی کیا اصل ہے؟

المستفتی: عبد الحفیظ قاسمی، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنازہ کو دیکھ کر ادباً کھڑے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سند صحیح کے ساتھ دونوں طرح کی روایات وارد ہوئی ہیں، حضرت عامر بن ربیعہ اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت میں جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا حکم موجود ہے اور حضرت علیؓ کی روایت میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضور ﷺ جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہوجایا کرتے تھے؛ لیکن بعد میں کھڑے ہونے کا عمل ترک فرمادیا، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر کے کھڑا ہوجانا لازم اور واجب نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کوئی ادباً کھڑا

ہوجاتا ہے، تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر کوئی کھڑا نہیں ہوتا ہے، اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے تو اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ہی اس کے اوپر سوءِ ادبی کا الزام ہے؛ بلکہ اس کو اختیار ہے؛ لہٰذا اگر کوئی کھڑا نہیں ہوتا ہے، تو اس کو برا نہیں سمجھنا چاہئے؛ کیوں کہ کھڑے ہونے کی جتنی روایتیں ہیں، وہ سب منسوخ ہوچکی ہیں۔

عن عامر بن ربيعةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الجنازة فقوموا لها، حتى تخلفكم أو توضع. (صحيح مسلم، كتاب الجنائز، فصل في استحباب القيام للجنازة و جواز القعود، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، بيت الأفكار رقم: ۹۵۸، ترمذي شريف، كتاب الجنائز، باب ماجاء في القيام للجنازة، النسخة الهندية ۱/ ۲۰۱، دارالسلام رقم: ۱۰۴۲)

عن علي بن أبي طالبؓ، أنه ذكر القيام في الجنائز حتى توضع، فقال عليؓ: قام رسول الله صلى الله عليه وسلم مرة واحدةً، كان يتشبه بأهل الكتاب في الشيء، فإذا نهى عنه تركه. (شرح معاني الآثار بيروت ۲/ ۱۷، رقم: ۲۷۳۵)

علي بن أبي طالبؓ يقول: في شأن الجنائز: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قام ثم قعد. (صحيح مسلم، كتاب الجنائز، فصل في استحباب القيام للجنازة وجواز القعود، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، بيت الأفكار رقم: ۹۶۲)

ولا يقوم من في المصلي لها إذا رآها قبل وضعها ولا من مرت عليه، وهو المختار، وماورد فيه منسوخ. (وتحته في الشاميه) بما رواه أبوداؤد، و ابن ماجه، وأحمد، والطحاوي من طرق، عن عليؓ قام رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم قعد و لمسلم بمعناه، وقال: قد كان ثم نسخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زكريا ۳/ ۱۳۶، ۱۳۷، كراچي ۲/ ۲۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۸ھ